مضامین

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

(اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

(جلد اوّل)

یکے از مطبوعات شعبہ اشاعت لجنہ اماءِ اللہ ضلع کراچی بسلسلہ صد سالہ جشنِ تشکر

مضامین

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

(اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

جلد اوّل

مرتبہ

امۃ الباری ناصر

یکے از مطبوعات

شعبہ اشاعت لجنہ اِماءِ اللہ ضلع کراچی

بسلسلہ صد سالہ جشنِ تشکر

(احمدی احباب کی تعلیم وتربیت کے لئے)

نام کتاب .... مضامین حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

جلد .... اوّل

مرتبہ .... امۃ الباری ناصر

پبلشر .... لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی

شمارہ نمبر 77

طبع .... اوّل

تعداد 1000

کتابت .... خالد محمود اعوان

پرنٹر .... **پرنٹ گرافکس** ڈیزائنر اینڈ پرنٹرز

فون: 0300-2260712 ,0300-2560760

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ لجنہ کراچی صد سالہ جشنِ تشکر کی خوشی میں کُتب شائع کرنے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہے۔ "حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل" اس سلسلے کی ستّرؔ ویں کتاب ہے فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ۳؍ جنوری ۱۹۹۹ء کی اردو کلاس میں فرمایا "حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل بہت قابل انسان تھے۔ بہت گنوں والے تھے ان کی سیرت پر پوری کتاب شائع ہونی چاہیئے۔ لطیفہ گو بھی تھے بہترین سرجن اور قرآن کا گہرا علم رکھنے والے تھے بہت قابل انسان تھے۔"

ہمیں خوشی ہے کہ ہمیں اطاعتِ امام کا موقع مل رہا ہے اور موصوف کی سیرت اور مضامین پر مشتمل کتاب طبع ہو رہی ہے۔ آپ کا منفرد اعزاز یہ ہے کہ آپ اس خوش قسمت خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے امام مہدی علیہ السلام کے لئے چنا تھا اور فرمایا تھا۔

اُشْكُرْ نِعْمَتِيْ رَأَيْتَ خَدِيْجَتِيْ

آپ حضرت میر ناصر نواب صاحب کے صاحبزادے اور حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگم کے بھائی تھے۔ آپ کا خدمتِ دین کا جذبہ آگے نسلوں میں منتقل ہوا۔ حضرت سیدہ مریم صدیقہ صاحبہ حرم حضرت مصلح موعود تا حیات لجنہ کی مثالی رہنما رہیں اور آپ کے نواسے محترم نواب مودود احمد خان صاحب آج کل امیر جماعت احمدیہ کراچی ہیں۔

حضرت میر صاحب کو حضرت اقدس مسیح موعود کی قربت میسر آئی۔ تحریر و تقریر کا ملکہ ہونے کی وجہ سے مسیحِ زماں کے خُلق و سیرت پر خوب روشنی ڈالی چنانچہ سیرت المہدی ازحضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد میں آپ سے ثقہ روایات کثیر تعداد میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی و جسمانی علاج کے گُر سکھائے تھے۔ نثر میں کئی کتب کے علاوہ آپ کا شعری مجموعہ "بخارِ دل" جماعت میں معروف و مقبول ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعود کو آپ سے بہت محبت تھی۔ آپ کے ارشاد پر کہ خطبہ الہامیہ یاد کریں۔ حضرت میر صاحب نے چند دنوں میں سارا خطبہ یاد کر کے سُنا دیا۔

اس کتاب کی تیاری میں سیکرٹری اشاعت عزیزہ امۃ الباری کی محنتِ شاقہ کے علاوہ عزیزہ برکت ناصر ملک صاحبہ کی اعانت بھی شامل ہے۔ فجزاھما اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ میں ان کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے الفاظ میں دُعا دیتی ہوں جو آپ نے عزیزہ باری کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرمائے۔

"کراچی کی ساری جماعت کو محبت بھرا اسلام یہ جماعت ان جماعتوں میں سے ہے جو میرے دل میں رہتی ہے۔ میری نظر تو ہمیشہ دُعا بن کر لگتی ہے۔ خدا حاسدوں کی چشمِ بد سے بچائے اور آپ کی طرف سے میری آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔" آمین

ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ پیشکش علم دین کی دنیا میں اہم دستاویز شمار ہوگی۔

وما توفیقنا اِلّا باللہِ العلیِ العظیم۔

سلیمہ میر

عرضِ حال

"ہمارے سامنے محترمہ آپا طیبہ صدیقہ صاحبہ نے حضرت میر صاحب کے مضامین یکجا شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہم نے حامی بھر لی اور جس قدر ہو سکا "الفضل" کی فائلوں سے مضامین فوٹو سٹیٹ کروا کے لے آئے ہیں اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

اس تمہید کے ساتھ محترمہ آپا سلیمہ میر صاحبہ اور عزیزہ برکت ناصر ملک صاحبہ نے میری جھولی میں جو فائل ڈال دی عجیب خزانہ تھا تبحر علمی اور جادو بیانی نے مل کر سماں باندھا ہوا تھا۔ مضامین پڑھ کر "اسسٹنٹ سرجن" کا ایک اور مفہوم ذہن میں آیا کہ حضرت سلطان القلم نے کمال حکمت سے زمانے کی جو سرجری کی ہے اس میں آپ نے خوب خوب ہاتھ بٹایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کام کے لئے خاص لگن پیدا کر دی پھر جس قدر ڈوبتی گئی زیادہ ڈوب جانے کی خواہش بڑھتی گئی۔ ایسے باسعادت کام میں جو محنت ہوئی اُس کا کیا ذکر؟ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

پروف ریڈنگ میں عزیزہ نصرت نذیر صاحبہ نے مدد کی۔ تمنا ہے کہ حضرت میر صاحب کا ایک شعر ہمیں بھی بطور دُعا لگ جائے۔

سجدے کروں گا شکر کے سرکار فرمائیں گے جب
راضی ہیں تجھ سے ہو گیا بندے مری جنّت میں آ

حضرت میر صاحب کے مضامین میں جن قرآنی آیات کا ترجمہ شامل نہیں تھا وہ تفسیر صغیر سے شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیات کے حوالے بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

دو ہستیاں جن کی دعاؤں کے ساتھ یہ کام ہو رہا تھا اب ہم میں نہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ اور محترمہ آپا طیبہ صدیقہ صاحبہ۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ ہمارا محبت بھرا سلام انہیں پہنچادے۔ اور اُن کی دُعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں آمین

خاکسار

امۃ الباری ناصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اُس نے محض اپنے خاص فضل و کرم سے میری ایک بہت پرانی خواہش کو پورا کیا۔ بہت مدت سے یہ خواہش تھی کہ میرے ابا جان ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل کے تمام مضامین جو سالوں پر محیط عرصے سے الفضل میں شائع ہوئے تھے وہ کتابی صورت میں چھپ جائیں۔ میں نے اس سلسلے میں سیّدہ چھوٹی آپا سے بھی بات کی تھی وہ اس کام کے لئے تیار تھیں۔ لیکن پھر وہ بیمار ہوگئیں۔ گزشتہ سال میں نے اپنے چھوٹے بھائی سیّد امین احمد سے بھی بات کی کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ لیکن خدا تعالیٰ کی تقدیر غالب آئی اور میرے پیارے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ لجنہ کراچی کو میری خواہش کا علم ہوگیا اور انہوں نے اس کتاب کی تیاری کا ذمہ اٹھا لیا اور وہ بے بہا موتی جو سالوں میں بکھرے پڑے تھے انہوں نے یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو دیئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ خدا تعالیٰ بڑا ہی عطا کرنے والا ہے وہ کسی کی سچی خواہش کو کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ پورا کر دیتا ہے۔

میں لجنہ اماء اللہ کراچی کے شعبۂ اشاعت کی بہت ہی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے مضامین اکٹھے کرنے میں اور چھپوانے میں میری خاطر اس قدر محنت

کی۔ اس کے علاوہ بھی حبیب الرحمان زبیری صاحب کی بھی بہت شکر گذار ہوں جنہوں نے بہت محنت سے مجھے الفضل میں سے حوالے نکال کر دیئے۔

خدا کرے کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کو پسند آئے اور اُن کا دینی و دنیاوی علم بڑھانے والی ہو اور یہ بھی دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے پیارے بندے کو اپنے قرب میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کی ساری اولاد کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام
طیبہ صدیقہ

حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ملفوظات میں

حضرت میر محمد اسمٰعیل کا ذکرِ خیر

"ڈاکٹر صاحب! ہمارے دوست دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کے ساتھ ہم کو کوئی حجاب نہیں اور دوسرے وہ جن کو ہم سے حجاب ہے۔ اس لئے ان کے دل کا اثر ہم پر پڑتا ہے اور ہم کو بھی اُن سے حجاب رہتا ہے جن لوگوں سے ہم کو کوئی حجاب نہیں ہے اُن میں سے ایک آپ بھی ہیں۔"

(ملفوظات جلد اول صـ۴۰۱)

"آج حضرت صاحبزادہ بشیر الدین محمود سلمہ اللہ تعالیٰ کی بارات رو ڑکی کو قادیان سے علی الصباح روانہ ہوئی۔ اس بارات میں حضرت مولانا مولوی نورالدین صاحب اور جناب مولانا مولوی سید محمد احسن صاحب اور جناب سیّد السادات میر ناصر نواب صاحب اور آپ کے صاحبزادہ میر محمد اسمٰعیل اور ڈاکٹر نور محمد صاحب، پیر سراج الحق صاحب نعمانی اور مفتی محمد صادق صاحب تھے۔"

(ملفوظات جلد دوم صـ۲۹۵)

"زلزلہ کا ایک دھکا لگتا ہے تو شہروں کے شہر ویران ہو جاتے ہیں۔ اس سے خدا تعالیٰ کی قدرتوں کا اظہار ہوتا ہے جب امن کا زمانہ ہوتا ہے تو لوگوں کو منطق یاد آتی ہے اور باتیں بناتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ ایک ہاتھ دکھاتا ہے تو تمام فلسفہ بھول جاتا ہے ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل ذکر کرتے ہیں کہ ۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء والے زلزلہ میں اُن کے کالج کا ایک ہندو لڑکا، دہریہ بیساختہ رام رام بول اُٹھا جب زلزلہ تھم گیا تو پھر کہنے لگا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ غرض ایسے لوگ درست نہیں ہوتے جب تک کہ اللہ تعالیٰ عجوبۂ قدرت نہ دکھائے وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جب تک کہ ایسا نہ ہو توحید قائم نہیں ہو سکتی۔"

(ملفوظات جلد پنجم صـ۱۵۲)

۱۴ مارچ ۱۹۰۶ئہ کو حضرت اقدس مسیح موعود نے ایک رؤیا دیکھا کہ

" میر ناصر نواب صاحب اپنے ہاتھ پر ایک درخت رکھ کر لائے ہیں جو پھلدار ہے اور جب مجھ کو دیا تو وہ ایک بڑا درخت ہو گیا جو بیدانہ توت کے درخت کے مشابہ تھا اور نہایت سبز تھا اور پھلوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور پھل اس کے نہایت شیریں تھے اور عجیب تر یہ کہ پھول بھی شیریں تھے مگر معمولی درختوں میں سے نہیں دیکھا گیا میں اس درخت کے پھل اور پھول کھا رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔"

(بدر جلد ۲ نمبر ۱۱ الحکم جلد ۱۰ نمبر ۹ تذکرہ صـ۵۴۴)

ارشاد

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

"[illegible] میر محمد اسماعیل صاحب جن کو ناظر اعلیٰ تجویز کیا گیا ہے۔ اُن کے دل میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی محبت بلکہ عشق خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ اس محبت کی وجہ سے روحانیت کا ایک خاص رنگ اُن میں پیدا ہو گیا ہے۔ اسلئے مَیں سمجھتا ہوں ایسی ٹھوکریں جو دوسروں کو لگ جاتی ہیں یا لگ سکتی ہیں۔ خدا نے اُن کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ اور مَیں اُمید کرتا ہوں کہ اس تعلق کی وجہ سے جو برکات اُن پر نازل ہوتی ہیں اُن کے باعث جماعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔"

الفضل ۲۲ جولائی ۱۹۲۴ء

ارشاد

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع
رحمہ اللہ تعالیٰ

"حضرت میر محمد اسماعیل حضرت اماں جان کے بھائی تھے۔ ڈاکٹر میر محمد اسماعیل بہت قابل انسان تھے۔ بہت گنوں والے تھے۔ اُن کی سیرت پر تو پوری کتاب شائع ہونی چاہیئے۔ لطیفہ گو بھی تھے۔ شاعر بھی تھے اور بہترین سرجن اور زبردست مربی اور قرآن کا گہرا علم رکھنے والے بہت قابل انسان تھے۔"

(اردو کلاس ۳۱ جنوری ۱۹۹۹ء)

جلسہ سالانہ ۲۰۰۲ء میں خواتین سے خطاب سے پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل کی نعت "بدرگاہِ ذی شانِ خیر الانام" کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا۔

"جب سے میں نے ہوش سنبھالی ہے کبھی ایسی نعت حضرت مسیح موعود کی نعتوں کے بعد نہ سُنی نہ دیکھی اور میرا خیال ہے ہمیشہ کے لئے یہ نعت حضرت میر صاحب کو خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔"

مندرجات

باب دوم

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل ـــــ بزرگانِ سلسلہ کے تاثرات

خراجِ محبت

باب سوم — توحید و اسلام ۱۷۹

باب چہارم — قرآن مجید ۲۷۵

باب پنجم

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۴۰۷

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

مندرجات جلد دوم

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

باب نہم

بعض مضامین کے متعلق قرآنِ مجید سے استدلال

باب دہم

باب یازدہم ——— شجرہ نسب اور برگ و بار

خدائی جبر

اپنی پیدائش ۔ زمانہ اور نسب — دلبرِ من تیرے ہی ہاتھوں سے تھے

اِک عجب عالم نظر آیا یہاں — قادیاں ۔ دہلی سے جب ہم آ گئے

زندگی ، اُستاد ، ہم صحبت ، عزیز — دین و دُنیا اور وطن سب تھے نئے

سرگزشتِ ماز دستِ خود نوشت — جو ہو خوشخط کس طرح بَد خط لکھے

مِل گیا تقدیر سے خیر القرون — اہلِ جنّت سے علائق ہو گئے

تھے مسیحِ وقت کے زیرِ نظر — حضرتِ مہدی کے قدموں میں پلے

عمر بھر دیکھا کیے حق کے نشان — اہلِ باطن کی مجالس میں رہے

دو خلیفہ جیسے سُورج اور چاند — یک نبی بہتر زِ ماہ و خاورے

تربیت ۔ تعلیم اور ماحول سب — بے عمل یہ فضل تُو نے کر دیے

از کرم ایں لُطف کر دی ورنہ من — ہیچو خاکم بلکہ زاں ہم کمترے

حُسن کی اپنے دکھادی اک جھلک — "دِل دواں ہر لحظہ در کُوئے کسے

طائرِ دِل تیرِ مژگاں کا شکار — سوختہ جانے زِ عشقِ دلبرے"

جُود و احساں نے ترے گھائل کیا — وصل کے آنے لگے پیہم مزے

جس کو تُو ہی خود نہ چھوڑے وہ بھلا — تیرے قابو سے نکل کیونکر سکے

"جبر سے دیتا ہے قسمت کے ثمار"
موکشانم مے بَرَد زور آورے

(بخارِ دل صـ۱۵۲)

باب اوّل

حضرت میر محمد اسمٰعیل
سیرت و سوانح

ایک پل بھی اَب گزر سکتا نہیں تیرے بغیر
اَب تلک تو ہو سکا جیسے گزارا ہو گیا
بعد مُردن قبر کے کتبے پہ یہ لکھنا مرے
آج ہم دِلبر کے اور دِلبر ہمارا ہو گیا

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

خدائے رحمان کا عطا کردہ سب سے بڑا اعزاز جو حضرت میر محمد اسمٰعیل (اللہ آپ سے راضی ہو) کو عطا ہوا وہ مہدیٔ معہود مسیح موعود حضرت مرزا غلام احمد قادیانی (آپ پر سلامتی ہو) کا برادرِ نسبتی ہونا ہے۔ رفقائے مسیح میں شمولیت کی سعادت اور پھر قرابت داری منفرد نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آپ اُس مبارک خاتون کے بھائی ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے "میری نعمت میری خدیجہ" قرار دیا۔

اُشْكُرْ نِعْمَتِيْ رَأَيْتَ خَدِيْجَتِيْ

میرا شکر کر کہ تو نے میری خدیجہ کو پایا۔ (براہین احمدیہ صہ ۵۵۸)

خالقِ ارض و سماء کی بسیط حکمتوں سے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانیوں سے اُن کی نسل میں فخر الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا خیر البشر پیدا ہوا۔ پھر آپؐ کی جگر گوشہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جیسی قربانیاں پیش کرنے کی توفیق ملی۔ جس کی قبولیت کا ایک رنگ آپ کی نسل میں صالحین کے سلسلوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔
حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب حضرت امام حسین علیہ السلام کی چالیسویں پُشت اور خواجہ میر دردؒ کی پانچویں پُشت سے تھے گویا آپ کا خاندان حسینی سادات تھا جس میں کئی باخدا امام اور ولی اللہ پیدا ہوئے۔ بارہویں صدی ہجری میں حضرت خواجہ محمد ناصر دہلویؒ بہت بڑے

فنا فی اللہ بزرگ گزرے ہیں۔ آپ دُنیاوی وجاہتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ذکرِ الٰہی میں مستغرق ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رؤیا وکشوف سے نوازا۔ ایک کشف میں آپ کو ایک بزرگ ملے اور فرمایا۔

"میں حسن مجتبیٰ بن علی مرتضیٰ ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے ماتحت تمہارے پاس آیا ہوں تا تجھے ولایت اور معرفت سے مالا مال کروں ..... ایک خاص نعمت جو خانوادۂ نبوت نے تیرے واسطے رکھی تھی اور اس کی ابتدا تجھ پر ہوئی ہے اور انجام اس کا مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ہوگا۔"

(میخانہ درد ص۲۶)

اللہ تعالیٰ سے زندہ تعلق کا اندازہ آپ کی تصنیف "نالۂ عندلیب" کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"میری یہ کتاب الہامی کتاب ہے اور میں نے جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ مکاشفہ اور معائنہ سے کیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ تمام مکاشفے اور الہام قرآنِ پاک اور حدیثِ صاحبِ لولاک کے مطابق اور موافق ہیں اور مرکزِ شریعت سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں۔"

(نالۂ عندلیب ص۶۰۲)

ایک دفعہ آپ کو یہ الہام ہوا۔

"ہم نے تمہارے نام کو پسند فرمایا اور تمہاری اولاد اور تمہارے معتقدین اور مریدوں کے لئے اس میں دونوں جہان کی برکات داخل فرما دیں جو شخص ازراہِ عقیدت لفظ ناصر کو اپنے یا اپنی اولاد کے نام میں شامل کرے گا اس کی برکت سے ہمیشہ مظفر ومنصور رہے گا اور آتش دوزخ

اس پر حرام کر دی جائے گی اور جو شخص اپنی کتاب یا خط کی پیشانی پر
"ھوالناصر" تحریر کرے گا اس کتاب اور خط کے مطالب کو کامیابی ہو
گی۔" (میخانۂ درد صـ۹۲)

حضرت خواجہ میر ناصرؒ کئی کتابوں کے مصنف اور کئی چیزوں کے موجد تھے۔ آپ کی داستانِ حیات تعلق باللہ کے واقعات سے مزیّن ہے۔ آپ نے ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ کو وفات پائی۔ تدفین کے وقت آپ کے بیٹے اور خلیفہ خواجہ میر دردؔ نے کشفاً دیکھا کہ سارا وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما رہے ہیں۔

خواجہ میر دردؔ (۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ھ) اس خاندان کے عالم باعمل صوفی باصفا نثر و نظم میں کئی کتب کے مصنف اردو کے مشہور شاعر تھے۔ خاندانی شرافت و بزرگی اور ولایت میں خاص مقام رکھتے تھے اللہ تعالیٰ کی عنایات کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

"مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کی ولایت کا مقام بخشا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقامِ ولایت مجھے دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ ولایت مجھے دیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا مقامِ ولایت مجھے مرحمت فرمایا۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی مقام ولایت مرحمت کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ ولایت بھی عنایت کیا اور پھر اس جامعیت کے کمال اور اختتام کے لئے ولایت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف فرمایا اور محمدیت خالص کی ردا میں مجھے چھپا لیا اور رسولِ پاک کی ذات میں مجھے فنا کر دیا پس نہ میں رہا اور نہ میرا نشان۔"

پھر فرمایا:۔

"مجھے خدا تعالیٰ نے عقل کامل و نفسِ کامل و روحِ کامل اور جسدِ کامل

کے ساتھ اپنے تمام اسماء کا مظہر پیدا کیا تا کہ میں معترفین کو طریقہ خالصہ محمدیہ کی دعوت دوں۔"

پھر فرمایا

اور یہ نسبت محمدیہ الخاصہ حضرت امام موعود علیہ السلام کی ذات پاک پر ختم ہوگی اور تمام جہان ایک نور سے روشن ہوگا اور اس نیرِ اعظم کے انوار میں سب فرقوں کے ستاروں کی روشنی گم ہو جائے گی۔

میخانۂ درد

(منقول از سیرت اماں جان نصرت جہاں بیگم از شیخ محمود احمد عرفانی)

پُشت در پُشت صالحین کے اس سلسلے کے انتہائی خوش نصیب بزرگ حضرت میر ناصر نواب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) اندازاً ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ خاندانی ولایت وسجادگی، فطری نیکی، اور فنا فی اللہ والدین کی تربیت نے آپ کو یکسر ردو تجدا کر دیا۔ آپ کی والدہ اتنی نیک خاتون تھیں کہ غدر کی دربدری میں گھر سے صرف قرآنِ پاک اٹھایا تھا۔ حضرت میر ناصر نواب کی سولہ برس کی عمر میں سادات گھرانے میں محترمہ سید بیگم صاحبہ سے شادی ہوئی وہ بھی معروف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ میرزا فواد بیگ ایران سے آئے تھے۔ اُن کے بیٹے نذر محمد بیگ کی بڑی بیٹی قادری بیگم کے ہاں پیدا ہوئیں۔ ان کا خاندان بہت پھیلا ہوا تھا۔ مرزا غالب کے خاندان لوہارو والوں سے بھی قرابت داری تھی۔ ان کے نصیب میں مسیحائے وقت سے صہری تعلق جوڑنا لکھا تھا۔ ان کے ہاں تیرہ بچے ہوئے جن میں سے تین زندہ رہے۔ ۱۸۶۵ء میں پہلی بیٹی نصرت جہاں پیدا ہوئیں جو الٰہی بشارتوں اور سامانوں سے حضرت مسیح موعود کے عقد میں آئیں۔

۱۸ جولائی ۱۸۸۱ء کو ایک بیٹا پیدا ہوا۔ حضرت میر ناصر نواب کو مشہور اہل حدیث مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی سے عقیدت تھی اپنے بیٹے کو ملانے کے لئے لے گئے

مولوی صاحب نے بچے پر ازراہِ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔ ؎

برائے کردن تنبیہ فسّاق
دوبارہ آمد اسمٰعیل و اسحاق

حضرت میر صاحب نے اپنے بیٹے کا نام میر محمد اسمٰعیل رکھا جب ۱۸۹۰ء میں آپ کے ہاں دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تو اسی شعر کی بنا پر میر محمد اسحٰق نام رکھا گیا۔

حضرت میر ناصر نواب کو اپنے ماموں میر ناصر حسین صاحب کے توسط سے محکمۂ انہار میں ملازمت مل گئی انہیں کے ذریعے آپ کا تعارف قادیان کے مرزا غلام قادر صاحب (حضرت مسیح موعود کے بھائی) سے ہوا جو کچھ عرصہ محکمۂ انہار میں ملازم رہے تھے۔ اُن دنوں حضرت میر ناصر نواب صاحب تتلہ نہر کی کھدائی کروا رہے تھے کہ اُن کی بیگم کچھ بیمار ہوگئیں۔ مرزا غلام قادر صاحب نے مشورہ دیا کہ اُن کے والد مرزا غلام مرتضیٰ صاحب سے طبی مشورہ کر لیں۔ چنانچہ آپ اپنی بیمار بیگم کو لے کر قادیان آئے۔ اس طرح ۱۸۷۶ء میں قادیان کی مبارک زمین اور حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے مبارک خاندان سے تعلق کا آغاز ہوا جو قبولِ احمدیت اور حضرت مسیح موعود سے مبارک پیوند پر منتج ہوا۔ حضرت مسیح موعود اور اُن کی عروسہ نصرت جہاں بیگم کے رشتۂ ازدواج سے ایک ایسے خاندان کا آغاز ہوا جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی موجود ہے یَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُ لَہٗ

وہ بابرکت گھر جس میں اس زمانے کی خدیجہ اور اسمٰعیل و اسحٰق جیسے فنا فی اللہ بھائیوں نے پرورش پائی۔ جنّت ارضی کی مثال تھا۔ حضرت میر ناصر نواب صاحب کی اہلیہ مثالی خاتون تھیں۔ جماعت احمدیہ میں "نانی اماں" کے لقب سے معروف ہیں۔

خانوادۂ میر درد میں لڑکیوں کو گھر پر ہی قرآن پاک، دینی تعلیم، عربی، فارسی، اردو پڑھائی جاتی تھی نانی اماں نے اسی سادگی سے تعلیم پائی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن میں ایسی خوبیاں یکجا کر دی تھیں جو اچھی بیوی اور اچھی ماں میں موجود ہونی چاہئیں۔ حضرت میر ناصر نواب صاحب نے حیاتِ ناصر میں بیان فرمایا ہے۔

"اس بابرکت بیوی نے جس سے میرا پالا پڑا تھا مجھے بہت ہی آرام دیا اور نہایت ہی وفاداری سے میرے ساتھ اوقات بسری کی اور ہمیشہ نیک صلاح دیتی رہی اور کبھی مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا نہ مجھ کو میری طاقت سے بڑھ کر تکلیف دی میرے بچّوں کو بہت ہی شفقت اور جانفشانی سے پالا نہ کبھی بچوں کو کوسا نہ مارا۔ اللہ تعالیٰ اسے دین و دُنیا میں سرخرو رکھے ..... ایسی بیویاں دُنیا میں بہت کم میسّر آتی ہیں یہ بھی میری ایک خوش نصیبی ہے جس کا میں شکر گذار ہوں کئی لوگ بسبب دینی اور دنیوی اختلاف کے بیویوں کے ہاتھ سے نالاں پائے جاتے ہیں جو گویا کہ دُنیا کی دوزخ میں داخل ہو جاتے ہیں میں تو اپنی بیوی کے نیک سلوک سے دنیا میں ہی جنت میں ہوں۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

(حیات ناصر صفحہ ۵۔۶)

آپ نے ایک دُعائیہ نظم کہی جس کے تین شعر تو سیدھے درِ قبولیت تک پہنچے۔

اسلام پر جئیں ہم ایمان سے مریں ہم
ہر دم خدا کے در کی حاصل ہو جبہ سائی

جس وقت موت آوے بے خوف ہم سدھاریں
دل پر نہ ہو ہمارے اندوہ ایک رائی

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

مہدی کے مقبرے میں ہم پاس پاس سوئیں
دنیا کی کشمکش سے ہم کو ملے رہائی
یہ خوش نصیب جوڑا حضرت اقدس کے قدموں میں پہلو بہ پہلو ابدی نیند سو رہا ہے۔

بچپن کا ایک واقعہ

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کے بچپن کے حالات محفوظ نہیں مگر ایک ایسا واقعہ گذرا ہے جو حضرت میر صاحب کے بچپن کا ہے اور مسیح وقت کی صداقت کا ایک نشان بن گیا ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۸۹۲ء کی تاریخ کے ساتھ تذکرہ میں درج ہے۔

"ایک دفعہ میری بیوی کے حقیقی بھائی سید محمد اسمٰعیل کا (جن کی عمر اُس وقت دس برس کی تھی) پٹیالہ سے خط آیا کہ میری والدہ فوت ہوگئی ہے اور اسحاق میرے چھوٹے بھائی کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے اور پھر خط کے اخیر میں بھی لکھا ہوا تھا۔ کہ اسحاق فوت ہوگیا ہے اور بڑی جلدی سے بلایا کہ دیکھتے ہی چلے آویں اس خط کو پڑھنے سے بڑی تشویش ہوئی کیونکہ اس وقت میرے گھر کے لوگ بھی سخت تپ سے بیمار تھے ....

تب مجھے اس تشویش میں یک دفعہ غنودگی ہوئی اور یہ الہام ہوا۔

اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْم

یعنی اے عورتو تمہارے فریب بڑے ہیں ..... اس کے ساتھ ہی تفہیم ہوئی کہ یہ ایک خلافِ واقعہ بہانہ بنایا گیا ہے تب میں نے ..... شیخ حامد علی کو جو میرا نوکر تھا پٹیالہ روانہ کیا جس نے واپس آکر بیان کیا کہ اسحٰق اور اُس

کی والدہ ہر دو زندہ ہیں ۔" (نزول المسیح صـ۲۳۳، ۲۳۴)

حضرت میر صاحب کے الفاظ میں واقعہ کی وضاحت پڑھنے سے اُن کی فطری عاجزی اور تقویٰ کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں ۔

واقعہ یہ ہوا کہ ان دنوں ہم پٹیالہ میں بطور اجنبیوں اور پردیسیوں کے رہتے تھے اور گھر کے صرف چار آدمی تھے یعنی حضرت میر ناصر نواب صاحب، حضرت والدہ صاحبہ ۔ یہ خاکسار اور میر محمد اسحاق صاحب ۔ کہ استنے میں حضرت والدہ صاحبہ کو بخار آنا شروع ہو گیا ۔ اور ساتھ ہی میر محمد اسحاق صاحب کو بھی ۔ والد صاحب قبلہ دفتر چلے جاتے تھے اور میں مدرسہ ۔ والدہ صاحبہ اپنی اور بچے کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھیں ۔ حتیٰ کہ ایک دن تو میں نے یہ حال دیکھا کہ بخار کی گھبراہٹ میں کپڑے پھینکتی تھیں اور کبھی اُٹھتی اور کبھی بیٹھتی تھیں ۔ اور سخت بدحواس ہو گئیں تھیں ۔ میر محمد اسحاق صاحب بھی بخار میں بے چین رہتے اور کبھی بے ہوش پڑے رہتے ۔ اس دن جب دوپہر کو میں اسکول سے آیا تو وہ اسی حالت میں تھیں ۔ فرمانے لگیں کارڈ لے کر ابھی قادیان خط لکھ دے ۔ میں کارڈ اور قلم دوات لے آیا ۔ اس پر انہوں نے اسی گھبراہٹ میں مجھے کہا کہ اپنی آپا کو خط لکھو کہ تمہاری والدہ فوت ہو گئی ہیں اور اسحاق کو کوئی سنبھالنے والا نہیں ہے ۔ کسی آدمی کو فوراً بھیج دو ۔ مَیں نے یہ سُن کر تردد کیا ۔ بلکہ کچھ پروٹسٹ بھی کیا ۔ انہوں نے اسی گھبراہٹ میں مجھے بھی کچھ سخت سُست کہا ۔ اور کہا جو کچھ میں لکھواؤں وہی لکھ ۔ آخر میں مَیں نے اُن کے رعب اور اصرار سے اور ان کی اپنی حالت بحران والی دیکھ کر وہی لکھ دیا ۔ پھر جب یہ مضمون لکھ چکا تو فرمانے لگیں ۔ جس کا مطلب قریباً یہ تھا کہ میں مرگئی تو یہ بھی بے ماں

کے مرجائے گا ۔ یہ لکھ دے کہ اسحٰق بھی فوت ہوگیا ہے ۔ اور تم دیکھتے ہی فوراً یہاں آجاؤ۔
چنانچہ میں نے یہ بھی لکھ دیا۔ اور خط کو ڈال کے بمبے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد دو تین
دن میں شیخ حامد علی صاحب مرحوم قادیان سے حضور کے بھیجے ہوئے آگئے ۔ اتنے میں والدہ
صاحبہ کو بخار سے آرام آگیا تھا۔ (غالباً ملیریا تھا) اس وقت سب قصّہ ظاہر ہوا تو حامد علی
صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے قادیان جاکر حضرت کے حضور عرض کر دیا۔ کہ یہ
بات یہ تھی ۔ چنانچہ حضور فرماتے ہیں ۔

" اور اس خط لکھنے کا صرف یہ باعث ہوا کہ چندروز اسحٰق اور اسمٰعیل
کی والدہ سخت بیمار رہیں ۔ اور اُن کی خواہش تھی کہ اس حالت بیماری میں
جلد تر ان کی لڑکی اُن کے پاس آجائے ۔ اس لئے کچھ تو بیماری کی گھبراہٹ
اور کچھ ملنے کے اشتیاق سے یہ خلافِ واقعہ خط میں لکھ کر بھیج دیا۔"
(تریاق القلوب ایڈیشن اول صفحہ ۴۷)

کل واقعہ یہ ہے کہ والدہ صاحبہ کی بیماری کی سخت گھبراہٹ اور بحران اور بیقراری
جو اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے انکو بہت حد تک معذور قرار دیتی ہے ساتھ
ایک دُودھ پیتے بچے کا حشر اُن کو نظر آتا تھا کہ کیا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے جلد سے
جلد اپنی لڑکی کو قادیان سے بُلانے کے لئے ایسا لکھوا دیا۔ پس کچھ حصّہ بیماری کا کچھ
خواہش ملاقات کا جو ایسے موقع پر ہوا کرتی ہے ۔

الہام: اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْم

اب رہی یہ بات کہ الہام اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْم تو بڑا سخت اور خطرناک الہام
ہے سو اس کی بابت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زلیخا کے لئے یہ سبب اس کی خاص شرارت کے
واقعی یہ الفاظ لفظی اور معنوی طور پر صحیح تھے لیکن قرآن میں آکر یہ آیت بطور ضرب المثل
یا متداول اور متعارف فصیح و بلیغ فقرہ کے لینے چاہئیں نہ کہ وہ معنی جو پہلی دفعہ اس

آیت کے لئے گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنی ازواج مطہراتؓ کو اِنکُنّ لصواحب یوسف فرمایا تھا وہ بھی اسی رنگ میں فرمایا تھا۔

انبیاء اور اولیائے کرام کو خدا تعالیٰ معصومیت اور محفوظیت کا مقام دیتا ہے ورنہ ہم کہاں اور غلطی اور گناہ سے پاک ہونا چہ معنی؟ ہاں وہ مرحومہ حضور کے قدموں میں مقبرہ بہشتی میں جگہ پاکر اس بات پر گواہی ثبت کر گئیں کہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ مل چکی ہے اور اب اُن کی کسی کمزوری کا ذکر کرنا یا اس کو قابلِ اعتراض سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ؎

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

اور میں جو ابھی زندہ ہوں نہیں جانتا کہ میرا کیا حشر ہوگا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت پر امید لگائے بیٹھا ہوں اور میرا دل جانتا ہے کہ ان گناہوں اور غفلتوں کی موجودگی میں جن کا میں مرتکب ہوا ہوں یہ گناہ کچھ ہستی ہی نہیں رکھتا اگر کسی دوست کو میرے اعمال نامہ کا ایک صفحہ بھی پڑھنے کو مِل جائے تو وہ غالباً اس زمین پر پھر نہ سکے جس پر میں رہتا ہوں اور اس آسمان کے نیچے نہ ٹھہر سکے جس کے نیچے میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں .....

اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمائے اور جہنم سے بچائے۔ آمین۔

ربنا ظلمنا انفسنا وَاِن لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین

مغفرت اور پردہ پوشی کر مرے آمرزگار
تجھ پہ ہیں اعمال اور نیات میری آشکار
لافِ زہد و راستی اور پاپ دل میں ہے بھرا
ہے زباں میں سب شرف اور نیچ دِل جیسے چمار

(سیرت حضرت سیدہ نصرت جہاں حصہ دوم از عرفانی کبیر صـ۳۰۲ تا ۳۰۴)

تعلیم

۱۹۰۰ء میں حضرت میر صاحب نے ایف ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ حضرت مسیح موعود اور گھر والوں کا مشورہ تھا کہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل ہو اس کی تفصیل حضرت میر صاحب خود بیان فرماتے ہیں :۔

"۱۹۰۰ء میں میں ایف اے کا امتحان دے کر جب قادیان آگیا تو آتے ہی پہلے تو نتیجہ کا انتظار رہا پھر اس کے بعد یہ کہ اب تعلیم کا رُخ کس طرف پھیرا جاوے۔ دو ماہ کے بعد نتیجہ نکلا تو میں فرسٹ ڈویژن پاس تھا۔ اس کے بعد حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور ان کے تتبع میں سب کا مشورہ یہی تھا کہ ڈاکٹری کی تعلیم شروع کی جاوے لیکن مشکل یہ آگرہ پڑی کہ والد صاحب صرف دس روپے ماہوار خرچ دے سکتے تھے کیونکہ اُن کی پنشن صرف تیس روپے ماہوار تھی مزید برآں تقریباً ۲۲۰ روپے سالانہ گاؤں کی آمد کا آتا تھا مشورہ تو ہو گیا مگر تعلیم کا خرچ ان کی مقدرت اور حیثیت سے بہت زیادہ تھا یعنی تیس روپے ماہوار عام اخراجات کے لئے اور پچاس روپے سالانہ فیس کالج کی اور قریباً سات سو روپے کی کتابیں و آلات جو مختلف اوقات میں تعلیم کے دوران خریدے جاتے تھے۔ آخر ایک دن والد صاحب نے گھر میں ذکر کر دیا کہ اس تعلیم کا خرچ میری طاقت سے بڑھ کر ہے میں گاؤں کا سارا روپیہ یعنی دس روپے ماہوار تو اس کو دے سکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتا خیر بات آئی گئی ہو گئی مگر اکتوبر کا مہینہ نزدیک آرہا تھا جب میڈیکل کالج کا داخلہ ہونا تھا اور میرا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ دیکھئے اب دفتر انگریزامیز ریلوے کی کلرکی کرنی

پڑتی ہے یا اور کوئی نوکری کہ اتنے میں ایک دن گھر کی کسی خادمہ نے میرے ہاتھ میں ایک ملفوف خط دیا (افسوس وہ خط میرے پاس محفوظ نہیں رہا) مگر اس کا خلاصہ مطلب یہ تھا۔

تم اپنی ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے تردد نہ کرو انشاءاللہ مزید جو خرچ درکار ہوگا وہ میں پورا کروں گی اور یہ مت خیال کرو کہ حضرت صاحب سے لے کر دوں گی بلکہ جو میرا ذاتی خرچ ہے اسی سے دیا کروں گی بلکہ انشاءاللہ حضرت صاحب کو بھی اطلاع نہ ہوگی۔

آخر میں نصرت جہاں لکھا تھا

اس کے بعد جب داخلہ کا وقت قریب آیا تو میں نے حضرت والد صاحب سے کہا کہ آپا صاحبہ کا اس مضمون کا خط مجھے ملا ہے اور اب داخلہ قریب ہے آپ تیاری کریں۔ انہوں نے آپا صاحبہ سے ذکر کیا کہ فلاں تاریخ کو داخلہ ہے اور محمد اسمٰعیل لاہور ڈاکٹری میں داخل ہونے جا رہا ہے۔ خیر میں لاہور گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ میرا نمبر سب سے اوپر ہے اور بسبب فسٹ ڈویژن کے مجھے بارہ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملے گا۔ غرض نام داخل کرا کر میں آ گیا۔ یہاں آ کر ماہوار خرچ کا یہ انتظام ہوا کہ بارہ روپے ماہوار وظیفہ سرکاری، دس روپے حضرت والد صاحب کی طرف سے اور دس روپے حضرت (اماں جان) کی طرف سے۔

اس طرح ماہوار خرچ بآسانی پورا ہو گیا جو ان دنوں کے مطابق کافی تھا۔ اب رہیں فیسیں اور کتابیں اُن کے لئے پہلے سال تقریباً تین سو روپے داخل کرنا پڑا۔ دوسرے اور تیسرے سالوں میں قریباً سو روپے اور چوتھے سال پھر قریباً تین سو پچاس روپے۔

آپا صاحبہ نے ان دس روپے ماہوار اور فیسوں اور کتابوں کے لئے تمام رقم جمع کرنے کی یہ تجویز ہوئی کہ حضرت (اماں جان) نے ایک صندوقچی مقفل جس میں روپے ڈالنے کا سوراخ بنا ہوا تھا۔ حضرت والدہ

صاحبہ کے پاس بطور امانت رکھوا دی اس صندوقچی میں قفل لگا رہتا تھا اور دوسرے تیسرے روز حضرت (اماں جان) جو روپیہ ان کے پاس ذاتی خرچ کا ہوتا تھا اس صندوقچی میں ڈال دیا کرتی تھیں جس میں سے دس روپے ماہوار والد صاحب کے دس روپیوں کے ساتھ مجھے لاہور پہنچ جایا کرتے تھے۔
تو پچاس روپے فیس کے اور چار سو روپے نئی کتابوں کی قیمت دستی بے جایا کرتا تھا۔ ان دنوں لاہور کے اخراجات بمقابل آج کل کم ہوا کرتے تھے میں اپنے تیس پینتیس روپے ماہوار میں سے ایک مکان کرایہ پہ لے کر رہا کرتا تھا اور ایک ملازم لڑکا بھی جو باورچی کا کام کر سکتا ہو رکھا کرتا تھا اور ہم دونوں کا کھانا، سقہ، خاکروب، نائی، دھوبی اور بالائی اخراجات سب اس میں پورے ہو جاتے تھے۔
کپڑے رخصتوں کے ایام میں قادیان میں بن جایا کرتے تھے۔ ساتھ ہی خدا نے یہ فضل بھی فرمایا کہ مجھے پانچوں سال برابر سرکاری وظیفہ ملتا رہا۔
اس طرح میری میڈیکل کالج کی تعلیم اس طرح ختم ہوئی جس میں بیشتر حصہ حضرت (اماں جان) کی طرف سے اور کچھ میرے وظیفہ کا اور دس روپے ماہوار حضرت والد صاحب کی طرف سے حصہ تھا۔

(سیرت حضرت (اماں جان) نصرت جہاں بیگم صفحہ ۲۴ تا ۲۶)

شفیق بہن نے عزت نفس کا خیال رکھا اور رازداری سے اپنا قول نبھایا اس کا گہرا اثر حضرت میر صاحب کے دل پر مسلسل رہا فرماتے ہیں :

"جو روپیہ ان کو ذاتی جیب خرچ کے لئے ملتا تھا اس میں مسلسل اتنے سال اپنے پر تنگی ترشی گوارا فرما کر انہوں نے میرے پر اتنا بڑا احسان فرمایا جس کے اظہار کا موقع اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا ان کا

ابتغاء ذی القربیٰ ان کی لمبی اور مسلسل قربانی اور مجھ پر ان کی خاص
شفقت اور محبت کے اخلاقِ فاضلہ کو آئندہ نسلوں کے لئے بطور سبق
کے پیش کروں۔ یہ تو صرف ایک خاص واقعہ ہے جس کا علم چونکہ عام
لوگوں کو نہیں ہے اس لئے لکھ دیا ہے ورنہ جوان کے احسانات مجھ پر
ہیں ان کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ احسان کہ ان کے
تعلق کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ایک ایسے عظیم الشان شخص سے ہمارا پیوند
کرا دیا کہ اس کے شکر سے ہماری زبانیں بالکل قاصر ہیں۔"

آپ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھے جب ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء کو کانگڑہ میں شدید زلزلہ
آیا۔ اس روز کئی دوستوں کے خط حضرت مسیح موعود کی خدمت میں پہنچے کہ ہم کو خدا تعالیٰ
نے اس آفت سے بچا لیا مگر حضرت میر صاحب کے متعلق کوئی خیریت نامہ تین دن سے
موصول نہ ہوا۔ جس پر حضرت مسیح موعود نے دُعا کی تو الہام ہوا۔

"اسسٹنٹ سرجن"

خدا کی قدرت آپ اس سال میڈیکل کالج لاہور کے آخری امتحان میں پنجاب بھر
میں اول پر پاس ہو کر اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ شروع میں آپ کی تقرری دہلی میں
ہوئی پھر ۱۹۰۶ء میں میو ہسپتال لاہور کے علاوہ پانی پت، گوجرہ، چکوال، سرحد ضلع حصار،
لائل پور (فیصل آباد) فاضلکا ضلع فیروز پور اور گورداسپور میں سرجن مقرر ہوئے۔ پھر سول سرجن
بھی رہے اور ۱۹۳۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

اخبار بدر ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء میں آپ کی کامیابی کی خبر شان سے شائع ہوئی۔

بدر نمبر ۱۶ جلد ۱ ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ڈاکٹر سید محمد اسمٰعیل صاحب کا اسسٹنٹ سرجنی کا امتحان اور صاحبان بصیرت کے واسطے ایک نشان

اللہ تعالیٰ کے لئے سب حمد وثناء ہے۔ جو اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان کی منتوں کو بار آور کرتا ہے۔ اُس کا بڑا شکر اور احسان ہے کہ مکرمی جناب میر ناصر نواب صاحب کے فرزند ارجمند محبی اخویم میر محمد اسمٰعیل صاحب جن کو اس عاجز کے ساتھ مدت سے ایک خاص محبت کا تعلق ہے میڈیکل کالج کے آخری امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ تمام پنجاب۔ یو۔ پی اور سنٹرل انڈیا میں اوّل رہ کر نہایت عزت کے ساتھ پاس ہوئے۔ یہ کامیابی نہ صرف احمدیہ برادران کے واسطے بلکہ عام مسلمانوں کے واسطے بھی ایک بڑی خوشی کا موجب ہے اور قابلِ فخر ہے۔ بالخصوص اس واسطے کہ میر صاحب موصوف زمانہ تعلیم کالج میں ہمیشہ اعلیٰ اخلاق کے ساتھ کالج کے طلباء اور اساتذہ کو ایک سچے مسلمان کی زندگی کا نمونہ دکھاتے رہے ہیں۔ اور اپنے ذہن رسا اور نکتہ رس طبیعت کے ساتھ اپنے پاک چلن سے احمدیت کا ایک موثر نمونہ ثابت ہوئے ہیں۔ اللّٰھمّ زد فزد لیکن ان سب باتوں سے بڑھ کر جس بات نے ان کی کامیابی کو ایک بڑی بھاری خوشی کا موقع بنا دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی کامیابی کے متعلق خداوند علیم وخبیر نے پہلے سے اپنے برگزیدہ رسول کی معرفت خبر دے دی تھی۔ اور وہ واقعہ اس طرح سے ہوا تھا کہ ۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء کو جب کہ زلزلہ آیا تھا۔ اس

دن لاہور سے کئی دوستوں کے خطوط آئے شاید دہ بیس کے قریب خط ہوں گے۔ ہرایک دوست نے اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دی۔ کہ ہم کو خداوند تعالیٰ نے اس آفت سے بچالیا۔ مگر میر محمد اسمٰعیل صاحب کا ایک خط بھی نہ آیا۔ حالانکہ ان کی عادت تھی کہ ذرا بھی عجوبہ بات سے اپنی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ کو اطلاع دیا کرتے تھے۔ پہلے دن تو اُن کی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ نے صبر کیا اور سمجھا کہ شاید کل خط آجائے گا۔ پھر دوسرے روز بھی کوئی خط نہ آیا۔ تب ان دونوں کا دل مارے غم کے دھڑکنے لگا۔ اور سخت پریشانی ان کے لاحق حال ہوئی اور یہ سمجھا کہ اب خیر نہیں۔ شاید کسی مکان کے نیچے دب گئے ہوں۔ پھر تیسرے روز بھی کوئی خط نہ آیا۔ اور کسی دوست نے بھی نہ لکھا۔ کہ میر محمد اسمٰعیل صاحب خیر و عافیت سے ہیں۔ تب اُن دونوں کی حالت مارے غم کے قریب موت کے ہوگئی اور حضرت کو دُعا کے واسطے کہا۔ حضرت نے ان کا سخت قلق اور رنج دیکھ کر بہت توجہ سے دُعا کی۔ تو جواب میں یہ الہام ہوا۔ "اسسٹنٹ سرجن"۔

اس وقت سمجھ نہ آیا۔ کہ اس دُعا کے ساتھ اسسٹنٹ سرجن کا کیا علاقہ ہے۔ بعد اس کے میر محمد اسمٰعیل صاحب آگئے۔ اور ان سب کو تسلی ہوئی۔ حضرت (اماں جان) نے اس الہام کو خوب یاد رکھا اور وہ ہمیشہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ اسمٰعیل پاس ہوجائے گا۔ کیونکہ جب زلزلہ کے وقت اس کی خیر و عافیت کے لئے دُعا کی گئی۔ تو الہام ہوا۔ کہ اسسٹنٹ سرجن۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ کہ وہ کسی مکان کے نیچے دب گیا ہے۔ اس کے لئے تو مقدر ہے۔ کہ وہ اسسٹنٹ سرجن ہوجائے۔

غرض یہ موقع ایک نہیں۔ بلکہ کئی طرح کی خوشیوں کا موقعہ ہے جس پر ہم صدق دل کے ساتھ حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اور جناب میر ناصر نواب صاحب اور عزیزی میر محمد اسحٰق صاحب (خدا اس کو ہمیشہ صحت و عافیت کے ساتھ رکھے) اور ان کی والدہ صاحبہ اور تمام احمدی برادران کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور

اور میڈیکل کالج کے اسٹاف کو مبارکباد کہتے ہیں۔ جن کی شاگردی میں ایک ایسا لائق ہونہار ڈاکٹر بنا۔ اور بالآخر دُعا کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ میر صاحب موصوف کے واسطے یہ کامیابی دین و دنیا میں حسنات کا موجب اپنی رضامندی کے حصول کا باعث بنائے۔ اور انسانی ہمدردی کے اس سچے خیر خواہ ہنر میں خدا تعالیٰ میر صاحب کو دن بدن فائدہ بخش علم میں ترقی عطا فرمائے۔ اور ان کا وجود سلسلہ حقہ احمدیہ کے واسطے بڑے بڑے برکات کا موجب ہو۔ آمین ثم آمین۔

حضرت میر محمد اسمٰعیل کی شادیاں اور اولاد

حضرت میر محمد اسمٰعیل کی شادی کے لئے پہلی تجویز ان کی پھوپھی زاد سے ہوئی۔ اس نسبت پر آپ کے والدین متفق تھے اور بہن بہنوئی بھی۔ یعنی حضرت اقدس مسیح موعود اور حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ حضرت سیّدہ مریم صدیقہ صاحبہ بیان فرماتی ہیں۔

"بچپن میں ابا جان کی نسبت آپ کی پھپھی زاد سے کر دی گئی۔ جیسا کہ پرانے وقتوں میں رواج تھا جب ابا جان کی تعلیم مکمل ہوئی تو آپ کو اب شادی کے لئے کہا گیا لیکن ابّا جان مانتے نہ تھے اور عذر صرف یہی تھا۔ کہ دینی طور پر اُن کی تربیت اُس ماحول میں نہیں ہوئی۔ حضرت سیّدہ نے ابا جان کو بہت کہا مگر آپ نہ مانتے تھے اس لئے بھی کہ حضرت میر محمد اسحٰق صاحب کا رشتہ پہلے طے ہو گیا تھا۔ آخر حضرت مسیح موعود سے اس امر کا تذکرہ ہوا کہ ہم گھر والوں کی یہ خواہش ہے لیکن میر صاحب نہیں مانتے حضور نے فرمایا لاؤ مجھے کاغذ قلم دو اور آپ نے میر صاحب کے نام کچھ لکھا اور میر صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے جب دیر تک اُن کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی تو حضرت مرزا محمد شفیع صاحب محاسب صدر انجمن احمدیہ کی صاحبزادی سے دوسری شادی ہوئی جس سے خدا تعالیٰ نے کثیر اولاد عطا فرمائی۔" (دو بھائی ص۳۳)

پھپھی زاد سے شادی کے لئے آمادہ کرنے میں آپ کی مہربان آپا کا بھی حصہ تھا۔

بہت محبت سے مخلصانہ مشورہ دیا۔

" تمہارا خط میں نے پڑھا میرے نزدیک اس موقع کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ تم ابھی بچہ ہو تمہیں معلوم نہیں کہ رشتہ ناتا کے وقت کیسی کیسی مشکلیں پیش آتی ہیں اور خاندان جو کسی طور سے عیب نہ رکھتا ہو کسی طرح مشکل سے ملتا ہے اور نئی جگہ میں کیسی کیسی خرابیاں نکل آیا کرتی ہیں۔ اب خدا نے بشیرالدین کو دوسری طرف سے روک کر تمہاری طرف توجہ دی ہے یہ خدا کا کام ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے اگر اس وقت انکار کروگے تو یہ خدا کے کلام کی بے قدری اور ناشکری ہے بلکہ مجھے ڈر ہے کہ اس ناشکری کی شامت سے مدت تک کوئی دوسرا موقع پیش نہ آوے۔ اس لئے میں تمہیں صلاح دیتی ہوں کہ اپنے دل کو سمجھاؤ اور جو حضرت صاحب نے لکھا ہے ضرور اس پر عمل کرلو۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ تم اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو اور وہ باتیں تمہارے لئے بہتر ہوتی ہیں۔ اسی غرض سے میں نے یہ خط لکھا ہے۔ اور مجھے بہت خوشی ہوگی جب میں تمہارا یہ خط پڑھوں گی کہ لو میں نے تمہاری بات مان لی اور اپنی ضد چھوڑ دی اور اس کا جواب مجھے جلدی لکھو کہ سکندرہ جانے کے لئے ہم تیار بیٹھے ہیں۔"

از قادیان — والدہ محمود احمد

اس خط کے مندرجات نے بھائی کو قائل کر دیا اور کمال اطاعت سے کام لیتے ہوئے رضامندی دے دی چنانچہ آپ کی پہلی شادی جولائی ۱۹۰۶ء میں اپنی پھوپھی زاد محترمہ شوکت سلطان صاحبہ سے ہوئی۔

دوسری شادی محترمہ سیدہ امۃ اللطیف صاحبہ بنت حضرت مرزا محمد شفیع صاحب دہلوی (محاسب صدر انجمن احمدیہ) سے ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اُن سے اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے اور سات بیٹیاں عطا فرمائیں۔

۱۔ سیّدہ مریم صدیقہ اہلیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفہ ثانی
۲۔ سیّدہ امۃ اللہ بیگم اہلیہ پیر صلاح الدین صاحب
۳۔ سیّدہ طیبہ صدیقہ صاحبہ اہلیہ نواب مسعود احمد خان صاحب
۴۔ سید محمد احمد صاحب، بیگم محترمہ امۃ اللطیف صاحبہ بنت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب
۵۔ سیدہ امۃ القدوس صاحبہ اہلیہ میاں وسیم احمد صاحب قادیان
۶۔ سیّد احمد ناصر صاحب بیگم ریحانہ باسمہ صاحبہ بنت مرزا عزیز احمد صاحب
۷۔ سیدہ امۃ الرفیق صاحبہ اہلیہ سیّد حضرت اللہ پاشا صاحب
۸۔ سیدہ امۃ السمیع صاحبہ اہلیہ مرزا رفیع احمد صاحب
۹۔ سید محمد امین صاحب بیگم راشدہ مبارکہ بیگم صاحبہ
۱۰۔ سیدہ امۃ الہادی صاحبہ اہلیہ کرنل ضیاء الدین صاحب

اَلصُّفّہ

حضرت میر صاحب پنشن لینے کے بعد قادیان تشریف لے آئے تھے اور آپ حضرت مولوی شیر علی صاحب کے مکان واقع دار العلوم سے متصل اپنے مکان دار الصفہ میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب شروع میں دار المسیح اور اس کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء کے آخر میں آپ نے دار العلوم میں اپنے رہائشی مکان کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد جلد ہی نانا جان حضرت میر ناصر نواب نے حضرت میر صاحب کا مکان دار الصُّفہ بنوایا۔ جہاں پہلے پہل حضرت ڈاکٹر صاحب کے بسلسلہ ملازمت

باہر رہنے کے ایام میں ان کے چھوٹے بھائی حضرت میر اسحٰق اپنے خاندان سمیت لمبے عرصہ تک قیام فرما رہے۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۹۸)

آپ کا اندرونِ شہر ایک اور مکان تھا جس کا نام "کنجِ عافیت" آپ نے رکھا تھا۔ وہ آپ نے سلسلہ کے لئے وقف کر دیا تھا پہلے الفضل کا دفتر اسی میں تھا۔ ہجرت کے بعد اس میں ہسپتال بنایا گیا۔

(دو بھائی صفحہ ۲۴)

خدمات

حضرت اقدس مسیح موعود کے زیرِ سایہ پرورش پانے، اَن گنت نشانات کے چشم دید گواہ ہونے اور حضرت اقدس کی تحریرات و تقاریر نے آپ کے ذات میں وہ روح پھونک دی جو زبانِ حال سے اقرار کرتی۔

اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

ایسے فنا فی اللہ وجودوں کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت اقدس مسیح موعود نے ایک خدمت کا ذکر فرمایا ہے۔

میر محمد اسمٰعیل انچارج پلیگ ڈیوٹی گورداسپور ملفوظات سوم صفحہ ۵۶۶

جنوری ۱۹۰۶ء میں صدر انجمن احمدیہ قادیان کا قیام عمل میں آیا تو حضرت اقدس نے آپ کو بھی مجلس معتمدین کا ممبر نامزد فرمایا۔ بدر ۲۴ فروری ۱۹۰۶ء

۱۹۲۴ء میں حضرت مصلح موعود نے سفر یورپ کے دوران آپ کو ناظر اعلیٰ تجویز فرمایا۔ اس اعتماد اور حسن ظنی کے ساتھ۔

"ان کے دل میں حضرت مسیح موعود کی محبت بلکہ عشق خاص طور پر پایا جاتا

ہے اس محبت کی وجہ سے روحانیت کا ایک خاص رنگ ان میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں ایسی ٹھوکر سے جو دوسروں کو لگ جاتی ہے یا لگ سکتی ہیں خدا نے ان کو محفوظ کیا ہوا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس تعلق کی وجہ سے جو برکات اُن پر نازل ہوتی ہیں ان کے باعث جماعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔"

(خطبہ جمعہ ۱۱ جولائی ۱۹۲۴ء)

حضرت مصلح موعود حضرت میر صاحب پر اتنا اعتماد فرماتے کہ جب کوئی کمیشن مقرر فرماتے تو میر صاحب ممبر ہوتے یا صدر۔

حلیہ و عادات مُبارکہ

قد درمیانہ۔ رنگ گندمی۔ وجیہہ قمری چہرہ، عشقِ الٰہی اور محبت رسول ؐ کا نور چہرہ پر عیاں۔ کشادہ پیشانی۔ ستواں ناک۔ گھنی داڑھی اعضاء بھاری۔ جسم بھرا بھرا باوقار چال۔ بات بہت نرمی سے کرتے لیکن ترازو میں تول کر۔ تقریر کی بجائے تحریر کو اپنے مافی الضمیر کی ادائگی کا ذریعہ بنایا مسائل پر دقیق اور گہری نظر ڈالتے۔ آپ کے مضامین احباب شوق سے پڑھتے۔ آپ کی مجالس دینی و علمی گفتگو پر مشتمل ہوتیں۔

طبیعت میں زہد تھا دنیا کی زخرفات انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا میں نہ تھے گویا آپ کی زندگی اس شعر کی مصداق تھی۔

در جہاں و باز بیروں از جہاں
بس ہمیں آمد نشانِ کاملاں

کاملوں کی یہی نشانی ہے کہ وہ دُنیا میں رہتے ہوئے دنیا میں نہیں ہوتے

(دو بھائی غلام باری سیف)

آپ کی سیرۃ کے ایک مؤقر گواہ جناب محترم شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

اُستاذی المحترم حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل عجیب و غریب قابلیتوں اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک تھے وہ اگرچہ ہر لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت اور ایک بلند شخصیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا آدمی نہ سمجھا اور نہایت فروتنی اور بڑی خاکساری کے ساتھ اپنی زندگی گذاری ان کی صورت فرشتوں جیسی اور ان کی سیرت ولیوں جیسی تھی۔ وہ نہایت ہنس مکھ، نہایت ملنسار، نہایت خوش گفتار اور نہایت بذلہ سنج اور نہایت خوش اخلاق انسان تھے۔ جو شخص ایک مرتبہ ان سے مل لیتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اُن کی باتوں میں ایسی مٹھاس اور ان کے کلام میں ایسی شیرینی تھی کہ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے وہ اپنے اعلیٰ اوصاف اور اپنی بہترین عادات کے باعث سلف صالحین کا ایک دلکش نمونہ تھے۔ ہمدردیٔ خلائق اور بہبودیٔ اخوان ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ نیکی و شرافت احسان و مروت کا وہ ایک مجسمہ تھے۔ عقل و دانش اور فہم و فراست میں وہ اس حدیث نبوی کے مصداق تھے کہ

اِتَّقُوْ بِفِرَاسَةِ المومنِ وَاِنَّہٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہ

ان کے پاس بیٹھنے اور ان کے پُرحکمت کلمات سننے سے جو روحانی سرور حاصل ہوتا تھا اس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی ان کا اندازِ بیاں نہایت دلچسپ اور ان کی گفتگو نہایت پُرلطف ہوتی تھی۔ پارسائی اور پرہیز گاری ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ زُہد اور اِتّقا کی روشن کرنیں ان کے حسین چہرے سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھیں۔ ان کی شفاف پیشانی سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ طبیعت نہایت سادہ پائی تھی۔ غرور و تکبّر فخر و نخوت ان میں نام کو نہ تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُلفت اور قرآن کی محبت ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی وہ جس والہانہ طور پر حضور

علیہ السلام کا ذکر کیا کرتے تھے اور جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ قرآن کریم کے معارف اور نکات بیان کیا کرتے تھے انہیں سُن کر دل چاہتا تھا کہ یہ سلسلۂ تقریر کبھی ختم نہ ہو۔ میرا ان کا تعلق ۳۲ سال رہا اور میں نے ان کے باطن کو ظاہر سے اچھا پایا۔ جہاں ذاتی کیریکٹر کے لحاظ عجیب انسان تھے وہاں بلند پایہ انشاپرداز، فصیح البیان مقرر، شگفتہ رقم مصنف، قادر الکلام شاعر اور نہایت صوفی منش بزرگ بھی تھے۔ ان محامد کے ساتھ وہ اپنے فن میں بھی تمام پنجاب میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ نہایت حاذق ڈاکٹر اور نہایت ماہر سرجن تھے بالخصوص آنکھوں کے آپریشن میں بھی ان کا کوئی عدیل وسہیم نہ تھا وہ جب تک جیئے اپنے اعلیٰ اخلاق اپنے وسیع علم اور اپنے فنی تجربہ سے خلقِ خدا کو فیض پہنچاتے رہے۔

(بخار دل)

بیماری اور حضرت خلیفۃ المسیح مُصلح موعود کی دُعائیں

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ کی صحت کمزور ہوگئی اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ مارچ اپریل ۱۹۴۷ء سے آپ کو دمہ کے شدید دورے شروع ہوگئے۔ وسط جون میں حالت نازک ہوگئی۔ حضرت مُصلح موعود نے جولائی ۱۹۴۷ء کے خطبہ جمعہ میں دُعا کی تحریک کرتے ہوئے فرمایا:-

"ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب قریباً ایک ماہ سے سخت بیمار ہیں اور اب وہ بہت ہی کمزور ہو چکے ہیں اور دو دن سے ان پر قریباً بیہوشی کی سی حالت طاری ہے۔

ہماری جماعت ابھی تک بہت سی تربیت کی محتاج ہے اور تربیت کے لئے صحابہ کا وجود بہت ضروری ہے۔ اب حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے بہت تھوڑے صحابہ باقی رہ گئے ہیں خصوصاً ایسے صحابہ جو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ابتدائی زمانہ کے حالات سے واقف ہیں اور جنہوں نے آپ کے ابتدائی ایام سے ہی آپ کی صحبت سے فیضان حاصل کئے تھے ان کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے اس لئے ایسے لوگوں کا وجود جماعت کی ایک قیمتی دولت ہے اور جتنا جتنا یہ لوگ کم ہوتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی جماعت کی رُوحانی ترقی بھی خطرہ میں پڑتی چلی جاتی ہے۔ اور چونکہ رفقاء کا وجود ایک قومی دولت اور قومی خزانہ ہوتا ہے۔ اس لئے جماعت کے افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے موقعہ پہ خاص طور پر دُعائیں کریں تاکہ یہ خزانہ ہمارے ہاتھوں سے جاتا نہ رہے اور اللہ تعالےٰ رفقاء احمد کے وجود کو ایک لمبے عرصہ تک قائم رکھے تاکہ جماعت ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ

وہ روحانی طور پر اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو سکے اور جماعت کے اندر ایسے نئے وجود پیدا ہو جائیں جو اپنی قربانی اپنے اخلاص اور اپنے تقوٰی کے لحاظ سے صحابہ کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ جہاں تک جانی اور مالی قربانیاں کرنے والے ہیں اور اس کے لئے ان کے اندر بہت زیادہ جوش بھی پایا جاتا ہے مگر روحانی رنگ ظاہری قربانیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرنا، اس کے کلام پر غور کرنا، اس کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور دُوسروں کے اندر بھی ان صفات کو پیدا کرنا اس کا نام رُوحانیت ہے محض قربانیاں تو غیر اقوام اور غیر مذاہب کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو چیز دُنیا کی دوسری قوموں کے اندر نہیں پائی جاتی اور صرف الٰہی جماعتوں میں ہی پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کرنا اور لوگوں کو ان چیزوں کی طرف توجہ دلانا ہے اور یہی اصل رُوحانیت ہے۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کا نمبر آتا ہے۔"

(الفضل ۷ جولائی ۱۹۴۷ء صا-۲)

حضرت میر صاحب کے علاج معالجہ کی ہر ممکن کوششیں جاری تھیں۔ حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب، کیپٹن ڈاکٹر شاہنواز صاحب اور صاحبزادہ ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب شب و روز اس خدمت پر متعین تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب ڈینٹل سرجن لاہور سے اور ڈاکٹر محمد یعقوب صاحب ماہر ایکس رے امرتسر سے بُلوائے گئے۔ مگر منشاء الٰہی کچھ اور تھا۔

۱۶۔۷ وفا (جولائی) کو آپ پر نمونیہ کا سخت حملہ ہوا جس سے پھیپھڑے بھی بہت متاثر ہو گئے اور غشی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اسی عالم میں ۱۸ وفا/ جولائی جمعہ کا دن آگیا اور حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ اس تشویشناک مرحلہ پر حضرت مُصلح موعود ان کی کوٹھی (دار الصفّہ) میں تشریف لے گئے۔ نُور ہسپتال کے تمام ڈاکٹر بھی پہنچ گئے۔ معائنہ کے بعد علاج کا مشورہ ہوا حضور نے سب سے پہلے فرمایا کہ آکسیجن دی جائے جو لاہور کے سوا نہ مِل سکتا تھا۔ آخر معلوم ہوا کہ حضرت مرزا شریف احمد صاحب کے کارخانہ میں کمرشل آکسیجن ہے وہ لا کر شروع کر دی گئی جس سے

چہرہ کی نیلاہٹ سُرخی میں تبدیل ہوگئی۔ پھر پنسلین کا ایک لاکھ یونٹ دیا گیا اور ساتھ ہی کونین کا ٹیکہ بھی۔ مگر بے ہوشی میں کمی نہ ہوئی اور ساتھ ہی ۱۰۴۔۵ تک بخار ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت مصلح موعود نہایت صبر اور اطمینان سے ڈاکٹروں کو ضروری ہدایات دیتے رہے۔
ساڑھے چھ بجے شام کے قریب حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب نے سورہ یٰسین کی تلاوت نہایت سوز اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ شروع کر دی۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود کی قریباً سب خواتین اور بزرگان اور صاحبزادگان خاموشی سے اپنا اپنا حقِ خدمت ادا فرما رہے تھے جن میں پیش پیش حضرت میر صاحب کی اہلیہ ثانی تھیں۔ ساڑھے سات بجے کے قریب جبکہ حضرت المصلح الموعود اور ڈاکٹر شاہنواز خاں صاحب صحن میں حضرت میر صاحب کی حالت پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اچانک اندر سے آواز آئی کہ جلدی آئیں حالت خطرناک ہے۔ اس پر حضور مع ڈاکٹر صاحب اندر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ حضرت میر صاحب کا سانس اُکھڑ رہا ہے اور نبض بالکل بند ہے۔ سات بجکر چالیس منٹ پر آپ نے آخری سانس لیا۔ آہ! وہ سانس کیا تھا، صرف مُبارک اور پیارے لبوں کی آخری معمولی سی جنبش تھی اور قلب کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اس سانحہ ارتحال کے بعد حضرت مُصلح موعود نے وضو فرما کر خدّام کو نماز مغرب پڑھائی اور حضور نے آپ کی وصیّت کے مطابق فیصلہ فرمایا کہ آپ کو حضرت نانی اماں کی قبر اور دیوار کے درمیان قطعہ خاص میں جگہ دی جائے۔ پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں شام کے قریب ڈاکٹر (شاہنواز خان۔ ناقل) صاحب کو ساتھ لے کر ٹہل رہا تھا کہ میری نگاہ سامنے کے مکان پر پڑی جہاں زرد سی دھوپ نظر آ رہی تھی۔ گویا تین چار منٹ سُورج غروب ہونے میں تھے۔ اس وقت مَیں نے اس خیال سے کہ شاید میر صاحب کی طبیعت پر کسی خواب کی بناء پر یہ اثر ہو کہ جمعہ

وفات کا دن ہے اور اگر یہ تین چار منٹ خیریت سے گذر جائیں تو ایک
ہفتہ (یعنی اگلے جمعہ تک) زندگی اور بڑھ سکتی ہے دُعا کرنی شروع کی مگر جلد
ہی اندر سے بلاوا آگیا کہ میر صاحب کا سانس اکھڑ رہا ہے۔"
(الفضل ۹ اگست ۱۹۴۷ء صفحہ ۴، ۵)

حضرت میر صاحب کی المناک وفات کی خبر آناً فاناً قادیان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور بہت سے احباب آپ کی کوٹھی پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آپ نے عرصہ ہوا اپنی تجہیز و تکفین سے متعلق خود مفصّل ہدایات وصیت کے طور پر تحریر فرما دی تھیں حتیٰ کہ اپنے کفن کا بھی انتظام فرما لیا تھا۔ چنانچہ رات ہی کو آپ کی وصیّت کے مطابق حضرت بھائی عبدالرحیم صاحب قادیانی، جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی اور جناب حکیم عبداللطیف صاحب گجراتی نے آپ کو غسل دیا اور تجہیز و تکفین کی۔ اگلے دن (۱۹ وفا/ جولائی) کو صدر انجمن کے تمام دفاتر اور تعلیمی اداروں میں تعطیل کر دی گئی۔ صبح ہی سے احباب اور خواتین آپ کی کوٹھی پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آٹھ بجے کے قریب سیّدنا حضرت مصلح موعود بھی تشریف لے آئے۔ اور ایک بڑے مجمع کے درمیان آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ راستے میں مجمع ہر لحہ بڑھتا چلا گیا۔ ہر شخص جنازہ کو کندھا دینے اور اس طرح ایک ایسے وجود کا حق الخدمت ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو عمر بھر نہایت بے نفسی کے ساتھ بنی نوع انسان کی دینی اور دنیوی خدمت کرتا رہا۔ جب جنازہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے باغ میں پہنچا تو حضرت مصلح موعود نے اپنی نگرانی میں صفوں کو درست کرایا اور پھر ایک بہت بڑے مجمع کے ہمراہ جو انیس لمبی صفوں پر مشتمل تھا نماز جنازہ ادا فرمائی۔ نماز جنازہ میں شامل ہونے والے افراد کی تعداد کا اندازہ چھ اور سات ہزار کے درمیان ہے۔

نماز جنازہ کے بعد حضرت المصلح الموعود نے اپنے دستِ مبارک سے کفن کا مُنہ کھولا اور حضرت میر صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے اور پھر

خاندانِ مسیح موعود کے دیگر افراد نے باری باری بوسہ دیا۔ اس کے بعد حضور جنازہ کے قریب ہی زمین پر خدام کے ہمراہ تشریف فرما ہو گئے اور احباب کو تنظیم کے ماتحت حضرت میر صاحب کا چہرہ آخری بار دیکھنے کا موقعہ دیا گیا۔ آپ کا چہرہ باوجود طویل علالت کے بہت بارونق شگفتہ اور نورانی نظر آتا تھا۔ بعدازاں جنازہ اٹھایا گیا۔ حضرت مصلح موعود نے قبر تک نعش کو کندھا دیا۔ حضور خود قبر میں اُترے اور میر داؤد احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسحٰق صاحب اور میر سید احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب نے نعش کو لحد میں اُتارا۔ حضرت میر صاحب کی قبر میں حضور نے اپنے دستِ مبارک سے مٹی ڈالی۔ قبر تیار ہو جانے پر حضور نے دُعا فرمائی اور پھر واپس تشریف لے آئے۔"

(الفضل ۲۱ جولائی ۱۹۴۷ء صہ)

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب سلسلہ کے چوٹی کے بزرگ، ولی اللہ، نہایت بلند پایہ رفیق اور ایک زبردست ستون کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کا انتقال ایک زبردست قومی صدمہ تھا جس کو جماعت احمدیہ نے عموماً اور رفقاء مسیح موعود نے خصوصاً بہت محسوس کیا اور آپ کی وفات پر نہایت گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

(تاریخ احمدیت جلد دہم)

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کا وصال

ہزاروں احباب کی دلی دعاؤں کے ساتھ حضرت احمد کی گود میں تربیت پلنے والے عظیم الشان رفیق اور ولی اللہ کو دفن کیا گیا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن

قادیان ۱۹ ر ماہ دفا ۔ جیسا کہ الفضل کے گزشتہ پرچے میں اطلاع دی جا چکی ہے۔ سیدنا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے برادر نسبتی ۔ حضرت اماں جان اطال اللہ بقاءھا کے حقیقی بھائی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ماموں حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کل بتاریخ ۱۸ ر جولائی ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ المبارک بوقت پونے آٹھ بجے شام انتقال فرما گئے ۔ اور اس محبوب حقیقی سے جا ملے ۔ جس کے دیدار کی تمنا میں آپ فرمایا کرتے تھے ۔ ؎

تڑپتی روح ہے میری کہ جلدی ہو نصیب اپنے\
ملاقات شہ خوباں لقائے حضرت باری

حضرت میر صاحب کی علالت یوں تو ایک لمبے عرصے سے تشویشناک صورت اختیار کر چکی تھی ۔ لیکن کل نماز جمعہ کے بعد آپ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی ۔ جس کے پیش نظر خاندان کے اکثر افراد اور خود حضرت مصلح موعود ایدہ اللہ تعالیٰ آپ کی کوٹھی دار الصفہ میں تشریف لے آئے تھے ۔ چنانچہ حضور کی موجودگی میں ہی آپ کی وفات واقع ہوئی ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

حضرت میر صاحب کی المناک وفات کی خبر آناً فاناً تمام محلوں میں پھیل گئی۔ اور بہت سے احباب آپ کی کوٹھی پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آپ نے عرصہ ہوا اپنی تجہیز وتکفین کے متعلق خود مفصل ہدایات وصیت کے طور پر تحریر فرما رکھی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنے کفن کا بھی انتظام فرما لیا تھا۔ چنانچہ رات کو ہی آپ کی وصیت کے مطابق حضرت بھائی عبدالرحیم صاحب نومسلم۔ مکرم شیخ محمد اسماعیل صاحب اور مکرم حکیم عبداللطیف صاحب شہید نے آپ کو غسل دیا۔ اور تجہیز وتکفین کی۔

اگلے دن (۱۹؍جولائی کو صدر انجمن احمدیہ کے تمام دفاتر اور تعلیمی اداروں میں تعطیل کر دی گئی۔ صبح ہی سے احباب اور خواتین آپ کی کوٹھی پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آٹھ بجے کے قریب سیدنا المصلح موعود ایدہ اللہ تعالیٰ بھی تشریف لے آئے۔ اور ایک بڑے مجمع کے درمیان آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ باوجود ناسازی طبع کے جنازہ کے ہمراہ پیدل مقبرہ بہشتی تشریف لے گئے۔ راستے میں مجمع ہر لحہ بڑھتا گیا۔ ہر شخص جنازہ کو کندھا دینے اور اس طرح ایک ایسے وجود کا آخری حق الخدمت ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو عمر بھر نہایت بے نفسی کے ساتھ بنی نوع انسان کی دینی اور دنیوی خدمت کرتا رہا۔ جب جنازہ باغ حضرت مسیح موعود میں پہنچا۔ تو حضرت صاحب ایدہ اللہ نے اپنی نگرانی میں صفوں کو درست کرایا۔ اور پھر ایک بہت بڑے مجمع کے ہمراہ جو انیس لمبی صفوں پر مشتمل تھا۔ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ نماز جنازہ میں شامل ہونے والے افراد کی تعداد کا اندازہ چھ اور سات ہزار کے درمیان ہے۔

نماز جنازہ کے بعد حضرت صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دست مبارک سے کفن کا منہ کھولا اور حضرت میر صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے اور پھر خاندان کے دیگر افراد نے باری باری بوسہ دیا۔ اس کے بعد حضور جنازہ کے قریب

ہی زمین پر خدام کے ہمراہ تشریف فرما ہو گئے اور احباب کو تنظیم کے ماتحت حضرت میر صاحب کا چہرہ آخری بار دیکھنے کا موقع دیا گیا۔ آپ کا چہرہ باوجود طویل علالت کے بہت بارونق شگفتہ اور نورانی نظر آتا تھا۔ بعدازاں جنازہ اٹھایا گیا۔ حضرت صاحب ایدہ اللہ نے قبر تک نعش کو کندھا دیا۔ حضور خود قبر میں اترے اور میر داؤد احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسحاق صاحب اور میر محمد احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کے ہمراہ نعش کو لحد میں اتارا۔ اس کے بعد حضور مزار حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور مزار حضرت اُم طاہر پر دعا کے لئے تشریف لے گئے پھر حضرت میر صاحب کی قبر میں اپنے دستِ مبارک سے مٹی ڈالی۔ قبر تیار ہو جانے پر حضور نے دُعا فرمائی۔ پھر واپس تشریف لے آئے۔

حضرت میر صاحب کو مزار حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے احاطہ میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے والد ماجد حضرت میر ناصر نواب صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) اور والدہ ماجدہ حضرت نانی اماں (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کے پہلو میں مزار حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے قدموں میں دفن کیا گیا ہے۔

حضرت میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) چوٹی کے بزرگ اور بلند پایہ رفیق تھے۔ آپ کو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے مجلس معتمدین کا رکن مقرر فرمایا تھا۔ ابتدا کے زمانہ سے ہی حضور کو نہایت قریب سے اور حضور کی مقدس صحبت سے فیوض حاصل کرنے کے خاص مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں۔ تصوف حقیقی اور عشق الٰہی کا ایک خاص رنگ پایا جاتا تھا۔ آپ کے مضامین اور آپ کی نظمیں اسی رنگ کی بہترین یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ وسیع دینی اور دنیوی علم کے ساتھ بنی نوع انسان کی بے غرضانہ خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہنا آپ کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ غرض آپ کا وجود سلسلے کی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے ایک ستون کی طرح تھا۔ آپ کی وفات ایک شدید قومی صدمہ ہے۔ آپ کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کے کتبہ کی عبارت

رقم فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی مصلح موعود (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

والسلام علیٰ عبدہ المسیح الموعود

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو النّاصر

تاریخ پیدائش: ۱۸ جولائی ۱۸۸۱ء

تاریخ وفات: ۱۸ جولائی ۱۸۸۱ء

میر محمد اسمٰعیل صاحب حضرت مسیح موعود کے دعوے سے پہلے پیدا ہوئے حضرت (اماں جان) سے سولہ سال چھوٹے تھے اور حضرت میر ناصر نواب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کے ساتویں بچے تھے۔ حضرت (اماں جان) کی پیدائش کے بعد پانچ بچے تولد ہوئے جو سب کے سب چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد میر محمد اسمٰعیل صاحب پیدا ہوئے اور زندہ رہے۔

حضرت میر ناصر نواب صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے جب پنشن لے کر قادیان میں رہائش اختیار کی تو بوجہ اس کے کہ قادیان میں کوئی سکول نہیں تھا انہوں نے ان کو لاہور پڑھنے کے لئے بھجوا دیا اور ساری تعلیم انہوں نے لاہور میں ہی حاصل کی۔

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو ان سے بہت محبت تھی اور ان کے کاموں میں آپ دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح حضرت میر صاحب کا بھی آپ کے ساتھ عاشقانہ تعلق تھا۔ بھائیوں میں سے حضرت (اماں جان) کو میر محمد اسمٰعیل صاحب سے زیادہ محبت تھی۔ نہایت ذہین اور زکی تھے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے جب خطبہ الہامیہ دیا۔ تو آپ کے اس ارشاد کو سن کر کہ لوگ اسے یاد کریں۔ انہوں نے چند دنوں میں ہی سارا خطبہ یاد کر کے حضرت مسیح موعود کو سنا دیا تھا۔ باوجود نہایت کامیاب ڈاکٹر ہونے کے اور بہت بڑی کمائی کے قابل ہونے کے زیادہ تر پریکٹس سے بچتے تھے اور غرباء کی خدمت کی طرف اپنی توجہ رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ملازمت کے بعد کئی اچھے مواقع آپ نے کھوئے۔ کیونکہ گو اُن میں آمدن زیادہ تھی۔ اور رُتبہ بڑا تھا۔ مگر خدمت خلق کا موقع کم تھا۔ میری بیوی مریم صدیقہ ان کی سب سے بڑی بیٹی تھیں جو توأم پیدا ہوئیں۔ پنشن کے بعد قادیان آ گئے۔ لیکن بوجہ صحت کی خرابی کے کوئی باقاعدہ عہدہ سلسلہ کا نہیں لے سکے۔ بلکہ جب طبیعت اچھی ہوتی تھی "الفضل" میں مضامین لکھ دیا کرتے تھے۔ بہر حال حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب حضرت مسیح موعود کے رفقاء میں سے تھے اور آپ کے منظورِ نظر تھے۔ آپ کی وفات کے بعد تمام ابتلاؤں میں سے محفوظ گذرتے ہوئے سلسلہ کی بہت سی خدمات بجا لانے کا آپ کو موقعہ ملا۔ اللہ تعالےٰ ان کے روحانی مدارج کو بلند فرمائے۔

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم و مغفور

۱۹۴۵ء میں حضرت میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے اپنے متعلق یہ مضمون لکھ کر مجھے دیا اور فرمایا کہ میرے انتقال کے فوراً بعد شائع کر دینا۔ انتہائی رنج وقلق اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ حضرت میر صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں آج یہ مضمون اشاعت کے لئے الفضل کے حوالے کر رہا ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

عمر اور وفات کی تاریخ میں نے خود درج کر دی ہے۔

خاکسار شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء

میں محمد اسماعیل ولد حضرت میر ناصر نواب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) ولد سیّد ناصر امیر صاحب دہلوی آج مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء بوقت پونے آٹھ بجے شام اپنے احباب و اعزّہ سے رخصت ہو کر عالم برزخ میں آگیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری پردہ پوشی اور مغفرت فرمائے۔ آمین۔ میں نے دُنیا میں ۶۶ سال قیام کیا۔ یعنی ۲۰ شعبان ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸ جولائی ۱۸۸۱ء دوشنبہ کے روز پیدا ہوا۔ اور ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء میں اس جہانِ فانی کو چھوڑا۔ ناظرین اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائیں کہ وہ مجھے قبر کے دُکھوں حشر کی تکالیف، پل صراط کے مصائب اور دوزخ کے عذابوں سے محفوظ کر کے جنت الفردوس میں محض اپنے فضل اور رحم سے جگہ عنایت فرمائے اور اپنی نعمتوں سے بہرۂ وافر عطا کرے۔ آمین۔ ہم میں سے ہر ایک نے خواہ وہ کوئی بھی ہو دنیا کو ایک دن چھوڑنا

ہے۔ مگر پھر بھی ہم اس طرح سے چمٹے رہتے ہیں جیسے بچہ ماں سے۔ اور ہرگز الگ ہونا نہیں چاہتے۔ یہاں تک کہ ہم کو زبردستی اور اکثر اوقات خلاف مرضی اس سے الگ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر موت نہ ہوتی۔ تو ہم اپنے بڈھوں کو اور ناکارہ لوگوں کو شاید اپنے ہاتھوں سے قتل کرتے۔ یا دنیا سے تنگ آ جانے کی وجہ سے خودکشیاں کرتے پھرتے دُنیا کی زندگی اور اس کے دُکھ آخرکار اس میں ہمارا رہنا دوبھر کر دیتے۔ پس خدا تعالیٰ کی کمال حکمت نے ہمارے لئے ایسا انتظام فرمایا کہ ہم خود ایک عمر کے بعد عالمِ دُنیا سے اُکتانے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ دوسرا عالم بن دیکھا ہوتا ہے۔ اور شاید آخرت پر کامل یقین میسر نہیں ہوتا۔ اور اپنے گناہوں کا ڈھیر سامنے نظر آتا ہے۔ اس لئے ہم کو دوسرے جہاں کی طرف انتقال کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ عالمِ بقا ہی اصل جگہ ہے۔ جہاں صفاتِ الٰہیہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ہم پر جلوہ گر ہونے والی ہوتی ہیں۔ آخرت کی ربوبیت دُنیا کی ربوبیت سے شدید تر ہے۔ آخرت کا رحم دنیا کے رحم سے ارفع تر ہے۔ اور آخرت کی مالکیت دُنیا کی مالکیت سے اعلیٰ ترین۔ موت کو صرف ایک دروازہ ہے۔ جو ایک خاردار سرنگ کے سرے پر ہے۔ اور دوست کو دوست سے اور بندہ کو اپنے مالک سے ملاتا ہے۔ پس چند کانٹوں کی خراشوں سے ڈر کر حُسنِ ازلی کی طرف نہ جانا یا نعمتِ ابدی سے منہ پھیر لینا۔ اور اس محسن کے ساتھ والہانہ شوق محبت اور عشق کے ساتھ قدم نہ اٹھانا محض بے وقوفی اور نادانی ہے۔ وہاں کا خدا دُنیا کے خُدا سے زیادہ مہربان ہے۔ زیادہ کریم ہے۔ زیادہ غفور ہے۔ زیادہ منعم ہے۔ زیادہ مجیب و قریب ہے۔ زیادہ رؤف ہے۔ زیادہ نافع ہے۔ زیادہ حنّان و منّان ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ہماری خواہشیں پوری کرنے والا ہے۔ اور یقیناً ویسا نہیں ہے جیسا غیر مذاہب والوں نے اس کو سمجھ رکھا ہے یا ہم میں سے اکثر نے اس کو ہوا بنا رکھا ہے۔ اس نے تو انسان کو بہشت کے لئے اور

اپنی صفات کے فیضان کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس یہ بدظنی اپنے محسن پر کیوں کر روا رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ہم کو وہاں دائمی دکھوں کے لئے لے جاتا ہے۔ میں تے دُنیا میں تکالیف ابتلاء، مصائب اور بیمار ایسے دیکھے۔ مگر ان میں بھی خدا کے فضل اور اس کی رحمت کو ہر قدم پر محسوس کیا۔ پس اب جبکہ لِقائے الٰہی کا مقام قریب تر ہوتا جاتا ہے میں کیونکر آگے بڑھنے یا انتقالِ مقامی سے ڈر سکتا ہوں۔ سو اے عزیز و تم بھی اس رحمٰن رحیم خدا کی محسنانہ صفات پر ایمان بلکہ یقین رکھو۔ اور موت کو صرف ایک سیڑھی سمجھو کہ یہ نچلی منزل سے انسان کو بالاخانہ تک پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کی کسی چیز کا محتاج نہیں۔ نہ اس کے مال کا نہ اس کی عبادت کا۔ وہ تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ بندے اس کو ہی اپنا پیارا رب تسلیم کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور اسی کو اپنا محسن۔ اپنا منعم اپنا خیر خواہ اور اپنا مالک سمجھیں۔ پس کیا اتنی سی بات کے لئے انسان اپنی عاقبت کو خراب کر سکتا ہے؟ اس نے تو فرما دیا ہے کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه دخل الجنۃ۔ پس کیا اس کلمہ کے کہنے اور مان لینے سے جو محض حق ہی حق ہے۔ کوئی انسان انکار کر سکتا ہے؟ میں نے ایک عظیم الشان نبی سے لے کر دُنیا کی ادنیٰ ترین مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن جو کرم۔ جو رحم۔ جو شفقت۔ جو مروت اور جو احسان مجھے اپنے خداوند میں نظر آیا۔ بخدا وہ ہرگز کسی دوسرے میں نظر نہیں آیا۔ پس ایسے خدا کے لقاء سے اور اس کے روبرو پیش ہونے سے ڈرنے کے کیا معنی؟ دُنیا کے آرام اور نعمتیں ان آراموں اور نعمتوں کا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں جو اس نے ہمارے لئے اگلے جہان میں مقدر کر رکھی ہیں۔ نیک اخلاق اور مذہبی عبادتیں تو محض ہمارے اپنے فائدہ کے لئے ہیں۔ نہ کہ خدا کے کسی فائدہ کے لئے ہیں۔ لیکن اگر ان میں کچھ کمی رہ جائے تو اسے دعاؤں سے پوری کرو۔ مگر اپنے آقا کا دامن کسی حالت میں نہ چھوڑو۔ کیونکہ ایسی وفاداری بہرحال تمہارے لئے بابرکت اور سودمند ہوگی۔

وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیرٌ بالعباد ہ واٰخر
دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔ واشہد ان لآ
اِلٰہ اِلّا اللّٰہُ وحدہ لاشریک لہ واشہد ان محمدًا
عبدہٗ ورسولہٗ۔ ربنا اِنّنا سمعنا منادی ینادی
للایمان ان اٰمنوا بربکم فاٰمنا ربنا فاغفرلنا ذنوبنا
وکفرعنا سیاٰتنا وتوفنا مع الابرار۔ آمین

خاکسار محمد اسماعیل

(الفضل ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء)

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کی ایک خاص خصوصیت

زندگی میں موت کے متعلق تیاری

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کے متعلق میں نے اپنے ایک مختصر سے مضمون میں بیان کیا تھا کہ کچھ عرصہ سے آپ وصال اللہ کے لئے ہر وقت بے تاب سے نظر آتے اور ایسے اشتیاقیہ الفاظ میں ایسے مسرت آمیز لہجہ میں اس کا ذکر فرماتے کہ دنیا سے آپ کی انتہائی دل برداشتگی ظاہر ہوتی تھی۔

بے شک یہ بات ایک اعلیٰ شان کے مومن کے ہی شایان ہے۔ اور ہر ایمان دار اپنی معرفت اور صفائی قلب کے لحاظ سے اپنے محبوب حقیقی کے حضور حاضر ہونے کے لئے اس دنیا کو خوشی خوشی چھوڑنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور جیسے موقع میسر آئے۔ کسی نہ کسی رنگ میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن اس سلسلہ میں حضرت میر صاحب سے جو خاص بات ظہور پذیر ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ آپ نے فرشتہ اجل کو خوش آمدید کہنے کے متعلق تمام تیاری اپنی زندگی میں خود کی اور اس اہتمام سے کی۔ کہ اپنی موت کا اعلان بھی آپ خود ہی لکھ کر دے گئے۔

ذرا اندازہ لگائیے اس انسان کی روحانی اور ایمانی قوت کا۔ جس نے اپنے ہاتھ سے سوائے تاریخ اور وقت کے جس کی تعیین اس کے بس میں نہ تھی۔ یہ الفاظ رقم فرمائے۔

"میں محمد اسمٰعیل ولد حضرت میر ناصر نواب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) ولد سید ناصر امیر صاحب دہلوی آج مورخہ بوقت اپنے احباب واعزہ سے رخصت ہو کر عالم برزخ میں آ گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری پردہ

پوشی اور مغفرت فرمائے۔ آمین۔ میں نے دنیا میں سال قیام کیا۔
یعنی دو شعبان ۱۲۹۸؁ھ ہجری مطابق ۱۸ر جولائی ۱۸۸۱؁ء دوشنبہ کے روز
پیدا ہوا اور میں نے اس جہان فانی کو چھوڑا۔ ناظرین اللہ تعالیٰ سے دُعا
فرمائیں کہ وہ مجھے قبر کے دکھوں حشر کی تکالیف اور پل صراط کے مصائب
اور دوزخ کے عذابوں سے محفوظ کر کے جنت الفردوس میں محض اپنے
فضل اور رحم اور کرم سے جگہ عنایت فرمائے اور اپنی نعمتوں سے بہرہ
وافر عطا فرمائے۔ آمین۔"

ان سطور کے ایک ایک لفظ سے یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ اعلان نہ صرف نہایت سکونِ دل اور اطمینانِ قلب کے ساتھ لکھا گیا۔ بلکہ موقعہ شناسی سے بھی خوب ہی کام لیا گیا۔ دُعا کی اور نہایت جامع اور ضرورت کے عین مطابق دُعا کی درخواست اس انداز سے کی گئی ہے کہ آپ کو جاننے والا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کا دل پگھل کر پانی نہ ہو گیا ہو اور آپ کی مغفرت اور بلندئ درجات کے لئے مضطربانہ دُعا نہ نکلی ہوگی۔ ایسے کی ایسی بیشمار دعائیں شرف قبولیت سے کیوں محروم رہی ہوں گی ایسے وقت کی حضرت میر صاحب ایسے ولی کے لئے کی گئیں۔

مذکورہ بالا اعلان کے بقیہ حصہ دنیوی زندگی۔ موت اور پھر آخرت کی زندگی کے فلسفہ پر نہایت عارفانہ کلام کرنے کے بعد اپنی قلبی کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے

"میں نے دنیا میں تکالیف اور مصائب اور بیماریاں سب دیکھے مگر ان میں
بھی خدا کے فضل اور اس کی رحمت کو ہر قدم پر محسوس کیا ہے۔ اب جبکہ
لقائے الٰہی کا مقام قریب ہوتا جاتا ہے میں کیونکر آگے بڑھنے یا
انتقالِ مقامی سے ڈر سکتا ہوں۔"

اس سلسلہ میں عزیزوں اور دوستوں کو خوشی خوشی موت قبول کرنے اور لقائے الٰہی

کے حصول میں ہر تکلیف مردانہ وار برداشت کرنے کی نہایت دِل نشین الفاظ میں تلقین کرتے ہوئے فرمایا :۔

"جو کرم ۔ جو رحم ۔ جو شفقت ۔ جو مروت اور جو احسان مجھے اپنے خداوند خدا میں نظر آیا ۔ بخدا وہ ہر کسی دوسرے میں نظر نہیں آیا ۔ پس ایسے خدا کے لقاء سے اور اس کے روبروپیش ہونے سے ڈرنے کے کیا معنی ۔"

جب دیکھا جائے کہ یہ الفاظ اس انسان کے قلم سے نکلے ۔ جو خوشی خوشی موت سے ہمکنار ہوا جسے موت کسی مرحلہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی ہراساں نہ کر سکی ۔ اور جس نے یہ تحریر اس لئے قلم بند فرمائی ۔ کہ جب وہ شاداں و فرحاں موت کی گھاٹی سے گذر جائے ۔ تو اس کی طرف سے اس کے دوستوں اور عزیزوں تک پہنچا دی جائے ۔ تو یہ ایک ایسی اہم دستاویز بن جاتی ہے ۔ جسے ہر احمدی کو ہر وقت اور خاص کر اس وقت جبکہ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی جان پیش کر دینے کا موقع میسر آ رہا ہو ۔ پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔ اور کسی رنگ میں بھی موت کا ڈر یا خوف اپنے پاس تک نہ آنے دینا چاہیئے ۔ کیونکہ بالفاظ حضرت میر صاحب مرحوم و مغفور موت ایک سیڑھی ہے ۔ جو انسان کو نچلی منزل سے بالاخانہ تک پہنچاتی ہے ۔

موت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد چونکہ جسد بے روح کے لئے کچھ اور مرحلے بھی اس دنیا میں باقی تھے ۔ اس لئے ان کے بارے میں بھی حضرت میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے اپنی خواہش اور تمنا کا اظہار کیا ۔ اور الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اس پیارے بندہ کی ان تمناؤں کو بھی اپنے فضل سے اسی طرح پورا فرمایا جس طرح وہ چاہتا تھا ۔

اپنی نعش کو غسل دینے کے متعلق حضرت میر صاحب نے یہ خواہش ظاہر فرمائی اور خدا تعالیٰ کے غنیٰ کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے فرمائی کہ

"میری نعش کو غسل دینے کے لئے اگر ممکن ہو تو شیخ عبدالرحیم صاحب بھائی جی اور شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی اور حکیم عبداللطیف صاحب شہید کو بلا لیا جائے۔ شہید صاحب پانی ڈالیں۔ کفن موجود ہے۔"

آخر جب وہ وقت آیا کہ حضرت میر صاحب کی روح ملاءِ اعلیٰ میں پرواز کر گئی۔ اور صرف ان کی "نعش" رہ گئی۔ تو اس کے متعلق آپ نے جس خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ اسے پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے سامان کر دیئے۔ مذکورہ بالا تینوں اصحاب زندہ وسلامت تھے۔ قادیان میں موجود تھے۔ اور صحت و تندرستی کی حالت میں تھے۔ وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے خود پہنچ گئے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں حضرت میر صاحب کی خواہش کو لفظ بلفظ پورا کرنے کی توفیق دی۔

میں نے حضرت میر صاحب کی وفات کے بعد حضرت شیخ عبدالرحیم صاحب بھائی جی سے پوچھا۔ حضرت میر صاحب نے اپنی زندگی میں آپ سے اس بات کا ذکر کیا ہوگا۔ اس وقت آپ نے یہ نہ کہا۔ کہ کون جانتا ہے پہلے کون فوت ہو کہنے لگے۔ میں نے کہا تھا۔ مگر میر صاحب نے جواب دیا۔ آپ لوگ مجھ سے پہلے نہیں فوت ہوں گے۔ پہلے میری باری ہے۔

نعش کے غسل کے بعد قبر کا سوال آتا ہے۔ اس کے متعلق بھی حضرت میر صاحب نے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا۔ اور خدا تعالیٰ کی قضاء و قدر کے متعلق اپنی پوری رضا کے ساتھ فرمایا۔ نیز حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ سے کمال ادب و احترام کے ساتھ حسنِ طلب میں بھی کمال کر دیا۔ چنانچہ لکھا۔

"درخواست۔ آخر میں حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ کوئی شخص اپنے انجام سے آگاہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ میرا انجام اچھا کرے۔ اور مجھے بہشتی مقبرہ کا اہل بنائے۔ اگر یہ فضل مجھ پر خدائے قدوس کی طرف سے ہو جائے تو میری خواہش ہے کہ اپنے لوگوں میں دفن ہوں۔

ایک جگہ حضرت والدہ صاحبہ اور دیوار کے درمیان ایک قبر کی ہے حضور کی مہربانی ہوگی اگر مجھے وہاں دفن کیا جائے ۔ وَاُفَوِّضُ امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

والسلام ۔ محمد اسماعیل "

خدا تعالیٰ نے حضرت میر صاحب کی یہ خواہش بھی بعینہٖ پوری فرمائی۔ اسی جگہ ان کی قبر بنی جہاں ان کی خواہش تھی۔

خاندانِ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ساتھ رشتہ کے لحاظ سے نہایت معزز رتبہ رکھنے کے علاوہ حضرت میر صاحب نے اپنی ساری زندگی اسلام اور احمدیت کی خدمت میں صرف کر دی۔ ہر قربانی اور ایثار کے وقت پیش پیش رہے مگر کیا مجال کہ اشارۃً بھی کسی بات کا ذکر ہو جبکہ اپنی انتہائی خواہش اور دلی آرزو کو درخواست کے طور پر پیش کیا۔ اور "حضور کی مہربانی ہوگی" کو ذریعہ قبولیت قرار دے کر خاموش ہو گئے۔ رضائے امام کو اپنی بڑی سے بڑی خواہش اور تمنا پر مقدم رکھنا اور کسی حالت میں بھی انتہائی ادب، احترام، اطاعت اور فرمانبرداری کے فرض کو نہ بھولنا وہ مقام ہے جو خاصانِ خدا کا ہی حصّہ ہے۔ اور جسے حاصل کئے بغیر کوئی انسان نہ دنیا میں فلاح پا سکتا ہے۔ اور نہ آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔

حضرت میر صاحب مرحوم و مغفور کی زندگی بے شک بہتوں کے لئے روحانی اور جسمانی زندگی تھی لیکن فوت ہو کر بھی آپ ایسا اسوہ اور نمونہ قائم کر گئے ہیں جو نسلوں تک کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۲۷ اگست ۱۹۴۷)

باب دوم

حضرت ڈاکٹر میر محمدؓ اسمٰعیل

بزرگانِ سلسلہ کے تاثرات

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کی وفات پر بزرگانِ سلسلہ کے تاثرات

۱۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب

شروع شروع میں بندہ کو دارالمسیح اور اس کے قرب وجوار میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۹۱۳ء کے آخر میں بندہ کے موجودہ رہائشی مکان کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اور اس کے بعد جلد ہی حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان حضرت نانا جان میر ناصر نواب صاحب نے بنوالیا۔ اور اس طرح گویا ہماری مستقل ہمسائیگی کی بنیادیں پڑ گئیں۔

پہلے پہل حضرت ڈاکٹر صاحب کے بسلسلہ ملازمت باہر رہنے کے ایام میں آپ کے چھوٹے بھائی یعنی حضرت سید میر محمد اسحاق صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) اپنے خاندان سمیت ہمارے ہمسائے میں کافی لمبے عرصے تک رہے۔ اور وہ اپنے اہلِ بیت سمیت ہمارے نہایت ہی محسن ہمسایہ تھے۔

حضرت ڈاکٹر میر صاحب مرحوم کے ریٹائر ہو کر قادیان آنے کے وقت سے باقاعدہ آپ کی ہمسائیگی بندہ کو میسر آئی۔ اس عارضی اور مستعار زندگی کے دوران میں آپ نے ہمسائیگی کے تعلق کو جس خوبی اور عمدگی سے نبھایا ہے۔ بندہ اس کے بیان سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے۔ آپ نے ان تمام حقوق کی ادائیگی میں جن کو کہ اسلامی شریعت ایک مسلمان ہمسایہ پہ واجب قرار دیتی ہے نہایت ہی اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا۔ آپ کا سلوک نہایت ہی بلند پایہ اخلاق پہ مبنی تھا۔ یہاں تک کہ بندہ نے دیکھا۔ کہ آپ کی طرف سے ہمسائیگی

کا تعلق یگانگت اور شفقت اور محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور اس پاک وجود نے دُوئی کے تمام پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ آپ بلا تکلف بلا احساس غیریت نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے مشفقانہ اور برادرانہ رنگ میں بندہ کے مکان پر تشریف لاتے۔ گھریلو قسم کے ادنیٰ ادنیٰ معاملات پر گفتگو فرماتے اور ہر چھوٹے بڑے امر میں دلچسپی لیتے

آپ کی ذات میں مَیں نے بہترین قسم کا ساتھی۔ ہر کام کا عمدہ مشیر اور ہم غم میں بہترین غم گسار پایا۔ میرے لڑکے عزیزم عبدالرحمٰن کی بیماری میں اکثر آکر گھنٹوں بیٹھتے اس کی چھوٹی چھوٹی بیماری سے متعلقہ باتوں کو نہایت سکون اور دلجمعی سے سنتے اور موقع اور محل کے مطابق بیماری کے تمام خدشات کو اس کے دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے نہایت فصیح اور محبت بھرے الفاظ سے مٹا ڈالتے۔ مریض کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سا علاج کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ کہ ایک مشفق اور مہربان ڈاکٹر اس کے تفکرات کا بکلی خاتمہ کر دے۔

آپ نے میرے نہایت پریشان کُن لمحات میں ایک ہمدرد و غمگسار کی طرح ساتھ دیا۔ بندہ کی اہلیہ کی بینائی بوجہ موتیا بند کے دونوں آنکھوں سے جاتی رہی تھی۔ اور ان کا اصرار تھا کہ حضرت میر صاحب کے سوا کسی دوسرے سے آنکھیں نہ بنواؤں گی۔ حضرت میر صاحب کی طبیعت کمزور تھی۔ جراحی کے تمام کام بوجہ ناسازئ طبع بند تھے۔ دیگر اطباء کا بھی مشورہ تھا کہ لاہور میں یا امرتسر میں کسی بڑے ہسپتال میں آپریشن کروایا جائے۔ غرض ایک طرف بندہ کی اہلیہ کا اصرار دوسری طرف حضرت میر صاحب کی ناسازئ طبع کی وجہ سے مجبوری میرے لئے حیران کن ثابت ہو رہی تھی۔ آخر ان حالات میں اپنے محسن سے میں نے اپنی اہلیہ کی اس خواہش کا اظہار کیا۔ آپ بلا تامل عمل جراحی کے لئے تیار ہو گئے۔ بس میری کل پریشانی اور حیرانی دُور ہوئی اور ان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے میری بیوی کی آنکھوں کو شفا عطا کی۔ یہ تھا آپ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا وہ نمونہ جو آپ ایک کمتر ہمسایہ

کے لئے روا رکھتے تھے۔ نہ صرف بندہ بلکہ بندہ کے بچوں کے جذبات اور احساسات کا انتہائی خیال تھا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام کا ایک واقعہ ہے جو بظاہر تو بالکل معمولی نظر آتا ہے۔ لیکن آپ کے احسانات کے کرشموں میں سے ایک بہت بڑا کرشمہ ہے۔ میرے لڑکے عبدالرحیم نے پہاڑ پر جاتے جانے بغیر گھوڑے کے ٹانگہ ان کے باغ میں ان کی بلا اطلاع حفاظت کی خاطر کھڑا کروا دیا۔ آپ نے جب ایک ٹانگہ اپنے باغ میں کھڑا ہوا دیکھا تو اپنے نوکر کو تاکیدی حکم دیا کہ اس ٹانگہ کو فوراً باغ سے باہر نکال دو۔ لیکن جونہی آپ کو یہ اطلاع ہوئی کہ یہ عبدالرحیم کا ٹانگہ ہے۔ تو آپ نے فوراً اپنا حکم واپس لیتے ہوئے نوکر کو تاکید فرمائی کہ اس بات کا عبدالرحیم کو علم بھی نہ ہونے پائے کہ میں نے ان کے ٹانگے کو اپنے باغ سے باہر نکالنے کے لئے کہا تھا۔

بندہ کو علمی رنگ میں بھی آپ سے دو دفعہ خصوصیت کے ساتھ استفاضہ حاصل کرنے کا موقعہ پیش آیا۔ دو مضمونوں کی تیاری کے لئے میں نے آپ سے امداد چاہی۔ آپ نے نہ صرف بغیر سوچنے کے ان مضمونوں کے لئے مجھے ضروری مصالح بہم پہنچا دیا۔ (گویا ان مضموں کے متعلق تمام معلومات پہلے ہی سے ان کے دماغ میں موجود تھیں) بلکہ جو مصالح انہوں نے بہم پہنچایا۔ وہ صرف عام باتوں پر مشتمل نہیں تھا۔ بلکہ نہایت ہی قیمتی اور نادر نکات پر مشتمل تھا۔ مثال کے طور پر میں صرف ان کا ایک نکتہ بیان کرتا ہوں جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ان کا دماغ کیسی عجیب اور باریک باتیں نکالتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ کہ دوسرے لوگوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں قصیدے لکھے اور جو قصیدے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں لکھے ہیں۔ ان میں یہ فرق ہے کہ آپ کے شعروں میں عشق اور محبت کا رنگ نظر آ رہا ہے۔ حضرت مسیح موعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو محبت تھی۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ آپ نے جو بعض مخالفوں کے متعلق اور ہلاکت کی پیشگوئیاں فرمائیں۔

ان کا موجب بھی عشق تھا۔ جو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بیکھرام کے متعلق جو آپ نے پیشگوئی فرمائی۔ اس کی محرک بھی وہ گالیاں تھیں جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیتا تھا۔ اور آتھم کے متعلق جو آپ نے ہلاکت کی پیشگوئی فرمائی۔ اس کا اصل موجب بھی وہی عشق تھا جو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ کیونکہ جہاں آپ نے آتھم کے متعلق پیشگوئی فرمائی۔ وہاں آپ نے آتھم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی کتابوں کے اندر و نہ بائبل میں دجال لکھا ہے۔

مَیں نے حضرت میر صاحب کی سیرت کے صرف ایک دو پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کی ساری صفات پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت میر صاحب مرحوم اپنے رنگ میں ایک بینظیر انسان تھے۔ اے خدا!

حضرت حافظ مختار احمد صاحب شاہجہانپوری

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب اور حضرت میر محمد اسحاق صاحب دونوں بھائی اپنے رنگ میں بے نظیر تھے اور سلسلے کے آفتاب و ماہتاب تھے۔

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب نہایت متقی اور نہایت متواضع تھے۔ مخلوق خدا کی دینی و دنیوی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اپنی تکلیف نظر انداز کر کے دوسروں کا کام کر دینا ان کی عادت تھی۔ جو شخص ایک بار آپ سے ملتا ہمیشہ آپ سے دوبارہ ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش رکھتا۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ساتھ آپ کو ایک خاص قسم کا تعلق تھا۔ آپ کی نظر بہت باریک بین تھی۔

حضرت ڈاکٹر غلام غوث صاحب

فرماتے ہیں کہ حضرت میر صاحب رفقاء کے تمام اخلاق کا زندہ نمونہ تھے۔
آپ نے حضرت عباس کی طرح حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی گود میں پرورش پائی۔ آپ رفقاء سے غالباً سب سے زیادہ چندہ دینے والے تھے۔ شاید ہی سلسلے کی کوئی تحریک ہو جس میں آپ نے حصہ نہ لیا ہو۔

حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

"حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کے وجود باوجود میں دونوں طرح کے نمونے اس اعلیٰ مقصد حیات کے بشان اجلی نمایاں طور پر پائے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت اور معرفت کے لحاظ سے آپ کے اندر عبد مسلم کا بہترین نمونہ پایا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی شفقت کی رُو سے آپ کے ڈاکٹری معالجات کا فن جو انواع واقسام کے مریضوں اور بیماروں کے علاج کے طور پر شب و روز مسلسل فائدہ بخش ہوتا رہتا۔ شفقتِ علیٰ خلق اللہ کے معنوں میں احسانات کا ایک وسیع سلسلہ تھا جس کے رو سے آپ کا عبدِ محسن ہونا نمایاں شان رکھتا تھا۔ چنانچہ جس جس علاقہ میں بھی آپ نے اپنے اوقات کو اس طرح گذارا وہاں کے بیمار اور تیمار دار اب تک آپ کے حد درجہ مدّاح پائے جاتے ہیں۔ اور حدیثِ نبوی کی رُو سے علاوہ اور لوگوں کے رفقاء حضرت مسیح موعود کا خصوصیت کے ساتھ آپ کا مدّاح ہونا برکات وصیّت کے بیان فرمودہ علامات کے یہ بھی آپ کے جنّتی ہونے کی ایک بیّن علامت ہے۔ آپ قرآنی حقائق اور لطائف سے خاص طور پر لُطف اندوز ہوا کرتے تھے اور مجھ سے زیادہ تر آپ کی محبت قرآن کریم کی وجہ سے ہی تھی۔ گو آپ میرے محبوبوں میں سے ایک محبوب ہستی تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے خدا تعالیٰ کے

پیارے بندوں کی نظرِ محبت و نگاہِ شفقت کبھی نہ کبھی مجھ جیسے غریب اور حقیر پر بھی پڑ جایا کرتی۔

اُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهُ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

قرآنی حقائق کا فہم دقیق آپ کو عطا کیا گیا تھا۔ آپ قرآنی معارف کے غوّاص تھے اور آپ کا فہم رسا دقائق کی گہرائیوں میں دُور تک نکل جاتا تھا۔۔۔ روحانی تعلقات کے لحاظ سے بھی مجھے آپ سے گہرا تعلق تھا جس کا ثبوت ذیل کے ایک واقعہ سے بھی ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خاکسار کو دو ہفتہ سے کچھ زائد عرصہ تک درد گردہ کا شدید دورہ رہا جس کا سلسلہ کسی قدر اب بھی چلا جا رہا ہے۔ ہاں نسبتاً آج کل کچھ افاقہ ہی ہے اور یہ مضمون بھی بحالت علالت لکھا جا رہا ہے۔ ۱۲-۱۳ جولائی کی درمیانی شب کو بوجہ شدید دورۂ درد گردہ کے میں سو نہ سکا اور شدّتِ درد کے باعث آنکھ نہ لگی۔

اسی سلسلہ میں مجھ پر اچانک ایک ربودگی اور غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کانوں کے بالکل قریب ہو کر کوئی کلام کرنے لگا ہے۔ نہایت فصیح اور موثر لہجہ میں کلام کا طرز ہے۔ اس وقت مجھے یہی محسوس کرایا جا رہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آواز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی حلم اور رحم کے پیرایہ میں یُوں کلام فرمایا۔

"میر محمد اسمٰعیل ہمارے پیارے ہیں۔ اُن کے علاج کی طرف فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم خود ہی ان کا علاج ہیں۔"

۔۔۔۔ اس مبشرہ میں ایک امر تو حضرت میر صاحب کے لئے بطور بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیارا اور محبوب قرار دیا ہے۔ دوسرے حضرت میر صاحب طبّی

اور ڈاکٹری علاج سے بالا اپنے لئے علاج کے خواہاں معلوم ہوتے تھے جس کے جواب میں خدا تعالیٰ نے دوسرے علاجوں سے ان کے استغناء کا اظہار فرما کر اس اصل علاج کا ذکر فرما دیا جس کی طبعی طور پر بلحاظ جذبات محبت و ذوقِ فطرت ان کی شدید خواہش تھی اور وہ علاج اللہ تعالیٰ نے خود ہی ذکر فرما دیا کہ ہم خود ہی ان کا علاج ہیں۔ گویا وہ بقول حضرت امیر خسرو ؎

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردمندِ عشق را دارُو بجز دیدار نیست

حضرت میر صاحب جیسے عاشق وجہ اللہ کا علاج اللہ تعالیٰ کا دیدار اور وصال ہی ہو سکتا تھا جو بالآخر آپ کو حسب پسند خاطر نصیب ہو گیا۔ رزقنا اللّٰہ ما رزقہٗ عشقاً ووصلاً (الفضل ۷ر اگست ۱۹۴۷ء صفحہ ۴،۳)

حضرت بھائی عبدالرحیم صاحب

محترم مکرم ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کے ساتھ میرے پرانے تعلقات تھے۔ آپ اپنے فن میں تو ماہر تھے ہی۔ ساتھ ہی دینی معلومات میں بھی آپ کی ذہانت قابلِ داد تھی۔ تقویٰ پر اکثر وبیشتر گفتگو فرماتے اور ساتھ ساتھ حدیثیں بکثرت پڑھتے جاتے تھے۔ ان کے اشعار میں علاوہ روایتی طبع کے اوامر و نواہی اور تقوےٰ کے بیان میں بلند پردازی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اگر طبیعت میں ذرا حدت تھی تو ساتھ ہی فوراً رقت بھی طاری ہو جاتی تھی۔ اور اپنی غلطی کے احساس میں جھٹ پشیمان ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے آپ میں یہ خاص وصف پایا تھا۔ خانگی معاملات میں جیسا مجھے معلوم ہے۔ عدل و انصاف سے آپ

کام لیتے تھے۔ تربیت اولاد کا درد بھی آپ میں حد سے زیادہ تھا۔ میرے ساتھ ان کے تعلقات مؤدبانہ تھے۔ جماعت کے اکثر دوست جب آپ سے اپنا دکھ درد بیان کرتے تو حتی الوسع اور حتی الامکان خاص طور پر ہمدردی کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ اور ان کے امور میں مخلصی کی راہ بھی نکالنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی طبیعت اور آپ کے دل کی کیفیت حدود شریعت سے باہر جاتی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ جب دیکھا گفتگو میں بہت محتاط پایا۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی قابلِ تعریف تھا۔ باوجود اپنی شدید بیماری کے پھر بھی ان کا حق حتی المقدور ادا کرتے رہتے تھے۔ میں کیا کیا لکھوں مجھے بھی ان سے اکثر معرفت کے نکات ملے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے۔ اور فردوسِ بریں میں اعلیٰ مقامات کا وارث بنائے آمین۔

جناب حافظ غلام محمد صاحب بی اے

حضرت میر محمد اسماعیل کو حضرت سیّد ولد آدمؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی اولاد میں سے ہونے کا فخر بخشا تھا۔ بلکہ سیدنا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا برادرِ نسبتی بننے کا شرف بھی عطا فرمایا تھا۔ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل اور احسان تھا۔ لیکن جناب موصوف نے اپنے علم و عمل سے ثابت کر دکھایا تھا کہ واقعی آپ خدا کے ان تمام تفضلات کے مستحق اور مورد تھے۔ احقر کی رائے میں آپ مصداق تھے

اذکر فی الکتاب اسماعیل انہ کان صادق الوعد وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وکان عند ربہ مرضیا۔

خدا نے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں کی نعماء سے نوازا تھا۔ کیونکہ آپ نافع الناس اور خیر خواہ خلائق تھے۔ خدا نے آپ کو ایسے پیشے کا مالک بنایا تھا جو خدمتِ خلق کے

لئے مخصوص ہے۔ آپ سرجیکل آپریشن میں بڑے ماہر تھے۔ ملازمت کے دوران میں جب کبھی بھی قادیان میں تشریف لاتے تو آنکھوں کے مریضوں کا جم غفیر آپ کے پاس جمع ہو جاتا تھا۔ اور بڑی خوشی سے ان کی آنکھیں بنا دیتے تھے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ مریضوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے۔ دہلوی ہونے کی وجہ سے آپ کی اردو زبان بڑی شستہ تھی۔ الفضل کو اپنے مضامین اور نظموں سے اکثر نوازتے رہتے تھے۔ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام منظوم اور منثور سے ثابت ہے کہ آپ عاشق خدا، عاشق محمد صلی اللہ علیہ وسلّم۔ عاشق حضرت مسیح موعود اور عاشق محمود ایدہ اللہ تھے۔ اسلام اور احمدیت سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ خدا نے آپ کو دُنیا میں بعض حسنات عطا فرمائیں اور آخرت میں بھی۔ اس لئے کہ آپ دنیا میں کامیاب زندگی گذارنے کے بعد خدا تعالیٰ کے فضل کے ماتحت بہشتی مقبرہ میں داخل ہوئے اور آخرت کی کامیابی کے وارث بنے

میں ۱۹۰۱ء سے آپ کو جانتا ہوں۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جن کا ذکر خیر اس آیت کریمہ میں بیان ہوا ہے۔

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون
الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن
المنکر والحافظون لحدود اللّٰہ

آپ سابق الخیرات اور اپنے رب کو تضرّع اور عاجزی سے پکارنے والے تھے۔ آپ کی خوش مزاجی اور ظریفانہ کلام نے آپ کو ہر جگہ ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اکثر دفعہ لوگ آپ سے مختلف مسائل کے متعلق سوال لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ اور ان کے جواب آپ الفضل میں شائع کروا دیتے تھے۔ ملازمت کے دوران میں جہاں جہاں آپ بطور ڈاکٹر کام کرتے رہے اور جو جو واقعات جہاں جہاں پیش آئے وہ آپ نے بطور آپ بیتی کے شائع فرما دیئے۔ یہ کتاب زندگی کے مختلف تجربات کا نچوڑ ہے۔

حضرت مولوی محمد الدین صاحب

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کی وفات سے جہاں قادیان کی پبلک ایک مہربان شفیق اور محسن معالج کی خدمات سے محروم ہوگئی ہے۔ وہاں سلسلہ میں ایک بلند پایہ رکن کی موت سے ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ حضرت میر محمد اسحاق صاحب مرحوم و مغفور کی وفات سے پیدا شدہ خلا بھی ایسا ہے جس کو دوست ابھی تک بھول نہیں سکے۔ اور نامعلوم کہ قادرِ گیتی ان جیسا وجود پھر کب پیدا کرے۔ اسی طرح حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کی وفات کا خلا بھی بہت جلد پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ وہ نہ صرف اپنے فن کے استاد و ماہر تھے۔ بلکہ فطرت انسانی کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ ہر طبیب کے لئے ضروری ہے کہ اس کو انسانی اعضاء کے باریک در باریک تعلقات کا گہرا علم ہو۔ لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ فطرت انسانی کا صحیح فہم بھی میسّر ہو۔ تو پھر یہ سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ حضرت میر صاحب مرحوم ان فوق العادت ہستیوں میں سے تھے۔ جو پورے جسمانی و روحانی طبیب ہونے کے علاوہ سنن الٰہیہ سے واقف اور رازہائے اعجاز و کرامت سے پوری طرح آشنا ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ان جیسا وجود پھر کتنی پشتوں کے بعد پیدا ہو۔ فی الحال تو ہم بے عدیل و بے مثال ہمدرد طبیب اور شفیق دوست سے محروم ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم و مغفور کو اپنی رحمت کی خاص چادر میں لپیٹ لے۔ اور اُن کے اور تمام راستبازوں کے طفیل ہمارا انجام بھی نیک کرے آمین۔

جناب مولانا جلال الدین صاحب شمسؔ

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب غفر اللہ لہ و نوّر مرقدہ۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ایک جلیل القدر رفیق تھے۔ اور محمدؐ، احمدؑ اور محمود کے عاشق صادق

تھے۔ آپ کو بوجہ قرابت ورشتہ داری کے حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے حلیہ مبارک اور لباس وطعام اور آپ کی زندگی کے بعض مخصوص پہلوؤں کے متعلق عمیق مطالعہ کا شرف حاصل تھا۔ آپ احمدیت کے درخشندہ ستارے تھے۔ جو لوگوں کی رہنمائی کرتا اور آسمانِ احمدیت کے وسط میں نہایت آب و تاب سے چمکتا تھا۔ روحانی علوم میں آپ کو خاص دسترس حاصل تھی۔ قرآن مجید کے ساتھ عشق تھا۔ قرآن کی آیات میں تدبّر کے عادی تھے۔ مشکل مقامات کو حل کرتے اور نہایت آسان پیرایہ میں بیان کر کے اشکال دور کر دیتے آپ عالم باعمل تھے۔ تصوف میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ عالم بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔ زاہد بھی تھے۔ نہایت شیریں مقال۔ شیریں زبان اور دلپسند ہم جلیس تھے۔ عمدہ اور دلچسپ نثر لکھتے لطیف اور دل پسند شعر کہتے۔

حضرت مولوی ابوالعطاء صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کا انتقال ایک بہت بھاری نقصان ہے جو ملت کو ہوا ہے۔ ہم لوگ ان کے انتقال کے بعد بہت سے روحانی فوائد سے محروم ہو گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

حضرت میر صاحب ماہر ڈاکٹر بھی تھے۔ اس لئے بے شمار لوگوں کو اُن سے جسمانی صحت کا فائدہ بھی ہوا ہے۔ اور آپ بیماروں سے شفقت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ جب تک قویٰ کام کرتے رہے۔ آپ نے کسی مصیبت زدہ کی امداد سے دریغ نہ فرمایا۔ آپ کی روحانیت ہم نشینوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اور ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو خاص لذت حاصل ہوتی تھی۔ حضرت میر صاحب مرحوم کا مکان الصفہ سڑک پر واقع ہے اور مجھے جامعہ احمدیہ آتے جاتے وقت راستے میں پڑتا ہے۔ اور کبھی ملنے کا موقعہ ملتا اور اکثر ملتا۔ آپ ہمیشہ کسی تبلیغی اور دینی فکر اور گہری سوچ میں منہمک ہوتے تھے۔ قرآن مجید

کی کسی آیت پر غور کر رہے ہوتے تھے۔ اور کوئی مفید مشورہ اور سلسلہ کی کسی ضرورت کا تذکرہ کرتے تھے۔ آخری چند سالوں میں آپ ہر گھڑی اپنے مولیٰ سے ملنے کے لئے آمادہ اور تیار بیٹھے تھے۔ سفر آخرت کے لئے پوری طور پر تیاری کر چکے تھے۔ دنیا سے مومنانہ طور پر دل برداشتہ نظر آتے تھے۔

حضرت میر صاحب کی بہت سی یادیں اور بہت سے کام ہیں جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اور ان کے درجات کی بلندی کا موجب بنیں گے۔ میں آج ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ غالباً تین سال گذرے کہ بورڈنگ تحریک جدید میں ایک تقریب دعوت تھی۔ احباب نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت میر صاحب اس کے صدر ہوں۔ حضرت میر صاحب کو طبعی طور پر امتیاز اور علو پسندی سے نفرت تھی۔ انہوں نے بہت انکار کیا اور آخر مجبور ہو گئے تو اس شرط سے کرسیٔ صدارت پر بیٹھے کہ میں کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ جب دعوت ختم ہو گئی۔ ایڈریس وغیرہ دیئے جا چکے۔ تو احباب نے اصرار کیا کہ حضرت میر صاحب بطور صدر کچھ فرمائیں۔ بصد مجبوری حضرت میر محمد اسماعیل صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے تقریر کی۔ تقریر کیا تھی۔ سادہ الفاظ مگر دل میں پیوست ہو جانے والے چھوٹے چھوٹے فقرے مگر ان میں محبت الٰہی وعشق ربانی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے کہ دنیا میں اتفاقی واقعات ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر چھوٹا بڑا کام ہمارے زندہ خدا کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ اور ہر واقعہ میں اس کی تقدیر کام کرتی ہے۔ اس لئے اتفاق کہہ کر خدائی قدرتوں سے روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اس دنیا کے وسیع کارخانہ کو اور اس کے کاموں کو ہر انسان اپنے لئے سمجھے تو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل کا خاص احساس ہوتا ہے۔ یہ تقریر ایسے انداز میں ایسے واقعات پر مشتمل تھی کہ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب ہمیشہ اسی طریق پر لذت اندوز ہوتے تھے۔ کہ وہ ہر فضل کو اپنے لئے سمجھتے تھے

ایک دفعہ شدت گرمی کے بعد بارش ہوئی۔ میں حضرت میر صاحب سے ملا تو فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ لوگ تو پہاڑوں پر چلے گئے ہیں۔ مگر اسمٰعیل گرمی میں ہیں۔ اس لئے اس نے میری خاطر بارش نازل فرمائی ہے۔ پھر اسی کیفیت میں اور بہت سی روحانی باتیں ارشاد فرمائیں۔

حضرت میر صاحب عشقِ الٰہی کا چلتا پھرتا مجسمہ تھے۔ سلسلہ کی عزت وعظمت کا قیام ان کا مطمح نظر تھا۔ وہ ہر وقت دینی مطالعہ میں مستغرق رہتے تھے۔ خدا کی قدرتوں پر فکر کرتے رہتے تھے۔ انہیں ظاہری اور خشک باتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ بہت بڑے نکتہ رس عالم دین تھے۔ ان کا وصال ان کے لئے تو مسرت اور خوشی ہے۔ مگر جو لوگ اس سے روحانی وجسمانی فوائد سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے رنج اور تکلیف کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے عاشق صادق بندہ کے درجات غیر معمولی طور پر بڑھائے اور ان کے اہل وعیال پر برکات نازل فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مکرم جناب خواجہ غلام نبی صاحب

اپنی بہترین خوبیوں اور غیر معمولی مومنانہ صفات کی وجہ سے جماعت احمدیہ کے معززترین رکن تھے۔ ایک لمبا عرصہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے براہِ راست تعلیم وتربیت کے مواقع پاتے والے خوش قسمت۔ نہ صرف اپنے تقویٰ وطہارت اور اعلیٰ ترین مومنانہ شان رکھنے کی وجہ سے بلکہ خاندانِ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے رشتہ کے لحاظ سے بھی بزرگ ترین ہونے کے باوجود ہر ایک کے لیے خادم اور خیر اندیش کہ چھوٹے سے چھوٹے بچے کی علالت کی اطلاع پاکر۔ اپنا دکھ درد بھول کر اس کے علاج میں ہمہ تن مصروف ہو جانے والے معالج۔ دنیوی لحاظ سے ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کی نیکی اور عبادت گزاری کا نہ صرف بہترین الفاظ میں اعتراف کرنے والے بلکہ اس پر رشک کا اظہار کرنے

والے مردِ صالح۔ مخلوق خدا کے لئے دینی اور جسمانی لحاظ سے فیض عام جاری رکھنے والے حضرت میر محمد اسماعیل (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) جو کچھ عرصہ سے اپنے آقا و مولا کے حضور حاضر ہونے کے لئے تیار پر تیار اور پا بہ رکاب نظر آتے تھے۔ ۱۸ جولائی کو جمعہ کے مبارک دن اپنے سب پیاروں اور عزیزوں کو اپنے محبوب حقیقی کی خاطر الوداع کہہ کر سچ مچ ہی چل دیئے۔

مجھے نہیں یاد کہ گزشتہ مدت میں حضرت میر صاحب مرحوم و مغفور سے ملاقات کا کوئی موقع میسر آیا ہو۔ اور اس وقت خوشی اور مسرت کے لہجہ میں باتوں باتوں میں مسکراتے مسکراتے اور حسب معمولی پاکیزہ مزاح کے پھول بکھیرتے بکھیرتے آپ نے اس قسم کا ذکر نہ فرمایا ہو کہ اب کو دُنیا سے دل سرد ہو گیا۔ اب تو دُنیا کی کوئی حسرت نہیں رہی۔ اب تو موت کے لئے تیار ہوں۔ اس پر چونک کر جب کہا جاتا ہے شک آپ کو دنیا میں رہنے کی ضرورت اور خواہش نہ ہو۔ لیکن دنیا کو خاص کر جماعت کو آپ کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ ایسے الفاظ کیوں استعمال فرماتے ہیں۔ تو گفتگو کا رُخ اور طرف پھیر لیتے۔ مرض الموت کے شدت اختیار کر لینے سے چند ہی روز قبل ایک ملاقات کے موقع پر فرمایا۔ ایک اہم کام سر انجام دینے کے لئے میں نے خدا تعالیٰ سے کچھ مہلت مانگی تھی۔ اب وہ دینی کام مکمل ہو گیا ہے اور میں موت کے لئے تیار ہوں۔ آخر خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ تیاری تکمیل کو پہنچ ہی گئی۔ اور اس نے اپنے ایک محبوب بندہ کے انتظار کی گھڑیاں ختم کر کے اُسے ہمیشہ کی زندگی دے کر اپنے پاس بُلا لیا۔ جماعت کے لئے یہ نہایت شدید صدمہ اور بہت بڑا جھٹکا ہے لیکن ہر دردمند اور غم رسیدہ احمدی کے لئے یہی واجب ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن کے درد کے ساتھ کہے۔

بُلانے والا ہے سب سے پیارا اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

خدا تعالیٰ نے حضرت میر صاحب کو جہاں بچپن سے لے کر آخری دم تک غیر معمولی

احسانات اور انعامات سے نوازا۔ وہاں حضرت میر صاحب نے بھی اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے اس کی اطاعت اور اس کی مخلوق کی خدمت گزاری میں صرف کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے اس کے لئے آپ کو اہلیت بھی غیر معمولی عطا فرمائی تھی۔ دین کا حقیقی علم بخشا۔ اور اس کی اشاعت اور تبلیغ کا بہترین ملکہ دیا۔ نظم و نثر میں وہ اثر قوت، شوکت اور دلکشی ودیعت کی کہ پڑھنے والے پر وجد طاری ہو جاتا۔ پھر آمد اور روانی کا یہ حال کہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اُس کے تمام پہلوؤں کو نہایت آسان اور عام فہم الفاظ میں واضح کر کے رکھ دیا۔ آپ اپنے بہترین اور بلند پایہ افکار اور مضامین سے ہمیشہ الفضل کو نوازا کرتے۔ اور بکثرت نوازتے۔ الفضل بھی شکر گزاری کے ہاتھوں لیتا۔ اور مفید ترین سمجھ کر شائع کرتا۔ اس بارے میں آپ کی بہ خصوصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کہ آپ نے کبھی کسی چیز کی اشاعت پر زور دینا تو الگ رہا۔ معمولی سا تذکرہ بھی نہ کیا۔ دیر سے اشاعت یا عدم اشاعت پر بھی کبھی بُرا نہ منایا۔ حتیٰ کہ اگر کبھی خود بخود معذرت کی گئی تو فرماتے کہ میرا کام لکھنا ہے۔ اشاعت یا عدم اشاعت اخبار والوں کا کام ہے۔ اور ان کا حق ہے جو مناسب سمجھیں۔ کریں۔

غرض آپ دینی مسائل کے متعلق بہترین لکھنے والے اور بکثرت لکھنے والے تھے۔ جس سے علم الادیان میں دسترس رکھتے اور خدا تعالیٰ کی اس نعمت کا حق ادا کرنے کا ثبوت ملتا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو خدا تعالیٰ نے علم الابدان بھی خصوصیت سے عطا فرمایا تھا۔ اور دستِ شفا بخشا تھا۔ اس انعام کا بھی آپ نے خوب خوب حق ادا کیا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں اور ممکن ہے لاکھوں مریضوں نے آپ کے ہاتھ سے شفا حاصل کی ہو۔ ملازمت کے دوران میں بھی ہمیشہ آپ نے اپنے آرام بلکہ اپنی صحت پر مریضوں کے علاج اور ان کی دیکھ بھال کو مقدم رکھا۔ اور جب رخصت لے کر قادیان تشریف لائے تو ٹھٹھ کے ٹھٹھ مریضوں کے ہر وقت آپ کو گھیرے رکھتے اور آپ سارا سارا دن

مصروف رہتے ۔

آپ کے اخلاق ایسے اعلیٰ ۔ عادات اتنی پاکیزہ ۔ اطوار اس قدر پیارے اشغال ایسے پسندیدہ اور اعمال اتنے قابل تعریف تھے ۔ کہ آپ کو تمام صفاتِ حسنہ کا قابلِ رشک نمونہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا ۔ آپ کی ایک ایک صفت کے متعلق اتنا کچھ لکھا جاسکتا ہے عقیدت یا خوش فہمی سے نہیں بلکہ واقعات اور شہادت کی بنا پر ۔ کہ کئی کئی صفحات بھر جائیں ۔ اور جب آپ کی سیرت کے متعلق میرے مشاہدات اور معلومات کی یہ وسعت ہے ۔ تو ان بزرگوں کے معلومات اور مشاہدات کس قدر وسیع ہوں گے جنہیں آپ کی زیادہ صحبت اُٹھانے کا موقع ملا ہو ۔ کاش ایسے جلیل القدر انسان کی پاکیزہ زندگی کے حالات اور واقعات قلم بند کئے جائیں ۔ جو بہتوں کے لئے مشعلِ راہ ہدایت اور بہتوں کے لئے ازدیادِ ایمان کا باعث بن سکتے ہیں ۔

آخر میں دُعا ہے کہ الٰہی تیرے لئے پیارے بندے نے دنیا میں تیرا نام بلند کرنے ۔ تیرے دین کی اشاعت کرنے ۔ تیرے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرنے تیرے مامور و مرسل حضرت مسیح موعود کا نام دنیا کے کناروں تک پہنچانے ۔ تیرے خلیفہ حضرت مصلح موعود ایدہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت میں دن رات مصروف رہے اور حتی الامکان تیری مخلوق کے دکھ دُور کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی ۔ اب اسے تو ہی اجر دے سکتا ہے اور تو اسے بڑے سے بڑا اجر اور بلند سے بلند مرتبہ عطا فرما ۔ اور ان کی تمام اولاد کو اپنے خاص انعامات کا وارث بنا ۔ آمین

(روزنامہ الفضل قادیان ۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء)

حضرت مولوی محمد نذیر صاحب لائلپوری پروفیسر جامعہ احمدیہ قادیان

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کی وفات ایک قومی صدمہ ہے۔ آپ ایک بلند پایہ صوفی اور تعلق باللہ عالمِ دین تھے۔ مضمون نگاری میں انہیں ایک خاص اور جدید طرز کا ملکہ حاصل تھا۔ آپ ایک سادہ زندگی بسر کرنے والے اور بے تکلف انسان تھے بعض امراء کو غرباء کے پاس بیٹھنا دوبھر ہوتا ہے لیکن آپ ایسے اخلاقِ فاضلہ سے متصف تھے کہ غریبوں میں بیٹھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے غرباء آپ سے بے تکلفی کے ساتھ ملنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

جن دنوں آپ لائل پور کے سرکاری ہسپتال میں تشریف لائے۔ ان دنوں میں لائل پور رہتا تھا۔ آپ نے اپنے حسنِ ظن اور ہمدردی سے جماعت کے لوگوں میں اپنی گہری محبت پیدا کر لی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ غرباء کو اچھا علاج میسر نہیں ہے۔ اگر کسی غریب احمدی یا غیر احمدی مریض کو علاج کی ضرورت ہو تو آپ مجھے بلا تکلف کہہ دیا کریں۔ میں بلا فیس اس کے گھر جا کر اس کا علاج کیا کروں گا۔ آپ ہمدردی اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے لائلپور میں مریضوں کا مرجع بن گئے۔ میں نے ان کو ہسپتال میں دیکھا کہ دن رات اپنی ڈیوٹی نہایت محنت، تندہی اور مستعدی سے ادا کرتے تھے۔ اور خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ آپ کے دل میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اتوار کے دن بھی چھٹی نہ کرتے۔ بلکہ سارا دن مریضوں کی آنکھوں کے آپریشن میں مصروف رہتے تھے۔ آنکھوں کی جراحی کے فن میں چونکہ آپ خوب ماہر تھے۔ اس لئے اس علاقہ کے صدہا آنکھوں کے مریضوں نے آپ سے فائدہ اٹھایا۔ آپ کی دیانت داری اور تقویٰ کا یہ اثر تھا کہ ہسپتال کا عملہ جو آپ کے ماتحت تھا۔ آپ کے زمانہ میں کسی مریض سے رشوت لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت میر صاحب ایک خوش بیان عالم تھے۔ فارغ اوقات میں حبیب احمدی

احباب میں بیٹھتے تو نہایت عمدہ جاذب اور مؤثر انداز میں قرآن مجید کے نکات بیان کرتے اور اس طرح وعظ نصیحت فرماتے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے حالات کا اس محبت سے ذکر کرتے کہ سامعین کے دل پگھل جاتے۔ آپ صوفی تھے مگر زندہ دل۔ چنانچہ اپنی گفتگو میں بعض اوقات اس طرح عالمانہ مزاح سے کام لیتے کہ اس سے دلوں میں شگفتگی پیدا ہو جاتی۔

ایک دفعہ فرمایا کہ "الفضل" میں بعض ایسے مضامین بھی ہونے چاہئیں۔ جو سادہ طرز اور حکایات کے رنگ میں ہوں۔ جس سے بچے بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ قوت دی تھی کہ جس مضمون پر قلم اُٹھاتے اُس کو نہایت خوبی سے نبھاتے۔ خدا تعالیٰ نے اب انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ لیکن ہمارے دل اُن کی جدائی سے سخت حزیں اور افسردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کو مدارج عالیہ عطا فرمائے۔ اور اُن کے اعزہ و اقارب اور احباب کے دلوں پر مرہم لگائے۔ اللّٰھم آمین

جناب مکرم ماسٹر فقیر اللہ صاحب

میر صاحب مرحوم۔ ایک قابل سرجن۔ ایک حاذق طبیب، عالم با عمل اور متقی بزرگ تھے۔ شروع سے آپ کی طبیعت تنہائی پسند واقع ہوئی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جب آپ کالج کی رخصتوں پر لاہور سے قادیان تشریف لائے تو سارا دن اندر گھر میں ہی رہتے۔ صرف نمازوں کے لئے بیت مبارک میں تشریف لاتے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر پھر اندر چلے جاتے۔ اپنی ملازمت کے زمانہ میں جہاں کہیں آپ گئے۔ اپنی خداداد قابلیت اور مریضوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے نہایت ہردلعزیز ہو گئے۔ ریٹائر ہو کر جب آپ قادیان تشریف لاتے تو ان دنوں میری رہائش لاہور تھی۔ اس لئے میر صاحب سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں ہی جب میں حضرت خلیفۃ المسیح

ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی بیعت سے مشرف ہوا۔ تو اس کے بعد کبھی کبھی میر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ بیعت کے بعد پہلی دفعہ جب اُن سے ملا ہوں۔ تو فرمانے لگے کہ مجھے آپ کے بیعت سے مشرف ہونے پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ آپ یہاں آجائیں۔ سو الحمد للہ کہ آپ آگئے۔ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اگر اپنے کسی عزیز ترین شخص کی بھی کوئی بات اسوۂ رسول کے خلاف دیکھتے تو اُسے سمجھاتے۔ اور اگر باوجود کوشش کرنے اور سمجھانے کے وہ اپنی بُری عادت کو نہ چھوڑتا۔ تو اُس سے قطع تعلق کر لیتے۔ آپ کا دماغ بڑا صاف تھا۔ اور بیماری کے آخری ایام تک یہی حالت قائم رہی۔ اُن کی وفات سے دو دن پہلے آپ کا ایک عزیز ڈاکٹر احسان علی صاحب کی دوکان پر کلسیم کا ٹیکہ لگوانے آیا۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے کہا کہ یہ علاج مجھے میر صاحب نے بتایا ہے۔ چونکہ چند دن سے آپ کو بیماری کی شدت کی وجہ سے سخت تکلیف اور تقریباً بیہوشی کی حالت رہتی تھی۔ اس لئے مجھے تعجب ہوا اور پوچھا۔ کون سے میر صاحب نے آپ کو یہ علاج بتایا۔ تو کہا۔ اپنے میر صاحب کی بیمار پرسی کے لئے میں گیا تھا۔ آپ آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے ہوئے تھے۔ جب مجھے باتیں کرتے ہوئے سُنا تو دھیمی آواز میں فرمانے لگے۔ کہ اُسے کہو "چونا کھائے چونا"۔ گویا ایسی حالت میں بھی جب اس عزیز کی باتیں سنیں تو فوراً بیماری کی تشخیص بھی کر لی۔ اور علاج بھی بتا دیا غرض بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پہ چلنے کی توفیق بخشے۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

مکرم منشی محمد اسماعیل صاحب سیالکوٹی

میں میر صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت تک مجھے ان کے قریب رہنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ میں نے اس عمر میں بھی آپ کو نہایت ہی خدا ترس، خلقِ خدا پہ مہربان اور ہمدرد پایا۔ حضرت میر صاحب مرحوم اپنے فرائض منصبی کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے تھے۔ کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کا وہم تک نہ کیا۔ ماشاء اللہ سول سرجن تھے۔ زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے لیکن کمال ثابت قدمی سے اس طرح بچتے رہے جس طرح کہ ایک بلند پایہ مومن کو بچنا چاہیئے۔

ایک دفعہ ۱۱ء میں ایک شخص میرے پاس سیالکوٹ آیا۔ حضرت میر صاحب بھی وہیں تھے۔ وہ ہسپتال کا وارڈ قلی تھا۔ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا کہ میر صاحب نے مجھے موقوف کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کہ ان کو شک پڑ گیا تھا کہ میں نے کسی مریض سے پیسے لئے ہیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ اب جبکہ میرے پاس سفارش کے لئے آئے ہو تو یہاں تو سچ سے کام لو۔ تو اس نے کہا کہ اس کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہوتا۔ مجبوری ہے۔ اب تک تو کسی نے سرزنش نہ کی تھی۔ اب میر صاحب نے شک کی بنا پر مجھے برطرف کر دیا ہے۔ میں نے حضرت میر صاحب کو کہا کہ دیکھ لیں غریب آدمی ہے۔ حضرت میر صاحب کہنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کی سروس بک میں اس کا ذکر ضرور کر دوں گا۔

ایک دفعہ میں سیالکوٹ میں ہسپتال میں جا رہا تھا کہ ایک عورت نے آکر میر صاحب سے درخواست کی کہ آپ سے علیحدگی میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میر صاحب نے اسے

جواب دیا۔ کہ میں علیحدگی میں باتیں نہیں سُنا کرتا ۔ میں نے اس عورت پر ترس کھا کر میر صاحب
کو کہا۔ کیوں نہیں سن لیتے ۔ تو فرمانے لگے ۔ کہ وہ مجھے علیحدگی میں کچھ روپے بطور رشوت دینا
چاہتی ہے ۔ میں نے کہا ۔ آپ کا خیال ہے ۔ چنانچہ وہ چلے گئے ۔ تو عورت نے کچھ رقم
پیش کی جسے آپ نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ آپ کے گھر پر اگر کوئی مریض آتا ۔ تو
اُس کا علاج بھی اس خندہ پیشانی سے کرتے جس طرح کہ ہسپتال میں ۔

الغرض حضرت میر صاحب نے ملازمت کا تمام عرصہ خالصتاً مخلوقِ خدا کی
خدمت ہمدردی اور بھلائی میں گذارا ۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی اسی میں کوشاں رہے ۔
خدمتِ خلق حضرت میر صاحب کے حمیدہ اوصاف میں ایک خاص وصف تھا ۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۲۸ جولائی ۱۹۴۷ء)

جناب ملک مولا بخش صاحب پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی قادیان

اگرچہ میں جب ۱۹۰۱ء کے دسمبر میں قادیان میں پہلی دفعہ آیا۔ اور بیعت کی میرا
خیال ہے کہ میں نے تب ہی ان کو دیکھا ۔ مگر زیادہ واقفیت اور محبت کے ازدیاد کے
مواقع بعد میں نصیب ہوئے ۔ ان کو قریب سے ملنے کا موقع مجھے اس وقت پیش آیا ۔
جب وہ لاہور کے بڑے ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے ۔ میں اپنے برادرزادہ کو لے کر گیا ۔
جس کی آنکھوں میں ککرے تھے ۔ میر صاحب نے ان کو کلوروفارم سے بے ہوش کر کے
عمل جراحی کیا ۔ میں پاس کھڑا تھا ۔ محبت اور رقتِ قلب کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا ۔
جب ہوش آئی تو میں بھی ایک میز پر پڑا ہوا تھا ۔ اور حضرت میر صاحب مجھ کو ہوش میں
لانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ جلدی ہی مجھے ہوش آگئی ۔ تو میر صاحب نے فرمایا ۔ کہ اگر
تم ایسے ہی بہادر تھے ۔ یا کہا کمزور دل تھے تو ساتھ ہی کیوں ٹھہرے تھے ۔

اس کے بعد جب میں قادیان آتا تھا تو ڈاکٹر عباد اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ جو میرے دوست تھے۔ عموماً میر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ پھر حضرت میر صاحب امرتسر میں ہاؤس سرجن مقرر ہوئے۔ تو ان سے راہ و رسم زیادہ بڑھ گئی۔ میرا برادرِ نسبتی بہت بیمار ہو گیا۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھلایا حتّٰی کہ دو سول سرجنوں کو بھی۔ وہ پھیپھڑے کا مرض بتلاتے رہے۔ میں نے حضرت میر صاحب سے ذکر کیا۔ تو انہوں نے ازراہِ مہربانی خود اس کو جا کر دیکھا۔ اور ایک منٹ میں کہہ دیا۔ کہ اس کے اندر تمام پیپ پڑی ہوئی ہے ہم نے کہا۔ آپ کے سول سرجن نے تو اور مرض بتلائی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ میرے ساتھ ان کو بلایا جائے۔ چنانچہ بلایا گیا۔ سول سرجن صاحب حضرت میر صاحب کے دلائل سے فوراً قائل ہو گئے۔ اور اس مریض کا اپریشن کیا گیا۔ جس سے چھ سات سیر پیپ نکلی۔ مرض بہت بڑھ چکا تھا۔ حضرت میر صاحب نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ گو صحت کی امید کم ہے۔ مگر اس وقت بجز اپریشن کے اور کوئی علاج نہیں۔ گو وہ مریض جانبر نہ ہو سکا۔ مگر حضرت میر صاحب کی ذہانت اور قابلیت کا لوہا سب کو ماننا پڑا۔

پھر جب میں گورداسپور میں تھا۔ تو قادیان کے اکثر دوست جب وہاں کسی کام کو جاتے تھے۔ تو میرے پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک روز جو میں صبح کو بیٹھک میں آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب ایک پاکیزہ بستر میں آرام سے سوئے پڑے ہیں۔ نوکر سے پوچھا۔ کون صاحب ہیں۔ تو اس نے کہا مجھے اتنا معلوم ہے۔ قادیان سے آئے ہیں۔ اور سو رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ آپ کو جگاؤں۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ مجھے صرف چارپائی دے دو۔ اور ان کو بے آرام نہ کرو۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ تو حضرت میر صاحب تھے جب جاگے تو میں نے پوچھا۔ مجھے جگایا کیوں نہ۔ تو نہایت سادگی سے فرمایا۔ مجھے صرف سونا تھا۔ جگہ مل گئی۔ بستر میرے ساتھ تھا۔ آپ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے ہاں دستور ہے کہ جب کہیں باہر جائیں تو اپنا بستر ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس سے

ایک تو میزبان خواہ مخواہ کی پریشانی اور تکلیف سے بچ جاتا ہے ۔ دوسرے اپنی مرضی کے مطابق بستر مل جاتا ہے ۔ لوگ ہر مہمان کے لئے الگ الگ بستر تو مہیا نہیں کر سکتے ۔ اور مہمان مختلف طبیعت اور صحت کے ہوتے ہیں ۔ اس سے انسان کئی کاوشوں اور بیماریوں سے بچ جاتا ہے ۔

پھر گورداسپور کا ہی ذکر ہے کہ حضرت میر صاحب کی رخصت ختم ہوئی تو ابھی ان کے کسی جگہ پوسٹنگ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا ۔ اس لئے اُن سے کہا گیا کہ آپ گورداسپور ہسپتال جنرل ڈیوٹی پہ حاضر ہو جائیں ۔ جب انہوں نے مجھ کو یہ بتلایا ۔ تو میں نے کہا ۔ یہ تو پولیس کی "لین حاضری" ہے ۔ یہ اصطلاح آپ کو بہت پسند آئی اور مدت تک محبت سے اس کا ذکر کرتے رہے ۔ انہی دنوں میں وہ واقعہ پیش آیا ۔ جو بالخصوص میرے لئے ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا ہے ۔ میں نے حضرت میر صاحب سے عرض کیا ۔ یہاں کے اسسٹنٹ سرجن سے لوگ مطمئن نہیں ۔ اگر آپ کچھ کوشش کریں تو آپ یہیں لگ جاویں ۔ فرمایا میں کیوں کوشش کروں ۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا ۔ میں نے کہا قادیان کے قریب رہیں گے ۔ ہر ہفتہ کے روز بائیسکلوں پر ہی قادیان جایا کریں گے ۔ اتوار وہاں گذار کر پیر کو آجایا کریں گے ۔ فرمایا مجھے کیا معلوم ہے کہ قادیان کے قریب رہنا یا اس طرح قادیان جانا میرے دین و دنیا کے لئے مفید ہوگا ۔ میں تو وہاں ہی رہنا چاہتا ہوں ۔ جہاں میرا خدا مجھے رکھے ۔ وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے کہ میرا کہاں رہنا مفید ہے ۔ اس سے نہ صرف میرا منہ بند ہو گیا ۔ بلکہ یہ بات ایسی میرے دل میں اُتر گئی ۔ کہ بعد کی زندگی میں میرے بہت کام آئی ۔ اور بعد میں بسلسلہ ملازمت میرے تبادلے دُور دُور ہوئے ۔ تو مجھے کوئی صدمہ نہیں ہوا ۔ اور میں عموماً یہی سمجھتا رہا ۔ کہ جہاں میرا مولا مجھے رکھے ۔ وہی جگہ مفید ہے ۔ اس طرح حضرت میر صاحب کی بات سے مجھے بڑا روحانی فائدہ پہنچا ۔ جب میرا تبادلہ گورداسپور سے حصار ہوا ۔ تو قادیان اور گھر سے دُور جانے کی وجہ سے مجھے کچھ غم ہوا ۔ جیسے بعد میں

میں نے محسوس کیا۔ کہ میری سوچ غلط تھی۔ اور سچی بات وہی تھی جو حضرت میر صاحب نے فرمائی تھی۔

جب میں قادیان میں پنشن لے کر آیا تو حضرت میر صاحب سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا۔ اور وہ ہمیشہ محبت سے ملتے اور مشفقانہ سلوک کرتے۔ کوئی تین سال کی بات ہے کہ میرے لڑکے ملک بشارت احمد کے کان میں سخت درد کئی دن رہا۔ کئی علاج کروائے۔ فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں اسے حضرت میر صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ بچے کی بیماری کا ان کو پہلے ہی شیخ فضل احمد صاحب کی زبانی علم ہو چکا ہوچکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ سنا ہے آپ کے کسی بچے کو تکلیف تھی۔ میں نے کہا یہ بچہ ہے اس کے کان میں بے چین کرنے والی درد ہے۔ حضرت میر صاحب نے ہاتھ سے کان پکڑ کر دیکھا اور ہسپتال کو چل پڑے۔ ہم ساتھ ہو لئے۔ پہلے اس کے کان کا معائنہ ہو چکا تھا۔ مگر نہ معلوم میر صاحب نے مرض کو دیکھ لیا۔ وہاں جا کر ایک مختصر سا آلہ لے کر جو کھرپا سا تھا۔ اس کے کان کو اندر سے چھیلنا شروع کیا۔ جس سے کچھ خون وغیرہ نکلا۔ لڑکا درد سے اونچی اونچی کرنے لگا۔ اس کی عمر اس وقت بیس سال کے قریب تھی۔ اور وہ خدام الاحمدیہ کا سرگرم ممبر تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حضرت میر صاحب نے کہا۔ یہ لوگ ہیں جو اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارتے ہیں کہ ہم نے دنیا کو فتح کرنا ہے۔ اور یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ یہ ذرا سی درد کو برداشت نہیں کر سکتے تو اور کیا کام کریں گے۔ اس غیرت دلانے والے کلمہ کا بچے پر ایسا اثر ہوا کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ اس کا درد اور تکلیف جاتا رہا۔

تین ماہ کے قریب ہوئے کہ ایک دن شیخ فضل احمد اور ماسٹر خیر الدین صاحب کے ساتھ حضرت میر صاحب کی خیریت پوچھنے کو گیا۔ اس سے پہلے دن سنا تھا کہ ان کو بہت تکلیف رہی تھی خیر ما کہ آپ باہر

تشریف لائے اور محبت سے باتیں کرتے ہوئے میرے گھر کے قریب تک جو ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا جا پہنچے۔ بھائی عبدالرحیم صاحب اور مولوی عبداللطیف شہید صاحب بھی ساتھ ہو لئے۔ سڑک پر میرے گھر کے پاس پہنچ کر فرمایا۔ اب آپ گھر جائیں۔ میں نے عرض کیا کچھ آرام فرمائیں۔ کچھ ناشتہ کریں۔ فرمایا میرے لئے بیٹھنا یا لیٹنا مشکل ہے۔ کھانا بھی کچھ نہیں چاہتا۔ پھر دوسرے دوستوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ حضرت میر صاحب رحمت فیض اور مجسم محبت تھے۔ اور مغز شریعت ان پر منکشف تھا۔ نہایت صاف اور سیدھے اور قولِ سدید کہنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے شمار رحمتیں کرے۔

جناب اخوند عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر تعلیم الاسلام کالج

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب ایک جلیل القدر رفیق تھے۔ اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ سے واقفیت رہی ہے۔ مگر زیادہ تر سلسلۂ راہ و رسم گزشتہ سات آٹھ سال میں ہی قائم ہوا کہ جب میں مستقل طور پر قادیان میں آ گیا۔ آپ بہت بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ طبیعت کے نہایت نیک تھے۔ صوفیانہ رنگ غالب تھا۔ صاف گوئی آپ کا شعار تھا۔ اور حتی الوسع اپنے فن کے علم و تجربہ سے دوسروں کو مستفید کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ بلکہ باوجود اس پیرانہ سالی کے بعض اوقات اہم اپریشن خود ہی نور ہسپتال میں کرتے رہے۔ اپنے رفقاء اور دوستوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ طبیعت میں مزاح کا رنگ بھی تھا۔ جو بعض اوقات عمدہ لطائف کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ اور جب کبھی ان کے افکار و جذبات نے منظوم کلام کی صورت اختیار کی۔ ایک وجدانی کیفیت

سے معمور ہو کر پڑھنے والوں نے لطف اٹھایا۔ ان کا پُرمعارف کلام آئندہ بھی پڑھنے والوں کے لئے ازدیادِ علم کا باعث بن کر خراجِ تحسین حاصل کرتا رہے گا۔ آپ کے دوسرے مضامین بھی جو نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ ٹھوس معلومات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ اپنے اندر نمایاں انفرادیت کی شان رکھتے تھے۔ ان کے مضامین و کلام کی انفرادیت اس درجہ نمایاں ہوتی تھی کہ اگر آخر یہ یا سرنامہ پہ ان کا نام نامی نہ بھی ہوتا۔ تو قارئین کو ابتدائی چند فقرات پڑھنے سے بخوبی معلوم ہو جاتا کہ یہ خیالات کس قلم گوہر کے چکیدہ ہیں احمدیت کی محبت آپ کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز سے تو خاص طور پر عشق تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسی درجہ حضور والا کا احترام بھی تھا۔ غرض حضرت میر صاحب ممدوح۔ اہل کلام۔ اہل کمال اور اہل فن تھے۔ اور روحانیات، اخلاقیات میں نہایت ہی بلند مقام پر فائز تھے۔ اور ایک نافع وجود تھے۔ دردمند دل رکھتے تھے۔ ان کا ہر خاص و عام مدح خواں ہے جماعت اور سلسلہ کے لئے آسمانِ احمدیت کے ایسے چمکتے ہوئے ستارہ کا غروب ہو جانا ایک زبردست قومی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ بیت النعیم میں بھی آپ کو مقام رفیع عطا فرمائے۔ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ نیز انہیں اپنے اس بزرگ جلیل کے روحانی و اخلاقی اوصاف کو اپنے اندر بدرجہ اتم پیدا کرنے اور ان روایات کو قائم رکھنے اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(الفضل قادیان ۲۸ جولائی ۱۹۴۷ء)

محترم خانصاحب منشی برکت علی صاحب جوائنٹ ناظر بیت المال

بے عیب ذات تو خدا ہی کی ہے۔ لیکن کوئی فرد ایسا نہیں جو عیب سے مبرا ہو۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب مرحوم اس درجہ محتاط واقع ہوئے تھے کہ کوئی شخص انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔ دنیاوی عزت کے لحاظ سے سول سرجن کے عہدے پر فائز تھے جسمانی رشتے کے اعتبار سے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے نسبتی برادر اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کے نہ صرف ماموں بلکہ سسر بھی تھے۔ مگر اللہ اللہ طبیعت نہایت سادہ پائی تھی۔ کہ خود پسندی وخود ستائی نام کو نہ تھی مجلس میں کبھی ممتاز جگہ پر نہ بیٹھتے۔ بلکہ معمولی پسند کرتے۔ جلسہ میں صدر بننا پسند نہ کرتے تھے۔ اگر کبھی آپ کو مجبور کیا جاتا تو بادل ناخواستہ منظور فرماتے۔ آپ صدارتی ریمارکس میں اعلیٰ درجہ کی نصائح کرتے۔ آپ حد درجہ متقی اور پرہیز گار تھے۔ مداہنت قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم حق بات اس طرح کیا کرتے کہ کسی کو بُرا معلوم نہ ہوتا۔ شخصیت نہایت متواضع تھی۔ اور تواضع اور کوئی تصنع نہ تھا۔ اور نہ کسی قسم کا رنج دل میں لاتے۔ بلکہ خوشی محسوس کرتے۔

عرصہ کی بات ہے جب آپ امرتسر تبدیل ہو کر آئے تو امرتسر جانے والے احمدی احباب اکثر آپ کے مکان پر ٹھہرتے۔ آپ کبھی دل میں میل نہ لاتے۔ آپ سب کی اس طرح تواضع کرتے کہ ہر کوئی یہ محسوس کرتا کہ گویا حضرت میر صاحب کو ان کے آنے سے خوشی ہوئی ہے۔ ان دنوں وہاں سول سرجن ایک انگریز تھا جس کا نام غالباً سمتھ صاحب تھا۔ اُسے آنکھوں کے بنانے میں خاص مہارت تھی، اور بلا مبالغہ سینکڑوں مرد اور عورتیں آنکھیں بنوانے کے لئے وہاں جاتے تھے اور شفایاب ہو کر آتے تھے۔ میری

والدہ صاحبہ مرحومہ کی نظر بوجہ موتیا بند کے بند ہوگئی تھی۔ میں نے حضرت میر صاحب سے ذکر کیا۔ تو انہوں نے فوراً انہیں دیکھنے کے لئے بلوا لیا۔ حضرت میر صاحب نے ازراہِ شفقت خود بڑی احتیاط سے ڈاکٹر سمتھ صاحب سے آپریشن کرا دیا اور پھر والدہ مرحومہ کو ہسپتال میں نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اپنے گھر لے آئے جو ہسپتال کے احاطہ میں ہی تھا۔ اور جب تک ان کی حالت تسلی بخش طور پہ درست نہ ہوگئی۔ پندرہ بیس دن تک ہم سب کو گھر میں رکھا۔ اور دونوں میاں بیوی یعنی خود حضرت میر صاحب اور ان کی پہلی اہلیہ محترمہ بڑی محبت سے ان کی خاطر داری کرتے رہے۔ نہ صرف ہم سب کو کھانا کھلایا جاتا بلکہ والدہ محترمہ کی بیماری کی وجہ سے اگر کسی خاص پرہیزی کھانے کی ضرورت ہوتی۔ تو ان کے لئے الگ کھانا پکایا جاتا تھا۔ یہ وہ شفقت اور احسان ہے جس کو ہم یعنی میں اور میری بیوی کبھی نہیں بھول سکتے۔ اور ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر انہیں احسان کا بدلہ دے اور اب جبکہ وہ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ پروردگارِ عالم اپنے فضل وکرم سے قرب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ ہم صرف حضرت میر صاحب کے احسان کے ہی ممنون نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اہلیہ صاحبہ کے بھی از حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بھی بیماری کی حالت میں میری والدہ صاحبہ کی بڑی خدمت کی۔ اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دین و دنیا میں خوشحال رکھے۔ آمین۔ ایک بڑی خوبی حضرت میر صاحب میں یہ تھی کہ خدا تعالیٰ پہ کامل بھروسہ اور توکل رکھتے۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قیام امرتسر میں ایک دفعہ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مہمانوں کی اس قدر کثرت ہے کہ بعض اوقات آپ کی ساری تنخواہ مہمان نوازی میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ مگر آپ بطیبِ خاطر ان اخراجات کو برداشت کرتے۔

متواضع ہونے کے علاوہ آپ نہایت خوش طبع اور بے لوث انسان تھے۔ ہر شخص جو ان سے بات کرتا یہی سمجھتا کہ میرے ساتھ ان کا خاص مشفقانہ تعلق ہے اور ہر چند

ایک نہیں بلکہ بلا مبالغہ ہزارہا احباب آپ کی اس خوبی کا اعتراف کریں گے۔ بے لوث طبیعت کی شملہ میں تو ایک ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ان کے ماتحت وہاں ایک سب اسسٹنٹ سرجن تھا۔ جو مذہباً شیعہ تھا۔ اس نے مجھے کئی دفعہ کہا کہ میر صاحب نہایت متوکل انسان ہیں۔ ان کی طبیعت میں لالچ بالکل نہیں۔ چونکہ نیک دل۔ خوش مزاج اور متقی اور پرہیز گار ہونے کے علاوہ ڈاکٹر بھی اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اس لئے لوگ انہیں اکثر بیماری پر بلاتے ہیں۔ اور گو قانونی اور سرکاری طور پر ۱۶ روپے فی معائنہ (V/S/T) فیس ملتی ہے مگر وہ پروا نہیں کرتے۔ اور کئی دفعہ مجھے بھیج دیتے ہیں اور بیمار کی حالت معلوم کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ نیز آپ نے کئی اپنے خاص خاص نسخے جوان کے تجربہ میں آچکے ہیں مجھے بتادیئے ہیں جن کی وجہ سے میرے علم اور تجربہ میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور میں نے دنیاوی طور پر بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

لیکن شملہ کی آب و ہوا میر صاحب کے موافق نہیں تھی۔ اور علاوہ اس کے اور بھی وجوہات تھیں۔ جن کی وجہ سے آپ وہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں آپریشن کا موقعہ کم ملتا ہے۔ کیونکہ یہاں کئی ڈاکٹر ہیں جو اپنے اپنے دائرہ عمل میں آپریشن کرتے ہیں۔ اور میرے حصہ میں کام کم آتا ہے جن کا یہ مطلب تھا۔ کہ آپ فطرتاً خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے متمنی تھے۔ چنانچہ آپ نے جلدی وہاں سے تبدیلی کرالی۔

پنشن لے کر آپ دارالامان میں آئے۔ تو محض اس وجہ سے کہ آپ کی طبیعت میں کسی قسم کا دنیاوی لالچ نہیں تھا۔ نہ آپ نے پریکٹس کی اور نہ ہسپتال میں کام کرنا پسند کیا۔ البتہ آپ دوستوں کی خدمت کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ میری داڑھ میں ایک دفعہ درد ہوا۔ میں نے آپ سے ذکر کیا۔ شام کا وقت تھا۔ آپ اسی وقت میرے ساتھ ہولئے۔ اور ایک ڈاکٹر کی دکان سے مجھے ایک دوائی لے دی۔ کہ آج اسے استعمال کر

کہ رات آرام سے گزارو۔ صبح کوئی علاج کریں گے۔

ایک دفعہ میرے ماتھے پر ایک گومڑ سا اٹھا اور موٹا سا گولہ بن گیا۔ درد تو کوئی نہیں تھا۔ مگر بڑا بھدا اور بدنما معلوم ہوتا تھا۔ میں نے حضرت میر صاحب سے ذکر کیا گو آپ ہسپتال نہیں جاتے تھے اور نہ آپ پریکٹس کرتے تھے۔ مگر محض میری خاطر از راہِ شفقت فرمایا کہ کل صبح میرے پاس آنا میں خود ہسپتال میں جاکر آپریشن کر دوں گا اور اس طرح کروں گا کہ ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں گیا۔ تو پہلے آپ نے کوئی دوائی لگائی۔ جس سے گوشت بے حس ہو گیا اور بعد میں چیرا دے دیا جس سے مجھے ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی۔

غرض اس طرح کے کئی احسانات ہیں جو انہوں نے مجھ پر کئے۔ اور جس کی وجہ سے میں اُن کا تہِ دل سے ممنون ہوں اور ہمیشہ اُن کے لئے دُعا گو ہوں۔ بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ اور بھی ہزارہا لوگ ہیں جن کے ساتھ حضرت میر صاحب کا خاص مشفقانہ سلوک رہا ہے۔ اور جو حضرت میر صاحب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت میر صاحب ظاہر طور پر عربی کے ڈگری یافتہ عالم نہیں تھے۔ مگر ذاتی علم وفضل میں وہ کمال رکھتے تھے کہ ہر مسئلہ پر حاوی تھے۔ اور قرآنِ پاک کے مشکل سے مشکل مقامات باسانی عام فہم طرز میں فرما دیتے تھے۔ کئی دفعہ آپ کے الفضل میں شائع شدہ مضامین اور طبع شدہ تصانیف اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں۔

نثر کے علاوہ نظم کہنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ آپ کے اشعار نہ صرف بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہوتے۔ بلکہ زبان بھی نہایت پاک صاف ستھری سلیس اور بامحاورہ ہوتی تھی۔ اور ان سب کہنہ مشق شاعروں کی سی روانی ہوتی۔ بعض نظمیں جو آپ نے خدا تعالیٰ کی حمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح میں لکھیں۔ ایسی مقبول عام ہوئیں۔ کہ آج تک اکثر خوشی کے موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو بہشت بریں میں جگہ دے۔ اور آپ کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۷ راگست ۱۹۴۷ء)

جناب حکیم عبداللطیف صاحب شہید

عروسی بود نوبتِ ماتمت — اگر بر نکوئی بود خاتمت

جیسا کہ احباب جماعت کو علم ہو چکا ہے کہ ہماری جماعت کے درخشندہ گوہر حضرت بزرگوار ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) بروز جمعۃ المبارک ۲۸ شعبان کو رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔ اور جماعت کے ہر خورد و کلاں کو اپنی جدائی سے مغموم و محزون چھوڑ گئے۔

العین تدمع والقلب یحزن وانا بفراقك یا اسماعیل لمحزونون ولانقول الا ما یرضیٰ به ربنا وهوارحم الراحمین وخیر الغافرین وانا لله وانا الیه راجعون

حضرت میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کو جماعت احمدیہ میں جوارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ وہ سلسلہ کے کسی فرد سے مخفی نہیں۔ آپ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے نہ صرف شدید روحانی تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کو قریبی جسمانی رشتہ بھی حاصل تھا۔ آپ جسمانی رشتہ کے تعلق کی وجہ سے اپنی ذاتی اعلیٰ استعداد کے باعث حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی صحبتِ صالحہ میں رہ کر آپ کو روحانی برکات حاصل کرنے کے ایسے بے نظیر مواقع ملے جو دوسروں کو کم ہی نصیب ہو سکتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

آپ دہلی کے اولیاء اللہ کے ایک نجیب الطرفین سید خاندان کے فرد تھے۔ پھر آپ

کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی فطری استعدادیں عطا کی تھیں۔ نیز آپ علمی اور مذہبی ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ کو حضرت مسیح موعود کی پاکیزہ صحبت ایک لمبے عرصہ تک میسر آئی تھی۔ اِن سب باتوں کی وجہ سے آپ کا وجود اسلام واحمدیت کا ایک بے نظیر نمونہ بن گیا تھا۔ اور آپ ان کامل الایمان لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں دیکھ کر رفقاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ افسوس اسلام واحدیت ان سابقون الاولیٰ رفقاء کرام کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اور وہ ستارہ ہائے سحر کی طرح ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو رہے ہیں ؎

اسلام کے فدائی احمد کے خاص پیارے
اب رہ گئے ہیں ایسے جیسے سحر کے تارے

ہر احمدی کو چاہیئے۔ کہ اپنی روز و شب کی دعاؤں میں رفقا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی صحت و تندرستی اور عمر میں برکت کی دُعا کو بھی شامل رکھے۔ تا موجودہ نسلوں کو زیادہ سے زیادہ لمبے عرصے تک روحانی برکات حاصل کرنے کے مواقع میسر آئیں۔ آمین!

خاکسار ہیچمیرز کو حضرت بزرگوار میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کی مصاحبت اور مجالست میں آٹھ سال تک رہنے کا موقع ملا۔ اس لمبے عرصے میں خاکسار نے حضرت میر صاحب کے اوصافِ حمیدہ واخلاقِ ستودہ کے جو جو کرشمے دیکھے ہیں میری خواہش ہے کہ جماعت کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کی بہبودی اور افادہ کے لئے ان میں سے بعض کا ذکر بالاقساط الفضل میں کر دوں۔ تاکہ جب فرمان نبوی اذکروا موتاکم بالخیر۔ حضرت میر صاحب کا ذکرِ خیر بھی ہو جائے اور افراد جماعت کو آپ کی سیرت کا تتبع کر کے آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب وتحریص بھی پیدا ہو جائے۔ وما توفیقی اِلّا باللہِ العلی العظیم

حضرت میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) ایک باکمال صوفی تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مُشتاق اور مُحبّین میں سے کامل عاشق، آپ کا دل عشقِ الٰہی کا ایک آتشدان تھا۔ اور آپ

کی روح ہر وقت آستانۂ خداوندی پہ آبِ زلال کی طرح بہتی رہتی تھی۔ کسی وجود کے عاشقِ الٰہی ہونے کا سب سے بڑھ کر ثبوت یہ ہے کہ عاشق اپنے ازلی ابدی محبوبِ حقیقی کی خاطر اپنی جان مال اولاد عزت سب کچھ قربان کر ڈالے اور احکامِ ایزدی کے ماتحت اپنے تن من دھن کو تج دے۔ اور دنیا کے کسی مرحلہ میں اُسے لغزش نہ آئے اور دنیا کی کسی مصیبت کے وقت اس کا قدم صراطِ مستقیم سے نہ ڈگمگا جائے۔ اور حالت عسر لیسر میں ثابت قدم اور قوی الایمان رہے۔

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی طفیل حضرت میر صاحب قبلہ نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے عشق الٰہی کے یہ تمام مراحل طے فرما لئے تھے اور وہ عشاق الٰہی کی صف اوّل میں شامل و داخل ہو گئے تھے۔ اپنے سنِ شعور سے لے کر وفات تک انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی قسم کی جانی، مالی بدنی، لسانی حالی و قالی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور خدا کے پاک دین اور سلسلہ حقہ کی دامے درمے قدمے سخنے مرتے دم تک خدمات بجالاتے رہے۔ اور ان خدمات کے سلسلہ میں ایسے ثابت قدم رہے کہ بطورِ مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ آپ نے سلسلہ کی ہر مالی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اپنی ملازمت کے زمانہ اور اس کے بعد پنشن کے عرصہ میں اپنا مال بے دریغ خدمتِ سلسلہ کی خاطر چندوں کی صورت میں دیا۔ آپ موصی تھے اور اپنی وصیت انتہائی باقاعدگی کے ساتھ ادا فرماتے رہے اور ماہوار پنشن ملتے ہی سب سے پہلے اپنا حصۂ وصیت ادا فرمانے کا تردد کرتے تھے۔ خود معذور ہوتے تو کسی کے ہاتھ وصیت کی رقم فوراً داخلِ خزانہ کرانے کا بندوبست کرتے۔ چنانچہ آپ نے مرض الموت کے زمانہ میں پچھلے ماہ کی وصیت خاکسار کے ذریعہ داخل کرائی۔

آپ نے اپنے وجود باجود سے جس قدر سلسلہ حقہ کو ہر رنگ میں فائدہ پہنچایا۔ اس سے جماعت احمدیہ کا ہر فرد آگاہ ہے آپ نے سلسلہ کی جس قدر قلمی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اور جس قدر اعلیٰ علمی لٹریچر چھوڑا جو صدہا مضامین کی صورت میں زیب جرائد سلسلہ ہے۔

اور بعض مستقل کتابوں کی شکل میں طبع ہو چکا ہے۔ اس سے بھی جماعت کا علمی طبقہ بے خبر نہیں۔ قربانی و ایثار کی یہ روح اور خدمتِ دین کا یہ بے پناہ جذبہ سب ان کے عشقِ الٰہی پر دال ہے۔

الغرض آپ اللہ تعالیٰ کی محبت میں گداز رہتے تھے اور اپنے محبوب ازلی کے خیال میں ہر آن مشغول آپ کا منظوم کلام اس بات کا شاہد عادل ہے کہ آپ مولا کریم کے کس قدر عاشقِ زار اور محبِّ بے قرار تھے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ "بخارِ دل" کے نام سے دو حصوں میں طبع ہو چکا ہے جس میں حصۂ دوم کو آپ نے کئی سو روپیہ کی لاگت سے چھپوا کر شائع کروایا۔ اور سوائے کچھ نسخوں کے جو دوست احباب میں مفت تقسیم کئے گئے باقی کتاب پبلشر کو بطور امداد مفت بخش دیئے۔ اس مجموعہ کلام میں آپ کی اکثر نظمیں عشقِ الٰہی کے عطر سے بھرپور نظر آئیں گی۔ خود کتاب کا نام بخارِ دل بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ کہ اس کے لکھنے والا ایک بیقرار عاشق ہے جو اپنے دِل پر درد کا بخار ان رنگین ترانوں کے ذریعہ نکال رہا ہے چنانچہ۔ آپ نے خود ہر دو کتاب کی تعریف میں مندرجہ ذیل قطعہ نظم فرمایا ہے ۔؎

بخارِ دل رکھا ہے نام اس کا
کہ آتشدانِ دِل کا یہ دھواں ہے
کسی کے عشق نے جب پھونک ڈالی
تو مُنہ سے نکلی یہ آہ و فغاں ہے
لگاتی آگ ہے لوگوں کے دِل میں
ہماری نظم بھی آتش فشاں ہے

اپنی ہر نظم میں آپ نے اپنے مولا کریم سے اپنی محبت والفت کا اظہار کیا ہے۔ بخارِ دل کے ہر دو حصص کے پڑھنے سے آپ کے جذبۂ عشق کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور آپ کی

مولا کریم سے وابستگی و شیدائیت کا پتہ مل سکتا ہے۔ الغرض آپ ایک سچے عاشق الٰہی تھے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی منازل طے کر کے لقائے الٰہی کی عظیم الشان نعمت حاصل کر چکے تھے۔ اور ہماری موجودہ نسل اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے آپ کا وجود بہترین نمونہ اور روشن مشعل ہے۔ جس نمونہ اور روشن مشعل کی روشنی میں ہم اپنے نورِ ایمان میں بہت کچھ اضافہ کر کے خود بھی عشاق الٰہی کی صفت میں شامل و داخل ہو سکتے ہیں۔

محترم چوہدری محمد اکبر علی صاحب

لکھتے ہیں ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے کہ بندہ حافظ آباد میں تھا۔ اور حضرت میر صاحب گوجرانوالہ میں سول سرجن تھے۔ میرا ایک دوست راجہ خان پولیس کانسٹیبل گوجرانوالہ میں لگا ہوا تھا۔ اتفاقاً اُس نے مجھے بُلا بھیجا۔ گوجرانوالہ میں جا کر معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں بیمار پڑا ہے۔ بندہ وہاں گیا تو دیکھا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ بھی احمدی ہیں۔ اور ہمارے سول سرجن بھی احمدی ہیں۔ رخصت درکار ہے۔ اب میں گھبرایا کہ میر صاحب میرے واقف نہیں اور ایک اعلیٰ عہدہ پر ہیں شاید ملاقات بھی نہ ہو۔ بندہ میر صاحب کی کوٹھی پر گیا اور اندر اپنا پتہ بھیجا۔ بہت ہی جلد خود میر صاحب تشریف لائے۔ نام دریافت کر کے فرمانے لگے۔ کیا آپ شام کا کھانا کھائیں گے۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر فرمایا کہ آپ نے ہی حضرت مسیح موعود کی صداقت میں ایک رسالہ بدر کامل چودھویں کا چاند تحریر فرمایا ہے۔ میرے خیال میں اُس وقت وہ مطالعہ کر کے ہی نکلے تھے۔ میری ہاں پر آپ مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ اور اس قدر خوش ہوئے کہ گویا کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ اور اسی وقت ہسپتال میں تشریف لے گئے اور بیمار سپاہی کو دس یوم کی رخصت منظور کرادی۔ آپ حقیقی رنگ میں احمدیت کے سچے عاشق تھے۔

(الفضل ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء)

محترم جناب اخوند فیاض احمد صاحب

ابھی میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھا۔ اباجی ایک سال کی لمبی رخصت لے کر بمع اہل وعیال قادیان جاکر رہے۔ تو ایک مرتبہ فخرالدین ملتانی کی دکان پر اباجی نے مجھے حضرت ماموں جان کی خدمت میں پیش کیا آپ کے الفاظ کا مفہوم مجھے ابھی تک یاد ہے جو آپ نے اس وقت کہے تھے کہ "میں اس کو باپ کی نگاہ سے دیکھوں یا ڈاکٹر کی نگاہ سے۔" چونکہ اباجی میری کمزوری صحت کی وجہ سے حضرت ماموں جان کا مشورہ میری صحت کے متعلق چاہتے تھے اس لئے اباجی نے جواب دیا "باپ اور ڈاکٹر دونوں کی نگاہ سے۔" اور مجھے یاد ہے کہ حضرت ماموں جان نے اپنا ایک کان میرے دل کی جگہ پر لگا کر میرا معائنہ کیا تھا۔

پھر جب میں دسویں جماعت میں قادیان میں پڑھتا تھا۔ اور اباجی ۱۹۳۹ء میں پنشن لے کر قادیان آگئے۔ اور کچھ عرصہ ہمارے ناناجان خان بہادر غلام محمد صاحب گلگتی کے پہلے مکان میں بمع اہل وعیال مقیم رہے اور پھر ہم سب محلہ دارالفضل میں اپنا مکان بن جانے پر وہاں آگئے۔ تو حضرت ماموں جان سے ملاقات کے موقعے ملتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب میں نے میٹرک پاس کیا اور نہ صرف تعلیم الاسلام ہائی اسکول کے طلبہ بلکہ قادیان سنٹر بھر میں اول آیا۔ تو کالج میں داخلے اور مضامین کے انتخاب کے لئے اباجی نے حضرت امام الثانی اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحب اور حضرت ماموں جان سے مشورے کئے۔

مجھے یاد ہے جب فزکس اور ریاضی کے انتخاب کے متعلق حضرت ماموں جان سے عرض کیا گیا کہ حضرت امام الثانی نے اس انتخاب کو پسند فرمایا ہے تو آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ "جو حضرت صاحب نے فرمایا ہے اسی میں برکت ہے۔"

غالباً ۱۹۴۲ء ہی کا واقعہ ہے کہ میں ملتان سے (کیونکہ ملتان کالج میں داخلہ لیا ہوا تھا) جلسہ سالانہ کے موقع پر خدام الاحمدیہ کے سالانہ تقریری مقابلہ میں شامل ہوا۔ مقابلہ بیت اقصیٰ میں تھا اور مقابلہ میں کافی خدام شریک تھے جو علمی قابلیت کے لحاظ سے یقیناً مجھ سے بڑھ کر تھے۔ میری باری آئی۔ میں نے ایک مضمون لکھ کر زبانی یاد کر لیا تھا۔ اور وقت کے مطابق تقریر کے انداز میں وہ مضمون سٹیج پر جاکر دہرا دیا۔ ابھی میرے بعد بہت سے خدام کی تقریریں ہونی تھیں کہ میں کسی ضرورت سے بیت کے اندرونی حصہ سے اُٹھ کر باہر جانے لگا تو برآمدے میں آتے ہوئے ایک صاحب کے قریب سے گذرا جو محراب کے ستون سے پیٹھ لگائے اور کمبل میں لپٹے لپٹائے ایسے بیٹھے تھے کہ ان کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ جوں ہی میں قریب سے گذرا تو مجھے کمبل میں سے حضرت ماموں جان کی آشنا آواز آئی "خوب تھی تمہاری تقریر خوب تھی۔"

اور اس مقابلہ میں اول آنا میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

۱۹۴۲ء میں مَیں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اگرچہ اپنے کالج کی آرٹ کلاس میں سے اوّل آیا۔ لیکن نمبر بہت اچھے نہیں تھے۔ نتیجہ نکلنے کے بعد ایک دن قادیان میں بازار سے گذر رہا تھا کہ ذرا فاصلے سے آواز آئی۔ "(سلام) مجھے معلوم ہے تم پاس ہو گئے ہو لیکن میں تمہیں مبارک نہیں دوں گا۔" میں نے مُڑ کر دیکھا تو حضرت ماموں جان مجھ ناچیز سے مخاطب تھے۔ جب میں قریب گیا تو یہی الفاظ دہرا کر فرمایا "کیا تم سمجھتے تھے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔" میں تمہارے اباجی سے تمہارے پاس ہونے اور نمبروں کے متعلق پوچھ چکا ہوں۔ میں تو جو بھی اچھا لڑکا قادیان سے نکلتا ہے اس کا خیال رکھتا ہوں اور اُس کے والد سے اس کے متعلق پوچھتا رہتا ہوں۔"

میرے اللہ! آپ اس انسان کی اولاد اور نسل پر اپنی بے پایاں برکتوں کا نزول فرمائیے جو جماعت کے نوجوانوں کا اتنا درد اپنے دل میں رکھتا تھا۔

محترم جناب مولانا غلام باری سیف صاحب

راقم الحروف نے حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کو اُن کی زندگی میں دیکھا۔ ان کے اکثر مضامین الفضل میں چھپے۔ انہیں پڑھا۔ آپ جماعت کے اوّلین بزرگوں میں سے تھے۔ حضرت میر محمد اسحٰق صاحب کو دیکھا۔ سفروں میں ہمرکاب رہا۔ جلسوں میں آپ کے ساتھ شرکت نصیب ہوئی۔ آپ کے درس سُنے آپ سے حدیث، فقہ اور منطق پڑھی۔

اَب میں چونسٹھویں سال میں قدم رکھ رہا ہوں۔ ہندوستان میں گھوم پھر کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے رفیق مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگردوں سے پڑھا۔ لیکن مَیں نے حضرت میر صاحب جیسا حدیث کا درس نہ دیکھا۔ نہ سُنا۔ حدیث کے بیان کے وقت وہ سراپا گداز ہوتے۔ آپ کے درس میں ایسا سماں بندھ جاتا۔ گویا سامع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس میں بیٹھا ہے۔ آپ کی شفقت، سلسلہ سے فدائیت طلباء سے محبت، نظم و ضبط، حق گوئی، جماعت کی تربیت، اصُول پرستی، بےنفسی، قناعت، عبادت اور عشقِ رسولؐ یاد آتی ہے تو دل بھر آتا ہے۔

ایسے انسان اس صفحۂ ہستی پر کبھی کبھی نمودار ہوتے ہیں۔

ع
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آج سے قریبًا پینتیس سال پہلے طالب علمی کے زمانہ میں کسی نے سوال کیا کہ حضرت مسیح موعود کے رفقاء میں سے سب سے بڑے صوفی کون تھے۔ یاد نہیں میں نے کیا جواب دیا تھا لیکن یہ خُوب یاد ہے کہ انہوں نے پھر خود ہی فرمایا۔

"حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب"

فضیلت کی بحث بہت مشکل ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت میر صاحب ایک خدا رسیدہ ولی تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد کئی بار "عظیم صوفی" کے لقب سے انہیں یاد کیا گیا۔

مسیح پاک کے درختِ وجود کی سرسبز شاخو! حضرت مسیح موعود سماء احمدیت کے قمر تھے تو رفقاء درخشندہ تارے۔ وہ شمع جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے قادیان میں روشن ہوئی۔ یہ سب اس کے پروانے تھے۔ یہ مسیح پاک کے شیدائی اور فدائی تھے۔ یہ احمدیت کی پیشانی کے جھومر تھے۔ ان میں سے ہر شخص

" ینصرك رجالٌ نوحی الیھم من السماء "

کا مصداق تھا۔ خدائے قدوس کی تقدیر انہیں مسیح پاک کے قدموں میں لائی تھی۔ اور اُس قادر و قدیر خدا کی تقدیر کے ماتحت پھر ایک ایک ستارہ اس آسمان سے غروب ہوا۔ ان میں سے ہر ایک مسیح پاک اور احمدیت کی صداقت کی دلیل تھا۔ ان میں مسیح کی سچائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ جیتے بھی احمدیت کے لئے تھے اور یہ مرے بھی احمدیت کی خاطر۔ ہماری گنہگار آنکھیں اب انھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اور وہ اگلے جہان میں آنکھیں کھول چکے ہیں اور ہمیں کہہ رہے ہیں ۔

" دیکھنا اس آسمان کی رونق اور سج دھج میں فرق نہ آنے دینا۔"

اَے مسیح پاک کے قدوس وکریم خُدا! رنگ والے! ہمیں بھی ان رفقاء مسیح کے رنگ میں رنگ دے کہ تیرے رنگ سے کونسا رنگ بہتر ہے ؟

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنَ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْن

(دوہرائی ص۷۶ ، ۷۷)

محترم جناب ملک محمد عبداللہ صاحب

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب حضرت اماں جان کے بھائی تھے۔ اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تقریر اور تحریر میں بھی خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں بھی بطور ڈاکٹر تعیناتی ہوئی لوگ دُور دُور سے بغرض علاج آپ کے پاس پہنچتے۔ جلسہ سالانہ کے ایام میں قادیان تشریف لاتے تو ان دنوں عشاء کی عبادت کے بعد بیت اقصیٰ میں ذکر حبیب پر تقریر ہوتی جس میں لوگوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی۔ آپ کی تقریر نہایت پُرکشش اور مؤثر ہوتی۔ میری آپ سے واقفیت کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ آپ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ماموں تھے اور خاکسار حضرت میاں صاحب کا خادم خاص تھا۔ جو آپ کے دفتر میں تالیف و تصنیف کے کام کے علاوہ آپ کے گھر کے انتظامی امور میں بھی شریک کار ہوتا تھا۔ دوسری وجہ میری ایک تالیف تھی۔

حضرت امام جماعت احمدیہ الثانی نے اپنی ایک تقریر میں اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ ایک ایسی کتاب تحریر کی جائے جو تمدن (دین حقہ) کے متعلق ہو۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے بحیثیت ناظر تالیف تصنیف یہ کام خاکسار کے سپرد فرمایا اور اس کے متعلق خاص ہدایات بھی دیں۔ سو آپ کے ارشاد کے ماتحت میں نے یہ کتاب تالیف کی۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے اس کتاب کو زیادہ جامع بنانے کے لئے اس کا مسودہ حضرت میر محمد اسحاق صاحب، حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب (اللہ تعالیٰ سب کے درجات بلند فرمائے) کو بھی دکھلایا۔

اس کا ذکر حضرت میاں صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں بھی فرمایا ہے۔ حضرت میر صاحب کو میری یہ تالیف بہت پسند آئی اور اس کے بعض عنوانات سے متعلق ہدایات بھی دیں۔ حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب جب قادیان تشریف لاتے تو آپ کا ایک

محدود دائرہ احباب تھا جن کی آپ کی کوٹھی سے ملحقہ باغیچہ میں عصر کے بعد مجلس لگتی۔ ان احباب میں چند ایک کے نام یہ ہیں :۔ محترم سید سردار حسین شاہ صاحب اوورسیر، محترم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی، محترم عبداللطیف صاحب گجراتی جو سلسلہ احمدیہ کی کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام کرتے تھے۔ اور یہ خاکسار (ملک محمد عبداللہ) محترم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی حضرت میر صاحب کے مکان کے ایک بیرونی کمرہ میں رہتے تھے۔ ان کا کام بھی تالیف وتصنیف کا تھا۔ بچوں کے متعدد رسالہ جات تالیف کئے

(مکرم ملک محمد عبداللہ صاحب کی کتاب "میری یادیں" سے ماخوذ ہے)

محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب مفتی سلسلہ

مقدس خاندان

حضرت میر صاحب ایک کامل ولی تھے تقوٰی و طہارت میں ممتاز، علم و حکمت میں بے مثال اور قابلیت میں حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک۔ آپ کی خاندانی وجاہت تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ حضرت علیؓ آپ کے جدِ امجد ہیں۔ سید بہاؤ الدین نقشبند جو نقشبندی سلسلہ کے بانی ہیں۔ اس خاندان کے ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ اس سلسلہ نے دین حق کی جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلہ کے مشہور رہنما ہیں۔ جنہوں نے اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں خلاف اسلام فتنوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور اسلام کی اشاعت میں بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کی اولاد میں خواجہ محمد ناصر دہلوی اور ان کے بیٹے اُردو کے باکمال شاعر حضرت خواجہ میر درد صاحب دہلوی اپنے زمانہ کے پاک باز بزرگ اور مشہور صحافی تھے۔ خواجہ محمد ناصر کو ایک بار کشف میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ایک خاص نعمت تھی جو

خانوادۂ نبوت نے تیرے واسطے محفوظ رکھی تھی۔ اس کی ابتداء تجھ سے ہوئی اور انجام
اس کا مہدی موعود پر ہوگا۔ یہ خواجہ محمد ناصر اور ان کے بیٹے خواجہ میر درد رحمۃ اللہ
علیہما ننھیال کی طرف حضرت میر محمد اسماعیل کے نانا لگتے ہیں اور آپ کے ددھیال میں
حضرت شیخ علاؤالدین عطار نقشبندی جیسے بزرگ شامل ہیں۔ غرض آپ کا گھرانہ قدیم سے
دینی وجاہتوں کا مرکز اور دنیاوی عظمتوں کا مہبط چلا آتا ہے۔ علاوہ ازیں امام الزمان
حضرت مسیح موعود سے آپ کا تعلق رشتہ داری آپ کے لئے اور زیادہ لازوال برکتوں
کا باعث ہوا۔

حضرت میر صاحب حضرت اماں جان کے حقیقی بھائی تھے اور اس تعلق سے
حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے برادر نسبتی تھے۔ آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت
بھی حضرت مسیح موعود کی خاص نگرانی میں ہوئی۔ بعد میں آپ کو احمدیت کی روایات کو محفوظ
کرنے اور سلسلہ کی بے نظیر خدمات سرانجام دینے کی توفیق ملی۔

حضرت محمد اسمٰعیل صاحب ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت اماں جان سے
تقریباً ۱۶ سال چھوٹے تھے۔ آپ نہایت ہی قابل اور ماہر ڈاکٹر تھے۔ اس کے ساتھ ہی خدمت
خلق کا خاص ذوق آپ کو عطا ہوا تھا۔ ان دونوں خوبیوں کی وجہ سے آپ محبوب عوام تھے۔
دین کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر آپ کو عطا ہوا تھا۔ قرآن کریم کے معارف اور
حقائق پر آپ کی وسیع نظر تھی۔ الفضل کی فائلوں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے اچھی
طرح واقف ہیں کہ آپ نے کیسے عجیب وغریب انداز میں روحانی مسائل اور دینی ہدایات
کو لوگوں کے ذہن نشین کرایا۔ "ذکر و فکر" اور دوسرے علمی عنوانوں کے ماتحت آپ بہت
دلچسپ مضامین لکھتے رہتے تھے۔ خاکسار آپ کے سامنے چند ایسی روایات بیان کرنا چاہتا
ہے جن سے آپ کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر خاص روشنی پڑتی ہے

حضرت میر صاحب کی روایات

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۹۵ء میں مجھے رمضان قادیان میں گزارنے کا اتفاق ہوا اور میں نے تمام مہینہ حضرت صاحب کے پیچھے نماز تہجد یعنی تراویح ادا کی۔ آپ کی یہ عادت تھی کہ وتر اول شب میں پڑھ لیتے تھے اور نماز تہجد آٹھ آٹھ رکعت کر کے آخر شب میں ادا فرماتے تھے جس میں آپ ہمیشہ پہلی رکعت میں آیت الکرسی تلاوت فرماتے تھے اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص کی قرأت فرماتے تھے اور رکوع و سجود میں یاحي یاقیوم برحمتك استغیث اکثر پڑھتے تھے اور ایسی آواز سے پڑھتے تھے کہ آپ کی آواز میں سُن سکتا تھا۔ نیز آپ ہمیشہ سحری نماز تہجد کے بعد کھاتے تھے۔ اور اس میں اتنی تاخیر فرماتے تھے کہ بعض دفعہ کھاتے کھاتے نداء ہو جاتی تھی۔ اور آپ بعض اوقات نداء ختم ہونے تک کھانا کھاتے رہتے تھے۔

(سیرۃ المہدی صفحہ ۱۳)

یہ پندرہ سال کے ایک نوجوان کا شوق و ذوق تھا جو بعد میں حضرت ڈاکٹر محمد اسمٰعیل کے نام سے مشہور ہوا۔

* حضرت میر صاحب فرماتے ہیں :۔

جب میں انٹرنس کا امتحان دے کر ۱۸۹۷ء میں قادیان آیا تو نتیجہ نکلنے سے پہلے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اکثر مجھ کہتے تھے کہ کوئی خواب دیکھا ہے۔ آخر ایک دن میں نے بیان کیا کہ میں نے خواب میں گلاب کے پھول دیکھے ہیں۔ فرمانے لگے اس کی تعبیر تو غم ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ میں اس سال امتحان میں فیل ہو گیا۔

(سیرت المہدی صفحہ ۶۲)

* حضرت مسیح موعود کو پرندوں کا گوشت پسند تھا اور بعض دفعہ بیماری وغیرہ کے

کے دنوں میں بھائی عبدالرحیم کو حکم ہوتا تھا کہ کوئی پرندہ شکار کر لائیں اسی طرح جب تازہ شہد معہ چھتا کے آتا تو آپ اسے پسند فرما کر نوش کرتے تھے۔

(سیرۃ المہدی صفحہ ۹۶)

* ایک دفعہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے زمانہ میں ایک بچہ نے گھر میں ایک چھپکلی ماری اور پھر اسے مذاقاً مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کی چھوٹی اہلیہ پر پھینک دیا جس پر مارے ڈر کے ان کی چیخیں نکل گئیں اور چونکہ بیت الذکر کا قرب تھا ان کی آواز بیت الذکر میں بھی سنائی دی۔ مولوی عبدالکریم صاحب جب گھر آئے تو انہوں نے غیرت کے جوش میں اپنی بیوی کو بہت کچھ سخت سست کہا حتیٰ کہ ان کی یہ غصہ کی آواز حضرت مسیح موعود نے اپنے مکان میں بھی سُن لی۔ چنانچہ اس واقعہ کے متعلق اسی شب حضرت صاحب کو یہ الہام ہوا۔

"یہ طریق اچھا نہیں اس سے روک دیا جائے (احمدیوں) کے لیڈر عبدالکریم کو۔"

لطیفہ یہ ہوا کہ صبح مولوی صاحب مرحوم تو اپنی اس بات پر شرمندہ تھے اور لوگ انہیں مبارک بادیں دے رہے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام (احمدیوں) کا لیڈر رکھا ہے۔

آپ کی مہمان نوازی

حضرت میر صاحب بڑے ہمدرد اور بہت مہمان نواز تھے۔ حضرت خان صاحب منشی برکت علی صاحب مرحوم جو حضرت مسیح موعود کے رفیق اور سلسلہ کے مخلص کارکن تھے اور عرصہ تک جائنٹ ناظر مال رہے بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ان کی بیوی کو موتیا بند ہو گیا۔ ان دنوں امرتسر میں آنکھوں کے آپریشن کا ماہر ایک انگریز ڈاکٹر لگا ہوا تھا۔ اور

حضرت میر صاحب بھی اسی ہسپتال میں تھے چنانچہ آپ نے خاص توجہ سے آپریشن کروایا اور اس کے بعد اپنے گھر لے گئے جو ہسپتال کے احاطہ میں ہی تھا۔ اور جتنے دن وہاں قیام رہا ان کا اور ان کی اہلیہ کا کھانا آپ کے ہاں ہی پکتا۔ حضرت خان صاحب ہی کا بیان ہے کہ امرتسر میں کثرت کے ساتھ آپ کے مہمان آتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپ کی ساری تنخواہ مہمان نوازی پر صرف ہو جاتی۔ مگر آپ کی بشاشت میں ذرہ فرق نہ آتا۔

جذبہ خیر خواہی

شیخ فضل احمد صاحب جو عرصہ تک افسر امانت رہے ان کا بیان ہے کہ ایک بار انہیں مالی تنگی سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے قادیان میں ایک مکان پانچ ہزار روپیہ خرچ کر کے بنوایا تھا۔ مشکل اتنی زیادہ تھی کہ وہ اس مکان کو دو تین ہزار میں بھی بیچنے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت میر صاحب سے انہوں نے مشورۃً اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا جب تک میں نہ کہوں مکان نہ بیچنا۔ مشکل تو بہت تھی لیکن میں نے آپ کے مشورہ پر عمل کیا۔ چنانچہ کچھ مدت بعد وہ مکان ساڑھے چھ ہزار میں بکا۔ جذبہ خیر خواہی کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

اب لڑکا ہوگا

مولوی محمد یعقوب صاحب انچارج شعبہ زود نویسی نے بیان کیا کہ حضرت میر صاحب نے اپنے ذوق کے مطابق الفضل میں ایک مضمون لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر کسی کے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہوں اور وہ اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھے تو اس کے بعد جو بچہ پیدا ہوگا وہ لڑکا ہوگا۔ اس کی ستر فیصدی امید ہے اور تیس فیصدی یہ امکان ہے کہ اس کے معاً بعد تو لڑکی پیدا ہو۔ لیکن پھر اس کے بعد دوسرے نمبر پہ لڑکا ہوگا چنانچہ

میرے ہاں لڑکیاں تھیں۔ آخری لڑکی جب پیدا ہوئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس کا نام بشریٰ رکھا۔ میں گھر واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں حضرت میر صاحب مل گئے میں نے از راہ مذاق کہا میں نے تو نہیں رکھنا تھا لیکن حضرت صاحب نے لڑکی کا نام بشریٰ رکھا ہے۔ دیکھیں آپ کا قاعدہ کہاں تک پورا ہوتا ہے۔ آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا تو اب اس کے بعد لڑکا لو۔ چنانچہ خدا کی قدرت اس کے بعد لڑکا ہوا۔ کوئی سال بھر بعد میر صاحب ملے تو میں نے ذکر کیا کہ آپ کی بات پوری ہوئی اللہ تعالیٰ نے لڑکا دیا ہے۔ آپ نے پھر ہنستے ہوئے فرمایا آپ بھی عجیب ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا ایک تھال مٹھائی کا ہوگا اور آپ اٹھائے خوشخبری سنانے آئیں گے۔ آپ نے اطلاع ہی سال بھر بعد دی۔

محبت الٰہی

آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عاشق صادق تھے۔ آپ کی قلم سے حضرت احدیت تعالیٰ شانہٗ کی تعریف اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں جو مضامین نکلے ہیں اور جو نظمیں آپ نے لکھی ہیں ان کے حرف حرف سے بوئے عشق مہکتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے ایک خاص ترتیب کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے۔

"مجھے کیسا خدا چاہیئے"

اس کا آغاز یوں کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات برکات سراپا حسن و احسانات ہے جس کے سوا کوئی ہمارا محبوب اور کوئی ہمارا معبود نہیں۔

وہ ساری کائنات کا رب ہمارا پیدا کرنے والا۔ پالنے والا اور درجہ بدرجہ ترقی دینے والا ہے اور وہ ساری مخلوقات پر بے انتہا رحم کرنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے۔"

آپ نے ایک تمثیلہ لکھا۔ اس میں آپ نے ایک عیسائی۔ ایک آریہ اور ایک مولوی کی زبان سے اللہ تعالیٰ کا وہ تصور پیش کیا جو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ایک احمدی مبشر کا جو تصور خدا ہے اسے بیان کرتے ہیں۔ ایک مجلس قائم ہے اور سوال یہ درپیش ہے کہ خدا کیسا ہے؟

جب سب لوگ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق اپنا تصور بیان کر چکتے ہیں تو ایک احمدی مبشر کی زبان سے ہستی باری تعالیٰ کا تصور بیان ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

اس کے بعد ایک سبز عمامہ پوش نوجوان اُٹھا اور اس نے کہا میں تو اس کا قائل ہوں جو بے شک صاحب عظمت وجلال ہے۔ بے شک لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے۔ بے شک ازلی و ابدی ہے۔ بے شک وراء الوراء ہے۔ بے شک ہمہ علم ہمہ قدرت ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ ہمہ تن شفقت۔ ہمہ تن عشق و فا۔ ہمہ تن غریب نوازی اور ہمہ تن بندہ پروری ہے۔ ہمہ تن قدردانی بھی ہے۔ میری حالت سے پورا باخبر ہے۔ میری دُعاؤں کو سُنتا ہے اور قبول کرتا ہے اور میری تربیت کرتا ہے۔ تکالیف کے وقت میری تسلی کرتا ہے۔ بیماری میں میرا علاج کرتا ہے۔

غرض ایسے ہی وہ دل نشین انداز میں ہستی باری تعالیٰ کا تعارف کراتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے مضامین سدا بہار گلستان علم وعرفان ہیں۔ آپ جب بھی پڑھیں گے خواہ بار بار ہی کیوں نہ پڑھیں ایک تازہ ہی لطف اس سے میسر ہوگا اور روحانیت ایک نئی بیداری حاصل کرے گی۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عجیب عاشقانہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ آپ کی مشہور نظم علیك الصلوٰۃ علیك السلام کا انداز کیا ہی محبت خیز ہے۔ ایک اور نعت کے چند اشعار سُنیے۔

محمدؐ مصطفیٰ ہے مجتبیٰ ہے
محمدؐ مہ لقا ہے دِلربا ہے
محمدؐ جامع حُسن و شمائل
محمدؐ محسن ارض و سما ہے
کمالات نبوت کا خزانہ
اگر پوچھو تو ختم الانبیاء ہے
غرض سچ مچ محمدؐ ہے محمدؐ
جبھی تو چار سُو صَلِّ علیٰ ہے

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے عقیدت

آپ کا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے عجیب انداز عشق تھا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ایک بار فرمایا:

"اُن کے دل میں حضرت مسیح موعود کی محبت بلکہ عشق خاص طور پر پایا جاتا ہے اسی محبت کی وجہ سے روحانیت کا ایک خاص رنگ ان میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں ایسی ٹھوکروں سے وہ جو دوسروں کو

لگ سکتی ہیں خدا نے ان کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ اس تعلق کی وجہ سے جو برکات ان پر نازل ہوتی ہیں ان کے اور جماعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔"

(الفضل ۲۱ر جون ۱۹۵۹ء)

احمدیت کا ایک درخشندہ تارا

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے رفقاء روز بروز اس دُنیا سے کوچ کرتے جا رہے ہیں۔ انہی میں سے ایک نہایت محترم انسان حضرت ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب بھی تھے جو افسوس کہ ۱۸ر جولائی کی شام کو ہم سے جدا ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آج ہمیں انہیں مرحوم لکھتے ہوئے بہت ہی رنج اور قلق ہوتا ہے۔ لیکن موت ہر شخص کو آتی ہے اور اس راستے سے ہر انسان کو گذرنا ہے۔ مگر موت موت میں بھی فرق ہے۔ ایک ایسے لوگوں کی موت ہوتی ہے جن کے متعلق اکبر کہتا ہے ؎

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے۔ ڈگری ملی۔ نوکر ہوئے پھر مر گئے

اس کے بالمقابل بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ساری عمر خلقت کی بھلائی۔ خدا کی اطاعت رسول کی تابعداری اور لوگوں سے حُسنِ سلوک۔ احسان اور مروت اور وعظ ونصیحت میں گزرتی ہے۔ وہ جب تک جیتے ہیں ایک دُنیا کو فیض پہنچاتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو ایک عالم ان کو روتا ہے۔

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب اس آخر الذکر گروہ کے ممتاز رکن اور ایسی صفاتِ حسنہ کے مالک تھے کہ جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے وہ ان کو ساری عمر کبھی نہیں بھولیں گے۔ ان کی خوبیاں اور ان کی نیکیاں بار بار یاد آئیں گی اور دل کو تڑپا کر چلی جائیں گی۔ ایسے جامع جمیع صفاتِ حسنہ بزرگ بہت ہی کم اور شاذو نادر ہی دنیا میں آتے ہیں اور جب

آتے ہیں تو یقیناً ملک کا فخر ثابت ہوتے ہیں۔ انسانیت ان پر ناز کرتی ہے اور اخلاق و شائستگی کا سر بلند ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی ایک خوبی بہت عمدہ پائی جاتی ہے۔ کسی میں دو، تین چار خوبیاں دوسروں کی نسبت اچھی ہوتی ہیں۔ کسی میں نیکیاں زیادہ اور عیب کم ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت میر صاحب ایسے عجیب و غریب الشان تھے کہ ان کے وجود میں خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے خوبیاں ہی خوبیاں کوٹ کر بھر دی تھیں۔ میرا تعلق ان سے ایک دو سال نہیں پورے بتیس سال رہا ہے اور میری طبیعت بہت ہی آزاد واقع ہوئی ہے مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حضرت میر صاحب کی نیکیوں اور خوبیوں زہد اتقا۔ پرہیزگاری اور پاکیزگی کی وجہ سے میرے دل میں ان کی وقعت، عزت، عظمت محبت اور الفت روز بروز زیادہ ہی ہوتی گئی۔ اور آج جبکہ وہ دنیا میں نہیں ہیں میں ان کو ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولی کامل سمجھتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے نہایت قرب میں جگہ دے۔

ع این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ان کی موت سے زندگی کا لطف جاتا رہا۔ اور میری باقی زندگی اُن کے بغیر بہت ہی بے لطف اور بے کیف گزرے گی۔ صد ہزار افسوس!

(روزنامہ الفضل قادیان ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء)

مکرم سلیم شاہجہانپوری صاحب

بُخارِ دل حضرت میر محمد اسمٰعیل بحیثیت شاعر

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقصدیت کی اولیت کے متعلق حضرت میر صاحب کا وہ بیان یہاں نقل کر دیا جائے جو آپ نے اپنی شاعری کاوشوں کا تعارف کرواتے ہوئے خود شامل کتاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"شعر کی تعریف اس سے زیادہ نہیں کہ وہ باوزن ہو، اس کے الفاظ عمدہ اور مضمون لطیف ہو۔ میرے بزرگوں کو چونکہ شاعری سے مناسبت تھی اس لئے مجھ میں بھی کچھ حصہ اس ذوق کا فطری طور سے آیا ہے کہ دس دس سال تک ایک شعر نہیں کہتا پھر کچھ کہہ لیتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ میرے اشعار مطلب کے حامل ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے۔ میں ایک مضمون ذہن میں رکھ کر شعر کہتا ہوں اور الفاظ اس مضمون کے پابند ہوتے ہیں نہ مضمون الفاظ کا۔ اس لئے یہ اشعار بجائے تغزل کے نظم کی صورت رکھتے ہیں اور بجائے آمد کے ہمیشہ آورد کا رنگ ان میں ہوتا ہے۔ میرا استاد کوئی نہیں نہ کوئی تخلص ہے۔ شروع میں (یعنی ۱۹۰۳ء میں) جب یہ شوق پیدا ہوا تو چند دفعہ "آشنا" کا تخلص استعمال کیا پھر ترک کر دیا اور ہمیشہ تخلص کے بغیر گزارا کیا۔ میرے کلام میں بیشتر اشعار بسبب مذہبی ماحول اور دینی تربیت کے متصوفانہ رنگ کے ہیں اور سلسلہ احمدیہ کے مقاصد سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں کسی کا عمدہ مصرع یا شعر یا کسی غیر زبان

کا لفظ اپنے شعر میں پیوند کر لینے سے نہیں ہچکچاتا تاہم اس کو سرقہ نہیں
کہا جا سکتا۔ بہت زیادہ حصہ ان نظموں کا ایسا ہے جو دراصل اپنے لئے
لکھی گئی ہیں نہ کہ اوروں کے لئے۔ میری دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان اشعار
کو ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے لئے بھی مفید بنائے۔"

جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے حضرت میر صاحب نے نہ صرف ظاہری اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے بلکہ معنویت کے لحاظ سے بھی آپ نے متعدد اور متنوع موضوعات پر اپنی صوفی منشی کے جوہر دکھائے ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل عنوانات پر نظر ڈالیے تاکہ آپ پر حضرت میر صاحب کی رجحانات شعری کے فہم میں آسانی ہو۔

۱۔ "بخارِ دل" کی طرح "محبت کا ایک آنسو" بھی آپ کی ایک نہایت پاکیزہ نظم ہے۔ جو مولا کا اپنے بندے سے پیار کا تعلق ظاہر کرتی ہے۔

۲۔ دعا بندے کا ایک آزمودہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ طاقتور سے طاقتور دشمن پر غلبہ پا لیتا ہے۔ حضرت میر صاحب نے بھی "دعائے من" "دعائے شکوہ" "عاجزانہ دُعا" "دُعا برائے معرفت" "نماز" وغیرہ نظموں میں قادر و توانا خدا سے مدد طلب کی ہے اور "بندہ" "میرے خدا" (طویل نظم) اور "مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات" کے ذریعہ بندہ کا اپنے مولا سے تعلق قائم ہونے کے لئے استعانت طلب کی ہے۔

۳۔ معرفت الٰہی حاصل ہو جائے تو انسان ضعیف البنیان کو اپنی کمزوری اور ناطاقتی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے اور وہ دُعا کے ذریعہ اپنے قادر خدا سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ترجمہ:۔ (اے میرے حبیب) تم لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے
محبت کرتے ہو تو پھر میری اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ (اس کے نتیجے میں)
تم کو اپنا محبوب بنائے گا۔

۴۔ پیارے خدا کا یہ محبت بھرا ارشاد اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جب لوگوں تک پہنچتا ہے تو ان کے دل اس محسنِ اعظم کے اخلاقِ کریمانہ اور حسنِ مجسم کے اندازِ محبوبانہ پر نثار ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ درود و سلام ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتا ہے۔ میر صاحب بھی شیدایانِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صف میں شامل ہو کر مدحت خیر الانامؐ میں ایک ایسا ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں جو مقبولیت کے لحاظ سے نعتیہ شاعری کے میدان میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور جب تک محامد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دلوں کو گرمانے کا فریضہ انجام پاتا رہے گا (اور یہ سلسلہ تاقیامِ قیامت جاری رہے گا) میر صاحب کے اس "سلام بحضور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلمؐ" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ آپ کی محبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی ایک دوسری نظم "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ "محمد مصطفےٰ ہے مجتبیٰ ہے۔" اور دیگر نعتیہ کلام آپ کے اس گہرے قلبی لگاؤ کا آئینہ دار ہے جو آپ کو محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے تھا

۵۔ خلقِ مجسم، محسنِ عالم حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا تھا کہ حضورؐ کے جلیل القدر فرزندِ روحانی حضرت بانیٔ سلسلہ سے بھی والہانہ عقیدت اور خادمانہ ارادت کا اظہار کیا جائے اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کے بعد اس کے جلیل القدر خادم کی صفات کے بیان سے بھی دلوں میں گداز پیدا کیا جائے۔ حضرت میر صاحب نے اس فریضہ کی ادائیگی کو بھی ضروری خیال کرتے ہوئے اپنی متعدد نظموں میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو اپنی عقیدتمندی کا خراج پیش کیا ہے۔

۶۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اپنے محبوب کے مسکن بلکہ اس شہر کی گلیوں تک سے محبت و عقیدت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت میر صاحب کا محبت پرور اور عقیدت مند

دل بھی بھلا اس جذبہ سے کس طرح خالی رہ سکتا ہے۔ آپ نے اپنے مرشد حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے مسکن قادیان سے اپنی محبت کا اظہار متعدد منظومات میں کیا ہے۔ قادیان سے جدائی کا نقشہ اور فراق کی اذیتوں کا حال " درفراقِ قادیان " والی نظم میں بڑے ہی دردانگیز طریقے سے کیا ہے۔ اسی قبیل کی ایک دوسری نظم " قادیان دارالامان " ہے۔ " قصہ ہجر ایک مہجور کی زبان سے۔ "، " ہم قادیان سے بول رہے ہیں "، " ہم ڈلہوزی سے بول رہے ہیں "، تینوں نظموں میں قادیان سے دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

۷۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے تکمیل اشاعت دین، احیاءِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جس جماعت کو قائم فرمایا اس کے افراد مالی، جانی، حالی و قالی، تعلیمی و تربیتی جملہ اقسام کی قربانیاں دے رہے ہیں اور ہمہ جہتی تدابیر و جہدِ مسلسل سے خدمات بجالا رہے ہیں۔ ایسی خادمِ انسانیت جماعت کے کارکنوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور دنیا کو ان مہمات سے آگاہ کرنا جو اس جماعت کے اولوالعزم اور باحوصلہ افراد شب و روز کر رہے ہیں۔ خدمتِ دین ہی کا ایک حصّہ ہے۔ " ندائے احمدیت "، " احمدی کی تعریف " " میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا "، " احمدیت "، " خدامِ احمدیت " وغیرہ نظموں میں اسی فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے اور اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے انفرادی رنگ میں بھی بعض خاص ہستیوں کے پاکیزہ خصائل کو متعارف کروانے کی کوشش بھی کی ہے۔ " حضرت مولوی برہان الدین جہلمی " کے عنوان سے آپ نے جو نظم لکھی ہے وہ اسی جذبہ کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور نظم حضرت مولوی نعمت اللہ خان کی شہادت پر آپ نے رقم فرمائی جس کا عنوان تھا " نعمت اللہ نے دکھلادیا قرباں ہو کر۔ "

۸۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے لختِ جگر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعودؓ کے خلاف جب اہلِ پیغام نے ایک مخالفانہ اور معاندانہ محاذ قائم کیا اور " پیغامِ صلح " کے پردے میں شب و روز محمود دشمنی اور شقاوتِ قلبی کے اظہار کو اپنا پیشہ بنا لیا تو حضرت

میر صاحب کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور آپ نے ان زہر آلود تیروں کا جواب " منکران ....محمود "، " پیغامی لیڈروں سے خطاب "، " ان کا رنگ " جیسی نظموں کے ذریعہ دینا ضروری سمجھا لیکن جن دوستوں کو میر صاحب کی ان نظموں کو پڑھنے کا اتفاق ہو وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ باوجود مظلوم ہونے اور انتہائی دل آزاری کے نشانہ بننے کے آپ نے اپنے کلام میں کوئی قابلِ اعتراض یا دل آزار بات نہیں کی۔ اور اپنی پاکیزہ نظموں کو ابتذال، تمسخر، یا استہزاء سے ہرگز آلودہ نہیں ہونے دیا جو آپ کی عالی ظرفی اور بلند اخلاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۹۔ حضرت میر صاحب نے سلسلہ کے واقعات کو منظوم فرما کر ایک تاریخی خدمت بھی انجام دی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں حضرت مصلح موعود نے جب " بیت الفضل " لندن کا سنگِ بنیاد رکھا تو میر صاحب نے اس موقعہ پر ایک نظم " مرکزِ کفر میں خانۂ خدا " کے عنوان سے تحریر فرمائی جس کے ذریعہ تمام افرادِ جماعت کے جذبات کی ترجمانی کا فرض انجام دیا۔

۱۰۔ قطعات و رباعیات کے علاوہ تربیتی رنگ میں آپ نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً " مجھ کو کیا بیعت سے حاصل ہوگیا "، " نہ ادھر کے نہ رہے نہ ادھر کے رہے " (وقف میں نااہلی کا نتیجہ)، " خدا داری چہ غم داری " (اہلِ خانہ کو وصیت)، " نوالۂ تلخ " (مربیان کو نصیحت)، " قابلِ توجہ خدام " وغیرہ

۱۱۔ عقائد کے سلسلہ میں آپ نے بعض ما بہ النزاع اور مختلف فیہ مسائل کے بارے میں بڑے لطیف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ایسی نظموں میں " ناسخ و منسوخ " " قرآن، سنت اور احادیث کے مدارج "، " علم ترب یعنی علم توجہ یا مسمریزم "، " کچھ دُعا کے متعلق " (اس نظم میں آپ نے دُعا کے فلسفہ کو اس طرح عام فہم انداز میں بیان کیا ہے کہ قبولیت دُعا کے متعلق تمام شکوک کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے نظم

لکھنے سے بیشتر جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں۔

" دعائیں چھ طرح قبول ہوتی ہیں اور اس طرح کی کوئی دُعا بھی رد نہیں ہوتی۔
۱۔ یا تو وہ لفظاً ہی قبول ہو جاتی ہے۔ ۲۔ یا اس کی جگہ آخرت کا بدلہ اور نعمت مِل جاتی ہے۔ ۳۔ یا اتنی ہی مقدار میں کوئی بُری تقدیر دُور ہو جاتی ہے۔ ۴۔ یا بطورِ عبادت محسوب ہو جاتی ہے۔ ۵۔ یا دُنیا میں ہی ایک کی جگہ دوسری بہتر چیز مل جاتی ہے۔
۶۔ یا اگر وہ دُعا بندہ کے لئے مُضر ہو تو منسوخ کر دی جاتی ہے (اور یہ نامنظوری بھی اجابت اور رحمت کا رنگ رکھتی ہے۔ یعنی بندہ ضرر اور تکلیف سے بچ جاتا ہے۔")

۱۲۔ ترکِ دُنیا کے بارے میں آپ نے متعدد ناصحانہ نظمیں لکھی ہیں اور ہر نظم میں ایک نئے انداز سے ترکِ لذات کی طرف توجہ دلائی اور رغبت دلانے کی سعیٔ مشکور کی ہے۔ مندرجہ ذیل منظومات اسی قبیل سے ہیں۔ "نصیحت از الوصیۃ"، "بشارات از الوصیت" "ترکِ دُنیا کے معنی ترکِ فضول ہیں" "دُنیا کا انجام" "دُنیا ہے جائے فانی دل سے اسے اُتار دو۔"

واقعاتی نظموں میں آپ کی ایک مزاحیہ نظم بھی شامل ہے جو راشن بندی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے۔ "قادیان میں ۱۹۴۳ء میں رمضان میں ایک تولہ کا راشن" اس نظم کے مطالعہ سے زمانہ جنگ کی تکالیف و مشکلات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حضرت میر صاحب کے قلم حقیقت رقم نے اس واقعہ کو بھی تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ یہ نظم آپ کی ہمہ گیر طبیعت کے چہرے سے نقاب کشائی کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ "قادیان کے آریہ" بھی اسی قبیل کی نظم ہے۔

حضرت میر صاحب نے طنز و مزاح کے خار زار میں بھی سمند فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ شرافت و متانت کے دامن سے کسی خار کو اُلجھنے کی اجازت نہیں دی۔ آپ نے اپنا مافی الضمیر بھی ادا کر دیا۔ لیکن ایسی کہنہ مشقی اور احتیاط کے ساتھ

کہ نہ کسی تسبیح کے بکھرنے کی نوبت آئی اور نہ کسی زنّار کے ٹوٹنے کی صدا سنائی دی۔ یہ بات آپ کے کمالِ فن کا زندہ ثبوت ہے۔

"اس لئے تصویر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں" یہ ایک ایسی مدلل نظم ہے جو آپ کی قادر الکلامی اور حقیقت نگاری کو ایک نئے روپ میں نگاہوں کے سامنے لاکر قارئین کو محو حیرت کر دیتی ہے۔

منظومات کے علاوہ حضرت میر صاحب نے نہایت پاکیزہ جذبات کی حامل عارفانہ غزلیات بھی لکھی ہیں جو محبتِ الٰہی اور عشقِ حقیقی میں ڈوب کر تحریر کی گئی ہیں۔ اور یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اپنے تسلسل اور مقصدیت کے لحاظ سے یہ غزل نما نظم کہلانے کی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ان کا مرکزی نقطۂ خیال عشقِ حقیقی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی مسلسل غزلیات کے ضمن میں "تو کیا آئے۔" "ہو نہیں سکتا" "عشق و مشک" "کہ جتنے رنگ مخفی ہیں محبت سب کی صیقل ہے" "محبت" "دن مدتوں میں آئے ہیں پھر اہل حال ہے۔" "جو رہ تجھے پسند ہے اس پر چلا مجھے" "آئے گی مرے بعد تمہیں میری وفا یاد" "چشم بینا حُسنِ فانی کی تماشائی نہیں۔" وغیرہ وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

لیکن واعظانہ پند و نصائح یا ناصحانہ تلقینِ عمل کے لئے قطعات و رباعیات کی اصناف زیادہ موزونیت رکھتی ہیں اور شاعر کو اپنا ما فی الضمیر ادا کرنے میں تنگی محسوس نہیں ہوتی۔ میر انیس، مرزا دبیر، اکبر الٰہ آبادی، امجد حیدر آبادی، حکیم اختر انصاری اکبر آبادی، جوش ملیسانی اور جوش ملیح آبادی اور دورِ موجودہ میں راغب مراد آبادی اور رئیس امروہوی نے ان اصناف میں اپنی جودت طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ہمارے میر صاحب بھی اس میدان میں اُترے ہیں اور آپ کے اشہبِ قلم کی جولانیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ اس میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ آپ نے اپنے قطعات میں بعض فارسی مصرعے جو ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے تھے استعمال کئے ہیں اور ان کو ایسے سلیقے

یں کام لائے ہیں کہ ہر مصرعہ اس قطعہ کا جزو لاینفک بن گیا ہے جس میں وہ استعمال کیا گیا۔ اسی طرح آپ نے عربی فقرات اور ہندی محاورات استعمال کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا بلکہ بڑی چابکدستی سے ان فقرات یا محاورات کو اپنے حسبِ منشاء استعمال کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

اعمال صالحہ

کبھی تو چاہیئے اے دوست آخرت کا خیال
کبھی تو عیش کو چھوڑ اور عمل کا وقت نکال
نہ کام آئیں گے عقبیٰ میں مال اور دولت
کہ " مال تالبِ گورست و بعد ازاں اعمال "

ذات اس کی ہے خیر محض اے دوست
رحم ہے مغز اور سزا ہے پوست
سکھ ہے نعمت تو دکھ علاج ترا
" ہرچہ از دوست میرسد نیکوست "

حسد سے نہ بن تو کسی کا بھی دشمن
دلائل کو دیکھ اور نشانات روشن
نہ کر سوکنوں کی طرح عیب چینی
" پیا جس کو چاہیں وہی ہے سہاگن "

ذکرِ الٰہی اور اصلاح نفس

رکھ زباں کو ذکر سے مولا کے تر
تا زباں سے روح تک پہنچے اثر

دل بھی سیدھا کر کہیں ایسا نہ ہو
"بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر"

دلاتا ہے صدقہ بلا سے نجات
دعائیں پلاتی ہیں آب حیات

یہی دو ہیں پس مغز احکام دین
"اقیموا الصلوٰة و اٰتوا الزکوٰة"

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کے کلام کا ایک مختصر سا تعارف پیش کیا ہے۔

اردو ادب اور خاص کر منظومات میں منظر کشی بھی ایک صنف ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن میں اپنے کمالات کا ماہرانہ اور استادانہ مظاہرہ کر کے اردو شاعری کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا ہے۔ حضرت میر صاحب نے بھی ایسی نظمیں رقم فرمائی جن سے منظر کشی کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں آپ کی نظم "کچھ یار" بہت مقبول ہے اور منظر کشی کا ایک اچھا نمونہ ہے انھوں نے ۱۹۰۳ء سے شعر کہنے شروع کئے اور آخر وقت تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ چوالیس برس کے اس عرصہ میں آپ نے بہت تھوڑی نظمیں کہیں مگر جو کچھ کہا بالعموم دین کی تائید، احمدیت کی حمایت، اخلاقی قدروں کی اشاعت اور پند و نصائح کی ترویج کے لئے کہا۔ ان کی نظمیں خدا اور رسول اور حضرت بانیٔ

سلسلہ احمدیہ کے عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کا ناصحانہ اور صوفیانہ کلام بیحد دلنشین اور مؤثر ہوتا تھا اور جب وہ سلسلہ کے اخبارات میں چھپتا تھا تو احمدی احباب نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ حضرت میر صاحب کے کلام کی مقبولیت اور شہرت اندرون و بیرون ملک دُور دور تک پھیل گئی تھی۔

میر صاحب کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور یہ شوق ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد حضرت میر ناصر نواب صاحب بہت خوش گو شاعر اور شمس العلماء مولانا الطاف حسین پانی پتی کے شاگرد تھے۔ ان کی نظموں کے کئی مجموعے چھپے ہوئے موجود ہیں چنانچہ باپ سے یہ شوق بیٹے میں منتقل ہوا اور انہوں نے بڑے ہو کر ایسی نظمیں لکھیں جو احمدیہ لٹریچر میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

تحریر: نسیم سیفی

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب

یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے کہ اس نے حضرت میر ناصر نواب صاحب دہلوی کو بھی ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر بنایا تھا اور حضرت میر صاحب کے ایک فرزند ارجمند حضرت میر محمد اسماعیل کو بھی ذوق شعری سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب ڈاکٹر تھے اور لوگوں کا جسمانی علاج کرتے تھے۔ لیکن اپنی شاعری سے آپ نے روحانی غذا بھی مہیا کی اور روحانی دوا بھی۔ حضرت میر محمد اسماعیل صاحب نے اگر صرف ایک ہی نظم جس کا عنوان ہے۔

علیك الصلوٰةُ علیك السلام کہی ہوتی تو پھر بھی احمدی شعراء میں آپ کا بہت بڑا مقام ہوتا۔ لیکن اس نظم کے علاوہ بھی انھوں نے سادہ عام فہم زبان میں متعدد نظمیں کہی ہیں۔

علیك الصلوٰةُ علیك السلام کے ایک دو بند سنیے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ساری نظم سنا دوں کیونکہ یہ نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور نعتوں میں اس نعت کا درجہ بہت بلند ہے۔

بدرگاہ ذی شان خیر الانام   شفیع الوریٰ مرجع خاص و عام

بصد عجز و منت بصد احترام   یہ کرتا ہے عرض آپ کا ایک غلام

کہ اے شاہ کونین عالی مقام

علیک الصلوٰۃ علیک السلام

خلائق کے دل تھے یقیں سے تہی ۔۔۔ بتوں نے تھی حق کی جگہ گھیر لی
کہ توحید ڈھونڈے سے ملتی نہ تھی ۔۔۔ ہوا آپ کے دم سے اس کا قیام
علیک الصلوٰۃ علیک السلام

آپ کی نظمیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا موزوں الفاظ آپ کے سامنے قطار اندر قطار کھڑے ہیں اور آپ بلا تکلف ان کو اٹھا اٹھا کر نہایت قرینے سے رکھتے چلے جاتے ہیں۔ مشکل مذہبی اصطلاحات کو عام فہم الفاظ میں پیش کرنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

جان پہچان تم سے ہو جائے ۔۔۔ معرفت سے بھلا ہمیں کیا کام
بات سننے کو میں ترستا ہوں ۔۔۔ مجھ کو الہام چاہیئے نہ کلام
تم پہ مرتے ہیں اے مرے پیارے ۔۔۔ عشق کا دے رہے ہو کیا الزام
یونہی چھپ چھپ کے ملتے رہنا تم ۔۔۔ وصل کا تو خیال ہی ہے خام
زاہدو! کیا کریں دعاؤں کو ۔۔۔ مانگنا بھیک ہے ہمارا کام
مجھ سے تقوٰی کا کرتے ہو کیا ذکر ۔۔۔ ڈرتا رہتا ہوں جب میں تم سے مدام

اسی طرح اس نظم میں متعدد دیگر اصطلاحوں کو عام فہم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ اشعار تغزل کی جان نہیں تو اور کیا ہیں۔

تم آئے اور گلے ملنے سے کترائے تو کیا آئے
ہم آئیں اور تمہارا دل نہ گرمائے تو کیا آئے
مزہ آنے کا ہے تب ہی کہ ہنستے بولتے آؤ
اگر چہرے پہ اپنے بے رخی لائے تو کیا لائے

رباعیات اور قطعات میں آپ نے حکمت کے انمول موتی پیش کئے ہیں ۔

ہیں گنہ بے حد و عد... شرک ہے پر سب سے بد
اور علاج اس زہر کا ... قل ھو اللہ احد

اگر تندرستی کی ہے آرزو
طبیبوں کی کرنا نہ تم جستجو

یہی ایک کافی ہے یار و عمل
کلو واشربو لیک لا تسرفو

شاعر ہونے کے علاوہ آپ ایک نہایت اچھے نثر نگار بھی تھے۔ آپ بیتیوں کو ہمیشہ سے ادب میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ آپ نے بھی ایک آپ بیتی لکھی ہے۔ ایسے واقعات جن کا براہ راست آپ سے تعلق ہے یا ایسے دلچسپ واقعات جن کے وقوع ہونے سے آپ نے ایک خاص تاثر لیا ان کو قلم بند فرما کر آپ نے اپنی زندگی کے نہایت مفید تجربوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ۔

آپ ایک بلند پایہ انشاء پرداز تھے۔ اور اس سلسلے میں آپ نے متعدد مضامین تحریر فرمائے ہیں جو کتابی صورت میں تو شائع نہیں ہوئے لیکن احمدیہ جماعت کے اخباروں میں ان کا انبار لگا پڑا ہے ۔

بیٹی کے جذبات اپنے پیارے ابا جان کے لئے

حضرت سیدہ مریم صدیقہ فرماتی ہیں :-

حضرت سید محمد اسمٰعیل صاحب بظاہر تو دیکھنے والے کو یہی نظر آتا ہوگا کہ ڈاکٹر بنے اور دُنیا میں پھنس گئے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا عطا کی تھی آنکھوں کے تو بہت ہی ماہر تھے۔ لیکن کبھی لالچ نہیں کی کسی نے فیس دے دی، لے لی، نہ دی نہ لی۔ جہاں ذرا بھی محسوس ہوتا کہ یہ فیس نہیں دے سکتا نہ صرف علاج کرنا بلکہ گھر سے کھانا تک اُس کے لئے بھجوانا جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج کی کوشش بھی ساری عمر جاری رہی۔

آپ کی نظمیں آپ کے الفضل میں مضامین آپ کی محبت الٰہی، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت مسیح موعود سے محبت، خلافت سے محبت کے چشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود کو بہت ہی قریب سے دیکھا آپ کے گھر میں رہے خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں پوری ہوتی دیکھیں ایمان بالیقین حاصل ہوا۔ (صـ۶ـ)

ابا جان محترم فرمایا کرتے تھے مجھے فیس لینے میں سخت حجاب تھا میں اس غرض کے لئے ہاتھ نہ بڑھا سکتا تھا اُس زمانے میں چاندی کے روپے ہوتے تھے۔ مریض میری جیب میں فیس ڈال دیتے بعض دفعہ گھر آکر جب فیس نکالی جاتی تو ان میں سے اکثر کھوٹے سکے ہوتے۔ (صـ۱۲ـ)

۱۹۴۶ء میں حضرت مصلح موعود کو گلے کی تکلیف ہوگئی اور اس کے ساتھ بخار آنے لگا اور حضور کو یہ وہم ہوگیا کہ آپ کو سِل ہوگئی ہے چنانچہ آپ ہر وقت تھرمامیٹر لگا کر ٹمپریچر دیکھتے رہتے۔ ابا جان روزانہ دیکھنے آیا کرتے تھے کئی دفعہ آپ نے تھرمامیٹر توڑ

بھی دیا کہ نہیں لگائیں گے۔ ابا جان چلے جاتے تو حضور پھر تھرمامیٹر منگوا لیتے باوجود اس کے کہ خلیفۃ المسیح آپ کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی۔ تاہم ابا جان آپ کا غیر معمولی احترام کرتے۔ (ص۳۵)

حضرت سیدہ (نصرت جہاں بیگم اماں جان) سے ابا جان کو عشق کی حد تک پیار تھا۔ حضرت سیدہ کسی چیز کی تعریف کرتے ابا جان فوراً وہ چیز آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے (اماں جان) کہتی رہتیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں لیکن ابا جان نہ مانتے فرماتے مجھے ضرور دینی ہے تو پھر خرید کر دے دینا لیکن ابا جان اُسی وقت اُسے پیک PACK کروا دیتے۔ میرے رشتہ کے لئے گھر تشریف لائیں ابا جان سے کہا میں تمہاری لڑکی مانگنے آئی ہوں۔ ابا جان نے فرمایا میں آپ کی بات واپس نہیں کر سکتا۔ لے جائیں۔ سیدہ موصوفہ نے مزید کہا۔ بے شک یہ خدا کی تقدیر تھی کہ میں حضرت مصلح موعود کے عقد میں آئی۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابا جان حضرت سیدہ کی بات ٹال نہ سکتے تھے ......
حضرت میر محمد اسحٰق سے سیدہ کو اگر بیٹوں کی طرح پیار تھا تو ابا جان پر انہیں بہت ناز تھا۔ ابا جان ہمیشہ عید پر اپنی آپا کو عیدی بھیجتے ...... ابا جان سُنایا کرتے تھے کہ آپا جان حضرت مسیح موعود کے لئے سیب منگوا کر رکھا کرتے ہمیں کبھی گدگدی محسوس ہوتی تو الماری کھولتے اور کہتے آپا کتنے سیب لا دیں۔ حضرت مسیح موعود تصنیف فرما رہے ہوتے ہماری آواز سُنتے تو سمجھ جاتے کہ ان کا سیب کھانے کو جی چاہتا ہے آپ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور ہمیں سیب مل جاتے (ص۴۶)

ملازمت کے دوران ابا جان بہت معمور الاوقات تھے ہم نے تو آپ کے بڑھاپے ہی کو دیکھا ہے آپ بچوں کو نماز باجماعت کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ گھر میں نماز ادا فرماتے تو ہمیں سامنے کھڑا کر لیتے دُعائیں یاد کراتے۔ بچوں سے پیار بھی تھا۔ لیکن کڑی نظر رکھتے تھے۔ میں نے پانچویں تک گھر میں پڑھا۔ آج تک آپ کے پڑھانے کا دلنشین

انداز یاد ہے۔ مجھے پڑھانے کے بعد فرماتے اب اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھاؤ میں سب سے بڑی تھی فرمایا کرتے تھے بڑے بچے کی تربیت پر زور دو اس کا اثر چھوٹوں پر بھی پڑے گا...... زمانے کا بڑا فرق ہے اُس زمانے میں بچے اتنے بے تکلف نہ ہوتے تھے احترام کے ساتھ ساتھ ایک ڈر بھی تھا۔ ابا جان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ گھر میں بہت سادہ لباس زیب تن فرماتے زبان اور تلفظ کا اتنا خیال تھا کہ ایک دفعہ میں نے لفظ غَلَطْ کو غَلْط کہہ دیا ابا جان ناشتہ فرما رہے تھے مجھے بلایا اپنے پاس کھڑا کر لیا اور فرمایا کہو غَلَطْ غَلَطْ اسی طرح کہتی رہو جب ناشتہ فرما چکے تو مجھے رخصت دی۔ گھر میں مرکز سے کسی نہ کسی عالم کو بُلا لیتے تاکہ گھر میں دینی علم کا چرچا رہے۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب حلالپوری اور حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصری تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ اسی طرح اگر کسی بزرگ سلسلہ نے علاج کروانا ہوتا تو ابا جان کے پاس تشریف لے آتے۔

حضرت میر محمد اسحٰق صاحب آپ سے چھوٹے تھے۔ ابا جان کو اُن سے بہت پیار تھا۔ میں نے خود دیکھا چچا ابا بیمار ہوتے تو ابا جان اُن کے پاؤں سہلا رہے ہیں۔ آخری بیماری میں ابا جان میر صاحب کے کمرے میں جاتے اور سخت بے چین ہو کر باہر آتے، دُعائیں کرتے اور فرماتے ڈاکٹر اب اُن کو کیوں ٹیکے پر ٹیکا لگا رہے ہیں یہ ٹیکے میرے دل پر لگتے ہیں۔ بھائی کی وفات پر اشعار میں کہا میرا ایک بازو جاتا رہا۔ ان کی وفات پر جو مضمون لکھا اُس میں فرمایا

"وہ آفتابِ علم و حکمت اور مجموعۂ محاسنِ اخلاقِ نبوی ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے غروب ہو گیا۔"

(دو بھائی)

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کی خدا تعالیٰ کے لئے غیرت

سیدہ طیبہ صدیقہ صاحبہ

ابھی پچھلے ماہ میرے بھائی سید ابن احمد کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی اور میری ذات سے متعلق ایک واقعہ ہے تحریر کر رہی ہوں کہ اس کے پڑھنے کے بعد خدا تعالیٰ کی غیرت ہر دل میں پیدا ہو۔ میرے ابا جان حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کو خدا تعالیٰ کی بہت غیرت تھی۔ کوئی بات خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف سننا پسند نہ فرماتے تھے۔ اور بے اختیار جس نے بات کی ہو اس کے متعلق ہر قسم کا تبصرہ کر دیتے تھے۔ اپنی آپ بیتی میں بھی آپ نے ایسا ہی ایک واقعہ لکھا ہے۔

میرا یہ بھائی ہم سب سے چھوٹا تھا۔ اور ست ماہا پیدا ہوا تھا۔ بہت ہی کمزور تھا۔ بہت محنت سے اس کی پرورش کی گئی۔ شروع شروع میں ڈراپر سے دودھ پلایا جاتا تھا۔ میں ہی اپنے بھائی کو سنبھالتی تھی۔ محبت کی وجہ سے بھی اور اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے بھی۔ جب وہ بالکل نارمل صحت مند اور بہت پیارا موٹا تازہ بچہ ہو گیا تو ایک دن میرے ابا جان کوئی بات اس کی کمزوری کے متعلق کر رہے تھے جو مجھے اب یاد نہیں۔ اس وقت میری نہ تو اتنی سمجھ والی عمر تھی اور نہ ہی اتنی عقل تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اپنا کارنامہ بیان کرنے کے لئے کہا کہ اگر میں اسے نہ رکھتی تو پھر پتہ نہیں کیا ہوتا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ میرے ابا جان کا منہ سرخ ہو گیا اور کہنے لگے کہ مجھے خدا تعالیٰ کی بہت ہی غیرت ہے۔ اب یہ بڑا ہو گا اور تمہارے گھر میں فوت ہو گا۔ اس وقت تو اس بات کا عارضی سا دھکا لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے بعد میری شادی ہو گئی۔ پھر جوں جوں عقل اور سمجھ ترقی کرتی گئی یہ الفاظ جب بھی یاد

اُٹھتے بیٹھتے میں توبہ واستغفار کرتی تھی کہ خدایا میں نے نادانی میں بیوقوفی سے ایک بات کہہ دی تھی تو رحیم وکریم ہے تو حرفِ غلط کی طرح اس بات کو مٹا دے ۔

عمر کے ساتھ ساتھ یہ دعا بڑھتی رہی اور میں خوف کھاتی رہی جب بھی وہ میرے گھر آتا تو میں اس کے لئے بہت دُعا کرتی ۔ اور جب مجھے دُعا کی اصل حقیقت کا پتہ چلا تو میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی وہ تو بہت بخشنے والا ہے ۔ بے عقلی میں کی گئی بات کو ضرور انشاء اللہ معاف کر دے گا ۔ ہمیشہ میں یہ دُعا کرتی رہی کہ اے خدا میرا باپ تیرا پیارا بندہ ہے، تو اس کی کہی ہوئی اس بات کو نہ مان کہ یہ میرے سے بے وقوفی میں سرزد ہوئی تھی ۔ اور ان دعاؤں کا عرصہ اُنسٹھ سال پر محیط ہے ۔

پھر خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھیں کہ ہمارے گھر کے سارے کام ہماری والدہ کے بعد ہماری بڑی بہن سیدہ چھوٹی آپا کے ہاں ہوتے تھے ۔ ایمن بیمار ہوا ۔ بیماری کل ایک ہفتہ کی تھی ۔ چھوٹی آپا خود بیمار ہیں میں نے کئی دفعہ کراچی جانے کا پروگرام بنایا لیکن ایک تو ہمت نہ ہوئی ، دوسرے وہی الفاظ کانوں میں گونجتے تھے ۔ آخر خدا تعالیٰ کی تقدیر غالب آئی اور ہمارا بھائی ہم سے جدا ہو گیا ۔ اس وقت کراچی سے فون آیا کہ اسے میرے گھر میں لے کر آ رہے ہیں ۔ اس وقت وہ سارا واقعہ میرے ذہن میں پھر تازہ ہو گیا اور میری روح خدا تعالیٰ کے حضور جھک گئی کہ یہ خدا تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے میری ساری عمر کی دُعائیں سُن لیں اور مجھے معاف کر دیا ۔ لیکن دوسری طرف میر اسماعیل کی بات بھی رکھ لی کہ وہ بھائی رُخصت میرے گھر سے ہی ہوا ۔ بلانے والا ہے سب سے پیارا ۔

(روزنامہ الفضل ربوہ صفحہ ۴ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۹۸ء)

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کی سیرت کے بعض پہلو

محترم سید محمود احمد ناصر صاحب

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب (جو حضرت اماں جان کے بھائی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ماموں ہونے کے شرف سے مشرف تھے) کو دیکھنے اور ملنے والے جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم پہلو ان کی محبت الٰہی تھا جن لوگوں کو ان کے قریب رہنے اور ان کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دن اور رات ان کو ایک لگن سی لگی ہوئی ہے۔ ایک تڑپ اور بے قراری ہے خدا تعالیٰ کے لئے۔ خدا تعالیٰ کی صفات کے ذکر میں وہ لذّت محسوس کرتے اسی رنگ سے اس کا ذکر کرتے جس طرح کوئی اپنے کسی نہایت پیارے کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی رحمتوں اور برکتوں کا ذکر ان کی زبان پر رہتا۔ اس کے حُسن کے تصور سے ان کی روح پر ایک مستی کی سی کیفیت طاری رہتی۔ اور پھر ان کی روح ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے کے لئے تیار رہتی اور یہ شعر ان کی زبان پر رہتا۔ ؎

تڑپتی روح ہے میری کہ جلدی ہو نصیب اپنے
ملاقاتِ شہِ خوباں لقائے حضرتِ باری

خدا تعالیٰ کے لئے جو جوشِ محبت آپ کے دل میں تھا آپ کے عمل میں بھی جھلکتا تھا اور آپ کے کلام میں بھی۔ خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے منظوم کلام میں فرماتے ہیں :- ؎

مری خوشبو مرا نغمہ مرے دل کی غذا تم ہو
مری لذّت مری راحت مری جنت شہا تم ہو
مرے دلبر مرے دلدار گنج بے بہا تم ہو
صنم تو سب ہی ناقص ہیں فقط کامل خدا تم ہو
مرے ہر درد کی دُکھ کی مصیبت کی دوا تم ہو
رجا تم ہو غنا تم ہو شفا تم ہو رضا تم ہو
جفا میں ہوں وفا تم ہو دُعا میں ہوں عطا تم ہو
طلب میں ہوں سخا تم ہو غرض میرے پیا تم ہو
مرا دن تم سے جگ مگ ہے مری شب تم سے چھم چھم
مرے شمس الضحیٰ تم ہو مرے بدر الدجیٰ تم ہو
تمہی مخفی ہو ہر شَے میں۔ تمہی ظاہر ہو ہر شَے میں
ازل کی ابتدا تم ہو اَبد کی انتہا تم ہو
ہر اک ذرّے میں جلوہ دیکھ کر کہتی ہیں یہ آنکھیں
تمہی تم ہو تمہی تم ہو خدا جانے کہ کیا تم ہو

اس شعر پر حضرت میر صاحب نے یہ نوٹ دیا ہے۔ "یہ مناجات بنا کر میں ایک دن آدھی رات کو اسے پڑھ رہا تھا جب اس شعر پر پہنچا تو مجھے انوار و برکات و قبولیت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس پر میں نے اس وقت آخری شعر میں اس کا ذکر کر کے مناجات

کو مکمل کر دیا اور اسے الفضل میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔
اس بے پناہ محبت کا جو انہیں خدا تعالیٰ سے تھی اظہار کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہیں۔

مجھ پہ اے جان چھا گئے ہو تم
دل میں میرے سما گئے ہو تم
پھرتے رہتے ہو میری آنکھوں میں
جب سے جلوہ دکھا گئے ہو تم

پھر فرماتے ہیں:۔

کیا مزا آپ کو آتا تھا عبادت میں مری
کیوں مجھے پچھلے پہر آپ جگا دیتے تھے
کیوں مرے منہ سے سنا کرتے تھے اپنی تعریف
کیوں مرے دل کو لگن اپنی لگا دیتے تھے
لطف کیا تھا کہ پھنساتے تھے مصائب میں اُدھر
اور اِدھر رغبت تسلیم و رضا دیتے تھے
نور عرفاں سے مرا سینہ منور کر کے
پتے پتے میں مجھے اپنا پتہ دیتے تھے

منعکس ہوتے تھے آئینہ عالم میں تمہی
بوئے گل میں بھی مہک اپنی سنگھا دیتے تھے
سالک راہِ محبت کی تسلی کے لئے
آپ ہر ساز میں آواز سنا دیتے تھے

اس راہِ سلوک کا آخری مرحلہ جو اس نظم میں بیان ہے اس کیفیت کے اظہار پر مشتمل ہے جہاں حضرت میر صاحب اپنے دل پر بارگاہِ احدیت سے وصال کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

اے خوشا وقت کہ پھر وصل کا ساماں ہے وہی
دست عاشق ہے وہی یار کا داماں ہے وہی
دل کے آئینہ میں عکسِ رخِ جاناں ہے وہی
مردمِ چشم میں نقشِ شہِ خوباں ہے وہی
ہو گئی دُور غم ہجر کی کلفت ساری
شکر صد شکر کہ اللہ کا احساں ہے وہی
مژدہ اے جان و دلم پھر وہی ساقی آیا
ہے وہی بزم وہی ساغر گرداں ہے وہی
مِل گئے طالب و مطلوب گلے آپس میں
ربِّ محسن ہے وہی بندہ احساں ہے وہی
پھر وہی جنّت فردوس ہے حاصل مجھ کو
نخلِ ایماں ہے وہی چشمۂ عرفاں ہے وہی
ذرّے ذرّے میں مرے رچ گیا دلدارِ ازل
ذکر میں لب پہ وہی فکر میں پنہاں ہے وہی
آتشِ عشق و محبت کا وہی زور ہے پھر
قلب بریاں ہے وہی دیدۂ گریاں ہے وہی

وصال ہی کا یہ سامان کس طرح میسر ہوا اس کا ذکر یوں کیا ہے

دوستو مژدہ کہ ایک خضر طریقت کے طفیل
پھر مرے دل میں رواں چشمۂ حیواں ہے وہی
اس وسیلہ کے سوا وصل کی صورت ہی نہ تھی
قاصدِ بارگہ حضرتِ ذی شاں ہے وہی
اس کے ملنے سے ہمیں شاہد گم گشتہ ملا
آستانے کا شہ حسن کے درباں ہے وہی

اس کے بعد خدا تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میرا محبوب ہے وہ جانِ جہانِ عشاق
اس سے جو دُور رہا قالب بےجاں ہے وہی
عالم کون و مکاں نور سے اس کے روشن
نغمۂ ساز وہی بوئے گلستاں ہے وہی
ذرّے ذرّے میں کشش عشق کی رکھی جس نے
مالک جسم وہی۔ روح کا سلطاں ہے وہی
رنگ سے اس کے ہے نیرنگئ عالم کا ظہور
گرمی و رونقِ بازار حسیناں ہے وہی
دل جو انساں کو دیا۔ دردِ محبت دل کو
قبلۂ دل ہے وہی درد کا درماں ہے وہی
جس نے آواز سُنی ہو گیا اس کا شیدا
دیکھ لے جلوہ تو سو جان سے قرباں ہے وہی

خود تو جو کچھ ہے سو ہے نام بھی اس کے پیارے
حیّ و قیوم و صمد۔ ہادی و رحماں ہے وہی
لاکھ خوشیاں ہوں مگر خاک ہیں بے وصلِ نگار
قرب حاصل ہے جسے خرّم و شاداں ہے وہی
حبِّ دنیا بھی نہ ہو۔ خواہشِ عقبیٰ بھی نہ ہو
جز خدا کچھ بھی نہ ہو۔ طالبِ جاناں ہے وہی

پھر یہ دُعا کرتے ہیں۔

اب تو دل میں ہے فقط ایک تمنّا باقی
آرزو صرف وہی خواہش و ارماں ہے وہی
درگہِ قدس سے قائم رہے رشتہ اپنا
لیکن اُس کا بھی اگر ہے تو نگہباں ہے وہی
نشۂ جامِ محبت کی دُعا ہے اُس سے
ساقیٔ میکدۂ محفلِ مستاں ہے وہی
آپ دیتے نہ تھکیں اور میں پیتے نہ تھکوں
میرے شایاں ہے یہی آپ کے شایاں ہے وہی
ہاتھ پکڑا ہے تو اب چھوڑ نہ دینا للّٰہ
مدّتوں دُور رہا جو یہ پشیماں ہے وہی
سچ تو یہ ہے کہ سبھی میری خطا تھی ورنہ
اپنے بندوں پہ کرم آپ کا ہر آں ہے وہی
ہم تو کمزور ہیں پر آپ میں سب طاقت ہے
جو بھی مشکل ہے ہمیں آپ کو آساں ہے وہی

حضرت میر صاحب کے دل میں یہ محبتِ الٰہی کا جو دریا بہہ رہا تھا اس کے نتیجہ میں بارگاہِ احدیت سے بیشمار تفضلات واحسانات کا مورد تھے اور بہت کثرت سے آپ مخاطباتِ الٰہیہ سے مشرف ہوتے تھے۔ میں اس تذکرہ کو بارگاہِ ایزدی کے ایک اور عاشقِ صادق مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کے کشف کو بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب اپنی عمر کے چھیاسٹھویں سال میں اپنی آخری بیماری میں مبتلا تھے اور احبابِ جماعت کو ان کی صحت کے متعلق سخت فکر تھی حضرت مولوی صاحب کو کشف ہوا جس کے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کانوں کے بالکل قریب ہو کر کوئی کلام کرنے لگا ہے۔ نہایت فصیح اور مؤثر لہجہ میں کلام کا طرز ہے۔ اس وقت مجھے یہ محسوس کرایا جا رہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آواز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی حلم اور رحم کے پیرایہ میں یوں فرمایا۔

"میر محمد اسماعیل ہمارے پیارے ہیں ان کے علاج کی طرف فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہم خود ہی ان کا علاج ہیں۔"

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کی یاد میں

از جناب عبداللطیف صاحب ظہور

افسوس تھے جو قوم کے معمار چل بسے
جو دینِ مصطفیٰؐ کے تھے غمخوار چل بسے

رحمت کو جن پہ ناز تھا دنیائے عشق میں
وہ عاشقانِ احمدِ مختار چل بسے

بچپن سے جن کو عشق تھا آقائے دین سے
ملنے کو اپنے یار سے وہ یار چل بسے

روتا رہے گا ابر بھی جن کو ہزار سال
گریاں وہ ہم کو چھوڑ کے یکبار چل بسے

جنّت کا درظہور تھا جن کے لئے کھُلا
وہ قادیاں کا چھوڑ کے گلزار چل بسے

(الفضل ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

تاریخ وفات حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب

از جناب قاضی محمد یوسف صاحب ہوتی مردان

آہ سیّد محمد اسمٰعیل ۔ احمدی ۔ دہلوی نمود رحیل
وہ چہ خوش مرد باصفا بودست ۔ مومن و متقی ۔ نجیب و نبیل
خندہ رو خوش مزاج صوفی طبع ۔ خوش خصال و حلیم و نیک و جمیل
نکتہ رس نکتہ گو و قرآں داں ۔ باعمل باحیا و مردِ عقیل
گل سر سبد باغِ احمدیت ۔ در ہمہ وصف بے نظیر و عدیل
بود ہمدرد بیوہ و مسکین ۔ خیر خواہ یتیم و ابن سبیل
آں حکیم و معالج غربا ۔ گشت از کثرت علاج علیل
آخرش حکم ارجعی آمد ۔ کرد تعمیل حکم عزرائیل
بست و ہشتم بد از مہ شعباں ۔ روز آدینہ بود یوم جلیل

لام و زارا [۳۷] کشیدہ یوسف گفت
یا بد از رب خویش اجر جزیل

(۱۳۶۵) (الفضل ۲؍اگست ۱۹۴۷ء)

جناب سیف اللہ فاروقی صاحب

خون کے دریا بہا لے دیدہ خونابہ بار
سامنے ہے آج تیرے میرؔ صاحب کا مزار
مظہر اوصاف احمد ہستی گردوں وقار
اے کہ تیرے نام سے تھا علمِ دیں کا افتخار
رہتی دنیا تک رہیں گے کام تیرے یادگار
اور تیری نیکیوں کے معترف لیل و نہار

جناب شیخ روشن دین تنویر صاحب

پھر یم سے جا مِلا دُرِ یکدانہ ایک اور
نُورِ ازل میں ڈھل گیا پروانہ ایک اور

پیمانہ تنگ اور وفورِ مئے حیات
چھلکا مئے حیات سے پیمانہ ایک اور

اہلِ بہشت لے ہی گئے ہم سے چھین کر
تسبیح ریز بلبلِ مستانہ ایک اور

(الفضل ۳۱ جولائی ۱۹۴۷ء)

آہ! حضرت میر محمد اسماعیل صاحب

آہ اک خیرِ مجسّم ۔ ایک پیکر نور کا
دیکھ کر جس کو نظر آتا تھا جلوہ طور کا

پوچھتا ہے وصف کیا تو ایسے عالی جاہ کا
پاک ظاہر پاک باطن عبد تھا اللہ کا

نیک طینت نیک سیرت متقی و پارسا
حامیٔ دینِ متیں اور سالکِ راہِ ہُدیٰ

منبعِ علم و ہنر اور کانِ فضل و خیر
فیضیاب اس سے ہر اک ہوتا تھا اپنا ہو کہ غیر

خوبیاں کیا کیا گناؤں میر اسماعیل کی
چہرہ انور تھا گویا روشنی قندیل کی

اے خدا کے برگزیدہ صوفیٔ عالی مقام
رحمتیں اللہ کی تجھ پر ہوں اور لاکھوں سلام

(روزنامہ الفضل ۳۱ جولائی ۱۹۴۷)
شاعر کا نام درج نہیں ہے

باب سوم

توحید و اسلام

حمد ذات باری تعالیٰ

میرا محبوب ہے وہ جانِ جہانِ عُشاق ۔۔۔ اُس سے جو دُور رہا قالبِ بیجاں ہے وہی
عالمِ کون و مکاں نُور سے اُس کے روشن ۔۔۔ نغمہ ساز وہی بُوئے گلستاں ہے وہی
ذرے ذرے میں کشش عشق کی جس نے رکھی ۔۔۔ مالکِ جسم وہی ۔ روح کا سُلطاں ہے وہی
رنگ سے اُس کے ہے نیرنگئ عالم کا ظہور ۔۔۔ گرمی و رونقِ بازارِ حسیناں ہے وہی
دل جو انساں کو دیا ۔ دردِ محبت دل کو ۔۔۔ قبلۂ دل ہے وہی ۔ درد کا درماں ہے وہی
جس نے آواز سُنی ہو گیا اس کا شیدا ۔۔۔ دیکھ لے جلوہ تو سو جان سے قرباں ہے وہی
خود تو جو کچھ ہے سو ہے نام بھی اُسکے پیارے ۔۔۔ حیّ و قیوم و صمد ہادئ و رحماں ہے وہی
عشق میں جسکے رقابت نہیں وہ یار ہے یہ ۔۔۔ جس پہ بِن دیکھے مریں لوگ یہ جاناں ہے وہی
لاکھ خوشیاں ہوں مگر خاک ہیں بے وصلِ نگار ۔۔۔ قُربِ حاصل ہے جسے خرم و شاداں ہے وہی
حُبِّ دُنیا بھی نہ ہو ۔ خواہشِ عقبیٰ بھی نہ ہو ۔۔۔ جز خدا کچھ بھی نہ ہو طالبِ جاناں ہے وہی

(بخار دل صـ۳۴)

کلمہ شہادت یعنی وجودِ باری پر ہماری گواہی

اسلام کے پانچ ارکان میں سے پہلا رکن کلمہ شہادت ہے یعنی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں یہ گواہی بھی دیتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ بغیر اس گواہی کے مسلمان، مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ اگر کوئی اس سے شہادت طلب کرے کہ خدا کے وجود کو ثابت کرو۔ تو اس کا فرض ہے کہ جہاں تک اس کی عقل اور سمجھ ہے اس پر اپنی شہادت پیش کرے ورنہ اس کا دعوےٰ بلا دلیل اس کا ایمان بلا اصلیت اور اس کی گواہی بلا تائیدی واقعات کے ہوگی۔ اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے تئیں اس گواہی کے لئے مستعد اور تیار رکھے اور جب بھی ضرورت ہو اسے پیش کرے۔ یہ نہ ہو کہ ساری عمر تو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے گزر جائے اور جب اس شہادت کے متعلق پوچھا جائے تو بغلیں جھانکنے لگے یا دبی زبان سے اقرار کرنے لگے کہ میرے پاس تو کوئی شہادت موجود نہیں۔ اور عوام الناس کی نسبت یہ شہادت اہلِ علم لوگوں پر اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ

شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران، ۱۹)

مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر نہ صرف خود اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ بلکہ تمام اہلِ علم مسلمان بھی انصاف پر قائم ہو کر اس بات کے گواہ ہیں۔ یعنی وہ بھی یہی گواہی اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔ اور یہی گواہی اسلام کا پہلا رکن ہے اور گواہی وہ ہوتی ہے جو محض سُنی سنائی نہ ہو بلکہ انسان کو اس کا ذاتی علم بھی ہو۔ اور اگر اسے بُلا کر شہادت طلب کی جائے۔ تو وہ قسم کھا کر دل کے یقین کے ساتھ اسے بیان کر سکے۔ یہ گواہی جو باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے لئے ہے حسب ذیل شقوں پر منقسم ہے

۱۔ اس کی فطرت کی گواہی

۲۔ اس کی عقل کی گواہی

۳۔ جن لوگوں کو وہ اپنے تجربہ سے راستباز یقین کرتا ہے ان کی گواہی

۴۔ اس کے علم کی گواہی

۵۔ اس کی آپ بیتی یا اپنی ذاتی گواہی

۶۔ ان واقعات کی گواہی جو اس نے دوسروں پر گزرتے دیکھے۔ اور وہ خود بھی ان باتوں کا شاہد ہے۔

۷۔ عالم روحانی کی کیفیات جن سے براہِ راست ذاتِ باری کی رویت کلام کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جہاں علی وجہ البصیرت کوئی بندہ اپنے بعض حواس کے ساتھ احساسِ صفاتِ باری تعالیٰ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد سمجھانے کے لئے بطور نمونہ نہایت مختصر اور سرسری شہادت میں اپنی طرف سے اس معاملہ میں پیش کرتا ہوں۔

فطرت کی شہادت

میری فطرت یہ چاہتی ہے کہ چونکہ میں بے علم۔ بد اخلاق۔ کمزور۔ حاجت مند اور مریض ہوں۔ اس لئے کوئی ایسی طاقتور ہستی ہونی چاہیئے جو مجھ پر رحم کرے۔ میری کمزوریاں

دُور کرے۔ مجھے صحت دے۔ میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرے مجھے رزق دے میری شکستگی کی مرمت کرے۔ دشمنوں کے حملے مجھ سے دُور کرے۔ میری حفاظت کرے۔ میری خواہشیں پوری کرے۔ میری دُعائیں قبول کرے۔ میرے علم میں اضافہ کرے۔ مجھے عزت دے۔ مجھے حکمت بخشے۔ غلطی کے وقت میری راہنمائی کرے۔ آنے والے خطرات سے مجھے آگاہ کرے۔ اور مجھے ہر طرح خوش رکھے۔ وہ خود ہر علم و قدرت سے آراستہ اور غیر فانی ہو۔ اور مجھے بھی فنا نہ ہونے دے۔ بلکہ ابدی زندگی عطا فرمائے۔ غرض یہ میری فطرت کی آواز ہے اور یقیناً میرا نفس کسی ایسے ہی وجود کو چاہتا ہے اور اُسے ڈھونڈتا ہے۔ بلکہ ایک بچے کو ایک جاہل عورت کو ایک بیوقوف مرد کو اور ایک عالم سے عالم شخص کو بھی پوچھ کر دیکھ لو کہ کیا وہ ایسی ہستی کا طالب ہے یا نہیں۔ یہ ایک سچی پیاس ہے۔ ایک واقعی بھوک ہے۔ ایک حقیقی ضرورت ہے۔ اس لئے اسے اسی طرح پورا ہونا چاہیئے۔ جس طرح ہماری ہر سچی ضرورت کے پورا ہونے کے لئے دُنیا میں سامان موجود ہیں اور وہ پوری ہوتی ہیں۔ پس اس ضرورت کا شدّت احساس خدا تعالیٰ کے وجود پہ ایک شہادت ہے۔

عقل کی شہادت

دوسری گواہی میری عقل کی ہے کہ یہ سلسلہ دنیا کا جو ایک حقیر ذرّہ سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوقات تک بغیر کسی فتور کے کمال عقلمندی اور کمال حکمت و دانائی سے چل رہا ہے تو اس خلق کے پیچھے کوئی خالق۔ اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم اور اس عقلمندی کے پیچھے کوئی نہایت دانشمند وجود ہونا چاہیئے۔ آپ ہی آپ یہ کام نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ چیزیں نہ اپنی آپ خالق ہیں۔ نہ اتنی عقلمند ہیں۔ اور تمام مخلوقات کی بناوٹ اور ترتیب کے پردہ کے پیچھے ایک ارادہ اور ایک مشیّت، ایک حکمت، ایک تدبیر جلوہ گر ہے۔

راست بازوں کی شہادت

میری تیسری گواہی راست بازوں کی شہادت ہے۔ میں نے تمام دنیا کے مشہور اور مقتدر راست بازوں اور اپنے زمانہ کے کم از کم تین عظیم الشان صدیقوں کو دیکھا۔ اور ہر ایک نے ان میں سے یہی گواہی دی کہ اللہ ہے۔ اور ہم ذاتی طور پر اس کے گواہ ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں اور ان کی راست بازی پر مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر یہ دن کو رات کہہ دیں تو میں اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھوں۔ اور ان کو سچا۔ پس میرے لئے ان کی شہادت کافی ہے۔

علمی شہادت

چوتھی شہادت علمی شہادت ہے وہ بجائے خود ایک لاانتہا مجموعہ شہادات کا ہے لیکن مختصر یہ کہ مجھے بڑے بڑے اہل علم سائنسدانوں اور نیچر کے راز دانوں نے یہ علم دیا ہے کہ تمام عالمین میں ایک نظام[1] ہے اور ایک تسلسل[2] ہے ایک ارتقا[3] ہے یعنی UNI/FORMITY اور CONTINUITY اور EVOLUTION اور بحیثیت مجموعی اس تمام سلسلۂ عالمین میں جہاں تک ہماری نظر علم اور قیاس پہنچ چکا ہے۔ اوّل سے آخر تک ایک چیز بھی ایسی ثابت نہیں ہوئی جو دوسری تمام چیزوں سے کچھ نہ کچھ تعلق نہ رکھتی ہو۔ اور دوسری مخلوقات کے ساتھ مل کر ایک مکمل سسٹم کے اجزاء میں منسلک نہ ہو۔ اور ترقی کی طرف نہ جا رہی ہو عجیب بات ہے کہ عام طور پر لوگوں کو اس بات کی خبر تک نہ تھی کہ مخلوق میں یہ کمال اور انضباط موجود ہے۔ اگر علوم جدیدہ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا یہ انکشاف یقینی ثبوت ہے وجود باری تعالیٰ کا۔ اس کے خالق و مالک ہونے کا۔ اور اس کی توحید کا۔ ایک چوٹی کا سائنس دان اور ماہر علم نجوم کہتا ہے۔ کہ "ہم نے اتنے فاصلوں تک ایسے ایسے مستقل عالم پھیلے ہوئے دیکھے ہیں کہ ہماری قوت واہمہ اور تخیل بھی ان فاصلوں کا اندازہ کرتے ہوئے چکرا جاتی ہے مگر پھر بھی یہ سب عالمین اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں جیسے کسی مشینری کے مختلف پُرزے۔"

(الفضل ۲ جون ۱۹۳۸ء)

ہمارا خُدا

اللہ اور صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ذاتِ بابرکات سراپا حُسن احسانات ہے جس کے سوا کوئی ہمارا محبوب اور کوئی ہمارا معبود نہیں۔ وہ ساری کائنات کا رب ہمارا پیدا کرنے والا۔ پالنے والا اور درجہ بدرجہ ترقی دینے والا ہے۔ وہ ساری مخلوق پر بے انتہا رحم کرنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے۔ نہ صرف اس عارضی دنیا میں ہی وہ ہمارا مالک ہے بلکہ آخرت میں بھی جو دارالجزار اور دائمی ٹھکانہ ہے۔ وہی ہمارا آقا اور مالک ہوگا وہی حقیقی بادشاہ ہے۔ نہایت پاک اور بے عیب خود تمام نقصانات سے محفوظ اور دوسروں کو سلامتی بخشنے والا امن دینے والا۔ نگہبان اور ہمارے اعمال کا محافظ۔ بڑی عزت و حرمت والا۔ بگڑی کو سنوارنے اور شکستہ کو جوڑنے والا۔ نہایت خود دار۔ مادہ اور ارواح کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ تخلیق کا موجد اور صحیح اندازہ کرنے والا۔ طرح طرح کی شکلیں اور صورتیں بنانے والا عیب پوش۔ دباؤ اور دبدبہ والا۔ لکھ داتا۔ روزی رساں مشکل کشا۔ ظاہر و پوشیدہ کا واقف اور ازل سے ابد تک ہر بات کا تفصیلی علم رکھنے والا۔ سب کو قبضۂ قدرت میں رکھنے والا۔ کشائش اور فراخی دینے والا۔ نافرمانوں کو پست اور فرمانبرداروں کو بلند کرنے والا۔ عزت بخشنے والا۔ ذلت دینے والا۔ ہر آواز کو سُننے والا۔ ہر چیز کو دیکھنے والا۔ صحیح حکم اور فیصلہ فرمانے والا۔ عادل و منصف۔ باریک بین اور لطف کرنے والا۔ ہر بات سے خبردار۔ نہایت بردبار۔ صاحبِ عظمت و شکوہ۔ بے حد بخشنے والا گناہوں کا۔

نہایت قدردان۔ عالی مرتبت۔ سب سے بڑا۔ سب کا محافظ۔ سب کی روزی پیدا کرنے والا سب کو کفایت کرنے والا اور انسان سے اس کے اعمال کا حساب لینے والا بزرگ قدر لاثانی سخی۔ چھوٹے بڑے سب کا ہر وقت نگران۔ دعاؤں کو قبول کرنے والا اور پکارنے والے کو جواب دینے والا۔ اپنی تمام صفات میں بے پایاں وسعت رکھنے والا۔ صاحبِ حکمت و دانائی۔ نہایت درجہ محبت اور دوستی کرنے والا۔ صاحبِ شرافت۔ مرنے کے بعد پھر زندہ کرنے والا۔ ہر جگہ حاضر۔ سراسر حق اور تمام سچائیوں کا سرچشمہ۔ کام بنانے والا۔ زور آور سنجیدہ دستگیر۔ مددگار، وفادار۔ تمام محاسن اور خوبیوں کا منبع اور مرکز۔ تمام مخلوقات اور ان کے افعال و اعمال کو شمار میں رکھنے والا ہے۔ پہلی بار پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور دوبارہ پیدا کرنے والا بھی وہی۔ زندگی دینے والا بھی وہی اور مارنے والا بھی وہی۔ قائم بالذات مجسم زندگی۔ کائنات کے قیام کا باعث۔ ذرّہ ذرّہ پر تصرف رکھنے والا۔ عالی شان۔ ایک یگانہ و یکتہ۔ بے نیاز۔ ہمہ قدرت اور اپنی قدرتوں کو خوب ظاہر کرنے والا۔ کسی کو آگے بڑھانے والا۔ کسی کو پیچھے ہٹانے والا۔ ازلی ابدی۔ سب سے زیادہ ظاہر۔ سب سے زیادہ مخفی۔ ہر ایک کا کام سنبھالنے والا۔ اعلیٰ اور پسندیدہ اخلاق والا۔ منعم اعلیٰ اور محسنِ حقیقی۔ توبہ قبول فرما کر رجوع برحمت کرنے والا۔ ظالموں سے ان کے ظلم کا بدلہ لینے والا لغزشوں سے درگزر کرنے والا اور گناہوں کو مٹانے والا۔ شفیق وغم گسار۔ تمام نظاموں اور بادشاہتوں کا مالک۔ صاحبِ جلال و جمال۔ حق دار کی حق رسی کرنے والا۔ پراگندوں کو جمع کرنے والا۔ غنی بے پروا۔ دوسروں کو مالدار اور غنی بنانے والا۔ مصائب کو ٹالنے والا۔ دکھ اور ضرر کا مالک۔ نفع اور سکھ کا خالق۔ سراسر نور اور روشنی بخش۔ سچا راہنما۔ نئی نئی باتیں نئی مخلوقات اور نئی نئی قدرتیں ظاہر فرمانے والا۔ غیر متغیر اور غیر فانی۔ سب کا وارث صحیح راستہ پر چلانے والا اور نہایت درجہ صبر و تحمل والا۔

یہ ہے ہمارا خدا یہ ہے ہمارا اللہ۔ یہ ہے ہمارا محبوب اور یہ ہے ہمارا معبود

بے عیب حسین و بے نہایت محسن
کوئی نہ ہوا۔ نہ ہے۔ نہ ہوگا اُس بِن

نہ وہ کسی کی ماں ہے۔ نہ کسی کا باپ۔ نہ اس کی کوئی بیوی ہے۔ نہ اولاد۔ نہ کوئی اس کا ہمسر۔ نہ رشتہ دار۔ نہ کوئی اس کا مثل۔ نہ مانند۔ نہ وہ کسی کی عبادت کا حاجت مند۔ نہ خدمت کا محتاج۔ غیر محدُود ہے۔ اور ورا الورا۔ اُس کی ذات۔ صفات اور افعال میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کا رب۔ پہلوں اور پچھلوں کا داتا۔ دل کے بھیدوں کا واقف۔ ہمارے ہر تصور سے بالاتر۔ رگِ جان سے زیادہ قریب فریادی کی فریاد کو پہنچنے والا۔ طبیبِ شافی۔ کفیل۔ نعم الوکیل۔ اپنی تمام مخلوقات سے اُن کی استعداد کے مطابق کلام کرنے والا۔ نجاتِ انسانی کے لئے ہر زمانہ میں پیامبر اور انبیاء مبعُوث کرنے والا۔ اور پھر قیامت کے دن ان انسانوں سے اُن کی فطرت۔ عقل۔ علم اور حالات کے مطابق بکمال رعایت۔ باز پُرس کرنے والا۔ ہر چیز کو ایک اندازہ اور حد لبست میں رکھنے والا۔ وہ جو کبھی کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔ وہ جس کا انتقام بھی صرف بندوں کے فائدہ اور اصلاح کے لئے ہے۔ وہ جس کی سزا قلیل اور عارضی اور جزا کثیر اور دائمی ہے۔ وہ جس کا دوزخ بھی شفاخانہ ہے اور چند روزہ۔ اور جس کی جنت بادشاہی مہمان خانہ ہے اور ابدی۔ وہ جس کا رحم تمام مخلوقات پر محیط ہے۔ اور جس کی رحمت ہمیشہ اس کے غضب پر غالب۔ کوئی نہیں جو اس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور کوئی سفارش کر سکے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر بھی کوئی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔ جسم، صُورت، جہت، رنگ، ترکیب محدود ہونے اور حلول کرنے سے پاک۔ نہ سوتا ہے۔ نہ اونگھتا ہے۔ نہ تھکتا ہے۔ نہ کمزور ہوتا ہے۔ نہ غافل ہے۔ نہ زوال پذیر۔ جس کی تمام صفات اس کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی ہیں۔ اپنی بات کا سچا۔ اپنے وعدہ کا صادق۔ اپنے وعید میں نرم۔ لائق اعتماد۔ اور قابلِ توکل۔ بدی۔ گناہ شرک اور کفر کو ناپسند کرنے

والا۔ بخل سے پاک۔ سراپا خیر۔ جب چاہتا ہے اپنی تقدیر کو جاری کرتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے۔ اُسے توڑ بھی دیتا ہے۔ ہر چیز سوائے اس کی ذات کے فانی ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُس کے وجود پر گواہ۔ اور اُس کے خالق مالک قدوس اور محسن ہونے پر شاہد ہے۔ جس کی عبادت بوجھ اور چٹی نہیں۔ بلکہ سراسر سرُور اور فائدہ ہے۔ جگہ اور زمانہ رُوح اور مادہ۔ موت اور حیات۔ نیز مخلوقات کے افعال۔ خیالات اور ارادے سب اُسی کی مخلوق ہیں۔ اُس کی تمام صفات پسندیدہ اور ہر صفت مخلوق کے لئے سرتاسر فضل اور انعام ہے۔ فالحمد للّٰہ رب العالمین۔

اب ذرا غور کرو۔ اور اپنے دل سے پوچھو کہ کیا تم ایسی ہستی کے بغیر گزارہ کر سکتے ہو؟ کیا تمہیں ایسے وجود کی ضرورت نہیں۔ کیا ایسے سرپرست کے بغیر خوشی اور اطمینان حاصل کر سکتے ہو۔ کیا ایسی ذات کے سوا کسی اور پر بھروسہ اور اعتماد کر سکتے ہو۔ کیا اس کو چھوڑ کر کوئی اور ہستی تمہارے علم میں ہے۔ جو تمہاری سب سچی ضرورتوں۔ ساری دلی خواہشوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے کی طاقت رکھتی۔ اور اس کا وعدہ کرتی ہو۔ یا اس میں خدا تعالیٰ جیسی اعلیٰ اور فیض رساں صفات اور اخلاق ہوں۔ اگر نہیں تو خوشی سے آؤ۔ مجبوراً آؤ۔ کرہاً آؤ۔ ضرورتاً آؤ۔ جس طرح ہو سکے آؤ۔ اس لئے کہ تمہاری سب مرادیں اور جذبات۔ تمہاری کُل ضروریات۔ تمہاری جملہ حاجات۔ تمہارے سارے فوائد صرف اسی ایک دربار سے پورے ہو سکتے ہیں۔ اور کسی دروازہ سے نہیں۔ کیونکہ صرف وہی ہے۔ جو لازوال دولت کا خزانہ ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۚ (الصّٰفّٰت: ۱۸۱-۱۸۳)

ترجمہ: تیرا رب جو تمام بڑائیوں کا مالک ہے، ان کی بیان کردہ باتوں سے پاک ہے اور رسولوں پر ہمیشہ سلامتی نازل ہوتی رہے گی

اور سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

سو یہ ہے ہمارا اللہ جسے قرآن نے پیش کیا۔ اور یہ ہے ہمارا وہ خدا جو ہمیشہ نبیوں پر ظاہر ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ اسے مانو۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اُس کے فرمانبردار بندے بنو۔ اس کی رضا چاہو۔ اُسی سے دُعا مانگو۔ اور اُسی سے اپنے دل و جان کے ساتھ محبت کرو۔ تاکہ تم بامراد ہو۔ آمین۔

(الفضل ۶ جنوری ۱۹۲۳ء)

سُنّت اللہ

آج کل اکثر لوگ جب کوئی دعویٰ کر بیٹھتے ہیں تو اُن کے ثبوت میں صرف یہ کہنا کافی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بات سُنّت اللہ ہے" یا سُنّت اللہ نہیں ہے۔ اور اس لفظ کے بوجھ کے نیچے وہ اپنے فریقِ مقابل کو دبانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پوچھا جائے۔ یا تفتیش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود سُنّت اللہ کا مفہوم نہیں سمجھتے۔

سب سے بڑی غلطی جو وہ کرتے ہیں یہ ہے کہ سُنّت اللہ وہ اس قانون کو کہتے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے مشاہدہ سے اور خود اپنی عقل سے خدا کے لئے تجویز کیا ہو۔ مثلاً کبھی مسیح ناصری کے باپ کے متعلق بحث ہو تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ایسے انسان کا ہونا جو بے باپ کے پیدا ہو سُنّت اللہ کے خلاف ہے۔ پر اس کے معنے ان کے دل میں یہ ہوتے ہیں کہ چونکہ ہم نے یا ہمارے ملنے والوں نے ایسا ہوتا نہیں دیکھا۔ لہٰذا یہ خدا کی سنت بن گئی۔ نہ خدا کبھی ایسا کر سکا نہ کرتا ہے نہ کر سکے گا۔ حالانکہ وہ ان محدود العقل محدود العلم انسان خدا تعالیٰ کی سُنّت اس کی قوت اور اس کی قدرتوں کی حدلیت کہاں کر سکتا ہے اس سے بڑھ کر احمق پن اور کیا ہوگا کہ ایک ۲۵ ۔ ۳۰ سالہ کمزور جاہل انسان ازلی ابدی غیر محدود فعال لما یرید اور قادر مطلق خدا کی قدرتوں کا احاطہ کرے اور کہہ دے کہ فلاں بات سُنّت اللہ ہے اور خدا تعالیٰ اس کے برخلاف نہیں کر سکتا یا نہیں کرتا۔ گویا کہ آپ نے اپنی طرف سے خدا کے ہاتھ باندھ دیئے اور حکم دے دیا کہ بس فلاں کام اس طرح سے ہو۔ اور دوسری طرح سے نہ ہو۔ میرے خیال میں سُنّت اللہ کا یہ مفہوم

بچوں کے لئے بھی ہنسی کا مقام ہے۔ چہ جائیکہ کوئی عقلمند اسے اس طرح پیش کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی بابت قرآن مجید میں آتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ید اللہ مغلولۃ۔ یعنی اللہ تعالیٰ صرف علت العلل ہے۔ مجبوراً اور اضطراراً اپنے ہی قوانین میں مقید ہے۔ گویا نعوذ باللہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ جس طرح مثلاً آگ خاصیت جلانے کی رکھتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ سے بھی خلق اور دیگر صفات مجبوراً اور بعض قواعد کے ماتحت صادر ہوتی ہیں۔ دراصل یہ تو آریہ کا عقیدہ ہے یا دھریہ کا۔ کیونکہ وہ بھی نیچر میں ایک گریٹ پاور مانتا ہے۔ سو جیسا دہریہ کا خدا ویسا ہی نیچری کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیچری خدا کا نام لیتا ہے اور دہریہ نام لینے سے بھی کتراتا ہے۔

بعض لوگ اپنی عقل اور مشاہدے سے ہٹ کر قرآن کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں اور یوں کہنے لگتے ہیں کہ قرآن مجید نے جو بیان کیا ہے۔ کہ ہم نے انسان کو جوڑا بنایا۔ اور اسی جوڑے سے اس کی نسل پھیلائی۔ پس ثابت ہوا کہ یہ سُنت اللہ ہوگئی۔ حالانکہ یہ بھی ان کی غلطی ہے۔ اسے تقدیر کہتے ہیں۔ اور جیسے خدا کی ایک تقدیر یہ ہے کہ ماں باپ سے مخلوق کا سلسلہ چلائے۔ اسی طرح دوسری تقدیر یہ ہے کہ بغیر ماں باپ کے بھی یہ سلسلہ چلائے۔ جیسے ابتدائے آفرینش کے وقت کیا تھا۔ پھر تیسری تقدیر یہ کہ ماں باپ میں سے مثلاً باپ نہ ہو۔ اور صرف ماں سے بچہ پیدا ہو جائے۔ ہاں کثرت قلت کی اور بات ہے۔ کہ کونسی تقدیر کس زمانہ اور کن حالات میں جاری ہوتی ہے اور کونسی بکثرت رائج ہے۔ اور کونسی کم۔ مگر ہم اسے بھی سُنت اللہ نہیں کہیں گے۔ یہ تو تقدیر کہلاتی ہے۔ اور ہزاروں تقدیریں ایک کام کے کرنے کی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ کبھی کسی طرح وہ کام ہوتا ہے اور کبھی کسی طرح۔ اور کبھی ایک زمانہ میں ہی کئی مختلف طریقوں سے۔

"سنت اللہ" برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی وہ عادت ہے۔ جو ہمیشہ ایک ہی طرح جاری ہوتی ہے۔ اور کسی زمانہ میں اور کبھی بھی اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ نہ اس کے

خلاف کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی اور عادت ثابت ہے۔ کیونکہ سُنت اللہ بموجب کلام الٰہی کے خود اللہ تعالیٰ کی طرح ایک غیر متبدل چیز ہے۔ کسی بات کو سنت اللہ ثابت کرنے کے لئے یہ کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے کلام میں اس کی بابت صرف اتنا ذکر پایا جائے۔ کہ میں ایسا کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ صرف یہ آیت پیش کرنے سے کہ خدا تعالیٰ ماں باپ سے انسانی بچہ پیدا کرتا ہے۔ یہ بات "سنتہ اللہ" نہیں کہلائے گی۔ سنتہ اللہ یہ اس وقت کہلاتی جب تحدی کے ساتھ اور حتمی طور پر یہ ذکر ہوتا۔ کہ آدم کے بعد پھر خدا تعالیٰ ہرگز کبھی اس دنیا میں انسان کو سوائے ماں باپ کے ملنے کے اور کسی طریق سے پیدا نہیں کرے گا۔ کیونکہ سُنت اللہ ہمیشہ متحدیانہ الفاظ میں بیان کی جاتی ہے۔ مثلاً مُردوں کے دنیا میں واپس نہ آنے کی بابت جو قانون ہے وہ سنت اللہ کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ ان زوردار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَهْلَکْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (الانبیاء ۹۶)

یعنی ہم نے قطعی حرام کر دیا ہے کہ جو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ وہ ہرگز ہرگز اس دنیا میں کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اسی طرح آسمان پر کسی بشر کے نہ جاسکنے کی بابت جو فرمان ہے وہ بھی ایک سُنتہ اللہ ہے۔ کیونکہ وہ بہ تحدی تمام بیان کرتا ہے کہ

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۹۴)

ترجمہ: تُو (انھیں) کہہ (کہ) میرا رب (ایسی بے ہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے) پاک ہے۔ میں (تو) صرف بشر رسول ہوں (آسمان پر نہیں جاسکتا)۔

اسی طرح رسولوں کے غلبہ کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنی سُنت ان تاکیدی الفاظ میں فرماتا ہے۔

کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (المجادلہ ۲۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے ذمہ فرض قرار دے لیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ

ہی غالب ہوں گے۔ اسی طرح یہ بات کہ رسولوں کے علاوہ کسی کو ہرگز ہرگز اظہار علی الغیب یعنی کثرت سے غیب کا علم نہیں دیا جاتا۔ یہ بھی ایک سُنتہ اللہ ہے۔ اوران پُر شوکت الفاظ میں اس کا ذکر ہے۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

(الجن: ۲۷، ۲۸)

ترجمہ: اور وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا سوائے ایسے رسول کے جس کو وہ اس کام کے لئے پسند کر لیتا ہے۔

بعض جگہ تو اللہ تعالیٰ ایسی متحدیانہ بات کے بعد خود ہی فرما دیتا ہے۔ کہ یہ ہماری سُنت ہے۔ اس لئے غیر متبدل ہے۔ مثلاً یہ کہ جب کوئی نبی وطن سے نکالا جاتا ہے۔ تو تھوڑی مدت کے بعد ہی اس شہر پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کی دائمی سُنّت ہے۔ اسی طرح یہ کہ خدا کے نبی اس کے سب حکموں کو مانتے ہیں۔ اور ان پر عمل کرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اسی طرح منافق اور نبی کے بدخواہ اس کے شہر سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کو کہیں بھی چین نہیں ملا کرتا۔ اسی طرح جب کفار پر عذاب نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔ تو پھر خواہ وہ توبہ بھی کریں وہ عذاب واپس نہیں کیا جاتا۔ پھر ایک سُنت اللہ یہ ہے کہ جب مومن خدا کے حکم کے ماتحت جہاد کرتے ہیں۔ تو مقابلہ پر کفار ہمیشہ شکست ہی کھاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کبھی سچے مسلمانوں کے معاندین کی مدد نہیں کرتا۔ اور ہمیشہ ان مخالفین پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔

اب یہ سب آیات دیکھ لو۔ اور قرآن مجید میں جو باتیں سنتہ اللہ کہہ کر بیان کی گئی ہیں۔ ان پر بھی روشنی ڈال کر دیکھ لو۔ کہ سُنتہ اللہ ہمیشہ غیر متبدل ہوتی ہے۔ ورنہ امان اُٹھ جاتا ہے۔ اور جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں رہتی۔ اور وہ اس تحدی سے بیان کی جاتی ہے کہ سوائے اس کے چارہ نہیں رہتا۔ کہ وہ ایسا محکم مضبوط بیان خود خدا کی طرف سے ہے۔

جس میں سوائے ایک کے باقی سب راستے بند کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بطور نمونہ چند باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پس یہ یا ایسی ہی اور بعض عادات الٰہی سُنتہ اللہ کہلاتی ہیں۔ اور وہ تھوڑی ہیں۔ باقی جس قدر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی تقدیریں یا کام بغیر ایسی تحدی کے بیان کئے ہیں۔ ان کو سُنتہ اللہ کا نام نہیں دینا چاہیئے۔ ان کاموں کو وہ ہزاروں طریقوں اور عجیب در عجیب تقدیروں اور اندازوں سے کرتا ہے۔ وہ اکثر آگ سے جلاتا ہے۔ مگر کبھی اُس کی اس خاصیت کو سلب کر لیتا ہے۔ اکثر انسان کو جوڑے سے پیدا کرتا ہے۔ مگر گاہے گاہے صرف ماں کے ذریعہ سے بھی اس کو پیدا کر دیتا ہے ہمیشہ ایک ہی طریق پر اپنی صفات دکھانے کا پابند نہیں۔ کیونکہ اُس کی طاقتیں غیر محدود ہیں۔ ہاں چند محدود امور میں اس نے یہ پابندی اپنے لئے خود مقرر کر لی ہے۔ کہ فلاں کام میری سنت ہے اور وہ اُس عالم میں غیر متبدل اور غیر متحول رہے گی۔ مگر یہ پابندی کسی زید بکر یا کسی نیچری کی ڈالی ہوئی پابندی نہیں۔ بلکہ خود خدا نے ہی اپنے لئے ایسا تجویز کیا ہے

پس ہم کو قدرت کے ہر امر کے لئے سُنت اللہ کے الفاظ نہیں بولنے چاہئیں۔ ورنہ ہم خدا کی قدرتوں کو محصور اور اُس کی لاانتہا طاقتوں کو محدود کر دیں گے۔ بلکہ کسی بات کو سنت اللہ کہنے کے لئے ہمیں تین شرطوں کا پابند ہونا پڑے گا۔

۱۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے خود اپنی عادت اپنے کلام میں کسی امر کے متعلق ایسی ہی بیان کی ہو۔ نہ یہ کہ کسی انسان نے اُس کے لئے تجویز کی ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ نہایت متحدیانہ واضح غیر مشتبہ پُرشوکت اور قطعی الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہو کہ الفاظ سے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ اُس کی عادت بلا استثناء غیر متبدل اور حتمی ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ہمیں بھی جہاں تک خدا کی سُنت کا علم اُس کے اپنے کلام اور تاریخ اور مشاہدہ سے حاصل ہوا ہو۔ وہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی اس

کے بر خلاف نہیں کیا۔

نیز یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اگر خدا کی ہر تقدیر کو سُنت اللہ کا نام دے دیا جائے تو بعض آیات میں ہمیں بہت مشکل پڑے گی۔ مثلاً سورۃ علق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کو ہم نے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ دیئے۔ اگر یہ سنت اللہ مان لی جائے تو ہمیں یہ مشکل ہو گی۔ ہر وہ انسان جس کی دو آنکھیں نہ ہوں۔ اس کو انسانوں کی جماعت سے خارج کرنا پڑے گا۔ پس یہاں ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی عام تقدیر یہی ہے۔ اور اس میں استثناء ہو بھی سکتا ہے۔ کثرت پر اس کا اثر ہے۔ اگر یہ سنت اللہ ہوتی تو پھر اس میں استثناء کی گنجائش نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سُنت کے بیان کے وقت اس کی یہ تعریف کی ہے۔ کہ سُنت اللہ میں تبدیل اور تحویل نہیں ہوا کرتی۔ ہاں تقدیر الٰہی متعدد الگ الگ طریقوں سے ایک ہی بات میں ظاہر ہو سکتی ہے اور وہ بکثرت تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے۔

بالآخر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جسے عام لوگ قانون قدرت کہتے ہیں اُسی کو تقدیر الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ نہ کہ سُنت اللہ۔

(الفضل ۲۶ نومبر ۱۹۴۳ء)

ذکرِ الٰہی

خدا کے ذکر سے ذاکر کی رُوح زندہ رہتی ہے۔ خدا تعالیٰ اُس کی دُعائیں قبول کرتا ہے اور اُسے معزز و مکرم بناتا ہے۔ اُس کے گناہ بخشتا ہے۔ خدا کی محبت اُسے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اور خود اُس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت بڑھتی جاتی ہے اور ملائکہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔

ذکر کی قسمیں

ذکر کی قسمیں بہت ہیں مثلاً دُعا بھی ذکر ہے اور دُعا میں استغفار بھی شامل ہے۔ تعوذ بھی دُعا ہے۔ درودِ شریف بھی دُعا ہے۔ مگر مَیں اُس قسم کا ذکر یہاں نہیں کروں گا۔ اسی طرح نماز اور قرآن پڑھنا بھی اعلیٰ ترین اذکار میں داخل ہیں۔ مگر یہاں ان کا ذکر بھی نہیں ہوگا۔

سب سے بڑا ذکر انسان کے لئے خدا تعالیٰ کی صفات کا بیان کرنا ہے۔ پہلے یہ کہ وہ ہے۔ پھر یہ کہ وہ اکیلا ہے۔ ازلی ابدی ہے۔ پھر یہ کہ کس طرح وہ کارخانہ عالم چلاتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ ربوبیت کرتا ہے، رحم کرتا ہے، انصاف کرتا ہے، ہر چیز پر کامل حکمرانی اسی کے لئے ہے، کامل علم اور کامل قدرت اُسی کے شایاں ہے، غرض بے حد صفات اس ذاتِ پاک کی دنیا میں ہمارے ذکر اور فکر کے لئے ہیں۔ اور یہی ذکر اعلیٰ درجہ کے لوگوں صاحبِ عقل انسانوں اور صاحبِ علم و معرفت بزرگوں کے مناسب حال ہے۔ پہلے یہ اصحاب صفاتِ الٰہی میں فکر کرتے ہیں۔ پھر پبلک میں بذریعہ تحریر و تقریر ان باتوں کا ذکر پھیلاتے ہے۔ اس جگہ میں اس قسم کے ذکر و فکر کا بیان بھی نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ ایک لاانتہا سمندر ہے اور اس کے اصل غوّاص انبیاء علیہم السلام ہیں۔

عام لوگوں میں مشہور ذکر

ہاں عوام الناس کے لئے جو ذکر مشہور ہیں۔ میں ان کو مختصر طور پر بیان کر دوں گا اور وہ چار ہیں۔ ۱۔ تسبیح ۲۔ تحمید ۳۔ تہلیل ۴۔ تکبیر

۱۔ تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہر نقص، ہر عیب اور ہر کمزوری سے پاک ہیں۔

۲۔ تحمید کے معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات نہایت اعلیٰ، نہایت عمدہ، نہایت قابلِ ستائش اور نہایت درجہ کا حسن و احسان اپنے اندر رکھتی ہیں۔

۳۔ تہلیل کے معنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا کوئی محبوب اور معبود نہیں۔ گویا یہ توحید کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کے لاثانی ہونے کا اقرار اور بیان ہے۔

۴۔ تکبیر اس کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ حسنہ کا مالک اور جملہ کمزوریوں اور رذائل سے پاک ہی نہیں۔ بلکہ اس کی سبوحیت اور محامد اس درجہ بلند اعلیٰ اکبر اور اعظم ہیں۔ کہ ان کا اندازہ کوئی عقل کر ہی نہیں سکتی۔

پس عُرفاً جو فقرات ذکرِ الٰہی کہلاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ تسبیح۔ سُبْحَانَ اللّٰہ (اللہ پاک ہے)

۲۔ تحمید۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں)

۳۔ تہلیل۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے)

۴۔ تکبیر۔ اَللّٰہُ اَکْبَر (اللہ سب سے بڑا ہے)

اب خواہ آپ سُبْحَانَ اللّٰہ پڑھتے رہیں۔ خواہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہتے رہیں۔ خواہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ورد کرتے رہیں خواہ اَللّٰہُ اَکْبَر فرماتے رہیں۔ یہ سب ذکرِ الٰہی محسوب ہوگا۔ اور اگر چاہیں تو چاروں اذکار کو ملا کر بھی پڑھ سکتے ہیں مثلاً سُبْحَانَ اللّٰہ وَالْحَمْدُ لِلّٰہ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وَاللّٰہُ

اَکْـبَر" اس طرح ملا کر پڑھنا ایک کامل اور جامع اور مختصر ذکر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم بھی ایک جامع ذکر ہے۔ جس کی احادیث میں بہت تعریف آئی ہے۔ کیونکہ اس میں تسبیح اور تحمید اور تکبیر تین ذکر داخل ہیں۔ پس خواہ کوئی الگ الگ یہ کلمات ذکر پڑھے۔ خواہ ملا کر۔ عام ذکر الٰہی انہی چار کلمات میں محدود ہے اور چار ول اذکار والا کلمہ اور اس کے بعد تین اذکار والا جامع کلمہ الگ الگ اذکار پر فضیلت رکھتا ہے۔ اور ان پہ وقت بھی تھوڑا خرچ ہوتا ہے۔

ان اذکار کے سوا اسماء و صفاتِ الٰہی کا ذکر بھی ذکر الٰہی ہی ہے۔ مگر وہ جامع نہیں ہے۔ بلکہ وہ کلمات اکثر فکر کرنے اور تفصیلی ذکر الٰہی کے لئے ہیں۔ جامع اور مجمل ذکر یہی ہیں۔ جن کے ماتحت باقی سب اذکار بطور شاخ کے ہیں۔ ایک نہایت عمدہ تفصیلی ذکر وہ ہے جس میں خدا تعالیٰ کی ننانوے صفات کا بیان ہے اور جس کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ فرمایا ہے۔ کہ جو شخص ان ننانوے اسمائے الٰہیہ کو یاد کرلے گا وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ ذکر میں اس مضمون کے آخر میں درج کروں گا۔

ایک مشہور کلمہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ بھی اذکار میں داخل ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی دعا ہی ہے جس طرح کہ تعوذ یا استغفار

سب سے اعلیٰ ذکر

یہ بیان پڑھنے کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ کے نزدیک سب سے اعلیٰ ذکر کونسا ہے۔ تو میں یہی جواب دوں گا کہ سب اذکار یعنی تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر نیز تعوذ۔ لاحول۔ استغفار اور درود ضرور اپنے اپنے موقعوں پر کرنے چاہئیں۔ لیکن ذکرِ الٰہی اور دُعا اور قرآن تینوں کو ملا کر ایک عجیب معجون مرکب خدا کی طرف سے بھی نازل ہوئی ہے۔ اور میرے نزدیک وہ سب سے اعلیٰ ترین ذکر ہے اور اس ذکر کا نام ہے سورۃ فاتحہ یہ مختصر سورۃ ہر قسم کے

ذکر اور ہر قسم کی دُعا پر حاوی ہے۔ اور بلحاظ فضیلت کے میرے علم میں تمام ادعیہ اور تمام اذکار اور تمام اوراد سے افضل اور اعلیٰ درجہ رکھتی ہے۔

ذکرِ الٰہی کا ایک عجیب فائدہ آخرت میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنّت جو انسان کو آخرت میں ملے گی وہ اس طرح کی ہوگی جس طرح یہاں زمینداروں کے مربعے یا مصفّٰی کردہ نرم زمین کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ پھر جس قدر ایک مومن ذکرِ الٰہی کرے گا۔ ہر کلمہ کے بدلہ اس کے لئے اس زمین میں ایک درخت لگا دیا جائے گا۔ پس تمہیں لازم ہے کہ اپنی جنت کو بارونق بناؤ۔ اور اس میں خوب درخت کاشت کرو۔ تاکہ جب تم اگلے جہان میں پہنچو تو سپاٹ زمین کی جگہ تم کو لگا لگایا سرسبز خوشبودار باثمر اور بارونق باغ ملے۔ لوگ پھل دار اور پھول دار درختوں کے لئے دنیا میں کتنی کتنی محنتیں کرتے ہیں۔ لیکن اگر ایک کلمہ سبحان اللہ کے کہنے سے تمہاری جنت میں سیب یا آم یا سنگترہ یا مالٹا کا ایک درخت پیدا ہو جائے۔ تو کیا یہ مہنگا سودا ہے؟ پس ذکرِ الٰہی سے زبان کو تر اور دل کو گرم رکھو۔ اور اپنی جنّت کے مربعوں کو آباد کرو۔ تاکہ دنیا اور آخرت میں فائدہ اٹھاؤ۔

اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفات

اب میں وہ تفصیلی ذکرِ الٰہی جس میں اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفات کا بیان ہے۔ لکھتا ہوں۔ یہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا وظیفہ ہے بلکہ اس ذکر سے اللہ تعالیٰ کی اکثر صفاتِ عالیہ انسان کے زیرِ نظر رہتی ہیں۔ اور اسے اسماءِ باری کے متعلق وسیع علم حاصل ہوتا ہے جو مجمل اذکار سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں

اَلرَّحْمٰنُ بخشش کرنے والا	اَلرَّحِیْمُ مہربان	اَلْمَلِكُ بادشاہ	اَلْقُدُّوْسُ نہایت پاک
اَلسَّلَامُ سلامت و بے عیب	اَلْمُؤْمِنُ امن دینے والا	اَلْمُهَيْمِنُ نگہبان	اَلْعَزِيْزُ غالب
اَلْجَبَّارُ شکستہ کی مرمت کرنیوالا	اَلْمُتَكَبِّرُ بڑائی والا	اَلْخَالِقُ عدم سے وجود میں لانے والا	اَلْبَارِئُ پیدا کرنے والا
اَلْمُصَوِّرُ صورت بنانے والا	اَلْغَفَّارُ بخشنے والا	اَلْقَهَّارُ زبردست	اَلْوَهَّابُ بہت دینے والا
اَلرَّزَّاقُ رزق دینے والا	اَلْفَتَّاحُ کھولنے والا	اَلْعَلِيْمُ علم والا	اَلْقَابِضُ تنگی کرنے والا
اَلْبَاسِطُ فراخی کرنے والا	اَلْخَافِضُ پست کرنے والا	اَلرَّافِعُ بلند کرنے والا	اَلْمُعِزُّ عزت دینے والا
اَلْمُذِلُّ ذلت دینے والا	اَلسَّمِيْعُ سننے والا	اَلْبَصِيْرُ دیکھنے والا	اَلْحَكَمُ فیصلہ کرنے والا
اَلْعَدْلُ عدل کرنے والا	اَللَّطِيْفُ باریک بین	اَلْخَبِيْرُ خبردار	اَلْحَلِيْمُ بردبار
اَلْعَظِيْمُ صاحب عظمت	اَلْغَفُوْرُ بہت بخشنے والا	اَلشَّكُوْرُ قدردان	اَلْعَلِيُّ بلند مرتبہ

الکبیر بڑا	الحفیظ حفاظت کرنے والا	المقیت رزق پیدا کرنے والا	الحسیب کفایت کرنے والا
الجلیل بزرگ قدر	الکریم بڑا سخی	الرقیب نگہبان	المجیب دُعا قبول کرنے والا
الواسع وسیع علم و قدرت والا	الحکیم حکمت والا	الودود محبت کرنے والا	المجید عالی شان
الباعث مردوں کو اٹھانے والا	الشہید ہر جگہ حاضر	الحق حق	الوکیل کارساز
القوی قوی	المتین استوار	الولی مددگار	الحمید تعریف کے قابل
المحصی گھیرنے والا	المبدئ پہلی دفعہ پیدا کرنے والا	المعید دوبارہ پیدا کرنے والا	المحیی زندہ کرنے والا
الممیت مارنے والا	الحی زندہ	القیوم قائم رکھنے والا	الواجد غنی
الماجد بزرگ	الواحد ایک	الاحد یکتا	الصمد بے پرواہ
القادر قادر	المقتدر قدرتیں ظاہر کرنے والا	المقدم آگے کرنے والا	المؤخر پیچھے کرنے والا
الاول سب سے پہلے	الآخر سب سے پیچھے	الظاہر سب سے اوپر	الباطن سب سے مخفی

اَلْوَالِیُ کارساز	اَلْمُتَعَالِیُ بہت بلند	اَلْبِرُّ محسن	اَلتَّوَّابُ توبہ قبول کرنے والا
اَلْمُنْتَقِمُ بدلہ لینے والا	اَلْعَفُوُّ معاف کرنے والا	اَلرَّؤُوْفُ بہت ہی شفیق	مَالِكُ الْمُلْكِ مُلک کا مالک
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ صاحب بزرگی اور عظمت کا		اَلْمُقْسِطُ منصف	اَلْجَامِعُ جمع کرنے والا
اَلْغَنِیُّ بے احتیاج	اَلْمُغْنِیُّ غنی کرنے والا	اَلنَّافِعُ نفع دینے والا	اَلضَّآرُّ نقصان دینے والا
اَلْمَانِعُ باز رکھنے والا	اَلنُّوْرُ نُور	اَلْهَادِیُّ ہدایت دینے والا	اَلْبَدِیْعُ نئی نئی طرح سے پیدا کرنے والا
اَلْبَاقِیُ ہمیشہ رہنے والا	اَلْوَارِثُ سب کا وارث	اَلرَّشِیْدُ راہ نما	اَلصَّبُوْرُ بہت صبر کرنے والا

رکھ زباں کو ذکر سے مولیٰ کے تر — تا زباں سے رُوح میں پہنچے اثر
دِل بھی سیدھا کر کہیں ایسا نہ ہو — بر زباں تسبیح و در دِل گاؤ خر

ذکرِ الٰہی کے گزشتہ بیان میں خاکسار نے لکھا تھا کہ اگرچہ ذکر کی کئی قسمیں ہیں۔ نماز بھی ذکر ہے۔ قرآن کی تلاوت بھی ذکر ہے۔ دُعا بھی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان بھی ذکر ہے۔ مگر عرفاً ایک عمل ذکر جس میں تسبیح و تحمید تہلیل اور تکبیر کے فقرات ہوں۔ ذکرِ الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ مثلاً

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔ یا سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ یا ان فقرات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ذکر کرنا۔ یہ ذکر زبان سے بار بار کئے جاتے ہیں اور صرف انہیں رٹتے جانا مگر مطلب نہ سمجھنا ان کے فائدہ کو بہت کم کر دیتا ہے۔ اصل فائدہ ان فقرات کا جب ہوتا ہے کہ انسان علاوہ زبانی ذکر کے غور و فکر کر کے ان کا حقیقی مطلب بھی سمجھے ۔

تسبیح

مثلاً تسبیح کو ہی لے لو۔ یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ پڑھنا۔ اس مجمل فقرہ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب ہر کمزوری اور ہر نقص سے پاک ہے۔ لیکن اگر عقلی طور پر تسبیح پڑھنے والا ان نقائص اور عیوب کو خود ہی نہ سمجھتا ہو۔ جن سے خدا تعالیٰ کی ذات منزہ ہے۔ تو یہ عین ممکن ہے کہ منہ سے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پاک کہتا ہو۔ مگر اعتقاداً وہ خدا تعالیٰ کی صفات میں عیب اور نقص کا قائل ہو۔ مثلاً ایک سبحان اللہ کہنے والا شخص ممکن ہے کہ تجسم اور حلول کا قائل ہو یا خدا کے برابر کسی اور مخلوق کا درجہ سمجھتا ہو۔ یا دُعا کا قائل نہ ہو۔ یا اپنے کسی عزیز کے مرنے پر خدا کو ظالم کہتا ہو۔ یا خدا تعالیٰ کو محدود العلم یا محدود القدرت سمجھتا ہو۔ پس آپ ہی غور کر لیں۔ کہ ایسے آدمی کا سبحان اللہ کہنا فضول گوئی ہوگا یا نہیں؟ اس لئے ضروری ہے کہ ہر شخص جو تسبیح پڑھتا ہو۔ اس کے لئے حسب ذیل اعتقادات کا سمجھنا اور خدا تعالےٰ کے تقدس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ سُبْحَانَ اللّٰہ پڑھنا ایک اَمرِ بے فائدہ ہوگا۔ اور وہ اعتقادات یہ ہیں۔

۱۔ خدا تعالےٰ کبھی ظلم نہیں کرتا ۔

۲۔ خدا تعالیٰ مددگار کفو اور شریک کا محتاج نہیں۔

۳۔ خدا تعالیٰ کا علم ناقص نہیں۔ بلکہ وہ ہر زمانہ کا تفصیلی علم اشیاء کے متعلق رکھتا ہے

۴۔ خدا تعالیٰ جسم سے پاک ہے ۔

۵۔ کوئی بھی اس کو اپنی قدرت اور فعل کے اظہار سے روک نہیں سکتا ۔
۶۔ وہ خلق کرنے میں روح و مادہ کا محتاج نہیں ۔
۷۔ نہ وہ اونگھتا ہے نہ سوتا ہے ۔
۸۔ کوئی اس کے حضور سفارش نہیں کر سکتا بغیر اجازت کے ۔
۹۔ اس کو کسی کی عبادت کی احتیاج نہیں ۔
۱۰۔ وہ پاک ہے اس بات سے کہ اس کی قدرتوں کا کوئی احاطہ کر سکے ۔
۱۱۔ وہ کسی جسمانی تخت یا کرسی پر بیٹھا ہوا نہیں ہے ۔
۱۲۔ نہ وہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے ۔
۱۳۔ وہ پاک ہے ان عیوب سے جو اس کے شان کے برخلاف ہوں مثلاً جھوٹ بولنا خودکشی کرنا ۔ مرنا ۔ اپنے جیسا ایک اور خدا پیدا کرنا ۔ بیوی بچے اختیار کرنا جنم لینا ۔ بھول جانا تھک جانا ۔ ناقص اور باطل مخلوقات پیدا کرنا علم و حکمت کے برخلاف کام کرنا بخل کرنا ۔ بندوں کی ہدایت کے سامان مہیا نہ کرنا ۔ گناہ معاف نہ کر سکنا ۔ غافل ہونا ۔ اس کے جوارح کا انسانی اعضا کی طرح ہونا ۔ اس کے غضب کا اس کی رحمت پر غالب ہونا کسی کا اس کی مثل ہونا یا اس کا کسی کی مثل ہونا ۔ زوال پذیر یا تغیر پذیر ہونا وغیرہ وغیرہ

تحمید

تحمید کے معنے الحمد للہ کے ہیں مگر ساتھ ہی یہ اعتقاد بھی ضروری ہے ۔ کہ واقعی جیسا کہ میں زبان سے کہتا ہوں ۔ ویسے ہی خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو قابلِ ستائش قابلِ تعریف اور قابلِ حمد بھی یقین کرتا ہوں ۔ اور نہ صرف اُسے ہر کمزوری اور عیب سے پاک سمجھتا ہوں ۔ بلکہ مزید براں اس کی صفات کو بھی نہایت اعلیٰ اور نہایت پسندیدہ خیال کرتا ہوں ۔ ورنہ صرف منہ سے الحمد للہ کہنا اور اعتقاداً اسے رحیم کریم مالک رب اور شافی نہ سمجھنا تحمید کے اصول کے برخلاف

ہے۔اور خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل سے بھی یہ سمجھا جائے کہ وہ ذاتِ بابرکات رب العالمین ہے رحمٰن ہے رحیم ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ہے۔ ہر آواز کو سنتا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ ہر بات کی خبر رکھتا ہے۔ دعاؤں کو قبول کرتا ہے اپنے بندوں سے کلام کرتا اور ان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا ہر فعل حق و حکمت پر مبنی ہے۔ وہی سب کو رزق دیتا ہے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ مارتا ہے اور پھر دوسرے عالم میں زندہ کرتا ہے۔ خود ہمیشہ رہنے والی ہستی ہے بشکستہ کی مرمت کرنے والا بیمار کو شفا بخشنے والا ہر طرح کی قدرت رکھنے والا۔ محدود اعمال کے بدلہ ابدی جزا دینے والا یحکم مایشاء فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (ہود:۱۰۸) بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ شہنشاہ سب پر غالب بے حد سخی۔ منصف ابدی۔ عالی شان۔ عالم کا قیوم فیض رساں مصلح روزی رساں۔ درگذر کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا۔ اکیلا۔ غنی نفیس مخفی مالا متہا۔ طاقتور، حلیم، قدردان، ذرہ ذرہ کا اندازہ اور حساب رکھنے والا۔ محبت کرنے والا ناصر قدوس، ازلاً ابداً غیر محدود اسب سے زیادہ ظاہر اور سب سے بڑھ کر مخفی۔ ہر جگہ حاضر ناظر اور جس کا عذاب بھی اس کی رحمت کی ایک شاخ ہے۔ غرض اس قسم کے محامد پر ایمان لانا اور خدا تعالیٰ کی اعلیٰ صفات پر یقین کر کے اسکی تحمید کے وقت ان باتوں کو مدِ نظر رکھنا ہی تو اصل ذکر ہے ورنہ ایک طوطے کے الحمد للہ کہنے اور کسی انسان کے الحمد للہ کہنے میں کوئی فرق نہیں۔

تکبیر

جس طرح تسبیح کے معنے خدا کو عیبوں سے پاک سمجھنے کے ہیں۔ اور تحمید کے معنی خدا کی تعریف بیان کرنے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح تکبیر کے معنے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ اپنی پاکی اور تعریف میں سب سے بڑھ کر ہے۔ یعنی وہ رحیم ہے۔ تو اس کا رحم تمام مخلوقات کے رحم سے بڑھ کر اور وسیع ہے۔ اگر وہ رب ہے تو اس کی ربوبیت تمام عالمین پر چھائی ہوئی ہے اور دیگر ربوبیت

کرنے والوں کی ربوبیت سے بے انتہا وسیع ہے۔ اگر اس کا علم ہے۔ تو وہ غیر محدود اور ہر چیز
پر ہر وقت حاوی ہے۔ اور علم رکھنے والی دوسری مخلوقات سے بے انتہا درجے زیادہ بڑھا
ہوا ہے۔ غرض یہ کہ وہ اپنی سبوحیت اور قابلِ تعریف صفات میں اکبر ہے۔ یعنی سب سے بعید
زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اگر حاتم کی سخاوت مشہور ہے تو خدا کی سخاوت اکبر ہے۔ اگر رستم کی طاقت
بہت تھی۔ تو خدا کی اکبر ہے۔ اگر دنیا میں کسی انسان کا علم بہت وسیع ہے تو خدا کا علم اس سے بھی
اکبر ہے۔ بلکہ قابلِ تعریف چیز جو کسی کے پاس ہے وہ خدا ہی کی بخشش اور اسی کے خزانہ کا ایک
عطیہ ہے۔ پس جو خوبی بھی جہاں کہیں نظر آتی ہے وہ خدا میں بدرجۂ اعلیٰ کامل واتم پائی جاتی ہے
بلکہ اس کی صفات منبع ہے مخلوقات کی ہر خوبی کا۔ بلکہ اس کا حُسن اصل ہے کائنات کے حسن کا۔
پس اللہ اکبر کہتے وقت سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم پڑھتے وقت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی وسعت!
اُن کی بڑائی اور عظمت کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ صفات میں عظمت اور کبریائی
والے اسمار تعداد عددی سب سے زیادہ وارد ہوئے۔ مثلاً کَبِیْرٌ، عَظِیْمٌ۔ مُتَکَبِّرٌ،
وَاسِعٌ۔ مَجِیْدٌ۔ مَاجِدٌ۔ الْمُتَعَالِیْ۔ ذُوالْجَلَالِ۔ اعلیٰ۔ رفیع الدرجات۔
ذوالمعارج وغیرہ۔ غرض اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں جب تک پڑھنے والا خدا تعالیٰ
کو اپنی صفاتِ حمیدہ میں عظیم الشان لاانتہا غیر محدود اور واقعی اکبر نہ سمجھے۔

تہلیل

تہلیل کے معنی ہیں لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا ذکر کرنا یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت
نہیں۔ وہی اکیلا وجود ہے جو ہمارا محبوب اور معبود ہو سکتا ہے اور ہے۔ چونکہ اس کی ذات
ہر عیب سے پاک اور ہر تعریف سے آراستہ ہے۔ اور ہر تقدس اور ہر خوبی اس کی لاانتہا،
غیر محدود اور اکبر ہے جس تک کوئی غیر اللہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے نتیجہ ظاہر ہے کہ اس کے
سوا ہمارا کوئی معبود بھی نہیں ہو سکتا اور یہی توحید ہے۔ جب وہی ہمارا خالق ہے اور وہی ہمارا

میں۔ وہی ہمارا قیوم ہے اور وہی ہمارا رزاق۔ وہی ہمارا مشکل کشا ہے اور وہی ہمارا رب۔ وہی ہروقت ہمارے جسم کی مشین کو چلاتا۔ ہمارے اعمال کو محفوظ رکھتا۔ ہماری روح کو اپنی نعمتوں کی لذتوں سے مسرور کرتا ہے۔ ہماری ضرورتوں کو برلاتا۔ اور ہماری دعاؤں کو سنتا ہے۔ اور ہم ہر لحظہ اسی کی حفاظت اور نگرانی کے محتاج ہیں۔ تو پھر اس کے سوا کون ہے جو ہمارا محبوب اور معبود ہو سکے۔ یا ہم کسی اور آستانہ سے اپنی امید باندھ سکیں۔ اسی کا نام تہلیل ہے

پس لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر اس قسم کے یقین اور اس طرح کی ذہنیت کے ساتھ کرو۔ تا کہ تم حقیقی موحّد ہو۔ اور تمہارے اوراد و اذکار نہ صرف تمہاری زبان ہی پر حاوی ہوں بلکہ تمہاری رُوح کو بھی روشن اور منور کر سکیں۔ آمین

کچھ اسمائے الٰہی ایسے ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی تسبیح ہوتی ہے۔ مثلاً قُدُّوسٌ، حَيٌّ غَنِيٌّ۔ صَمَدٌ وغیرہ۔ کچھ ایسے ہیں جن سے اس کی تحمید ہوتی ہے۔ مثلاً رَحْمٰن، رَحِیم، خَالِقٌ رَبٌّ۔ عَلِیم۔ حَکِیم۔ رَزَّاقٌ۔ وَهَّابٌ، غَفُوْرٌ وغیرہ۔ کچھ ایسے ہیں۔ جن سے ان کی تعظیم اور کبریائی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً مُتَکَبِّر۔ علیّ۔ عَظِیم۔ مَجِیْدٌ۔ مَاجِدٌ وغیرہ۔ اور کچھ ایسے ہیں جن سے اس کی توحید کا علم حاصل ہوتا ہے مثلاً وَاحِدٌ۔ اَحَدٌ۔

لیکن ایک حصہ اسماء و صفاتِ الٰہی کا اسلام نے ایسا بھی پیش کیا ہے۔ جس پر مخالف لوگ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کا دفع کرنا اور ان صفات کے صحیح معنوں کا پیش کرنا بھی تسبیح میں داخل ہے۔ بلکہ موجودہ زمانہ میں یہی سب سے اعلیٰ قسم کی تسبیح ہے۔ جن اسماء و صفات پر لوگ اعتراض کرتے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔ خَادِعٌ۔ کید کرنے والا۔ اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ والا صاحب کُرسی۔ غضب کرنے والا۔ دھوکہ کھا جانے والا۔ ہاتھ۔ ساق۔ وجہ۔ یدین وغیرہ اعضا والا۔ لعنت کرنے والا۔ مُضِلّ یعنی گمراہ کرنے والا۔ مہر لگانے والا دلوں کانوں اور آنکھوں پر۔

قَہَّارُ۔ جَبَّارُ۔ مُنْتَقِمُ استہزا کرنے والا۔ تکلیف دینے والا۔ ایذا پانے والا۔ بھول جانے والا متکبر وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن وحدیث میں اس قسم کے الفاظ ضرور آئے ہیں لیکن ان کے معنی کرتے وقت معترض اپنی ناسمجھی کی وجہ سے بعض غلطیوں کے مرتکب ہو کر اور کلام الٰہی کا یا عربی زبان کا اصل مطلب نہ سمجھ کر ان کو لے دوڑتے ہیں۔ نہ تو موقعہ محل اور استعارہ اور حسنِ بیان کا خیال رکھتے ہیں۔ نہ اُن اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں جو صفاتِ الٰہی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور نہ لغت عربی کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے ضرور ہوا کہ پہلے وہ اصول بیان کئے جائیں جن کے نہ سمجھنے سے لوگ ایسے اعتراض صفاتِ باری پر کرتے ہیں۔ اور یہ اصول قرآنِ مجید نے ہی خود بیان کر دیئے ہیں۔

۱۔ پہلا اصل یہ ہے

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاعراف: ۱۸۱)

یعنی اللہ کے سب اسماء میں حسن و خوبی ہی ہے۔ اگر کوئی معنے کسی کمزوری یا عیب یا نقص کے حامل ہوں۔ تو وہ جائز نہ ہوں گے۔ اور یہی صفاتِ الٰہی کے سمجھنے کا سارا رانہ ہے۔ یعنی اسماء الٰہی کے معانی ہمیشہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور شان کے مطابق کرنے چاہئیں۔

۲۔ دوسرا اصل یہ ہے کہ

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ: ۱۲)

ترجمہ: اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ بہت سُننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

یعنی گو الفاظ کا اشتراک ہو مگر خدا تعالیٰ اپنی صفات میں دوسروں کی صفات سے مشابہت نہیں رکھتا۔ مثلاً انسان بھی سمیع و بصیر ہے اور خدا بھی سمیع و بصیر ہے۔ لیکن انسان کے سمع اور بصر محدود ہیں۔ دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ خاص خاص اعضاء کے محتاج ہیں۔ انسان اپنے سننے اور دیکھنے میں ہوا اور روشنی کے بغیر لاچار ہے۔ پس یہ الفاظ سمجھانے کے لئے ہیں۔ ورنہ اس کی اصل حقیقت کا

خدا ہی کو علم ہے۔ جب خدا بے مثل ہے تو اس کی صفات بھی بے مثل ہونی چاہئیں۔

تیسرا اصل یہ ہے کہ عربی الفاظ کے معنی اہل عرب کی لغت کے موافق ہی ہونے چاہئیں۔ نہ یہ کہ لفظ تو عربی کا ہو مگر معنے اردو کے کئے جائیں۔ مکر کید وغیرہ کے الفاظ میں لوگوں کو یہی دھوکا لگا ہے۔

سب سے پہلے میں لغوی معنوں کے نہ سمجھنے سے جو غلطیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا ذکر کروں گا۔ مکر اور کید عربی میں تدبیر اور جنگ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ پس خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ کے معنے ہوئے کہ اعلیٰ تدبیر کرنے والا اور اَکِیْدُ کَیْدًا کا ترجمہ ہوا۔ کہ میں بھی جنگ کروں گا۔ وَھُوَ خَادِعُھُمْ کے معنی ہیں۔ کہ خدا ان کے دھوکہ کی سزا ان کو دے گا۔ یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ کے معنے ہیں کہ منافق لوگ خدا تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں یا بزعم خود دھوکہ دیتے ہیں یا خدا کو ترک کرتے ہیں۔ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالےٰ ایسے مجرموں کو اپنے قرب سے محروم کر دے گا۔ اور اپنی رحمت سے دور دَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ خدا گمراہ انہی کو کرتا ہے جو بدکار، فاسق، بدعہد ہوتے ہیں اور اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ اور دلوں وغیرہ پر بھی انہی لوگوں کے مہر لگاتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر اپنی ہوا ؤہوس کے پیچھے لگ جاتے ہیں (حاشیہ) اسی طرح قَھَّارُ کے معنی غالب کے ہیں نہ کہ ظالم کے اور جَبَّارُ کے معنی بھی شکستہ کی مرمت کرنے والا ہیں۔ نہ کہ ستمگر کے۔ اور مُنْتَقِمُ کے معنی صحیح اور مناسب بدلہ یا سزا دینے والا کے ہیں نہ کہ کینہ نواز کے۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کے معنی اللہ ان کے استہزا کی مناسب سزا ان کو دے گا نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ کے معنی ہیں کہ جب انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو چھوڑ دیا (نَسِیَ بمعنی تَرَكَ) یا انہوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ تو اللہ نے بھی ان کو اس غفلت کی سزا دی۔ مُتَکَبِّر کے معنی عظمت اور کبریائی کا مدعی۔ انسان کے لئے بسبب اس کی کمزوریوں کے اس لفظ کا استعمال اور بڑائی کا دعوےٰ غلط ہے۔ لیکن خدا کے لئے بالکل جائز ہے۔ اسی طرح اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ میں

اللہ کے ایذا دینے کا مطلب ایک استعارہ ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ گویا اپنی طرف سے خدا کو دُکھ دینا چاہتے ہیں۔ ایذا ر پانا، بھُولنا۔ تمسخر کرنا۔ ظلم کرنا۔ کینہ وری۔ فریب دھوکا اور گالیاں دینا خدا تعالیٰ کی شان سے بعید ہیں۔ اور یہ الفاظ بطور استعارہ یا محاورہ کے استعمال کئے گئے ہیں۔

کرُسی کے معنے خود آیت کی رو سے علم کے ہیں۔ اور عرش کے معنی حکومت کے غضب کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح انسان غصّہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور جوش میں اس کے ہوش بجا نہیں رہتے اور اس پر ایک تغیر آجاتا ہے۔ یہ حالت خدا کی نہیں ہوتی۔ اس پر کوئی تغیّر وارد نہیں ہوتا بلکہ مغضوب کے معنی ہیں خدا کی رضا سے محروم ہو جانا اور خدا کی نعمتوں کا چھن جانا۔ خدا کے ہاتھ سے مراد اس کی طاقت اور قدرت ہے۔ توجّہ سے اس کی توجہ۔ آنکھ سے مراد اس کی صفت لبصر۔ اور ان کی حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے۔ جب اسلام نے خدا کو بے مثل مانا تو لازمًا اس کی صفات کو بھی بے مثل مانا۔ اور یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہیں کہ جس دن حقیقت آشکارا کی جائے گی۔ یا جس دن سخت اضطراب کا وقت ہوگا۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ بعض صفاتِ الٰہیہ آپس میں متضاد ہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک صفت اگر اس کی اچھی ہے تو دوسری جو پہلی صفت کے عین مخالف ہے وہ لازمًا بُری ہوگی۔ اس مشکل کا حل اس طرح پر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے تو اصلی تضاد اس کی صفات میں نہ ہوگا۔ مثلاً اگر وہ رحیم ہے تو وہ بے رحم نہیں ہو سکتا اور جو تکالیف اور مصائب لوگوں پر آتے ہیں وہ اس کی بے رحمی کا نتیجہ نہیں بلکہ انصاف ہیں یا کسی اور پر رحم ہیں یا خود اسی شخص پر رحم ہیں۔ جس کی کُنہ کو ہم فی الفور نہیں پاسکتے۔ نیز بعض قسم کا تضاد معیوب نہیں ہوتا۔ بلکہ موقعہ وقت اور حالات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے ایک بادشاہ کی حکومت میں بعض لوگ شاہی دسترخوان پر بیٹھے ہوتے ہیں اور بعض جیل خانوں میں تکلیف اُٹھا رہے ہوتے ہیں۔ مخلوقاتِ عالم میں جو اختلاف آپس میں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی کمال حکمت کی وجہ سے ہے

نہ کہ ظلم کی وجہ سے ۔

اسمائے الٰہی پر ہونے والے اعتراضات دُور کرنے کے علاوہ ہماری جماعت کا کام ایک اور قسم کی تسبیح بھی ہے ۔ وہ یہ کہ دیگر مذاہب والے اور غیر احمدی یہ عقیدہ رکھتے ہیں ۔ کہ خدا تعالیٰ پہلے زمانہ میں تو کلام کیا کرتا تھا مگر اب نعوذ باللہ گونگا ہو گیا ہے ۔ نہ اب الہام ہو سکتا ہے نہ وحی ۔ گویا ایک بڑا بھاری تعلق جو پہلے خدا کا انسان سے ہوا کرتا تھا ۔ وہ ٹوٹ گیا ہے ۔ اسی طرح بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دُعائیں قبول ہونے اور مطلب پورا کرنے کے لئے نہیں ہیں ۔ صرف ایک قسم کی عبادت ہیں ۔ اس عقیدہ سے جو کچھ رہا سہا واسطہ خدا اور انسان کے درمیان تھا وہ بھی جاتا رہا ۔ سوان صفات کے متعلق اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے اپنی مثال اور قرآنی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ خدا تعالیٰ پہلے جیسے لوگوں سے کلام کیا کرتا تھا اب بھی اُسی طرح بلکہ آئندہ زمانہ میں بھی انسان سے کلام کرتا رہے گا ۔ اور دعائیں قبول کرنا یعنی مجیب ہونا بھی خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے ۔ اگر دعا نہ ہو تو پھر انسان انسان نہیں بلکہ ایک حیوان ہے اور اس کا کوئی رابطہ اور تعلق ذاتِ باری سے نہیں رہتا ۔ نہ اُسے کوئی خدا شناسی حاصل ہو سکتی ہے ۔ اور نہ اُسے خدا پر کوئی اعتماد اور بھروسہ ہو سکتا ہے ۔ نہ وہ کوئی خاص فائدہ بارگاہِ الٰہی سے حاصل کر سکتا ہے ۔

پس یہ دو بڑی صفات یعنی کلام اور قبولیت دُعا ایسی چیزیں ہیں جنہیں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے دُنیا پر ظاہر کر کے خدا تعالیٰ کو دو بڑے عیوب سے پاک ثابت کر کے دکھایا ہے ۔

اسم اعظم ۔ خدا تعالیٰ کا صرف ایک نام اس کا اسم معرفہ یا ذاتی نام ہے اور وہ اللہ ہے ۔ اور یہی اسمِ اعظم ہے ۔ باقی جتنے اسماء ہیں وہ صفاتی ہیں ۔ اللہ کا لفظ بذاتِ خود کوئی معنے نہیں رکھتا ۔ ایک حدیث سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ سے یہ مطلب مستنبط ہوتا ہے ۔ کہ اللہ

وہ وجود ہے جو ہر نقص سے پاک ہر حمد سے آراستہ اور نہایت عظیم الشان ہستی ہے لیکن صرف اللہ اللہ کہتے رہنا کوئی ذکر نہیں۔ جب تک کوئی صفت اس کے ساتھ ذکر نہ کی جائے۔ جیسے سُبْحَانَ اللّٰہِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ یا اَللّٰہُ الشَّافِیْ اَللّٰہُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ پس بغیر کسی صفت کے بیان کے یا بغیر کسی دُعا کے شامل کرنے کے محض اللہ اللہ کہنا مسنون ذکر الٰہی نہیں ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اسلام کے سوا اور کسی مذہب میں خدا تعالیٰ کا کوئی ذاتی نام موجود نہیں ہے۔ مشہور اذکار کے علاوہ جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ بعض اور فقرات بھی ذکر الٰہی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

دیگر مختلف اذکار

۱۔ لك الحمد لا الٰه الا انت الحنّانُ المنّانَ بدیع السمٰوٰتِ والارض یاذوالجلال والاکرام یاحیّ یا قیّوم

۲ لا اله الا ھو الرّحمٰن الرحیم

۳۔ لا الٰہَ الا ھو الحي القیوم

۴۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ

۵۔ اَللّٰہ لا اِلٰہَ الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد۔

۶۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ عدد خلقه ورضٰی نَفْسِہٖ وزنت عرشه

۷۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ۔ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

تعداد ذکر

ذکر کی تعداد دو طرح سے ہوتی ہے۔ ۱۔ انگلیوں پر (۲) تسبیح کے دانوں پر۔ تسبیح کا استعمال نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے نہ صحابہؓ سے۔ نہ میں نے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور ان کے خلفاء کو تسبیح استعمال کرتے دیکھا ہے۔ اگر تسبیح کا استعمال اپنی بزرگی اور ذکر کا رعب جتانے کے لئے ہے تو حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تسبیح اس لئے رکھے۔ کہ ذکر الٰہی کو یاد کراتی رہے۔ اور خاص خاص تعداد ذکر پر عمل ہو سکے اور وہ انگلیوں پر گننا نہ جانتا ہو تو جائز ہے۔ عقد انامل سے اگر ذکر الٰہی کی گنتی کا کام لیا جائے تو انگلیوں پر ہی ایک ہزار تک گنتی ہو سکتی ہے۔ لیکن انگلیوں کی گنتی سوائے خاص لوگوں کے کوئی نہیں جانتا اور اگر کوئی سیکھنا چاہے تو یہ گنتی مشکل نہیں ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انگلیوں پر ہی گننے کی تاکید فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ

علیکن بالتسبیح والتھلیل والتقدیس واعقدن الانامل فانھن مسئولات مستنطقات

یعنی اے عورتو تم تسبیح تہلیل اور تقدیس کیا کرو۔ اور انگلیوں کے ساتھ گنا کرو۔ کیونکہ انگلیاں قیامت میں پوچھی جائیں گی اور ان کو گویا کیا جائے گا۔ (ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ انگلیوں کے پوروں پر ذکر کرنا افضل ہے۔ رہا یہ امر کہ ذکر کی گنتی کس قدر ہو۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ فرض نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے یا بموجب ارشاد حضرت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کم از کم ۱۲، ۱۲ دفعہ تسبیح اور درود شریف کے ذکر کی تعداد کا تعین ثابت نہیں ہے درحقیقت یہی ہے کہ ذکر الٰہی بکثرت اور ہر وقت کرنا ضروری ہے۔

تسبیح اور ذکرِ الٰہی کے اوقات

علاوہ پنج وقتہ نماز یا نوافل کے اندر ذکر کرنے کے (جن کے اوقات مشہور ہیں) حسب ذیل وقتوں میں تسبیح کرنے کی تاکید قرآن مجید میں پائی جاتی ہے۔ ۱۔ صبح کے وقت ۲۔ شام کے وقت ۳۔ دوپہر کے وقت ۴۔ تیسرے پہر ۵۔ طلوع آفتاب سے پہلے ۶۔ غروب آفتاب سے پہلے ۷۔ رات کے درمیانی حصہ میں۔ ۸۔ نمازوں کے بعد۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت خدا کے ذکر میں ہی مصروف رہتے تھے۔ حتّٰی کہ بیت الخلا جانے کے موقعہ پر اور بیویوں سے خلوت کرنے کے وقت بھی حضور دعا میں مشغول رہتے تھے۔

ذکرِ الٰہی اور جہاد

مختلف اوقات کی بیان کی ہوئی مختلف اور متعدد احادیث سے یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر الٰہی کو جہاد سے افضل قرار دیا ہے مثلاً جب آپ سے پوچھا گیا کہ قیامت کے دن کون لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل اور اعلیٰ درجہ والے ہوں گے تو حضور نے فرمایا کہ ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ اس پر پوچھا گیا کیا غازی سے بھی؟ حضور نے جواب دیا ہاں اُس غازی سے بھی جو کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے یہاں تک کہ اس کی تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے۔ ایسے غازی سے بھی ذاکر افضل ہے۔ صرف یہی ایک حدیث اس مضمون کی نہیں بلکہ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں اسی کی ہم مطلب متعدد حدیثیں بیان کی ہیں۔ جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کرنے والا جہاد کرنے والے سے افضل ہے۔

اِن احادیث نے کچھ مدت تک مجھے تعجب میں ڈالے رکھا لیکن آخر کار اس کے معنی

مجھ پر کُھل گئے۔ یعنی یہاں ذاکرین کے معنی صرف تسبیح پھیرنے والوں کے نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں سے مراد ہے جو عقلی زبانی تقریری اور تحریری دلائل سے خدا تعالیٰ کا ذکر پھیلا کر لوگوں کو دہریت کفر اور شرک سے بچاتے ہوں ۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور توحید دنیا کے اندر قائم کرتے ہوں ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ احدیت یا (دین حق) کے مبلغ ہوں ۔ ان کے مقابل غازی اور مجاہد سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں۔ جنہوں نے صرف تلوار کے ساتھ کفار کا مقابلہ کیا۔ پس کیا شک ہے کہ عقلی مُبلّغ اسلام کا درجہ سیفی مجاہد سے افضل ہے۔ کیونکہ ایک تو خدا کا نام کافروں اور مشرکوں کے دلوں کے اندر داخل کرتا ہے۔ مگر دوسرا صرف تلوار سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ذکر الٰہی کو وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کہہ کر تمام اعمال سے افضل بتایا گیا ہے ۔

مقام ذکر الٰہی

مسجدیں گھر راستے دوکانیں مجلسیں ہر جگہ ذکر الٰہی کرنا چاہیئے ۔ اور ہر کام کے وقت دل میں خدا کا نام اور اسی سے دُعا ہونی چاہیئے ۔ تب انسانی زندگی میں برکت آتی ہے۔ نیز کھڑے بیٹھے لیٹے ہر حالت میں ذکر الٰہی کا حکم ہے۔ چونکہ ذکر سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہر کام ہر آن اور ہر حالت میں ذکر کرنے کا یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت ذاکر انسان پر اس طرح چھا جائے۔ کہ اس کے ذرّہ ذرّہ میں مالک کے عشق کا نشہ رچ جائے۔ کیونکہ یہی عبودیت ہے اور اسی کا نام توحید ہے ۔

عرش کے خزانے

اذکار میں سے بعض ذکر ایسے ہیں جن کی بابت احادیث میں آتا ہے۔ کہ وہ عرش کے نیچے جو خدا کے خزانے ہیں اُن میں سے تحفۃً اہل دُنیا کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ سورہ فاتحہ اور لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ منجملہ اُن عرش کے خزانوں کے ہیں۔ اس تعریف کا اصل

مطلب تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔لیکن میری سمجھ میں یہ آتا ہے۔کہ یہ ایسے ذکر ہیں۔جو عالمگیر اور نہایت درجہ وسیع الاثر ہیں۔کیونکہ عرش سے حکومتِ الٰہی' خدا کا اَحۡکَمُ الۡحَاکِمِیۡنَ اور مالک الملک ہونا مراد ہے۔پس جس طرح خدا کی حکومت سے کوئی چیز باہر نہیں۔اور اس کی بادشاہت عالمین پر بکلی چھائی ہوئی ہے۔اسی طرح ان اذکار کا اثر بھی نہایت درجہ وسیع اور عالمگیر ہے۔چنانچہ سورہ فاتحہ میں جو چار صفات رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ۔رَحۡمٰن۔رَحِیۡم اور مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کی ہیں۔وہ اُمّ الصفات ہیں۔اور قرآن میں لکھا ہے کہ یہ چار صفات گویا عرش عظیم کے چار پایوں کی طرح ہیں یعنی تمام عالمین کا انتظام اور حکومت انہی کے بل چل رہی ہے اسی طرح لَاحَوۡلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ بھی عرش کا ایک خزانہ ہے۔کیونکہ یہ کلمہ بھی جوامع الکلم میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور قوتوں کو عالم کی تمام قوتوں کا منبع اور مبداء ٹھہراتا ہے اور خدا کے سوا کسی اور کی طاقت اور قدرت کی بکلّی نفی کرتا ہے۔اس وجہ سے اس کا اثر بھی تمام مخلوقات پر حاوی ہے۔پس اپنے کامل وسعتِ اثر کی وجہ سے یہ دونوں ذکر عرش کا خزانہ کہلانے کے مستحق ٹھہرے

قابلِ افسوس بات

جس طرح اور عباداتِ اسلامی اس زمانہ میں محض چھلکا اور قشر بن کر رہ گئی ہیں۔یہی حال آج کل ان اذکار کا بھی ہوگیا ہے۔اب سُبۡحَانَ اللّٰہِ صرف ایک تعجب کے اظہار کا نقرہ رہ گیا ہے۔اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ خوشی کے اظہار کا۔اور لَاحَوۡلَ وَلَاقُوَّۃَ نفرت کے اظہار کا۔اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بطور قسم کے استعمال ہوتا ہے۔اور اَللّٰہُ اَکۡبَرُ احرار کے نعرہ سے بڑھ کر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔یہ نہایت درجہ افسوس اور رنج کی بات ہے۔ہماری جماعت کے لئے ذکر الٰہی کو بھی اپنے اسی اصلی مقام پر قائم کرنا ضروری ہے جو خدا کا مقصد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ۔

(الفضل ۶، ۷، ۱۲، ۱۳ ستمبر ۱۹۴۴ء)

شکرِ الٰہی

میرے علم میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کو بچہ بچہ جانتا ہے مگر ان کو سمجھنے یا ان سے فائدہ اٹھانے کا طریق عموماً لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا۔ ایک یہ کہ شکر کیونکر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ موت کو کس طرح یاد کیا جائے۔ موت کے متعلق پھر کسی وقت عرض کروں گا۔ اس وقت شکر کے متعلق مختصراً بیان کرتا ہوں۔

شکر کے معنے

شکر کے معنی ہیں نیکی کے بدلہ کسی کی تعریف کرنا۔ یا مختصراً عرفانِ احسان اور حمد و ثنائے جمیل۔ یہ انسان کے اعلیٰ اخلاق میں سے ایک خُلق ہے۔ لیکن ایک غلطی میں ابھی دُور کئے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ اکثر لوگ شُکر کو صبر سے اعلیٰ جانتے ہیں اور بعض صبر کو شکر سے اعلیٰ کہتے ہیں اور بحثیں کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صبر کا درجہ شُکر سے اعلیٰ ہے۔ یہاں دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک غلطی کا دُور کرنا مقصود تھا۔ ہاں خاص حالات میں خاص لوگوں کے لئے شکر بھی صبر سے بڑھ سکتا ہے۔

منعم اور نعمت

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی محسن اور منعمِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا عالم میں جو بھی چیز ہے وہ نعمت ہے یا نعمت بن سکتی ہے۔ غرض سوائے منعمِ حقیقی کے ہر چیز ہر مخلوق ہر مجازی منعم

دراصل کسی نہ کسی رنگ میں نعمت ہی ہے۔ یہ نہیں کہ صرف روٹی کپڑا میوے ہی نعمت ہیں۔ ماں بھی نعمت ہے اور باپ بھی۔ نبی بھی نعمت ہے اور استاد بھی۔ علم بھی نعمت ہے اور صحت بھی۔ یہاں تک کہ موت بھی نعمت ہے۔ اور بیماری بھی۔ بلکہ شیطان اور جہنم بھی نعمت ہیں۔ ہم بعض چیزوں کو جو نعمت ہیں اپنے لئے غلطی کی وجہ سے زحمت بنا لیتے ہیں۔ ورنہ مسئلہ یہی ہے کہ ہمارا ایک منعم ہے اور باقی ہر چیز نعمت ہے۔ نعمت کو منعم جاننا شرک ہے اور منعم حقیقی کو منعم جاننا شکر۔ شکر کرنے کے لئے یہ کہنا کافی نہیں کہ "خدا کا بڑا شکر ہے۔ مگر عملاً خدا کی شکایت کرتے رہنا۔ پس زبان اور دل دونوں سے شکر کرنا چاہیئے۔ یعنی احسان ماننا دل سے اور تفصیلی ذکر زبان سے یہ دونوں لازمی ہیں۔ اس لئے انعامات اور احسانات کا گنتے رہنا شکر کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ علاوہ احسان شماری کے ہر چیز کو دیکھ کر انسان یہ سمجھے کہ یہ نعمت ہے۔ پھر اس نعمت کے فائدے اپنے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے سوچے۔ جب یہ عادت ہو جاتی ہے تو شاکر اکثر خدا کی نئی نئی نعمتیں اپنے اوپر پاتا ہے اور ان کو گنتے گنتے تھک جاتا ہے مگر پھر بھی نہیں گن سکتا۔ اس حالت کا نام دراصل شکر ہے۔ اور شکر کا لازمی نتیجہ ہے محسن کی محبت۔

بظاہر مضر اشیاء بھی نعمت ہیں

میں نے بیان کیا تھا۔ کہ ہمارے چاروں طرف نعمتوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اور ہر چیز سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ہماری حقیقی منعم و محسن نہیں ہے۔ لیکن جب بعض چیزیں بظاہر ایذا اور تکلیف بھی پہنچاتی ہیں۔ ان کو ہم کس طرح نعمت کہہ سکتے ہیں؟ یہ سوال بعض لوگوں کو اٹکتا ہے سو واضح ہو کہ ایسی موذی اور مضر چیزوں سے بچانا بھی خدا کا فضل ہے۔ اور ایسی موذی چیزیں خود کسی نہ کسی کے لئے نعمت ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً سانپ کا زہر آج کل بعض بیماریوں کے لئے شفا ثابت ہوا ہے۔

شکر کے طریقے

شکر کے لئے ضروری ہے کہ آپ جس چیز کو دیکھیں۔ اس کی حکمت اور فوائد کو معلوم کریں۔ کیونکہ جب تک کسی چیز کا فائدہ معلوم نہ ہو۔ اس کا نعمت ہونا محسوس نہیں ہو سکتا۔ وہ چیزیں جو آپ کی اپنی ذات کے لئے نعمت ہوں۔ اُن کی طرف ایسی توجہ خاص طور پر کرنی چاہیئے تاکہ آپ کا نفس قدر شناسی کی وجہ سے خدا کے شکر کی طرف راغب ہو۔

اسی طرح جب آپ بار بار نعمتوں کو گنیں گے۔ اور ہر روز نئی نئی نعمتوں کو گنیں گے اور ہر روز نئی نئی نعمتوں اور نئے نئے احسانوں کا خیال رکھیں گے۔ تو گو ابتدا میں تھوڑی نعمتیں ذہن میں آئیں گی اور صرف انگلیوں پر ان کا شمار کر سکیں گے لیکن اس پر عمل کرتے کرتے آخر آپ اس قدر ماہر اور رواں ہو جائیں گے کہ اپنے تجربہ سے ہی آپ کو یہ یقین حاصل ہو جائے گا کہ ہم اِن نعمتوں کو نہیں گن سکتے۔ اور اگر گننا شروع کریں تو تھک جائیں گے۔ مگر ان کا احاطہ نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت خدا کے احسان اور اپنی احسان فراموشی دل پر نقش ہو کر بے اختیار یہ آیت آپ کے مُنہ سے نکلے گی۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم، ۳۵)

پس بار بار نعمتوں کو گنو اور ہر روز نئی نئی نعمتوں کا خیال رکھو اور ہر چیز کو کسی نہ کسی قسم کی نعمت سمجھو۔ ان کے فوائد پر غور کرتے رہا کرو۔ اور صرف ایک اور ایک ذات وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ کو اپنا محسن و منعم سمجھو تب شکر کا لطف اٹھا سکو گے۔

یاد رکھو بہت سی نعمتیں مستقل ہیں اور بہت سی نئی نئی ہر روز اور ہر گھڑی نازل ہوتی ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ شکر کا موقعہ بے لذت ہو جائے گا۔

خدا کی نعمتوں کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے رہنا بھی ان کا شکر ہے۔ اور ان نعمتوں کا جائز استعمال بھی ان کا شکر ہے اور ان میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنا بھی ان کا شکر ہے۔ اور ان کی وجہ سے اپنی عبادات میں ترقی کرنا بھی ان کا شکر ہے۔

کوثر

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ میں کوثر کے معنی بکثرت اور لا انتہا نعمتوں کے بھی ہیں۔ اور ہر متنفس نعمتوں کی کثرت سے لدا ہوا۔ اور الٰہی انعامات سے دبا ہوا ہے۔ جس کے پاس کم سے کم نعمتیں ہیں۔ اس پر بھی اس قدر فضلوں کی بھرمار ہے کہ حد وشمار نہیں اور منعم بھی بخیل اور کنجوس نہیں۔ وہ ہم سے کوئی بڑی قیمت بھی نہیں مانگتا۔ صرف شکر اور قدردانی کا طالب ہے۔ وہ بھی ہمارے ہی فائدہ کے لئے۔ کیونکہ شکر نعمتوں کو بڑھاتا ہے اور ان میں ترقی کرتا ہے۔ دینے والے کی طرف سے کمی نہیں۔ جو کچھ کسر ہے وہ لینے والوں کی طرف سے ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی نعمت سے محروم رکھا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ منعم کے خزانے خالی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ نعمت اس شخص کے لئے مضر اور نقصان دہ ہے۔ اور اس کا نہ ملنا ہی اس کے لئے احسان اور نعمت ہے۔

وَلَوۡ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوۡا فِى الۡاَرۡضِ (الشوریٰ ۲۸)

ترجمہ: اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو بہت وسیع کر دیتا تو وہ مُلک میں سرکشی کرنے لگ جاتے۔

کسی چیز کو نعمت سمجھ کر شکر کرنے میں بعض دفعہ یہ دقت ہوتی ہے کہ اس کا نعمت ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے ایک اور طریقہ بھی اس کے لئے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر فلاں چیز مجھ سے چھین لی جائے تو کیا نتیجہ ہو؟ اس وقت پھر معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کا فائدہ کیا ہے۔ اکثر نعمتوں کے فائدے ہمیں نہیں معلوم ہوتے پھر جب وہ چھن

جاتی ہیں تب پتہ لگتا ہے ہم پر کیا کیا احسان خدا کی طرف سے ہو رہے تھے۔ لڑائی سے پہلے لوگ دو آنہ سیر دودھ اور اڑھائی روپیہ من گندم پر غرلاتے تھے۔ اور اس نرخ کو ایک مصیبت سمجھتے تھے اب جبکہ آٹھ آنہ سیر دودھ اور دس روپیہ من گندم ہو گئی۔ تو پھر وہ آرام یاد کر کر کے روتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک بجلی کا پنکھا چھت میں لگا ہوا ہے۔ سات سال وہ چلتا رہا۔ اور ہمیں شکر کی توفیق نہ ملی۔ ایک دن سخت گرمی کے دنوں میں وہ بند ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ سات سال کی جنت کے بعد ہم آج جہنم کی چاشنی چکھ رہے ہیں۔ یہی حال اور نعمتوں کا ہے۔

نعمائے الٰہی

شکر کے لئے انسان سب سے پہلے ان فضلوں کو دیکھے جو اس کی روح کے متعلق ہیں۔ جن میں ایمان اخلاق اور خوشی وغیرہ جذبات داخل ہیں۔ پھر جسم کا نمبر ہے۔ جس میں اس کے حواس دماغی قوٰے۔ صحت۔ رجولیت اور تمام اعضا کی درستگی داخل ہیں اس کے بعد وہ چیزیں جو مدار زندگی ہیں مثلاً سورج ہوا پانی خوراکیں وغیرہ۔ پھر وہ جو جسم کی زینت ہیں۔ اس کے بعد حسب ونسب مال۔ تعلیم۔ زمانہ۔ استاد۔ دوست۔ اولاد۔ خدمتگار مکان۔ ساز و سامان اس زمانہ کا امن۔ اور نئی ایجادیں مثلاً ریل، موٹر کار، ریڈیو۔ پریس وغیرہ وغیرہ۔ پھر طرح طرح کے علاج اور دوائیں۔ ملازمتیں۔ یہاں تک کہ آج کل ہم ایک پیسے کی برف سے وہ راحت حاصل کر لیتے ہیں۔ جس سے شہنشاہ اکبر باوجود اپنی بڑی سلطنت کے محروم تھا۔ علم کی وہ افراط کہ اَللّٰہُ اَکْبَر اور ہنر کی وہ فراوانی کہ سُبْحَانَ اللّٰہ پھر ہر چیز کس قدر سستی کہ اِذَا الْجَنَّۃُ اُزْلِفَتْ کا نظارہ سامنے آجاتا ہے۔ مذہب کے متعلق وہ آسانیاں کہ ہم نے نبی کا زمانہ پایا اور اس کے خلفاء کو دیکھا۔ زندہ خدا کا زندہ کلام سُنا۔ اس کے نشانات ملاحظہ کئے اور ہدایت کے چمکتے ہوئے سورج کو گویا اپنی گود میں لے لیا۔ آج کل

توانسان دنیا کا کونہ کونہ اگر چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔ میں تو سر درد کی ایک ٹکیہ، دمہ کی ایک پڑیا اور انڈی پنڈنٹ قلم کے ایک نب تک کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ بڑی بڑی نعمتوں کو کہاں بیان کر سکتا ہوں۔ میرے لئے قادیان ایک نعمت ہے۔ یہاں کی نمازیں، درس خطبے رمضان، جلسہ، کانفرنس، عیدیں نکاح اور جنازے ہر چیز ایک گرانبہا نعمت ہے۔ بیت مبارک ایک نعمت ہے۔ اخبار الفضل ایک نعمت ہے بہشتی مقبرہ ایک نعمت ہیں۔ (رفقائے) مسیح موعود ایک نعمت ہیں۔ احمدیہ جماعت ایک نعمت ہے۔ غرض کہاں تک بیان کروں؟

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا است

روزانہ اخبارات کتابیں رسالے دل بہلانے کو طرح طرح کے میوے۔ طرح طرح کی ترکاریاں طرح طرح کی مٹھائیاں۔ طرح طرح کی خوشبوئیں طرح طرح کے لباس ان کا ذکر بھی جانے دو۔ ایک تین پیسے کا کارڈ۔ اور ایک چند روپے کی گھڑی۔ بلکہ اس کا الارم بھی میرے لئے نئی نعمت ہے۔ قادیان میں منارہ اس کا گھنٹہ اور اس کی روشنی سب شکر کے قابل ہیں۔ بچوں کے لئے یسرنا القرآن اور بڑوں کے لئے خزینۃ العرفان اور تفسیر کبیر جیسی نعمتیں بخشیں۔ میں باہر نکلتا ہوں تو چھتری لگا کر شکر کرتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو بجلی کی روشنی پمپ کے پانی اور برقی پنکھے سے نعمتوں کا لطف اٹھاتا ہوں۔ گلیوں میں سے گذرتا ہوں تو ایک ادھر سے سلامتی کی دُعا کرتا ہے اور ایک اُدھر سے۔ بیٹھتا ہوں تو ایسے لوگوں کے درمیان جن کی بابت فرمایا گیا کہ لا یشقیٰ جلیسھم جن سے خدا کلام کرتا ہے۔ اور وہ خدا سے کلام کرتے ہیں۔ دین وہ ملا جس میں کوئی نقص نہیں۔ کوئی رخنہ نہیں۔ سراسر اپنا فائدہ ہی فائدہ اور آرام ہے۔ عزیز رشتہ دار ایسے ملے کہ یا جنت میں ہیں یا جنت میں جائیں گے ہمسائے وہ ملے جو فرشتہ سیرت ہیں۔ بیویاں ملیں کہ تیس سال سے ایک نے دوسری کو تُو کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ گھر وہ بخشا کہ نہایت آرام دہ اور چھ آنے روپیہ کی مالیت سے خود بخود بڑھتے

بڑھتے تیس ہزار مالیت کا ہو گیا۔ محلہ وہ عطا فرمایا جو دارالامان کا مرکز ہے۔ عزت وہ دی جس کا میں مستحق نہ تھا۔ یا اللہ میں تھک گیا اور ابھی روزانہ نئی نئی نعمتوں اور نئے سنئے فضلوں کا تو ذکر بھی نہ کر سکا۔ مجھے تو بیماری اور موت تک بھی تیری نعمتوں میں سے نظر آتی ہیں۔ تو نے ہی محض اپنے فضل سے میری وصیت میری زندگی میں ادا کرادی اور تو نے ہی باوجود امراض کے مجھے غیر معمولی عمر بخشی۔ جب دُنیا کا یہ حال ہے تو آخرت میں جو خیر اور ابقیٰ ہے۔ کیا کیا فضل نہ ہوں گے سچ ہے

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۵)

ترجمہ: اور اگر تم اللہ کے احسان گننے لگو تو اُن کا شمار نہیں کر سکو گے۔ انسان یقیناً بڑا ہی ظالم (اور) بڑا ہی ناشکر گذار ہے۔

اگر خدا طاقت عقل اور روانی بخشے تو دُنیا کے کاغذ اور سیاہیاں ختم ہو جائیں۔ قلمیں گھس جائیں۔ مگر اے میرے خدا میرے منعم خدا تیری نعمتوں کی گنتی اور اُن کا شکر پھر بھی ادا نہ ہو سکے۔ میری تو عینک کا ایک شیشہ ہی اگر ٹوٹ جائے تو میں مصیبت میں پڑ جاتا ہوں۔ جاڑے میں اگر گرم جرابیں نہ ملیں تو قریب المرگ ہو جاتا ہوں۔ گھر کی بجلی فیل ہو جائے تو اندھوں کی طرح ٹٹولتا پھرتا ہوں۔ غرض ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت بھی ضائع ہو جائے تو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ بڑی بڑی نعمتوں کے ضائع ہونے کا تو کیا کہنا۔ اَللّٰهُمَّ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یا اللہ دُنیا اور آخرت میں اپنی رضا اور اپنے کوثر سے ہمیں متمتع فرما۔ اور اپنی بے نہایت رحمت اور وسیع اور ابدی جنّت سے ہم کو سرفراز کر۔ آمین

(الفضل ۱۸ اکتوبر ۴۴ء)

مغفرت الٰہی کے نظارے

ایک مرتبہ مغفرت الٰہی کے مضمون پر غور کر رہا تھا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سوچ کر لطف اٹھا رہا تھا کہ میرے ذہن پر ایک ربودگی طاری ہوگئی اور بعض ایسے نظارے نظر کے سامنے سے گزرے جن کے ساتھ میرے اس مضمون کا تعلق ہے۔ اب خواہ ان معاملات کو دماغی تصور سمجھ لیں، خواہ خیالات کی رو خواہ نیم مکاشفہ کی حالت اس کا کوئی اثر اصل بات پر نہیں پڑتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک علمی بات معنوی حالت سے ایک صوری شکل پکڑ گئی ورنہ مطلب اور حقیقت دراصل ایک ہی ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک میدان میں ایک عظیم الشان دروازہ، جیسا کہ شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبوں میں نصب کیا ہے، مجھ سے کچھ فاصلہ پر لگا ہوا ہے، نزدیک گیا تو اس کے اوپر نہایت خوبصورت حروف میں لکھا ہوا تھا:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن: ۳۰)

ترجمہ: وہ ہر وقت ایک نئی حالت میں ہوتا ہے۔

اور اس بڑے دروازے کے دونوں طرف بھی عجیب و غریب قطعات لگے ہوئے تھے، کسی پر لکھا تھا۔

نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الحجر: ۵۰)

ترجمہ: (اے پیغمبر!) میرے بندوں کو آگاہ کر دے کہ میں بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

اور کسی پر۔

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ (النجم: ۳۳)

ترجمہ: تیرا رب بڑی وسیع مغفرت والا ہے۔

کہیں یہ لکھا تھا۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ (اٰل عمران: ۱۳۰)

ترجمہ: وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

کسی جگہ یہ تحریر تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر: ۵۴)

ترجمہ: اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔ وہ بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کسی جگہ۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ (ابراہیم: ۱۱)

ترجمہ: وہ تمھیں اس لئے بُلا رہا ہے تاکہ وہ تمھارے گناہوں میں سے بعض بخش دے۔

اور کہیں۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۫ وقف (اٰل عمران: ۱۳۶)

ترجمہ: اور اللہ کے سوا کون قصور معاف کر سکتا ہے۔

غرض دونوں طرف مغفرت کے متعلق بیسیوں خوبصورت قطعات لکھے ہوئے تھے۔

میدانِ حشر

میں نے بعض لوگوں کو اس دروازہ پر بطور پہرہ داروں کے متعلق دیکھا اور خیال کیا کہ

شاید یہ فرشتے ہیں، اور ان سے پوچھا کہ کیا میں اندر جا سکتا ہوں۔

انہوں نے کہا " ہاں، آج اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے پُر زور مظاہرے ہو رہے ہیں۔ بیشک جاؤ اور دیکھ لو۔ مگر تمہارے ساتھ ایک سرکاری چوکیدار کا ہونا ضروری ہے۔"

یہ کہہ کر ان کے افسر نے اس جماعت میں سے ایک کو میرے ساتھ کر دیا، اور کہا کہ ان کا نام غفران ہے، یہ تمہارے ہمراہ رہ کر تمہیں میدان حشر کی سیر کرائیں گے، اس دوران میں تم استغفار پڑھتے رہنا اور کسی بات کو دیکھ کر اعتراض نہ کرنا۔

یہ سُن کر جونہی میں نے اس صحرائے محشر کی طرف قدم بڑھائے تو فرشتہ غفران نے میرا بازو پکڑ لیا۔ بازو پکڑتے ہی میں اور وہ دونوں گویا اُڑنے لگے، اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ جہاں اور جدھر ہم جانا چاہتے ہیں، پل جھپکنے میں جا پہنچتے ہیں۔ چلتے چلتے دیکھتا ہوں کہ جہاں تک نظر کام کرتی ہے انسان ہی انسان ہیں، مگر سب کے سب برہنہ۔ سوائے بعض خاص خاص کے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ایک ٹولی یہاں ہے تو دوسری وہاں ہر جگہ جمگھٹے لگے ہیں اور ہر جمگھٹے اور مجمع کے درمیان ایک ترازو یعنی میزان نصب ہے۔ اسی طرح جہاں تک نظر کام کرتی تھی یا تو انسان نظر آتے تھے یا میزانیں تھیں یا فرشتے۔ مگر کیا مجال جو ذرا بھر بھی غل یا شور ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا مُردے کھڑے ہیں اور سوائے اس کے جسے بولنے کی اجازت ہو۔ کوئی لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلتا تھا۔ ہاں یا غفور یا ستار یا غفار کے الفاظ ہر طرف سے نہایت دھیمی آواز میں سُنائی دیتے تھے اور کبھی کبھی جب کسی کی آواز ناواجب طور پر بلند ہو جاتی تو معاً ایک طرف سے بگل بجتا سنائی دے جاتا۔

وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (طٰہٰ: ۱۰۹)

ترجمہ:۔ اور رحمٰن (خدا کی آواز) کے مقابلہ میں (انسانوں کی) آوازیں دب جائیں گی پس تو سوائے کھُسر پُھسر کے کچھ نہ سُنے گا۔

جس پر ایک ایسا سکوت طاری ہو جاتا، جیسا آدھی رات کے وقت قبرستانوں میں ہوا کرتا ہے۔

عرشِ عظیم

غرض ایسے نظارے دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھے، اور جہاں بھی پہنچے، یہی حال دیکھا، حتیٰ کہ میں قریباً تھک گیا، اتنے میں غفران نے کہا کہ وہ سامنے عرش عظیم ہے۔ میں نے نظر اُٹھائی تو سوائے ایک روشنی اور نور کے کچھ نظر نہ آیا۔ مگر خود بخود اس قدر دہشت اور رعب اس طرف نظر کرکے مجھ پر طاری ہوا کہ میری گھگھی بندھ گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس لاانتہا میدان میں یہ مقام ہر جگہ سے یکساں قریب نظر آتا ہے، اور وہاں کے احکام ہر شخص کو ایسے ہی صاف سنائی دیتے ہیں گویا وہ ہمارے سامنے اور بالکل پاس ہی ہے۔ بے انتہا فرشتے، اس جگہ کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ کوئی گروہ یہ کہہ رہا تھا۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا

اور کوئی یہ کہ

رَبَّنَا اغْفِرْ مَنْ فِي الْاَرْضِ

اور کوئی رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ (المومنون : ۱۱۹)

ترجمہ: اے میرے رب! معاف کر، اور رحم کر

کا ورد کر رہا تھا۔

کوئی يَا غَفُوْرُ الرَّحِيْمُ کا

اور کوئی يَا عَفُوُّ يَا غَفُوْرُ يَا سَتَّارُ يَا غَفَّارُ کا

غرض وہ لوگ طرح طرح کے جملے پڑھتے جاتے تھے، اور ایک طرف سے آتے اور دوسری طرف غائب ہوتے جاتے تھے۔

خوشی اور طرب کا سماں

ساتھ ہی بہ سبب یوم مغفرت ہونے کے ایک خوشی اور طرب کا سماں اس نظارہ پر چھایا ہوا تھا۔ ہر گنہگار کے چہرہ پر آس اور امید کا تبسم موجود تھا۔ لوگوں کے اعمال تُل رہے تھے، اور ان کی کمی اور خامیاں فضل اور مغفرت کے انعامات سے پوری ہو رہی تھیں، کیونکہ آج صفت عفو و مغفرت کے مظاہرہ کا دن تھا اور حساب کتاب میں بجد نرمی تھی، گو دوسری طرف کراماً کاتبین بھی اپنا کام کئے جاتے تھے۔ مالک و رضوان بھی گاہے گاہے آپس میں جھگڑ لیتے تھے، اور سائقین و شہدا کی کشمکش بھی جاری تھی، مگر آخری فیصلہ ان تمام جھگڑوں کا بارگاہ حضرت غفور رحیم سے ہی صادر ہوتا تھا۔

میں اسی سیر میں مشغول تھا کہ غفران نے مجھے کہا" چل تجھے بعض لوگ دکھلاؤں جنہیں تو جانتا ہے اور ساتھ ہی بعض دلچسپ حالات مغفرت الٰہی کے بھی ملاحظہ کراؤں جن سے عام لوگ ناواقف ہیں۔ باقی یہ حشر اور حساب کتاب تو اسی طرح ہوتا رہے گا۔ اور جس طرح آج بموجب

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن: ۳۰)

ترجمہ: وہ ہر وقت ایک نئی حالت میں ہوتا ہے۔

صفت مغفرت کے تقاضا کا دن ہے، اسی طرح کوئی دن جلال الٰہی اور انتقام کا آجاتا ہے تو کوئی عدل و انصاف اور قسط کے اظہار کا کسی دن شفاعت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو کسی دن قہر و جبروت کا۔ مگر یہ سب ایام ان لوگوں کے اعمال اور حالات کے مطابق آتے ہیں جن کا حساب و کتاب ان اسمائے الٰہی کے مطابق ہونا ہوتا ہے۔ اس عالم میں رحم کی تو کوئی حد نہیں، ہاں عدل و انصاف بھی کبھی کبھی ہوتا ہے، مگر ظلم کبھی نہیں.....

آ، چل، تجھے بعض تفصیلی باتیں مغفرت الٰہی کے متعلق دکھاؤں تا کہ تیرا ایمان اور محبت

اپنے مالک اور آقا سے زیادہ ہو اور تاکہ تو جو ہمیشہ اپنے اعمال کی وجہ سے یاس اور ناامیدی میں گرفتار رہتا ہے کچھ اس عالیشان مغفرت سے بھی آگاہی پائے جو ہر گنہگار کا سہارا اور ہر عاصی کی پشت پناہ ہے اور جس کے بل پہ عالمین کی پردہ پوشی اور بخشش ہو رہی ہے۔"

انبیاء کا گروہ

یہ سن کر میں اور وہ آگے چلے اور ایک مجمع کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ سب اعلیٰ کپڑے پہنے ہوئے استغفار میں مصروف تھے۔ غفران نے کہا "یہ انبیاء کا گروہ ہے جو دُنیا سے ہی معصوم اور مغفور ہو کر یہاں آیا ہے۔"

مغفرت کے نظارے

(۱)

ذرا اور آگے چلنے تو دیکھا کہ ایک شخص کے گناہوں کا پلڑا بہت بھاری ہے اور اس کے نیک اعمال بہت کم ہیں۔ دوزخ کے فرشتے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے تو بارگاہ الٰہی سے آواز آئی۔

"فلاں نیک شخص کو مع اپنے اعمال نامہ کے حاضر کرو۔"

یہ کہنا تھا کہ وہ شخص وہاں موجود کر دیا گیا۔

فرمایا "یہ اس گنہگار کا بیٹا ہے، اس کا اعمال نامہ بھی دیکھو" جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگا کرتا تھا۔ حکم ہوا کہ بیٹے کی ان دعاؤں کو بھی باپ کی نیکیوں کے پلڑے میں ڈال دو۔ اُن کا ڈالنا تھا کہ پلڑا جُھک گیا اور بہشت کے فرشتے اسے اپنے مونڈھوں پر بٹھا کر لے گئے۔

(۲)

جب ہم آگے بڑھے تو اسی طرح کا ایک اور گنہگار اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔
حکم ہوا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پہ کتنے مؤمنین نے دعائے مغفرت کی ہے ؟
جب اس کا حساب لگایا گیا اور وہ دعائیں جو محض ناواقف راہ گزروں نے اس کی قبر پہ کی تھی، وزن کی گئیں، تو وہ بھی کودتا پھاندتا، مغفرت کے ملائیکہ کی گود میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا۔

(۳)

آگے چلے تو ایک اور گنہگار کمیٔ اعمال صالحہ کی وجہ سے متاسف کھڑا تھا۔ حکم ہوا کہ جس جس شخص نے کسی قسم کی حق تلفی اس کی کی ہے یا اس کی غیبت وغیرہ کی ہے. ان لوگوں کی نیکیاں ان حق تلفیوں اور غیبتوں کے عوض اسے دے دو۔
میں نے دیکھا کہ اوروں کی ہزاروں نیکیاں اس طرح اس شخص کے حصّے میں آگئیں اور وہ بخشا گیا۔

(۴)

ذرا اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک شخص وہاں بھی مالک کے پنجے میں گرفتار ہے۔
آواز آئی کہ یہ تو فلاں کتاب کا مصنف ہے جس کی وجہ سے کئی نسلوں نے نیکی اور اسلام سیکھا ہے۔ پس اس کتاب کے پڑھنے کی وجہ سے ہر نیکی کرنے والا نہ صرف نیکی کا ایک اجر خود پائے گا بلکہ اتنا ہی اجر مصنف کو بھی ملے گا۔
حساب کتاب کیا گیا تو ایک لا انتہا خزانہ باقیات الصالحات کا اس مصنف کے قبضہ میں آگیا۔ مالک نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی اور رضوان کا اسسٹنٹ اسے لے کر اپنے ہاں چلا گیا۔

(۵)

اور آگے چلا تو دیکھا کہ ایک عورت کھڑی رو رہی ہے، اس کا اعمال نامہ بدکاری سے بھرا پڑا ہے، ایک یاس اور ناامیدی اس پر طاری ہے، آواز آئی کہ "اس فاسقہ و فاجرہ عورت نے کوئی پسندیدہ عمل بھی کیا ہے؟"

کراماً کاتبین میں سے ایک بولا کہ حضور! ایک دن یہ جنگل میں سفر کر رہی تھی اور ایک کتا پیاس کے مارے زبان لٹکائے کنویں کے کنارے ہانپ رہا تھا۔ یہ اس کنویں میں اتری، آپ پانی پیا، پھر اپنی جوتی میں پانی بھر کر سامنے لائی اور کتے کو پلایا۔

ارشاد ہوا ہم نکتہ نواز ہیں، ہمیں اس کا یہ عمل اتنا پسند آیا تھا کہ ہم نے اسی وقت اسے بخش دینے کا عہد کر لیا تھا، اب ہماری مغفرت کی چادر اس پر ڈال دو۔ اور جہاں جانا چاہتی ہے اسے لے جاؤ۔

(۶)

پھر آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک شور سا برپا ہے۔ ایک عاجز گنہگار ہے اور پاس ہی ایک مرصع نیکوکار۔ اس گنہگار کی بداعمالیاں دیکھ کر وہ نیکوکار کہنے لگا کہ خدا کی قسم! تجھے خدا کبھی نہیں بخشے گا۔ اس بات پر حاضرین میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ اور بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ مولانا سچ فرماتے ہیں، یہ شخص ایسا ہی ہے۔

بارگاہِ الٰہی کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے شخص تو کون ہے میری مغفرت پر قسم کھانے والا؟ جاؤ، ہم نے اسے تو بخش دیا اور تیری بابت فیصلہ بعد میں صادر ہوگا۔ اور وہ شخص ہنستا کودتا بہشت کے دروازے کی طرف بھاگا۔

(۷)

اسی طرح پھر ایک گروہ میں بعض آدمیوں کا حساب کتاب ہو رہا تھا۔ یہ لوگ مومن تو تھے مگر ان کے اعمال نامے نیکیوں سے خالی تھے، کیونکہ گو وہ اپنے وقت کے

نبی پر ایمان لائے تھے، مگر عمر نے وفا نہ کی اور جلد ہی فوت ہو گئے، بعض کے اعمال صالحہ تو محض صفر ہی تھے۔ ایسے لوگوں کا فیصلہ بارگاہ الٰہی سے اس آیت کے ماتحت کیا گیا۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(الشعراء: ۵۱)

ترجمہ: ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے گناہ اس وجہ سے معاف کر دے گا کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے بن گئے۔

یعنی یہ چونکہ شروع میں ہی نبی کو مان گئے تھے، اس لئے ان کا السابقون الاولون میں ہونا ہی ان کی مغفرت کے لئے کافی ہے، خواہ مسلمان ہو کر ایک عمل بھی نیک نہ کیا ہو۔

(۸)

یہاں سے ہم اور آگے بڑھے، تو دیکھا کہ وہاں حضرت یعقوبؑ کی اولاد اپنی میزان پر سے نجات پا کر آ رہی تھی۔ اور ان کی نجات کا باعث دعائے بزرگان تھی، یعنی ان کے باپ کی وہ دعائیں جو ان کی درخواست

يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ (یوسف: ۹۸)

ترجمہ: اے ہمارے باپ! آپ ہمارے حق میں (خدا سے) ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کریں۔ ہم یقیناً خطا کار ہیں۔

کے جواب میں بوعدہ

اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (یوسف: ۹۹)

ترجمہ: (میں ضرور) تمہارے لیے اپنے رب سے بخشش طلب کروں گا۔ یقیناً وہی (ہے جو) بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کی گئی تھی۔

(۹)

ایک جگہ دیکھا کہ چند شخص اپنے گناہوں کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور نجات کی شکل صورت نظر نہیں آتی ہے۔ حکم ہوا کہ اچھا بتاؤ کہ اس دائیں طرف والے کا جنازہ کس کس نے پڑھا تھا ؟

معلوم ہوا کہ چالیس موحد مسلمان اس کے جنازہ میں شریک تھے۔ ارشاد ہوا کہ مالک ! اسے چھوڑ دے، ہم نے ان چالیس مومنوں کی شفاعت جو انہوں نے نماز جنازہ میں اس کے لئے کی تھی قبول کر لی ۔

پھر بائیں طرف والے کی باری آئی تو معلوم ہوا کہ اس کے مرنے کے بعد اس شہر کے اکثر اہل اللہ نے اسے نیکی سے یاد کیا تھا اور تعریف کی تھی کہ اچھا مسلمان آدمی تھا ۔

فرمایا ان کی تعریف کی وجہ سے اسے بھی چھوڑ دو۔

پھر تیسرے کے بارے میں سوال پیدا ہوا کہ اس کا کیا حال ہے ؟

فرشتوں نے عرض کیا کہ صرف دو مومن تھے جو اسے مرنے کے بعد نیک اور اچھا کہتے تھے۔ ارشاد ہوا کہ چلو اسے بھی جانے دو۔

چوتھے گنہگار کی بخشش اس لئے ہو گئی کہ اس کے جنازہ میں تین صفیں مسلمانوں کی تھیں ،

پھر اور آگے چلے تو دیکھا کہ ایک گنہگار مسلمان اس لئے رہائی پا گیا کہ اس کے تین بچے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے ۔

اور ایک مومن عورت صرف ایک بچہ کی موت کا صدمہ اٹھانے کی وجہ سے بخش دی گئی ۔

ایک میاں بیوی نظر آئے، ان کا حساب کتاب ہو رہا تھا، اتنے میں ایک دو برس کا بچہ دوڑتا ہوا کہیں سے آگیا اور کہنے لگا کہ یہ میرا باپ ہے اور یہ میری ماں ہیں جنت میں نہیں جاؤں گا جب تک ان دونوں کو ساتھ نہ لے جاؤں۔

حاضرین کی آنکھوں میں یہ نظارہ دیکھ کر آنسو آ گئے ۔

اتنے میں ایک اور والدین کا مقدمہ پیش ہوا، اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بچہ، جس کے آنول نال ابھی اس کے ناف کے ساتھ ہی تھے، چیخنے چلانے لگا اور کہنے لگا :- اے رب! میں اسقاط شدہ بچہ ہوں اور تیرے فضل سے مجھے جنت میں رہنے کی اجازت ملی ہے۔ مگر میں ہرگز وہاں اپنے ماں باپ کو دوزخ میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

حکم ہوا کہ تیری خاطر ہم نے ان کی مغفرت کر دی، لے جا ان کو بھی جنت میں ۔

وہ بچہ بھی اپنی آنول نال کے ساتھ اپنے والدین کو کھینچتا ہوا جنت کی طرف لے گیا اور سب دیکھنے والے چشم پُر آب تھے ۔

(۱۰)

پھر ہم آگے چلے۔ ایک شخص کے اعمال نامہ میں کچھ کسر تھی۔ وہ اس طرح پوری کی گئی کہ چونکہ وہ اپنے بزرگ والدین کی قبر کی ہر جمعہ کے دن زیارت کرتا تھا اس لئے اُسے چھوڑ دیا گیا۔

دائیں طرف ایک ایسا جم غفیر نظر آیا، جس کے لوگ اپنے اعمال کے وزن کی رو سے بہت ناقص ثابت ہوئے تھے، مگر ان سب کی بخشش اس لئے ہوئی کہ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات صبح تک کھڑے یہ دعا فرماتے رہے تھے ۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (المائدہ : ۱۱۹)

ترجمہ :- اگر تو اُنھیں عذاب دینا چاہے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو اُنھیں بخشنا چاہے تو تُو بہت غالب (اور) بڑی حکمتوں والا (خدا) ہے۔

پس اس دُعا کی مقبولیت کے نتیجہ میں امت محمدیہ کے یہ سب لوگ نجات پا گئے ۔

(۱۱)

وہاں سے چلتے چلتے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک قاتل کھڑا تھا۔ اس کی بابت یہ سنا کہ اس شخص نے ننانوے خون کئے تھے اس کے بعد اس کے دل میں توبہ کی خواہش پیدا ہوئی، اور وہ ایک راہب کے پاس گیا اور کہا "میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

راہب نے جواب دیا "ہرگز نہیں" اور اس نے غصہ میں آکر راہب کو بھی مار ڈالا۔ پھر وہ آگے چلا لوگوں نے اسے ایک بزرگ کا پتہ دیا کہ شاید وہاں تیری توبہ کی کوئی صورت نکلے۔ یہ قاتل اس گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک جگہ وہ قضائے الہٰی سے مر گیا۔ اس پر رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا ہوا۔ عذاب کے فرشتے کہتے تھے کہ یہ ایک ظالم ڈاکو اور قاتل ہے اور دوسرے کہتے تھے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے، مگر یہ تو توبہ کرنے چلا تھا۔ غرض ایک ہنگامہ اس امر پر برپا تھا۔

میں نے سنا کہ بارگاہ الوہیت سے فرمان صادر ہوا کہ بتاؤ اس کی نعش میں اور اس کے وطن میں کتنا فاصلہ تھا؟ اسی طرح اس کے مرنے کی جگہ میں اور اس بزرگ کے شہر میں کتنا فاصلہ تھا؟

حضرت میکائیل کے محکمہ سے رپورٹ ہوئی کہ اس کی نعش اس بزرگ کی بستی سے بقدر ایک بالشت کے نزدیک تھی۔

ارشاد ہوا۔ "ہم نے اس کی توبہ قبول فرمائی اور اسے بخش دیا، اس پر ہماری مغفرت کی چادر ڈال دو۔"

(۱۲)

پھر اور آگے چلے۔ ایک جگہ ایک بہت بڑے گنہگار کا مقدمہ پیش ہو رہا تھا۔ کراماً کاتبین نے عرض کیا۔ "یا الہ العالمین! یہ شخص دن کو تو گناہ کرتا تھا اور رات کو روتا تھا کہ اے میرے رب! میں نے قصور کیا ہے، مجھے معاف فرما۔ اس پر حضور کے ہاں سے اس کا قصور معاف فرمایا جاتا اور ارشاد ہوتا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو

گناہوں کو معاف کر سکتا ہے اور ان کے سزا دینے پر بھی قادر ہے۔ سواے فرشتو گواہ رہو میں نے اُسے بخش دیا۔

" اس کے کچھ دن بعد وہ پھر گناہ کرتا تھا اور رات کو پھر اسی طرح دعا کرتا تھا کہ خدایا میرے گناہ بخش دے اس وقت بارگاہ احدیت سے یہ حکم صادر ہوتا تھا کہ میرا یہ بندہ یقین رکھتا ہے کہ میں اس کے گناہ پہ گرفت بھی کر سکتا ہوں اور اسے معاف کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہوں، سو تم گواہ رہو کہ میں نے اسے پھر بخش دیا۔

"کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ پھر گناہ کرتا تھا، اور بعد میں اسی طرح پھر توبہ استغفار کرتا تھا، اور حضور یہی ارشاد فرماتے تھے کہ میرا یہ بندہ یقین رکھتا ہے کہ میں اس کے گناہ پر پکڑ بھی کر سکتا ہوں اور اسے معاف بھی کر سکتا ہوں۔

"پس اسی طرح یہ شخص عمر بھر گناہ کرتا رہا اور اس کا اعمال نامہ سیاہ ہوتا رہا۔ اب جو کچھ ارشاد ہو کیا جائے۔"

فرمایا کہ میں نے تو تین دفعہ کے بعد ہی کہہ دیا تھا۔

غَفَرْتُ لِعَبْدِی فَلْیَفْعَلْ مَا شَاءَ

میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا، اب جو جی چاہے کرے۔

کیا یہ حکم ریکارڈ میں نہیں آیا؟

آخر ڈھونڈنے سے اس فرمان کی نقل بخاری اور مسلم میں مل گئی اور اس ملزم کی خلاصی ہوگئی۔

(۱۳)

اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک شخص کا مقدمہ پیش ہے کرام الکاتبین نے عرض کیا،

"علاوہ اور قسم کے گناہوں کے اس پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میری نعش کو جلا کر آدھی راکھ ہوا میں اڑا دینا اور آدھی سمندر میں ڈال دینا، کیونکہ خدا کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر گرفت کی تو مجھے ایسا عذاب ملے گا کہ

مجھ سے پہلے کسی کو نہ ملا ہوگا۔

"خیر اس کے کچھ مدت کے بعد وہ شخص مر گیا اور لڑکوں نے اس کی وصیت پر عمل کر دیا۔ جزا کے دن حضور تبارک وتعالیٰ کے حکم سے وہ پھر زندہ کیا گیا ہے اس کی بابت کیا فرمان ہے؟"

ارشاد ہوا "اس سے پوچھو کہ تو نے ایسا کام کیوں کیا؟"

وہ شخص کہنے لگا "میرے خداوندا میں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا اور ہمیشہ بدعملیوں ہی میں مصروف رہا۔ اس لئے اے رب میں نے یہ بات تیرے ڈر کے مارے کی اور تو خود سب حقیقت جانتا ہے۔"

حضور باری نے یہ سن کر فرمایا "یہ سچ کہتا ہے، اسے چھوڑ دو۔ اس کے دل میں ضرور میرا حقیقی تقویٰ اور خوف موجود تھا۔"

(۱۴)

ایک طرف کچھ آدمی خوش خوش جنت کی سڑک پر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری نجات ہوگئی؟

کہنے لگے "ہاں"

پوچھا کہ کیونکر؟

کہنے لگے کہ جب ہم کو ذاتِ باری نے مصیبت میں مبتلا دیکھا تو فرمایا میرا تو ان لوگوں سے وعدہ ہے کہ ان کو جنت میں داخل کروں گا۔

میں نے کہا کہ وہ وعدہ کیا تھا؟

کہنے لگے کہ حضور احدیت نے اپنے رسول کی معرفت ہم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ

مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا يَعْنِي الذُّكُورَ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ

"جس شخص کی ایک بیٹی ہو، پھر نہ وہ اسے زندہ گاڑ دے اور نہ ذلیل رکھے، اور نہ ترجیح دے اس پر اپنے بیٹوں کو، تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

پس اس بات پر عمل کی وجہ سے ہم پر خدا کا فضل ہو گیا ہے۔

(۱۵)

اسی طرح ایک عورت کو دیکھا کہ باوجود اس کے کہ اس کی عبادتیں یعنی روزے، نمازیں اور صدقے بہت ہی کم تھے، تاہم اس لئے جنتی ہو گئی کہ وہ اپنے ہمسایوں کو اپنی زبان سے کبھی کوئی تکلیف نہ دیتی تھی اور سب اس سے خوش تھے۔

(۱۶)

غرض ہم اسی طرح چلتے رہے یہاں تک کہ ایک عظیم الشان گروہ شہدا کا دیکھا جن کی گنتی اور حد و بست خیال و وہم سے بالاتر تھی۔

غفران نے بتایا کہ ان میں سے تلوار سے خدا کی راہ میں شہید ہونے والے بہت کم ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کی مغفرت اور رحم نے شہید بنانے کے لئے اور بہت سے سامان محض اپنے فضل سے پیدا کر دیئے ہیں۔ مثلاً۔

جو شخص خدا کے دین کی خدمت کے کسی کام میں بغیر تلوار کے بھی اپنی موت مر جائے وہ بھی شہید ہے۔

جو اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

جو مومن طاعون سے مر جائے وہ بھی شہید ہے۔

جو عورت بچہ جن کر مرے وہ بھی شہید ہے۔

جو ذات الجنب سے مرے وہ بھی شہید ہے۔

جو دستوں کی بیماری سے مرے وہ بھی شہید ہے۔

جو دب کر مرے وہ بھی شہید ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض شہادت، مغفرت اور بلندی درجات کے ایسے بہت سے راستے کھول دیئے ہیں کہ اگر مومن خدا کا شکر کرتے کرتے مر بھی جائیں تو بھی اپنے مالک کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ جو شخص شہادت کے لئے دُعا مانگتا ہے پھر خواہ اپنے بستر پر ہی اس کی جان نکلے وہ بھی شہید ہی محسوب ہوتا ہے۔

(۱۷)

عورتوں کے لئے تو وہاں بہت ہی نرمی تھی اور عام حکم یہ تھا کہ جو عورت نماز پڑھے روزہ رکھے اپنی عفت کی حفاظت کرے اور خاوند کی نافرمان نہ ہو، وہ بہشت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

(۱۸)

پھر ہم اور آگے چلے وہاں ایک شخص کا مقدمہ پیش تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فوت ہوا تھا جب اس نے وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے جنازہ کے لئے نکلے۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا "حضور یہ ایک فاجر فاسق شخص تھا اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حاضرین جنازہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا "کیا کسی نے اسے اسلام کی کسی بات پر عمل کرتے دیکھا ہے؟"

لوگوں نے عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ اس نے خدا کی راہ میں ایک رات پہرہ دیا تھا۔"

یہ سُن کر حضورؐ نے اس کی نماز پڑھی، اس کی قبر پر مٹی ڈالی اور اس کی نعش کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "اے مرنے والے! تیرے دوستوں کا خیال ہے تو جہنمی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو یقیناً جنتی ہے۔ اور اے عمر بن خطاب! تو لوگوں کے تفصیلی اعمال نہ کرید اکر بلکہ صرف یہ دیکھ لیا کر کہ آیا وہ اسلام کا مجملاً متبع ہے یا نہیں۔"

(۱۹)

اسی طرح ایک مومن مجاہد جس کے اعمال کم تھے، اس کے نیکی کے پلڑے میں اس کا گھوڑا، گھوڑے کا چارہ اور اس کے گھوڑے کی لید اور پیشاب وغیرہ تک ڈالے گئے، یہاں تک کہ وہ پلڑا اس کی غفلتوں اور گناہوں کے پلڑے سے بھاری ہو گیا اور وہ اپنے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر جنت کی طرف سرپٹ روانہ ہو گیا۔

اسی طرح لاتعداد انسانوں کی مغفرت اس طرح پر ہوئی کہ ان کو انبیاء، اولیاء، نیکوں اور اہل اللہ سے صرف دوستی اور محبت تھی اور

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ

کے وعدہ کے مطابق وہ سب باوجود کمی اعمال کے ان بزرگوں کے ہمسائے قرار پائے۔

(۲۰)

ایک جگہ دیکھا کہ خدا کا ذکر و تسبیح کرنے والوں کی ایک جماعت فرشتوں کے پروں کے سایہ میں جنت کی طرف جا رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی تھا جس کی طرف غفران نے اشارہ کر کے کہا کہ اس کا قصہ بھی عجیب ہے۔ ایک دفعہ باری تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے پوچھا کہ آج تم نے دُنیا میں کیا دیکھا؟

انہوں نے عرض کیا "الٰہی! تیرے کچھ بندے ایک مسجد میں تیرا ذکر بصد ذوق و شوق کر رہے تھے۔"

فرمایا "گواہ رہو کہ میں نے ان کو بخش دیا۔"

فرشتوں نے عرض کیا کہ الٰہی! اسی مجلس میں ایک شخص اور بھی موجود تھا مگر وہ ذکرِ الٰہی کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ اپنے نج کے کسی کام کو آیا تھا۔

ارشاد ہوا کہ گواہ رہو۔ میں نے اسے بھی بخش دیا۔

هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ

(ایسے لوگوں کے پاس بیٹھنے والا بھی نامراد نہیں ہوا کرتا)

اور یہ وہ شخص ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا تھا۔

(۲۱)

پھر ہم اور آگے بڑھے تو غفران نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو مغفرت کی چادر اوڑھے چلا جاتا تھا۔ کہنے لگا کہ اس شخص کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

اس شخص نے ایک بزرگ صحابی کی معیت میں اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ کی طرف اس وقت ہجرت کی جب حضورؐ نے ہجرت فرمائی تھی۔ مدینہ جا کر یہ شخص بیمار ہو گیا اور ایسا بے صبر ہوا کہ تیر کے پیکان سے اپنے ہاتھ کی رگیں خود کاٹ ڈالیں جن سے اتنا خون جاری ہوا کہ یہ مر گیا۔ اس کے دوست صحابی نے اُسے خواب میں دیکھا کہ اس کی حالت بہت اچھی ہے مگر اپنے دونوں ہاتھ ڈھانکے پھرتا ہے۔

پوچھا "تیرے ساتھ کیا معاملہ ہوا ؟"

کہنے لگا کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا، اس لئے کہ میں نے اس کے نبی کی طرف ہجرت کی تھی۔ مگر یہ بھی فرما دیا کہ ہم تیرے ہاتھوں کو درست نہ کریں گے جن کو تو نے خراب کیا ہے۔

یہ قصہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ وَلِیَدَیْہِ فَاغْفِرْ

(یا اللہ ان کے ہاتھوں کی بھی مغفرت فرما)

سو یہ شخص آج تک اسی حالت میں رہا۔ آج اس دُعا کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی معیت دُور ہو گئی اور یہ جنت کو جا رہا ہے۔

(۲۲)

پھر اور آگے بڑھے۔ تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کی بابت حکم ہوا ہے کہ اس کا حساب کتاب ہم خود ذاتی طور پر لیں گے۔ چنانچہ وہ شخص عرش کے سامنے حضوری میں پیش کیا گیا۔

ارشاد ہوا۔ تجھے معلوم ہے کہ تو نے ایسے ایسے بھاری گناہ دنیا میں کئے تھے۔
اس نے عرض کیا۔ "ہاں اے میرے رب کئے تھے۔"
اس کی بوٹی بوٹی خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی کہ بس اب جہنم کے سوا میرے لئے کوئی جگہ نہیں کہ اتنے میں ارشاد ہوا۔ دیکھ میں نے تیرے ان سب گناہوں کی دنیا میں پردہ پوشی کی تھی۔ اب اسی طرح میں یہاں بھی ان کی پردہ پوشی کر دوں گا۔ جا اپنی نیکیوں کا اعمال نامہ لے جا۔ اور اپنے گناہوں کا رجسٹر یہیں ہمارے پاس چھوڑ جا۔ آگے ہم جانیں ہمارا کام۔

(۲۳)

اس کے بعد ایک اور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ایک مجرم لایا گیا۔ اور اس کے ساتھ ننانوے بڑے بڑے طومار رجسٹروں اور اعمال ناموں کے تھے۔ مجھے ارشاد ہوا۔ "دیکھو یہ تیرے اعمال نامے ہیں۔ اگر تجھے ان سے انکار ہے تو کہہ دے۔"
اس نے عرض کیا "میرے مولا! جو کچھ ان میں لکھا ہے وہ سب سچ ہے۔"
ارشاد ہوا۔ "کوئی عذر ہے۔"
کہنے لگا "کوئی نہیں۔"
حکم ہوا کہ ہمارے ہاں تو تیرا ایک عذر اور ایک بڑی نیکی موجود ہے۔ تجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ایک چٹھی پیش کی گئی جس پر لکھا تھا۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

حکم ہوا کہ اس چٹھی کو اس کی نیکیوں کے پلڑے میں رکھو۔
رکھتے ہی وہ پلڑا اتنا جھک گیا کہ وہ سب طومار گناہوں کے اس کے مقابلہ میں بالکل ہلکے ہو گئے۔ اور وہ شخص الحمدللہ، الحمدللہ کہتا ہوا بہشت بریں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

(۲۴)

اس کے بعد ہم ایک اور طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ خداوند عالم رب العالمین کی طرف سے ایک منادی کنندہ یہ اعلان کر رہا تھا کہ

اَیْنَ الَّذِیْ کَانَتْ [تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ] (السجدہ: ۱۷)

(کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو میری خاطر رات کے وقت بستروں سے الگ رہتے تھے)

یہ سنتے ہی ایسے سب لوگ کھڑے ہو کر ایک جگہ جمع ہو گئے اور ان کو حکم ہوا کہ جاؤ تمہیں بغیر حساب بخش دیا۔

۲۵

اس کے بعد ایک تیسرا مقدمہ عدالت خاص میں پیش ہوا۔ ایک شخص کو آگے لایا گیا اور حکم ہوا کہ اس کے صغیرہ گناہ اور چھوٹی چھوٹی خطائیں اسے پڑھ کر سناؤ، پھر پوچھو کہ تو نے یہ گناہ کئے تھے۔ مگر کبائر اس کے سامنے نہ پیش کرنا۔

صغائر کو سن کر وہ شخص کہنے لگا " ہاں مولا! یہ سب میری غلطیاں مجھ سے ہی سرزد ہوئی ہیں۔ میں کیونکر سچی باتوں کا انکار کر سکتا ہوں۔" اور ساتھ ہی وہ شخص دل میں ڈر رہا تھا کہ اب اس کے بعد میرے کبائر بھی ظاہر کئے جائیں گے کہ اتنے میں حکم ہوا " جا تجھے ہم نے بخشا، اور تیرے ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی تجھے دی۔"

یہ دیکھ کر وہ بے چارا خوشی کے مارے بالکل دیوانوں کی طرح ہو گیا اور کہنے لگا " یا الٰہی یہ تو میرے چھوٹے چھوٹے گناہ تھے۔ ابھی بڑے بڑے گناہوں اور کبائر کو تو پڑھا ہی نہیں گیا۔ ان کو بھی پیش کیا جاوے۔"

یہ سننا تھا کہ حاضرین بے اختیار ہنس پڑے اور وہ شخص بھی شرمندہ سا ہو کر جنت کی طرف روانہ ہوا اور پیچھے سے ایک فرشتہ نے مغفرت کی چادر اسے اوڑھا دی۔

(۲۶)

جن اشخاص کو دنیا میں اپنے قصوروں اور حدود کی سزا مل چکی تھی ان کے ساتھ تو خصوصًا وہاں نرمی اور شفقت کا سلوک ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایک شخص سے دنیا میں ایک برا کام سرزد ہو گیا تھا۔ وہ خود گیا اور حاکم وقت سے عرض کیا "حضور! مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا ہے، میں نے توبہ کی ہے، تم مجھے دنیا میں سزا دے لو، میں اپنے رب کے آگے روسیاہ ہونے سے دنیا کی تکلیف برداشت کر لینا بہتر سمجھتا ہوں۔" چنانچہ اسے سنگسار کر دیا گیا اور جو حشر میں لایا گیا تو اس کو ان خوش کن الفاظ سے مخاطب کیا گیا "اے میرے بندے! ہمیں تیری اس توبہ کی اس قدر قدر و منزلت ہے کہ اگر وہ ایک پورے شہر کے گنہگاروں پر تقسیم کی جاتی تو ہم ان سب کو بخش دیتے۔"

(۲۷)

ایک اور شخص کو دیکھا جس نے اپنے زمانہ حکومت میں رعایا پر بہت ظلم کئے تھے۔ وہ سب مظلوم اس سے بدلہ لینے کے لئے وہاں حاضر تھے۔ مگر جب یہ سنایا گیا کہ اس شخص نے آخری عمر میں اپنے سب مظالم سے توبۃ النصوح کر لی تھی اور مدینہ طیبہ ہجرت کر کے چلا گیا تھا اور وہیں مرا تھا تو اس اعلان سے یکدم ان تمام لوگوں پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ سب ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے "ہم نے اس شخص کے سب قصور معاف کئے، خدا بھی اسے بخشے۔" چنانچہ وہ خوش خوش ہنستا ہوا وہاں سے جنت کی طرف رخصت ہوا۔

(۲۸)

اس سے بڑھ کر یہ کہ کروڑوں انسانوں کے حقوق العباد کا بدلہ خدا تعالیٰ نے مستحقین کو اپنے پاس سے بڑھ چڑھ کر ادا کر دیا اور ان مظلوموں نے نہایت خوشی سے اپنے دعوؤں اور حقوق سے دستبرداری داخل کر دی اور ان کے گناہ بخش دیئے گئے۔

نالائق اولاد جن پر ان کے ماں باپ بہت راضی اور خوش تھے وہاں محض اس

لئے بخشی جارہی تھی کہ وہ
رِضَی الرَّبِ فِی رِضَی الْوَالِدِ کے قانون کے ماتحت خدا کا فضل جذب کر رہی تھی۔

(۲۹)

سب سے حیران کرنے والی بخشش میں نے دو شخصوں کے معاملہ میں دیکھی۔ دو جہنمی ایک طرف دوزخ میں جانے کے لئے کھڑے تھے کہ ایک مغفور شخص وہاں سے گزرا ایک جہنمی نے اس جنتی سے کہا "بھائی صاحب! کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہ ہوں جس نے آپ کو فلاں جگہ ایک دفعہ پانی پلایا تھا۔"

اس پر دوسرا جہنمی بولا "مجھے بھی تو آپ نہ بھولے ہوں گے۔ میں نے آپ کو فلاں جگہ ایک دن وضو کے لئے لوٹا بھر کر دیا تھا۔ اب ہم تو جہنم کو جائیں گے اور آپ جنت کو۔"

یہ سن کر جنتی کا دل پسیج گیا اور اس نے وہیں بارگاہ غفور رحیم سے ان کے لئے دعا کی۔ حکم ہوا ان کو بھی اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ۔

(۳۰)

ابھی ہم ان نظاروں سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ جہنم کی طرف سے سخت چیخوں کی آواز آنے لگی۔ رپورٹ ہوئی کہ دو شخص بے حد غل مچا رہے ہیں۔ ارشاد ہوا "ان کو ہمارے روبرو پیش کرو۔" غرض وہ حضوری میں لائے گئے۔

پوچھا گیا "اتنا غل کیوں مچاتے ہو"۔

انہوں نے عرض کیا "الہٰی جل گئے ہیں اس عذاب کی برداشت نہیں۔ ہم پر رحم ہو"۔

ارشاد ہوا "جاؤ! فی الحال اپنی جگہ چلے جاؤ، تمہارے معاملے پر غور ہوگا"۔

یہ سن کر ایک تو واپس جہنم میں چلا گیا مگر دوسرا وہیں کھڑا رہا۔

حکم ہوا "تو کیوں نہیں جاتا؟"

وہ عرض کرنے لگا۔ "مولا! کیا تو نے مجھے اسی لئے جہنم سے نکالا تھا کہ پھر دوبارہ اسی میں ڈالا جائے"۔

اس پہ حاضرین ہنس پڑے۔ ارشاد ہوا "اے بے صبر! اچھا جا۔ ہم نے تجھے بخشا اور ترے ساتھی کو بھی"۔

(۳۱)

غرض اسی طرح کے حالات دیکھتے ہوئے ہم ایک گروہ صحابہ کی طرف گئے وہاں بھی کچھ جھگڑے اور حساب کتاب شروع تھا۔ ایک صحابی حاطب کے متعلق ان کے گواہوں نے بیان دیا کہ اس شخص نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ خیانت کی ہے کہ اس کی سزا دنیا میں سوائے قتل اور عاقبت میں سوائے جہنم کے اور کچھ نہیں۔ اس نے کفار مکہ کو خط لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تم پہ یکدم مخفی حملہ کرنے والے ہیں، تم ہوشیار ہو جاؤ۔ اس نے حضور کا راز فاش کیا، کفار کو مدد دی، اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کا پورا سامان مہیا کر دیا۔ اگر خداوند تعالیٰ کی طرف سے حضرت ختمی مآبؐ کو بروقت اطلاع نہ مل جاتی تو فتح مکہ کی ساری تجاویز درہم برہم ہو کر رہ جاتیں۔ اس سے بڑھ کر غدار ہم کو تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ تمہاری بات بالکل سچی ہے لیکن ۲ھ میں ہمارا جو فرمان اہل بدر کے لئے جاری ہوا تھا اس کا ریکارڈ نکالو۔" ارشاد کی دیر تھی کہ فرمان متعلق اہل بدر حضوری میں پڑھا گیا اور وہ یہ تھا۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَاِنِّیْ غَفَرْتُ لَکُمْ

(اب جو چاہو کرو۔ میں نے تمہاری مغفرت بہرحال کر دی)

نیز ارشاد ہوا کہ بندوں کی بعض اہم خدمات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے بعد ہم ان کو ایسا ہی انعام دیا کرتے ہیں۔ جانے دو حاطب کو اہل بدر کے ساتھ وہ مغفور ہے۔

(۳۴)

اس کے بعد سید الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب شیر خدا کا مقدمہ پیش ہوا۔ گواہوں نے کہا کہ یہ ایک دن شراب کے نشے میں بیٹھے اپنی ایک لونڈی کا گانا سن رہے تھے کہ خوش ہو کر فرمانے لگے "مانگ کیا مانگتی ہے۔" اس لونڈی کو حضرت علی ابن ابی طالب سے کچھ عناد تھا۔ کہنے لگی "جنگ بدر کے مال غنیمت میں سے علیؑ کو دو اونٹنیاں اپنے حصے کی ملی ہیں اور وہ فلاں احاطہ میں بندھی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی تازہ کلیجی بھون کر کھاؤں۔"

اس پر یہ صاحب اُٹھے اپنا خنجر سنبھالا اور اس احاطہ میں پہنچ کر ان زندہ اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر ڈالے اور پیٹ کے اندر سخت بیدردی سے ہاتھ ڈال کر ان کی کلیجیاں کھینچ کر نکال لیں اور اس لونڈی کو لا کر دے دیں کہ کھالو۔ بعد میں وہ زخمی جانور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ لوگوں نے حضرت علیؑ کو خبر کی۔ وہ روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔

حضورؐ ان کو ساتھ لے کر ان صاحب کے ہاں تشریف لے گئے وہ نشہ میں کیا فرماتے ہیں۔ "کیا تم دونوں میرے باپ کے غلام نہیں ہو۔" یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور سمجھ لیا کہ وہ شراب کے نشے کی وجہ سے ہوش میں نہیں ہیں۔ ان سے بات کرنا فضول ہے۔ اس کے کچھ مدت بعد یہ صاحب اُحد کی جنگ میں مارے گئے۔ ہم ان سے اس ظلم کا قصاص چاہتے ہیں جو ان سے سرزد ہوا تھا اور جو مذہب کے متعلق نہ تھا بلکہ انسانیت کے خلاف تھا۔ اور گو اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی، پھر بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ یہ سخت قساوت قلبی اور ظلم ناحق کا مظاہرہ تھا جسے انسان کی فطرت دھکے دیتی ہے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو اس لئے ہم جو سائق ہیں اس کا قصاص طلب کرتے ہیں۔

بارگاہ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ ہم تو اس قصور کا قصاص پہلے ہی لے چکے ہیں۔

حمزہ ہمارا شیر ہے لیکن ہم نے جو قصاص لیا ہے وہ بھی ظاہر ہے اور جو مقام قرب کا ہم نے اسے بخشا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ایک لونڈی نے ان اونٹنیوں کو حمزہ سے کہہ کر مروایا۔ اسی طرح وحشی جو ایک غلام تھا اسے بھی انعام دے کر احد میں لایا گیا تھا اور اس کے حربہ نے حمزہ کا پیٹ اسی طرح چاک کیا جس طرح ان جانوروں کا پیٹ پھاڑا گیا تھا۔ پھر ہندہ زوجہ ابوسفیان نے حمزہ کا کلیجہ اس زخم میں سے اسی طرح نکالا جس طرح حمزہ نے ان جانوروں کے کلیجے نکالے تھے اور جس طرح اونٹنیوں کے جگر کباب بنا کر کھائے گئے تھے اسی طرح حمزہ کا جگر بھی ہندہ نے میدانِ احد میں سب کے سامنے کھڑے ہو کر چبایا۔ اور دوسری اونٹنی کے بدلہ میں اس عورت نے ان کو مثلہ بھی کیا یعنی ان کے ناک، کان اور ہونٹ کاٹ کر ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈالے اور میدانِ جنگ میں فخریہ لوگوں کو دکھاتی پھری۔ اور انہوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے باپ کا غلام کہا تھا تو ایک حبشی غلام ہی نے ان کا کام تمام کیا اور یہ نصیب نہ ہوا کہ کسی معزز سردار قریش کے ہاتھ سے مارے جاتے۔ اب بتاؤ کون سی چیز ہے جس کا قصاص حمزہ سے نہ لیا گیا ہو۔ اونٹنیوں کا جگر کھانے والی بھی ایک مغنیہ تھی اور حمزہ کا جگر کھانے والی بھی ایک گانے والی تھی جو میدانِ احد میں وہ مشہور گیت گاتی پھرتی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

نَحْنُ بَنَاتُ الطَّارِقِ نَمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ

ہاں چونکہ وہ ہمارا محبوب بندہ تھا ہم نے اس قصاص کو بھی ایک عزت کی شکل دے دی۔ اس کا احد میں مارا جانا اس کے سید الشہداء مشہور ہونے کا باعث ہوا اور باقی باتیں جو مرنے کے بعد اس سے کی گئیں ان سے بھی اُسے کوئی تکلیف اور اذیت نہ ہوئی، نہ مثلہ ہونے کی، نہ کلیجہ نکالنے کی اور نہ کلیجہ چبانے کی۔ پس ہم نے ایک ایسی عزت والی مغفرت کی چادر اس پر اوڑھا دی جس کی وجہ سے اس کے مدارج بھی بلند ہو گئے اور تمہارا دعویٰ قصاص بھی پورا ہو گیا۔ اب اسے لے جاؤ اور جنت میں اس کے بھتیجے کے پاس ہی اس کا

مقام بھی بتا دو۔ ہم اس سے راضی ہیں اور وہ ہم سے

(۳۳)

یہ فیصلہ سُننے کے بعد ہم آگے بڑھے۔ ایک مسلمان کو دیکھا کہ اس کا ہر عمل عیب دار تھا اور سوائے اس کے اس نے شرک نہیں کیا تھا۔ باقی ہر طرح اس کی زندگی گنہگارانہ تھی۔ قریب تھا کہ جہنم کے فرشتے اسے کھینچ کر لے جائیں کہ یہ پُر رعب و پُر شوکت آواز فضا میں بلند ہوئی۔

مَنْ عَلِمَ اَنِّیْ ذُوْقُدْرَتِہٖ عَلٰی مَغْفِرَۃِ الذُّنُوْبِ
غَفَرْتُ لَہٗ وَلَا اُبَالِیْ مَالَمْ یُشْرِکْ بِیْ شَیْئاً

اور یہ شخص گو بڑا گنہگار ہے مگر اسے ہمیشہ یہ یقین تھا کہ میرا خدا غفور الرحیم ہے پس اس یقین کی وجہ سے میں اسے بخشتا اور جنت میں داخل کرتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا آدمی کھڑا تھا جس کے نامۂ اعمال میں پہلے ورق سے آخر ورق تک نافرمانیاں اور غفلتیں ہی غفلتیں لکھی تھیں، لیکن ہر صفحہ پر اس کے ایک دو استغفار بھی ضرور لکھے ہوتے تھے جو گناہ بے لگا ہے خدا سے مانگ لیا کرتا تھا۔ حکم ہوا کہ میں نے اپنے اس بندے کے سب گناہ اس کے استغفاروں کی وجہ سے محو کر دیئے۔

(۳۴)

پھر ایک اندھے کی بابت جھگڑا شروع ہوا۔ بارگاہِ الٰہی کی طرف سے حکم آیا کہ ہم نے اس کی دو نہایت پیاری عزیز آنکھیں لے لیں۔ اب یہ مستحق ہے کہ ہم اس کی مغفرت کریں۔

(۳۵)

آگے چل کر لاانتہا بیماروں اور مصیبت زدہ مفلسوں کا ایک جم غفیر تھا جن کے لئے یہ حکم ہوا کہ جن لوگوں کی مغفرت کا مجھے خیال ہوتا ہے ان کو میں دنیا سے رخصت نہیں کرتا۔ جب تک ان کے ایک ایک گناہ کے بدلے ان کو جسمانی امراض اور رزق کی تنگی دے کر انہیں جنت میں جانے کے قابل نہیں بنا لیتا۔

لَا اُخْرِجُ اَحَدًا مِنَ الدُّنْیَا اُرِیْدُ اَغْفِرُلَہٗ حَتّٰی اَسْتَوْفِیَ
کُلَّ خَطِیْئَۃٍ فِیْ عُنُقِہٖ بِسُقْمٍ فِیْ بَدَنِہٖ وَاِقْتَارٍ فِیْ رِزْقِہٖ۔

خاکسار بھی چونکہ اپنے بچپن کے زمانہ سے ہمیشہ بیماری میں مبتلا رہا ہے اس لئے یہ ارشاد سُن کر بے حد خوش ہوا اور اپنی سب تکالیف مجھے راحت نظر آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے غفران سے کہا۔

" بھائی! بہت کچھ نمونہ جناب الٰہی کی مغفرت کا میں نے دیکھ لیا۔ یہاں کا معاملہ تو ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اور میں اب تھک بھی گیا ہوں۔ اب تو مجھے واپس لے چل۔ چنانچہ ہم واپس ہوئے۔ مگر راستہ میں میری تکان کو دیکھ کر اس نے مجھے باتوں میں مصروف رکھا اور بتایا گیا کہ مغفرت کی بعض وجوہ اور اسباب کیا ہیں چنانچہ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

۱۔ یہ کہ کوئی شخص خواہ اس کا کتنا ہی ایمان ہو یا کتنے ہی اعلیٰ عمل ہوں ابدی جنت اور دائمی مغفرت کا وارث صرف اپنی کوشش کی وجہ سے نہیں ہو سکتا بلکہ یہ سب چیزیں جاذب فضل خدا ہیں۔ پس اصل چیز فضل الٰہی ہے اور کسی انسان کی نجات عمل پر نہیں بلکہ فضل پر موقوف ہے۔

۲۔ دوسرا اصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ بڑا ہی نکتہ نواز ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ وہ بالاِرادہ غفور الرحیم ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے کسی کو بے حساب بخشتا ہے اور کسی کو ہلکا سا حساب لے کر، اور کسی سے پورا حساب مانگتا ہے۔

۴۔ اس کا رحم ہمیشہ اس کے غضب پر غالب ہے۔

۵۔ اس کی سب سزائیں بھی کسی حکمت، مصلحت اور اصلاح پر مبنی ہیں نہ کہ خفگی اور غصہ پر۔ یہاں تک کہ جہنم بھی ایک شفاخانہ ہے اور عارضی ہے نہ کہ دائمی۔

۶۔ تمام مخلوقات میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو کسی کا کوئی گناہ بخش سکے گناہوں کی بخشش صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے۔

اِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ

۷۔ اس کی درگاہ ظلم کے عیب سے بالکل پاک ہے۔ وہاں یا تو رحم ہے یا انصاف ہے یا مناسب سزا۔

۸۔ نیکی کا بدلہ نیک ہے بلکہ بہت بڑھ کر ملتا ہے۔ بدی کی سزا بڑھا کر نہیں بلکہ اتنی ہی دی جاتی ہے۔ اگر کوئی نیکی کی صرف نیت کرے تو اس نیت کا اجر بھی ملتا ہے لیکن بدی کی نیت کرے اور کر نہ سکے تو کوئی سزا نہیں۔ اور اگر بدی کا ارادہ کر کے پھر بدی کرنے سے پہلے ہی اس سے باز آجائے تو پھر نیکی محسوب ہوتی ہے نہ کہ بدی۔

۹۔ استغفار کی دُعا بارگاہ الٰہی میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے۔

۱۰۔ کوئی دوسرا شخص کسی کے لئے مغفرت کی دُعا کرے تو وہ نہ صرف اسی شخص کے لئے مقبول ہوتی ہے بلکہ دُعا کرنے والا بھی برابر کی مغفرت کا حصہ پاتا ہے اور زندوں کا بہترین ہدیہ مردوں کے لئے استغفار ہی ہے۔

۱۱۔ غفور الرحیم خدا نے بے انتہا فرشتے عالمین کے ہر گوشہ اور کونہ کونہ میں بٹھا رکھے ہیں اور ایک نہایت معزز اور مقرب طبقہ ملائکہ کا اپنے عرش کے گرد مقرر کیا ہے تاکہ وہ ہر وقت انسانوں کے لئے مغفرت کی دُعا اور سفارش کرتے رہیں۔ خدا تعالیٰ مغفرت کرنے سے نہیں ہچکچاتا خواہ کسی مومن کے گناہ پہاڑ جتنے ہوں یا آسمان تک ہوں اور ہر روز لاانتہا گناہ انسانوں کے اس غفور الرحیم کے فضل و کرم سے یونہی معاف ہوتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ آخرت میں تمام انبیاء خصوصاً سرتاج انبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ دیگر جملہ مقربین بھی شفاعت کا اذن پائیں گے اور لاتعداد مخلوق ان کی شفاعت سے بخشی جائے گی اور نہ صرف بزرگوں اور نیکوں بلکہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کی سفارش

اور شفاعت بھی گنہگاروں کی مغفرت کرائے گی ۔

۱۳۔ بالآخر وہ غفور الرحیم یہ کہہ کر اپنا ہاتھ جہنم میں ڈالے گا۔ کہ سب شفاعت کرنے والے اپنی اپنی شفاعت کر چکے، اب مجھ رحمان، حنان، منان کی شفاعت کی باری ہے یہ کہہ کر وہ باقی ماندہ سب سزا یافتوں کو نکال لے گا جہنم اپنے سکان سے خالی ہو جائے گا۔ اور رحمت الٰہی کی نسیم اس کے دروازوں کو کھڑکھڑائے گی۔ اور فرعون اور ابوجہل تک بھی ایک محدود زمانہ کے بعد بخشے جائیں گے اور اس غفور الرحیم کی مغفرت کی چادریں لپٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ جہنم بھی تک مجرم کو اپنے اندر رکھے گی جب تک کہ اس کی اصلاح نہ ہو جائے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حَتّٰٓی اِذَا ھُذِّبُوْا وَنُقُّوْا یعنی جونہی تہذیب اخلاق اور پاکیزگی قلب وہاں مجرم کو حاصل ہو گئی اور وہ اس قابل ہو گیا کہ جنتیوں کے ساتھ مل کر بکمال اخلاق و نیکی اپنی زندگی وہاں پُرامن طور پر بسر کر سکے اسی وقت وہ جنت میں داخل کر دیا جائے گا ۔

۱۴۔ بعض لوگ اس وسوسہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے تو پھر کیوں وہ ان کو دوزخ میں ڈالے گا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جہنم تو دراصل معاند مشرکین، سخت ترین مفسدین اور خدا و رسولؐ کا مقابلہ کرنے والوں کے لئے ہی ہے ۔ ماں باپ بھی جب ان کی اولاد متمرد اور سرکش ہو جائے تو ان سے بیزار اور ان کے دشمن ہو جاتے ہیں ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِہٖٓ اِلَّا الْمَارِدَ الْمُتَمَرِّدَ الَّذِیْ یَتَمَرَّدُ عَلَی اللّٰہِ وَاَبٰٓی اَنْ یَّقُوْلَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔

ایسے لوگوں کے سوا گنہگاروں کے ساتھ جو سلوک یہاں ہو رہا ہے وہ تو تم نے آج خود دیکھ ہی لیا ہے ۔

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (المومنون : ۹۲)

اعمال صالحہ

ان باتوں کے سوا جو تیری نظر سے گزریں اور ہزاروں طریقے مغفرت الٰہی کے اجراء کے ہیں۔ اور لاکھوں اعمال ایسے ہیں جن کو حضرت غفور الرحیم پسند کر کے اس شخص پر اپنی مغفرت کا نور چڑھا دیتے ہیں۔ کہیں نماز روزہ، اخلاق پسندیدہ، بزرگوں کو خوش رکھنا، والدین کی اطاعت، خاوند کی فرمانبرداری، یتیموں کی پرورش، صدقہ وخیرات، توبہ استغفار، تبلیغ، ذکر الٰہی، خشیۃ اللہ اور تقویٰ، خدا تعالیٰ پر امید رکھنا، کبائر سے بچتے رہنا، بزرگوں کا ادب کرنا دوسروں کے قصور معاف کرنا اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا، احسان، بکثرت اور محبت کے ساتھ درود پڑھنا، اخلاص، جہاد، قربانیاں، تلاوت قرآن مجید وغیرہ۔

"غرض تمام اچھے طریقے بلکہ اور جملہ نیک اعمال مومنوں کے لئے مغفرت کو جذب کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس درگاہ کی نکتہ نوازی ہی انسان کی بخشش کا موجب ہو جاتی ہے۔ تیرا پھر کبھی ادھر آنا ہو گا تو باقی مضمون تجھے سناؤں گا۔"

غفران کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ وہی بڑا دروازہ جس سے ہم میدان محشر میں داخل ہوئے تھے نظر آنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی جو ربودگی مغفرت الٰہی کے نشہ کی مجھ پر مستولی تھی وہ جاتی رہی اور میں بیدار ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھر میں اپنے پلنگ پر کاغذ قلم لئے یہی مضمون لکھ رہا ہوں۔ مگر میں نے اپنے پورے ہوش میں صرف یہ آخری فقرہ لکھا کہ

اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اللہ تعالیٰ کا ایک نام اَلصَّبُوْر بھی ہے

ایک دن ایک دوست سے کہہ رہا تھا کہ " انسان کی فطرت ایسی ہے کہ اگر کوئی سائل یا حاجت مند بار بار اس کے پاس آتا ہے تو وہ بیزار ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تنگ ہو کر یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ بھائی تو نے تو میرا ناک میں دم کر دیا اور مانگنے چلے آئے " ایسے فقرے تو وہ چند ہی روز کے بعد کہنے لگتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ سائل کچھ دن برابر آتا رہے۔ اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرے۔ تو پھر بعض اوقات سخت کلامی اور لڑنے تک کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ساری عمر کوئی سائل کسی کے پیچھے پڑا رہے اور وہ تحمل سے اس کی بات سنتا رہے اور آنکھ میلی نہ کرے۔ خواہ وہ امیر ہو یا بادشاہ اور خواہ سوال چھوٹا ہو یا بڑا۔ لیکن خدا تعالیٰ کی یہ ایک عجیب صفت ہے کہ ساری عمر دن رات اس سے مانگے جاؤ۔ مگر وہ مانگنے سے ناراض نہیں ہوتا۔ ایک فقیر نہیں لاکھوں کروڑوں فقیر دن رات کے ہر وقت اور ہر لحظہ میں اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ مگر اس کی آنکھ پر میل نہیں آتا۔ نہ وہ اُکتاتا ہے نہ تنگ ہوتا ہے نہ بیزار۔ غرض یہ خدا تعالیٰ کی ایک عجیب صفت ہے۔ اور مجھے اب تک اس صفت کا نام اسمائے الٰہی میں معلوم نہیں ہوا "۔ ادھر میرے مُنہ سے یہ فقرہ نکلا۔ اور اُدھر معًا دل میں یہ پڑا کہ "ہمارا وہ نام جس کا تو ذکر کر رہا ہے۔ اَلصَّبُوْر ہے"۔ یعنی سائلوں سے تنگ نہ آنے والا اور نہ اُن سے اکتانے والا۔ بلکہ ہر پیچھے پڑنے والے کی بار بار کی پکار کو سہنے والا عالی حوصلہ خداوند۔ کوئی دوسرا

ہو تو اتنے اور بار بار کے مانگنے اور پیچھے پڑنے والوں سے تنگ ہو کر اُن کو دھکے دے کر اپنے دروازہ سے باہر نکال دے۔ مگر یہ اُسی کا حوصلہ اور صبر ہے کہ نہ آزردہ ہوتا ہے نہ بُرا کہتا ہے۔ نہ جھڑکتا ہے۔ نہ اُن کو کسی قسم کی تکلیف پہنچاتا ہے۔ اور سوال کرنے میں بندہ جو بے احتیاطیاں اور زیادتیاں کرتا ہے اُسے برداشت کرتا چلا جاتا ہے اور ان پر صبر کرتا ہے۔ بلکہ جتنا کوئی مانگے اتنا ہی اس سے خوش ہوتا ہے۔

پس یہ بھی صَبُور کے ایک معنے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو یہ نمونہ صبر اور عالی حوصلگی کا دکھا سکے۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

(الفضل ۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء)

اسماءِ الٰہیّہ اور اُن کے صحیح معنے

اَللّٰہُ :۔ تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف اور ہر قسم کے نقص سے منزّہ
رَحْمٰنُ :۔ بہت مہربان۔ بلا مبادلہ فضل کرنے والا۔
رَحِیْمُ۔ نہایت رحم والا۔ نیک اعمال پر ثمرات حسنہ مرتب کرنے والا
مَلِكُ :۔ بادشاہ پورا مالک
قُدُّوْسُ :۔ پاک ذات تمام عیبوں سے بری
سَلَامُ :۔ سلامتی والا۔ تمام نقصانات سے محفوظ
مُؤْمِنُ :۔ امن دینے والا۔ تمام نقائص سے الگ۔ سلامتی کا سرچشمہ
مُهَيْمِنُ :۔ پناہ دینے والا۔ گواہ۔ اعمال کا محافظ اور واقف
عَزِيْزُ :۔ غالب۔ بے نظیر۔ متصرف۔ معزز کرنے والے۔ قوی۔ قاہر
جَبَّارُ :۔ زبردست۔ سنوارنے والا۔ بگڑے کاموں کی اصلاح کرنے والا۔ ٹوٹے کی مرمت کرنے والا۔ بڑے دباؤ والا۔
مُتَكَبِّرُ :۔ بڑائی والا۔ کمال عظمت کا مالک اور مستحق۔ بزرگی والا۔
خَالِقُ۔ بنانے والا۔ اندازہ کرنے والا۔ ہر چیز کا خلق کرنے والا
بَارِئُ۔ پیدا کرنے والا۔ ہر چیز کا عمدہ خلاصہ الگ کرنے والا موجد
مُصَوِّرُ۔ صورت بنانے والا۔ طرح طرح کی شکلیں بنانے والا۔
غَفَّارُ۔ بخشنے والا۔ معاف کرنے والا۔ ڈھانکنے والا۔

قَهَّارُ۔ دباؤ والا۔ حکمران۔ زبردست غلبہ رکھنے والا۔ غالب
وَهَّابُ۔ بہت دینے والا۔ بے حد عطا کرنے والا۔
رَزَّاقُ۔ رزق دینے والا۔ روزی پہنچانے والا۔
فَتَّاحُ۔ کھولنے والا۔ مشکل کشا
عَلِيْمُ۔ جاننے والا۔ بہت علم والا۔
قَابِضُ۔ تنگ کرنے والا۔ لوگوں کے صدقات لینے والا۔ بندوں کی روزی محدود کرنے والا۔
بَاسِطُ۔ کشادہ کرنے والا۔ صدقات کو بڑھانے والا۔ روزی کو فراخ کرنے والا
رَافِعُ۔ بلند کرنے والا۔ درجات اونچے کرنے والا۔ بعد مردن رفع کرنے والا۔ فرمانبرداروں کو بلند کرنے والا۔
خَافِضُ۔ پست کرنے والا۔ مرنے کے بعد گنہگاروں کا رفع نہ کرنے والا۔ نافرمانوں کو ذلیل کرنے والا۔
مُعِزُّ۔ عزت دینے والا۔
مُذِلُّ۔ ذلیل کرنے والا۔
سَمِيْعُ۔ سننے والا۔ بہت سننے والا سب کی سننے والا۔ دعا قبول کرنے والا
بَصِيْرُ۔ دیکھنے والا۔ بینا۔ بہت دیکھنے والا۔
حَكَمُ۔ فیصلہ کرنے والا۔ حاکم۔ صحیح فیصلہ کرنے والا۔
عَدْلُ۔ انصاف کرنے والا۔ فیصلہ میں ظلم نہ کرنے والا۔ منصف
لَطِيْفُ۔ بھید جاننے والا۔ نرمی اور مہربانی کرنے والا۔ باریک بین۔
خَبِيْرُ۔ خبردار۔ واقف۔ آگاہ۔ دانا
حَلِيْمُ۔ تحمل والا۔ بردبار

عَظِیۡمُ۔ عظمت والا۔ بزرگ۔ بڑا
غَفُوۡرُ۔ بخشنے والا۔ بہت بخشنے والا۔
شَکُوۡرُ۔ نہایت قدر دان
عَلِیُّ۔ بلندی والا۔ بہت علو والا۔ بہت اونچا۔ بڑی عظمت والا
کَبِیۡرُ۔ بڑائی والا۔ بزرگ تر۔ تمام بزرگیوں کا مستحق۔
حَفِیۡظُ۔ حفاظت کرنے والا۔ نگہبان
اَلۡمُقِیۡتُ۔ مخلوقات کو روزی پہنچانے والا۔ نگران
حَسِیۡبُ۔ کفایت کرنے والا۔ کافی۔ حساب لینے والا۔
جَلِیۡلُ۔ بزرگی والا۔ قہری نشانوں والا۔ بزرگ قدر۔
کَرِیۡمُ۔ عزت والا۔ بزرگ۔
رَقِیۡبُ۔ نگہبان۔ نگران
مُجِیۡبُ۔ قبول کرنے والا۔ دُعا قبول کرنے والا۔ جواب دینے والا۔
وَاسِعُ۔ کشائش والا۔ وسیع المعلومات۔ وسیع الفضاء
حَکِیۡمُ۔ حکمت والا۔ حقائق اشیاء کا پورا علم رکھنے والا۔
مَجِیۡدُ۔ بڑی شان والا۔ عظمت و بڑائی والا۔ بزرگ۔
وَدُوۡدُ۔ محبت کرنے والا۔ نیک بندوں کو دوست رکھنے والا۔
بَاعِثُ۔ اُٹھانے والا۔ مُردوں کو پھر زندہ کرنے والا۔ سوتوں کو جگانے والا۔ زندگی کی روح پھونکنے والا۔
شَہِیۡدُ۔ حاضر۔ نگہبان۔ گواہ۔ بادشاہ۔ نگران
حَقُّ۔ سچا مالک۔ سچائی و صداقت کا سرچشمہ۔ اپنی ہستی میں ثابت شدہ وہ وجود جس میں کبھی فنا اور تغیر ثابت نہیں۔

وَكِيْلُ ۔ کام بنانے والا۔ کارساز۔ جس کے سپرد اپنا کُل کام کر دیں۔ اور تمام تصرّف اس کے ہاتھ میں ہو۔

قَوِيُّ ۔ زور آور۔ توانا

مَتِيْنُ ۔ قوّت والا۔ اُستوار

وَلِيُّ ۔ حمایت کرنے والا۔ محب۔ مددگار۔ سرپرست۔ قریب۔

حَمِيْدُ ۔ خوبیوں والا۔ ہر قسم کی حمد کا سزاوار

مُحْصِيْ ۔ گنتی والا۔ ہر چیز کو احاطۂ علم میں لانے والا۔

مُبْدِئُ ۔ پہلی بار پیدا کرنے والا۔ ابتداءً پیدا کرنے والا۔

مُعِيْدُ ۔ دوسری بار پیدا کرنے والا۔ دوبارہ پیدا کرنے والا۔

مُحْيِيْ ۔ جلانے والا۔ زندگی عطا کرنے والا۔

مُمِيْتُ ۔ مارنے والا۔

حَيُّ ۔ زندہ۔ خود زندہ اور دوسروں کی زندگی کا باعث۔

قَيُّوْمُ ۔ سب کا تھامنے والا۔ خود قائم اور دوسروں کے قیام کا ذریعہ۔ کارخانۂ عالم کا سنبھالنے والا۔

وَاجِدُ ۔ پانے والا۔ غنی۔ مقصد میں کامیاب ہونے والا

مَاجِدُ ۔ عزّت والا۔ بزرگی والا۔

وَاحِدُ ۔ اکیلا۔ تنہا۔ یگانہ۔ یکتا۔ ایک۔ بے ہمتا۔

صَمَدُ ۔ بے احتیاج۔ بے نیاز۔ تمام مخلوقات کا مرجع۔

قَادِرُ ۔ قدرت والا۔

مُقْتَدِرُ ۔ مقدور والا۔ صاحب مقدرت

مُقَدِّمُ ۔ آگے کرنے والا۔ دوستوں کو بارگاہ عزت میں بڑھانے والا۔

مُؤَخِّرُ۔ پیچھے کرنے والا۔ دشمنوں کو پیچھے ڈالنے والا

اَوَّلُ ۔ سب سے پہلے۔ سب سے پہلا ۔

الآخِرُ۔ سب سے پیچھے۔ سب سے پچھلا

ظَاھِرُ۔ ظاہر۔ سب پر غالب، آشکار (بلحاظ صفات)۔

بَاطِنُ ۔ چھپا ہوا۔ سب سے چھپا ہوا اور مخفی (بلحاظ ذات)

وَالِیُ۔ مالک ۔ تمام امور کا متولی۔

مُتَعَالِیْ ۔ پاک صفات والا۔ مخلوقات کی صفات سے منزّہ

بِرُّ۔ احسان کرنے والا۔ مہربانی سے نیکی کرنے والا ۔

التَّوَّابُ ۔ رجوع ہونے والا۔ توبہ قبول کرنے والا۔ رجوع برحمت ہونے والا ۔

مُنْتَقِمُ۔ بدلہ لینے والا۔ نافرمانوں سے بدلہ لینے والا ۔

عَفُوٌّ ۔ معاف کرنے والا۔ گناہوں سے درگذر کرنے والا۔ گناہوں کو مٹانے والا۔

رَؤُفُ۔ نرمی کرنے والا۔ بہت شفقت کرنے والا ۔

مٰلِکُ الْمُلْکِ ۔ مُلک کا مالک

ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۔ صاحب عزت اور بخشش کار بزرگی اور عزّت والا ۔

مُقْسِطُ۔ انصاف کرنے والا۔ عادل و منصف

جَامِعُ۔ اکٹھا کرنے والا۔ تمام مخلوقات کو جمع کرنے والا۔ تمام کمالات کا جامع ۔

غَنِیُّ۔ بے پروا۔ ہر قسم کی ضرورتوں کا متکفل اور خود بے پروا ۔

مُغْنِیُّ۔ بے پروا کرنے والا۔ لوگوں کو مالدار اور بے پروا کرنے والا ۔

مَانِعُ ۔ روکنے والا۔ جسے چاہے نہ دینے والا

الضَّارُّ۔ نقصان پہنچانے والا۔ خیر و شر کا خالق ۔ اعمالِ بد کے بُرے نتائج دینے والا۔

نَافِعُ۔ نفع پہنچانے والا۔ نیک اعمال کا نیک بدلہ دینے والا۔
نُوْرُ۔ روشن کرنے والا۔ روشنی کا منبع۔ ہمہ نور
ھَادِیُ۔ ہدایت کرنے والا۔ کامیاب کرنے والا۔
بَدِیْعُ۔ نئی طرح پیدا کرنے والا۔ موجد۔
بَاقِیْ۔ باقی رہنے والا۔ وہ جو کبھی فنا نہیں ہوگا۔
وَارِثُ۔ سب کا وارث۔ فناء موجودات کے بعد باقی رہنے والا۔
رَشِیْدُ۔ نیک راہ بتانے والا۔ صفاتِ کمال والا۔
صَبُوْرُ۔ صبر کرنے والا۔ بڑا صبر کرنے والا۔
غافر۔ گناہوں کو بخشنے والا۔
قابل التوب۔ توبہ قبول کرنے والا۔
شدید العقاب۔ بُرے کاموں کی سخت سزا دینے والا۔
ذوالطول۔ مقدور والا۔ صاحبِ خیر کثیر
ذوالعرش۔ صاحبِ عرش
ذوالمعارج۔ ہر ایک بلندی کا مالک
ذوالرحمت۔ رحمت کا مالک۔
ذو مغفرت۔ مغفرت کا مالک۔
خلّاق۔ بڑا اندازہ کرنے والا۔
فاطر۔ اوّل اوّل پیدا کرنے والا
اکرم۔ معزّز
نصیر۔ مددگار
شاکر۔ قدر دانی کرنے والا۔ (ماہنامہ خالد ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

پنج ارکانِ اسلام

اکثر لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اعمالِ صالحہ ہی ہمارا مقصود ہیں جس نے ایسے اعمال کر لئے بس وہ اپنے مطلب کو پہنچ گیا۔ اور غالباً یہ بھی سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ہماری ان عبادات کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسے لوگ اپنے اعمال پر بہت فخر کرتے ہیں اور ان کو ہی مدارِ نجات یقین کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اعمال خود مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ ذریعہ ہیں بڑی چیزوں کے حصول کا۔ جو نجات و فلاح کا اصل باعث ہیں۔ مثال کے طور پر روزہ کو ہی لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ روزہ تمہارا مقصود ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ تقویٰ تمہارا مقصود ہے اور روزہ کا حکم صرف اس لئے ہے کہ تم کو تقویٰ حاصل ہو جائے۔ پس ثابت ہوا کہ تقویٰ اصل چیز ہے اور روزہ اس کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ مگر عام طور پر لوگ ذرائع اور اسباب کو چمٹے رہتے ہیں۔ اصل چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ترقی اور فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ روزہ رکھ لیا اور تسلی پالی کہ مقصود حاصل ہو گیا۔ حالانکہ اگر اس روزہ سے تقویٰ میں ترقی کرتے تب ان کو خوش ہونا چاہیئے تھا۔

آگے چل کر میں اس مضمون میں بیان کروں گا کہ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ کن باتوں کے لئے کئے جاتے ہیں اور ہمیں ہمیشہ ان اصلی اور ضروری باتوں پر اپنی توجہ رکھنی چاہیئے۔ اگر وہ حاصل ہو رہی ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ ہماری یہ عبادات صحیح لائن پر چل رہی ہیں ورنہ نہیں۔ اور یہ کہ ارکانِ اسلام صرف ذرائع ہیں بعض اور چیزوں کے حاصل کرنے کے جن پر نجات و فلاح منحصر ہے۔ اور وہ چیزیں اصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ،

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَلَا دِمَآؤُہَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ (الحج: ۳۸)

یعنی خدا تعالیٰ کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ جو چیز اسے پہنچتی ہے وہ پاک دلی ہے۔ جو قربانی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو نمازیں روزہ، حج، زکوٰۃ نہیں پہنچتے۔ کیونکہ یہ جسمانی اعمال ہیں۔ اسے تو ان اعمال کی وجہ سے جو دلی پاکیزگی اور محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے وہ پہنچتی ہے۔ اور اس کے دربار میں صرف انہی کی قدر ہے۔ نہ کہ جسم کو فاقہ سے رکھنے یا نماز کی اٹھک بیٹھک کی۔ کیونکہ یہ اعمال صرف وسائل اور ذرائع ہیں تعلق باللہ پیدا کرنے کے لئے اور بس۔

دوسری بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سب عبادات اور اعمال ہمارے اور صرف ہمارے اپنے فائدہ کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے ہم کو یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ اگر ہم روزہ نہ رکھیں گے۔ یا زکوٰۃ نہ دیں گے تو خدا کا اس میں کوئی نقصان ہے یا وہ غصّے ہو جائے گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر ہم یہ اعمال نہ کریں گے تو ہم خود بڑے بڑے فوائد سے محروم رہ جائیں گے اور یہ ارکان کیا بلکہ تمام اعمال خواہ بڑے ہوں یا خواہ چھوٹے اور تمام کے تمام عقائد خواہ اہم ہوں یا معمولی سب بلا استثناء ہمارے اپنے نفع کے لئے ہیں۔ نہ خدا تعالیٰ اپنی تعظیم کا محتاج ہے۔ نہ ہماری عبادتوں کا۔ اس نے تو صاف صاف فرما دیا ہے کہ خواہ تم میری عبادت اور شکر میں مصروف رہو۔ خواہ میرا کفر کرتے رہو۔ دونوں صورتوں میں مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں پہلی بات میں تمہارا اپنا فائدہ ہے اور دوسری میں تمہارا اپنا نقصان۔ میری ذات ان سب باتوں سے بالاتر ہے۔ میں تو تمہیں نفع پہنچانا چاہتا ہوں۔ اور اس نفع کی خاطر کچھ قواعد اور ضوابط تمہارے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔ اگر ان پر عمل کرو گے تو فائدہ اٹھا لو گے ورنہ نہیں۔ میرا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ نہ میری کوئی شان تمہاری عبادتوں سے بڑھے گی۔ نہ میری عزت تمہارے انکار اور کفر سے گھٹے گی۔

وَمَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ

الْعَالَمِیْنَ (عنکبوت: ۷)

جو شخص بھی کوشش کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لئے کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو تمام جہانوں سے غنی اور بے پرواہ ہے۔

وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (لقمان: ۱۳)

جو میرا شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کو ہی فائدہ پہنچانے کے لئے کرتا ہے اور جو میرا کفر کرتا ہے۔ تو میں اُس سے بے پروا اور ستائش کے قابل ہوں۔ اس مضمون کی ایک نہیں بلکہ بہت سی آیات قرآنِ مجید میں موجود ہیں اور سب کا مطلب یہی ہے کہ جملہ عبادات اور ساری نیکیاں اور تمام کوششیں بندہ کے اپنے فائدہ کے لئے ہی ہیں۔ خدا کا قطعاً کوئی فائدہ ان میں نہیں ہے۔ اور اس کے برخلاف عقیدہ رکھنا ایک بڑا دھوکا ہے جو عام لوگوں کو لگا ہوا ہے۔

دوسرا دھوکا یہ ہے کہ لوگ ان اعمال کو ہی اصل چیز سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور جن باتوں کے حصول کے لئے یہ اعمال بطور ذرائع کے تھے۔ ان کا خیال بھی نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روحِ اعمال ضائع ہو گئی اور صرف چھلکا ہی اصل چیز سمجھ لیا گیا۔ اس لئے میں مختصراً یہاں بیان کرتا ہوں کہ نماز کس چیز کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور روزہ کس چیز کے حاصل کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے اور حج ادا کرنا کس مطلب کے لئے ہے اور زکوٰۃ دینے سے ہم کو کس نفع کی امید رکھنی چاہیئے۔ اگر ان اعمال سے وہ چیزیں اور وہ فائدے ہم کو حاصل ہو رہے ہوں۔ تب تو ہمارے ذرائع صحیح ہیں۔ ورنہ ان میں غلطی ہے۔ اور اس غلطی کی اصلاح کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیئے۔ اور جب تک وہ اصل مقصد حاصل نہ ہو۔ ان اعمال کو ناقص اور نکما سمجھتے رہنا چاہیئے۔ مثلاً اگر ہم بیس فٹ اونچے کوٹھے پر چڑھنا چاہتے ہوں۔ اور ۱۵ فٹ لمبی سیڑھی لگا کر اس پر چڑھنے لگیں تو کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اصل مقصد ہمارا کوٹھے پر چڑھنا ہے نہ کہ صرف ایک سیڑھی دیوار سے لگا دینا۔ پس اصل مقصود ان عبادات کا جو کلامِ الٰہی نے بیان فرمایا ہے۔ اسے ہمیشہ ذہن میں مستحضر رکھیں اور ان اعمال کو اصل

مقصد کا ایک ذریعہ سمجھو۔ تب تو فائدہ ہوگا ورنہ نہیں اور اغراض حسب ذیل ہیں ۔

نماز

نماز اس لئے پڑھی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے

۱۔ ہم گناہوں سے پاک ہوجائیں - اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡھِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (ھود : ۱۱۵)

یعنی نماز کی وجہ سے انسان کی اخلاقی بدیاں دُور ہوجاتی ہیں اور اسے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے یا یوں کہو کہ نماز تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے ۔

۲۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (طٰہٰ : ۱۵) یعنی نماز سے وہی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ جو ذکر الٰہی سے ہوتے ہیں ۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی محبت۔ قبولیت دُعا۔ خشیت الٰہی وغیرہ۔ پس یہ اصل مقصود ہیں ۔ اور نماز ان کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ اگر یہ چیزیں نماز کے نتیجہ میں حاصل ہو رہی ہیں تو نماز ٹھیک ہے ۔ ورنہ اس میں نقص ہے۔

۳۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتَابًا مَّوۡقُوۡتًا (نساء : ۱۰۴)

یعنی نماز کی وجہ سے انسان کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور وہ بھی نماز کے ذریعہ سے عبداللہ ہو جاتا ہے ۔

۴۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (عنکبوت : ۴۶)

نماز روکتی ہے بے حیائیوں اور نامعقول باتوں سے ۔ پس نمازی دیکھ لے کہ نماز کو تو اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کے لئے فحشا و منکر سے بچنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے ۔ اگر نفس ان باتوں سے واقعی بچنے لگا ہے تو نماز ٹھیک ہے ورنہ اصلاح کی محتاج ہے ۔

۵۔ اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ فِیۡ صَلَاتِھِمۡ خٰشِعُوۡنَ (المومنون : ۳) نماز سے خشوع قلب اور رقّت دل کا حاصل کرنا مقصود ہے ۔

۶. وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بقرہ: ۴۶)

ترجمہ: اور صبر اور دُعا کے ذریعہ سے (اللہ سے) مدد مانگو اور بیشک فروتنی اختیار کرنے والوں کے سوا (دوسروں کے لئے) یہ امر مشکل ہے۔

یعنی نماز قبولیت دُعا کا ذریعہ ہے۔

۷. آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی عبادتوں کے بارہ میں افلا اکون عبدًا شکورًا (الحدیث) کہہ کر بتا دیا کہ نماز ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ کے شکر کے اظہار کا۔

مختصرًا یہ وہ باتیں ہیں۔ جن کے لئے نماز پہ مداومت اختیار کی جاتی ہے اور نماز ان کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ باتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ تو نماز بھی ٹھیک ہے۔ ورنہ قابل توجہ و اصلاح۔ یاد رہے کہ دُنیا میں یہ سب اعمال یعنی روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ موت تک جاری رہتے ہیں۔ مگر جنّت میں نہ روزہ رہے گا۔ نہ حج نہ زکوٰۃ۔ مگر نماز کا عمل وہاں بھی رہے گا۔ کیونکہ نماز تو دراصل ایک دعا ہے۔ اور دعا اس وقت تک جب تک بندہ بندہ ہے۔ اور خدا اس کا رب ہے۔ ہمیشہ قائم رہے گی۔ کیونکہ دعا نہ ہو۔ تو بندہ اور خدا کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے یہ عمل ابدی ہے۔ باقی سب اعمال صرف موت تک ہیں۔

روزہ

۱. روزہ ذریعہ ہے تقویٰ کا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۱۸۴)

ترجمہ: تم پر (بھی) روزوں کا رکھنا (اسی طرح) فرض کیا گیا ہے جس طرح اُن لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم (روحانی اور اخلاقی کمزوریوں سے) بچو۔

پس تقویٰ اصل چیز ہے۔ نہ کہ روزہ۔ روزہ تو تقویٰ کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

۲۔ روزہ ذریعہ ہے قربِ الٰہی کا۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (البقرہ ۱۸۷)

ترجمہ: اور (اے رسول!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (تو جواب دے کہ) میں (اُن کے) پاس (ہی) ہوں۔

۳۔ روزہ حرام خوری سے بچاتا ہے۔

۴۔ روزہ بدکاری سے بچاتا ہے۔

۵۔ روزہ قبولیتِ دعا کا سبب ہے۔

۶۔ روزہ صبر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

۷۔ روزہ ہمدردیٔ مخلوق پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں روزہ کے یہ سب فوائد قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

زکوٰۃ

۱۔ زکوٰۃ اس لئے فرض کی گئی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تزکیہ نفس کا۔

۲۔ وہ مال کو پاک کرتی ہے۔

۳۔ اس سے بخل اور مال کی محبت دُور ہوتی ہے۔

۴۔ شفقت عَلٰی خَلْقِ اللّٰہ پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ حکومت اسلامی کا نظام اس سے چلتا ہے۔

۶۔ بڑی بڑی قربانیوں کے لئے انسان کی روح تیار ہوتی ہے۔

۷۔ شرک دُور ہوتا ہے۔

۸۔ قناعت پیدا ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے ان آیات کا نقل کرنا غیر ضروری ہے۔

حج

۱- حج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت جوش مارتی ہے۔

۲- دُنیا اور اس کی زینت سے بیزاری حاصل ہوتی ہے۔

۳- گناہ کے میل اور گندگی سے انسان پاک صاف ہوجاتا ہے۔

۴- ماسوا اللہ کے سب بُت ٹوٹ جاتے ہیں۔

۵- جھوٹ سے نجات حاصل ہوجاتی ہے۔

۶- تقویٰ ترقی کرتاہے

۷- اولاد اور جان کی قربانی کے لئے انسان آمادہ ہوجاتاہے۔

یہ سب باتیں سورہ حج میں مذکور ہیں اور یہ اصل مقاصد ہیں۔جن کے حصول کے لئے حج کیا جاتاہے۔

اعلان کلمۂ توحید

پانچواں رکن اسلام کا توحید کی شہادت یا کلمۂ توحید کا اعلان ہے۔ اس اعلانِ کلمۂ توحید کے ذریعہ حسبِ ذیل فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

خود اپنے اندر استقامت پیدا ہوتی ہے ۔اعلان کے بعد انسان کو اپنے دعویٰ پر مضبوط ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنی عملی زندگی اس کے مطابق بنانی پڑتی ہے۔ نیز چونکہ مخالفوں کے قائل کرنے کے لئے توحید کے دلائل سوچنے پڑتے ہیں۔ اس لئے نتیجتاً اس کا اپنا ایمان اور یقین بھی توحید پر بڑھتا ہے۔ یہ اعلان تبلیغ کا بھی ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ ایسا اعلان نفاق کو دُور کرتا ہے۔ اور شجاعتِ ایمانی پیدا کرتا ہے۔ کلمۂ شہادت شرک کی جڑ کاٹنے کے لئے ایک کلہاڑا ہے۔ یہ اعلان انسان کے محبت الٰہی کے دلی جذبات کو باہر لے آتاہے۔

پس پنج ارکانِ اسلام جو جسمانی مجاہدات ہیں۔ روح کے کمالات حاصل کرنے کا ذریعہ

ہیں اور یہ کمالات اصل مقصد ہیں۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ میں بغیر ان ارکان کے تقویٰ اور خشیت اور محبت الٰہی وغیرہ کسی اور طریقہ یا ترکیب سے حاصل کر لوں گا تو یہ غلط ہے۔ صرف یہی ارکان شریعت الٰہی نے نفس کی صفائی۔ تہذیب اخلاق اور روحانیت کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ اس لئے جو شخص ان کے ذریعہ کے سوا کسی اور طریقہ سے عمدہ نتیجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ غلط کہتا ہے۔ اور جو صرف انہی کو اپنا مدعا اور مقصود سمجھتا ہے اور اصل مقصود سے بے خبر ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے۔

(روزنامہ الفضل ۷ ستمبر ۱۹۴۴ء)

میرا بندہ

(الفضل مورخہ ۶ر جنوری ۱۹۴۳ء میں خاکسار نے ایک مضمون بعنوان "میرا خدا" لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ اسلام نے جو خدا پیش کیا ہے۔ وہ کیسا ہے۔ موجودہ مضمون گویا پہلے مضمون کا جواب ہے۔ یعنی اسلام نے اس خدا کے مقابل پر جو بندہ پیش کیا ہے وہ کیسا ہونا چاہیئے۔)

میرا بندہ تو وہی کہلا سکتا ہے جو میرا پسندیدہ ہو۔ وہ مجھے چاہے اور میں اُسے چاہوں۔ مجھے تو وہی بندہ پسند ہے۔ جو صاحب قلبِ سلیم ہو۔ میرا مومن ہو۔ میرا فرمانبردار ہو۔ میرا تقوےٰ خشیت اور عشق اپنے دل میں رکھتا ہو۔ آخرت پر اور سب رسولوں پر یقین رکھنے والا ہو۔ مخلص۔ نڈر۔ عقلمند۔ صاحب علم۔ نیک کردار۔ انصاف پسند۔ راستباز۔ دُور اندیش۔ صابر۔ شاکر۔ فرمانبردار۔ متواضع۔ دُنیا سے بے رغبت۔ متوکل۔ موحد۔ وسیع الظرف۔ صادق الوعد۔ میری رضا کا طالب۔ میرے دین کا خدمت گزار۔ پاک ظاہر۔ صاف باطن۔ امن پسند ہمدردِ خلائق۔ رحیم کریم۔ میرے محبوبوں پر درود بھیجنے والا۔ نمازوں کا محافظ۔ لغو سے اعراض کرنیوالا۔ اپنے فروج کی حفاظت کرنیوالا۔ میرے ذکر میں شاغل۔ توّاب۔ جہنم سے خائف جنت کا شائق۔ چھوٹوں پر شفقت کرنے والا۔ بڑوں کا ادب کرنے والا۔ صاحبِ تمیز و تہذیب۔ سخی۔ معمور الاوقات، مجاہد۔ راستباز۔ سادہ مزاج۔ عابد۔ حامد۔ امین۔ اٹھتے بیٹھتے میرا دھیان رکھنے والا۔ عالم باعمل۔ حسنِ معاشرت پر عامل۔ خداداد۔ رزق میں سے مخلوق پر خرچ کرنے والا۔ میانہ رو پچھلی رات کو عبادت کرنے والا۔ بہت دُعا مانگنے والا۔ مجاہد۔ روزے رکھنے والا۔ میری رخصتوں اور سہولتوں پر دل کی خوشی سے عمل کرتے والا۔ خوف و غم سے آزاد۔ بداخلاقیوں سے مبرا۔ بے تکلف ہنس مکھ

خوش مزاج ۔حلال روزی کمانے والا ۔میرے احسانات کو یاد رکھنے والا اور ان کو بار بار گننے والا ۔ دین کو دُنیا پر مقدم کرنے والا ۔ درگزر اور چشم پوشی کرنے والا ۔ نفاق سے دُور بھاگنے والا ۔ متبع آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ۔ اولوالامر کا مطیع ۔ راضی بقضاء صاحب وقار حلیم ۔ مستقل مزاج ۔ دل کا غنی ہمیشہ ترقی کا خواہش مند ۔ روشنی بخش ۔ اور مخلوق کی ہدایت میں کوشاں ۔ رقیق القلب ۔ ظاہری شکل وصورت شرع کے مطابق رکھنے والا ۔ قرآن مجید بہت پڑھنے والا اور اسلامی شریعت کا عامل اور مبلغ ۔ اور میرے نیک بندوں سے اُنس رکھنے والا ہوں ۔

میرا پیارا بندہ ظالم نہیں ہوتا ۔ مشرک نہیں ہوتا ۔ کافر نہیں ہوتا ۔ چور چغل خور ۔ مفسد ۔ خائن نہیں ہوتا ۔ بخیل ۔ بدمزاج ۔ متکبر ۔ جلدباز ۔ بدزبان ۔ بدکار سُست الوجود ۔ لاچار خسیس اور بداخلاق نہیں ہوتا ۔ وہ گناہوں سے نفرت رکھتا ہے اور شیطان سے عداوت ۔ میرا بندہ کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان مجھے اور صرف مجھے اپنا خالق اپنا مالک اور اپنا رب اور اپنا محسن سمجھے ۔ کسی کو میرا شریک نہ بنائے ۔ صرف میری ہی عبادت کرے ۔ صرف مجھ سے ہی دُعا مانگے ۔ اور صرف مجھ ہی کو اپنا محبوب سمجھے ۔

میرا بندہ میری تمام مخلوقات کا سرتاج اور میری تمام صفات کا مظہر اور میری تمام قدرتوں کا خاص الخاص نمونہ ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ میں نے اسے احسن تقویم میں پیدا کیا ۔ خلق اور خُلق میں جملہ مخلوقات میں اسے برگزیدہ بنایا ۔ اور تمام اہلِ جہان پر اسے فضیلت اور عزت بخشی ۔ اس لئے میں بھی توقع رکھتا ہوں کہ وہ مجھے پہچانے اور میرے صفات اور اخلاق کو اختیار کرے ۔ میرے احکام پر عمل کرے ۔ اور میری محبت میں سرشار رہے ۔ اور اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ میرا مطیع ہو جائے ۔ پھر جب میرا بندہ ایسا ہو جاتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں ۔ اس سے کلام کرتا ہوں ۔ اس کا خیال رکھتا ہوں ۔ اس کی مدد کرتا ہوں اس کے دشمنوں کو ذلیل کرتا ہوں ۔ اس کی تعریف اپنے فرشتوں کے سامنے کرتا ہوں ۔ اس کو علم و معرفت بخشتا ہوں ۔ اس کو بشارتیں دیتا ہوں ۔ اس کی خواہشیں اور ضرورتیں پوری کرتا ہوں ۔ اُس کی دُعائیں قبول کرتا ہوں

اس کی دُعائیں قبول کرتا ہوں۔ اس کا دوست بن جاتا ہوں۔ اسے ہر قسم کے خوف و حزن سے آزاد کر دیتا ہوں۔ اسے اطمینانِ قلب بخشتا ہوں۔ اس کی تائید و نصرت فرماتا ہوں اور مرنے کے بعد اُسے اپنی جنت میں داخل کر کے ابدی خوشحالی اور دائمی نعمتوں سے مالامال کر دیتا ہوں۔

(روزنامہ الفضل ۱۹ر نومبر ۱۹۴۴ء)

دیباچہ راہِ سلوک

جو مانتا خدا کو نہ ہو اس کو اے عزیز
عقلی دلیلیں ہستی و باری کی دے سُنا

اتنا وہ مان لے گا دلائل سے بالضرور
عالَم کے کارخانہ کا اِک چاہیئے خُدا

اگلا قدم یہ ہے کہ ہو ایمان بھی نصیب
اس کے لیے کلامِ خدا کی مدد بلا

قرآں کی روشنی میں نظر آئے گا اسے
موجود ہے وہ ذات جو ہے سب کا مبتدا

مخلوق بن گئی ہے وہ کہتا ہے خود بخود
بے مثل جو کلام ہے وہ کیونکر خود بنا ؟

انسان غیب دانی سے عاری ہے گر تو پھر
صدیوں کے غیب کا اُسے کیونکر پتہ لگا ؟

تازہ نشان حضرتِ مہدی کے پیش کر
مومن کو معرفت کی ذرا چاشنی چکھا

سارا جہاں ہو جس کا مخالف وہ کس طرح
غالب ہر ایک جنگ میں ہوتا ہے برملا

اب آگے ہے یقین کا درجہ مرے عزیز
ذاتی مشاہدہ سے خدا کا ملے پتا

یعنی کہہ یہ اُس سے کہ اب آگیا ہے وقت
گر وصل چاہتے ہو تو خود کو کرو فنا

"جو خاک میں ملے اُسے مِلتا ہے آشنا
اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما"

(بخارِ دل صـ۱۳۱)

پرسوں کی بات ہے کہ میں نے (خواب میں ۔ناقل) دیکھا کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب جو میرے ماموں ہیں وہ آئے ہیں۔ میں نے ایک لمبے تجربے کے بعد یہ بات معلوم کی ہے کہ اسماء کے ساتھ رؤیا اور کشوف کا خاص تعلق ہوتا ہے اور مجھے جو خدا تعالیٰ سے قبولیت کا تعلق ہے اُس کے متعلق میں نے دیکھا کہ ۹۸ فیصدی انہیں کو دیکھتا ہوں۔ ان کا نام ہے "اسمٰعیل" جس کے معنی ہیں خدا نے سُن لی۔ جب میں کوئی دُعا کرتا ہوں تو یہی مجھے دکھائے جاتے ہیں۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا کسی ملک کے ذریعے بتا دیتا ہے اور کبھی خود جلوہ نمائی کرتا ہے۔"

(تقریر حضرت مُصلح موعود "اصلاح نفس" جلسہ سالانہ
۲۷ دسمبر ۱۹۲۰ء

انوار العلوم جلد ۵ صفحہ ۴۰۸)

باب چہارم

قرآنِ مجید

قرآن سب سے اچھا — قرآن سب سے پیارا
قرآن دِل کی قوت — قرآن ہے سہارا
اللہ میاں کا خط ہے — جو میرے نام آیا
اُستانی جی پڑھاؤ — جلدی مجھے سپارا
پہلے تو ناظرے سے — آنکھیں کروں کی روشن
پھر ترجمہ سکھانا — جب پڑھ چکوں میں سارا
مطلب نہ آئے جب تک — کیونکر عمل ہے ممکن
بے ترجمے کے ہرگز — اپنا نہیں گزارا
یارب تو رحم کرکے — ہم کو سِکھا دے قرآں
ہر دُکھ کی یہ دوا ہو — ہر درد کا ہو چارا
دل میں ہو میرے ایماں — سینے میں نورِ فرقاں
عیسیٰ مسیح آئے — ایمان ساتھ لائے
قرآن گُم شدہ بھی — نازل ہوا دوبارا
اب وقت آگیا ہے — اِسلام کا ہو غلبہ
گر تو نمی پسندی — تغییر کُن قضا را

دُرِّ ثمین / بخار دل صـ۵۲

قرآنی پردہ

حوالہ نمبر (۱) امہات المومنین کا پردہ اپنے گھروں میں

(الف) يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (احزاب ۳۲، ۳۳)

ترجمہ: اے نبی کی بی بیو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر پرہیز گاری کرو۔ پس بات کہنے میں نرمی نہ کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ شخص جس کے دل میں بیماری ہے کوئی طمع کرے۔ اور تم بات کیا کرو نیکی اور بھلائی کی۔ اور اپنے گھروں میں ہی رہا کرو۔ اور اگلے زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو۔

(ب) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ .... وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۚ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۚ

(احزاب: ۵۳)

ترجمہ: اے مومنو! نبی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہو ..... اور جب تم آپ کی بی بیوں سے کوئی چیز مانگنا چاہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ بات بہت پاکیزہ ہے

تمہارے دلوں کے لئے اور ان کے دلوں کے لئے) ۔ اس آیت کا نام آیت حجاب ہے ۔

نوٹ :۔ یہ دونوں آیتیں صرف امہات المؤمنین کے پردہ کے بارہ میں ہیں ۔

حوالہ نمبر (۲) گھر سے باہر کا پردہ تمام عورتوں کے لئے

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ
يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ (احزاب : ۶۰)

ترجمہ :۔ اے نبی کہہ دو اپنی بیبیوں اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی بی بیوں سے کہ اوڑھ لیں اپنے اوپر بڑی چادریں ۔ یہ اس لئے کہ آسانی سے پہچانی جائیں اور ایذا سے بچی رہیں ۔

نوٹ :۔ یہ آیت تمام عورتوں کے لئے ہے اور گھروں سے باہر جو پردہ کرنا چاہیئے اس پر حاوی ہے ۔

حوالہ نمبر (۳) گھروں کے اندر پردہ مومنات کا

(الف) وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ
ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ
وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِ
هِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ

(النور : ۳۲)

ترجمہ: اے رسول مسلمان مَردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ بہت پاکیزہ بات ہے ان کے لئے۔ یقیناً اللہ ان کے اعمال سے خبردار ہے۔ اور کہہ دو مسلمان عورتوں سے کہ وہ بھی نیچی رکھیں اپنی آنکھیں اور حفاظت کریں اپنی شرم گاہوں کی۔ اور نہ ظاہر کریں زینت اپنی سوائے اس کے جو مجبوراً ظاہر ہے۔ اور اپنی اوڑھنیوں کی بُکل ماریں اپنے گریبانوں پر اور نہ ظاہر کریں سنگار اپنا سوائے اپنے خاوندوں، اپنے باپوں، اپنے سُسروں اپنے سگے یا سوتیلے بیٹوں، اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں یا اپنی عورتوں کے سامنے۔ یا جو غلام ہیں ان کے۔ یا ایسے نوکر یا کمین لوگ مردوں یا لڑکوں میں سے جو عورتوں کی چھپی باتوں سے واقف نہیں ہیں (یعنی نابالغ یا پیر فرتوت) اور نہ ماریں اپنے پیروں کو زمین پر اس طرح کہ ان کے چھپے ہوئے زیور جھنکار کریں۔

(ب) وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ (النور : ۶۱)

ترجمہ: اور بیٹھ رہنے والی عورتوں میں سے جو نہیں امید رکھتیں نکاح کی (یعنی جو بڑھیا ہو گئی ہیں) پس نہیں اُن پر گناہ کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے نہ نمائش کرنے والی ہوں سنگار کی۔ اور اگر اس سے بھی بچیں تو اُن کے لئے اچھا ہے۔

نوٹ: یہ آیات سوائے امہات المومنین کے باقی تمام مومنات کے اپنے گھروں کے اندر کے پردہ کے متعلق ہیں۔ باہر کے لئے نہیں۔

حوالہ نمبر (۴) اپنے اپنے گھروں کے اندر کا پردہ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْکُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَۃِ وَ مِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّکُمْ

(النور: ۵۹)

(ترجمہ) اے مسلمانو! تم سے تمہارے غلام اور نابالغ بچے بھی تین اوقات میں اندر آنے کی اجازت مانگیں۔ یعنی صبح کی نماز سے پہلے اور جس وقت تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتارتے ہو۔ اور رات کی نماز کے بعد۔ تین وقت تمہارے لئے پردے کے ہیں۔

نوٹ:۔ یہ آیت اپنے خاص کمروں میں خاص اوقات کے پردہ کے لئے ہے۔

یہ وہ کل آیات ہیں جو پردہ کے متعلق قرآن مجید میں آئی ہیں۔ اور میں نے ان کو شروع میں ہی یکجائی طور پر اس لئے لکھ دیا ہے کہ ایک نظر سے آپ پردہ کی تمام حقیقت کو معلوم کر لیں۔ اور پیشتر اس کے کہ میں اس مضمون کو بیان کروں آپ خود اس کی اصل پر حاوی ہو جاویں اور پھر مضمون کے متعلق صحیح یا غلط ہونے کی رائے قائم کر سکیں۔ ان حوالوں کو میں نے چار ہیڈنگ کے ماتحت اس لئے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں چار قسم کے پردوں کا ذکر ہے اور ہر ایک مختلف لوگوں یا مختلف حالات کے ماتحت ہے۔ لوگوں نے اس مسئلہ میں ایک غلطی یہ بھی کھائی ہے کہ ان مختلف حالات کو ملا دیا ہے بلکہ گڈمڈ کر دیا ہے اور اس کے لئے ان کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے۔ پس ہمیشہ ان چار قسم کے احکام کو اپنی اپنی جگہ پر سمجھو تو پردہ کے احکام کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے میں نہ دقت واقع ہو گی نہ اعتراض۔

ضروری نوٹ: ان سب حوالوں میں حوالہ نمبر(۱) کی آیت ب کا نام "آیت حجاب" ہے اور یہ آیت صرف اُمہات المومنین کے لئے ہے۔

پردہ کا مطلب

جو فطری حجاب عورت کو مرد سے ہوتا ہے اس کے بقا کے لئے شریعت نے پردہ قائم کیا ہے تاکہ فتنوں کا سدِ باب ہو اور سوسائٹی میں امن قائم ہو۔ عام طور پر پردہ کے دو حصے ہیں۔ ایک شرعی، دوسرا رواجی۔

شرعی اور رواجی پردہ

شرعی پردہ وہ ہے جسے قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے اور اس کی ایک حد بندی کر دی ہے کہ اس سے کم نہ ہو۔ لیکن ملکی یا زمانہ کے حالات کی وجہ سے اس میں رواج کا بھی دخل ہو گیا ہے۔ یہ رواج حالات کے ماتحت بدلتا رہتا ہے۔ اور سب جھگڑا زیادہ تر اس رواجی حصہ پر ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ یورپ کی تقلید اب شرعی پردہ سے بھی اُلجھنے لگی ہے مگر بہت سے مسلمانوں پر تعجب ہے کہ وہ رواجی پردہ کو ہی دین کا پردہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مروجہ پردہ خالص اسلامی پردہ نہیں ہے۔ علاوہ رواج کے تشدد کے جو شرعی پردہ پر اضافہ کے طور پر ہے۔

شرعی پردہ میں بھی رواج کو دخل ہے

ایک قسم کا رواج وہ بھی ہے جس کی مداخلت کو شرع نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ شرعی پردہ میں جلباب اور زینت اور الا ما ظھر منھا کے

الفاظ کے معانی ملک اور زمانہ رواج کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان حالات کے مطابق شرعی پردہ میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ مغز پردہ کا وہی رہے گا مگر اس کے کرنے کے طریق اور زینت کے طریقوں کے تغیر کے ساتھ اس کا بھی بدلتے رہنا اور سوسائٹی کے حالات کے مطابق مختلف مدارج کی عورتوں کا مختلف قسم کا پردہ کرنا یہ ایسی باتیں ہیں کہ عملاً ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔

موجودہ معجون مرکب پردہ جو ہندوستان میں رائج ہے اسے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک کے ہر حصہ میں اس کی بابت اختلاف ہے۔ حتیٰ کہ مختلف خاندانوں کے پردہ میں فرق ہے۔ لڑکیوں جوان عورتوں اور بوڑھی عورتوں کے پردہ میں فرق ہے۔ امیروں اور غریبوں کے پردہ میں فرق ہے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتوں کے پردہ میں فرق ہے۔ اس لئے پردہ کی حقیقت اور اسلامی پردہ کی حدود اور بعض رواجی باتوں کے فوائد اور نقصانات سمجھنے کے لئے مفصل باتیں لکھنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ لوگ اصلیت کو سمجھ کر پھر حالات کے ماتحت اس پر جو مناسب ہو کمی بیشی کر لیں۔

ہندوانہ پردہ

ایک پردہ ہندوانہ ہے۔ وہ یہ کہ عورتیں اپنے میکے کے ہر آدمی سے خواہ وہ بدمعاش ہو مجرم ہو۔ کسی قوم کا ہو۔ کوئی ہو پردہ بالکل نہیں کرتیں اور اپنے سسرال میں اپنے خاوند اور خسر جو دونوں محرم ہیں اُن سے ساری عمر گھونگھٹ مارتی ہیں۔ اور خاوند کے چھوٹے بھائی سے خواہ وہ عورت کا ہم عمر اور جوان ہو۔ نہ صرف پردہ نہیں کرتیں۔ بلکہ نہایت بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتی رہتی ہیں جو اکثر حدِ شرافت سے گر کر مکروہ حد تک پہنچ جاتا ہے۔

انتقامی پردہ

ایک پردہ ہندوستان میں انتقامی پردہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شرعاً تو وہ لوگ آپس میں نامحرم ہوتے ہیں مگر چونکہ برادری یا رشتہ داری ہوتی ہے اس لئے ہر اس رشتہ دار کے سامنے انہیں اپنی بی بی کو کرنا پڑتا ہے جو اپنی بی بی کو ان کے سامنے کر دے۔ اور جو ایسا نہ کرے اُس سے اپنی بی بی کا بھی پردہ کرایا جاتا ہے۔

پُشت پردہ

ایک بیہودہ پردہ جو خصوصاً امرتسر لاہور میں نمایاں طور پہ بازاروں میں دیکھا جاتا ہے وہ "پُشت پردہ" ہے۔ یعنی عورتیں بناؤ سنگار کر کے باہر شارع عام پہ پھرتی ہیں اور ان کے سر پہ ایک بُرقعہ بھی ہوتا ہے مگر وہ صرف پُشت کی طرف سے دکھائی دیتا ہے۔ باقی تین اطراف سے برقعہ کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔ یہ غالباً بہت چھوٹی عمر میں بُرقعہ پہنا دینے کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اس عمر میں لڑکیاں پردہ کی مکلف نہیں ہوتیں۔ نہ طبیعت میں حجاب ہوتا ہے۔ اس لئے برقعہ سر پہ رکھ کر بے تکلف مُنہ کھولے پڑی پھرتی ہیں۔ آخر یہی عادت اتنی راسخ ہو جاتی ہے کہ بڑی عمر میں بھی اسی پہ کاربند رہتی ہیں۔

تعزیری پردہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت ایسی بے حیا ہو کہ اس سے اکثر بے شرمی کی باتیں صادر ہوتی ہوں اور وہ سمجھانے سے اپنی اصلاح نہ کرے تو ثبوت کے بعد ایسی عورت کو ساری عمر گھر سے مت نکلنے دو۔ یہی ایسی بے باک عورت کی سزا ہے جو عادتاً بے شرم اور بے حیا ہو۔ مگر تعجب ہے کہ ہمارے ملک میں یہ سزا شریف اور پاکدامن

بی بیوں کو دی جاتی ہے اور پھر اس سلوک کے ساتھ فخریہ یہ کہا جاتا ہے کہ شریف عورت کی علامت یہ ہے کہ بیاہ ہو کر خاوند کے گھر آئے تو پھر مر کر لاش ہی اس گھر سے نکلے۔ حالانکہ یہ تو بے حیا اور بدکردار عورتوں کی سزا ہے !!!

اب اسلامی پردہ کی حدود سُن لیں

۱۔ اُمّہات المومنین کا پردہ اپنے گھروں میں

ایک خاص امہات المومنین کا پردہ ہے وہ یہ کہ اُن کے لئے قرآن میں حکم آگیا تھا کہ کوئی نامحرم شخص ان کے گھروں میں داخل نہ ہو۔ اور انہیں کہا گیا تھا کہ تم اپنے گھروں میں ہی رہو اور بن ٹھن کر یا جاہلیت کے زمانہ کا سنگار نہ کیا کرو بلکہ اپنی حالت اور لباس سادہ رکھو اور لوگ کسی کام کے لئے یا علم حاصل کرنے کو آویں تو دروازہ کے باہر سے ہی آواز دے کر اپنا کام بتا دیا کریں ۔ یا سودا وغیرہ لے دے لیا کریں ۔ یا مسئلہ پوچھ لیا کریں۔ اور مسئلہ کا جواب دینے میں ایسی باتیں کرنے میں لجاجت اور نرمی کا لہجہ نہ اختیار کریں بلکہ ایسا جیسے اُستاد کا لب ولہجہ ہوتا ہے۔ دروازہ پہ پردہ پڑا ہے۔ اور سوائے اشد ضرورت کے باہر نہ نکلا کریں۔

۲۔ باہر نکلنے کے وقت کا پردہ سب کا

دوسرا پردہ باہر نکلنے کا ہے یہ سب شریف عورتوں پہ حاوی ہے یعنی امہات المومنین پر بھی جب وہ اشد ضرورت کے لئے نکلیں اور عام مومنات کو تو کوئی باہر نکلنے کی شرعی روک ہی نہیں۔ اُن کے لئے۔ اس میں یہ ہدایات ہیں کہ جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے گھر کے لباس کے اُوپر ایک "بڑی چادر" (جلباب) اوڑھ لیا کریں۔ یہ اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ شریف عورت آ رہی ہے تو اس کو آسانی سے راستہ پر سے گذر جانے دیں اور اُن

عورتوں کو تکلیف اور ایذا نہ ہو۔ ایذا نہ ہونے سے ایک تو یہ مراد ہے کہ بھیڑ وغیرہ میں راستہ آسانی سے مل جائے۔ مراد یہ کہ راہرو ادھر اُدھر سرک جائیں۔ دوسرے یہ کہ چادر ہونے کی وجہ سے جسم ڈھک کر چہرہ اور زینت چھُپ جائے گی تو کوئی نامعقول آدمی نہ ان کو تاڑے گا نہ گھور کر دیکھے گا۔ اگر عورت ظاہری زینت اور چہرہ پورے طور پر بالکل کھُلا رکھ کر باہر نکلے گی تو شریر اور بدمعاش آدمی اسے تاکے گا۔ اس تاکنے اور گھورنے سے ایک شریف عورت کو سخت روحانی ایذا پہنچتی ہے اور اس کا تدارک ایسے ہی لباس سے ہو سکتا ہے جو اس کے زینت اور حُسن کو چھُپا دے۔

جلباب

باقی یہ کہ "بڑی چادر" سے کیا مراد ہے۔ اس کا فیصلہ رواج پر آ گیا۔ اس زمانہ میں عرب میں سادہ چادر کا رواج تھا۔ چونکہ اس کا سنبھالنا ذرا مشکل تھا۔ اس لئے اس کے بعد اسلامی ممالک میں اس کی جگہ بُرقعہ نے لے لی۔ اب بُرقعے بھی آسانی اور صحت اور موسم کے لحاظ سے طرح طرح کے ہو گئے۔ لیکن یہ سب جلباب میں داخل۔ اس زمانہ میں اچھا اور آرام دہ بُرقعہ وہ ہے جو کوٹ کی طرح ہو اور پیروں کے قریب تک لمبا ہو اور سر پر ٹوپی مع ایک گردن چھپانے والی جھالر کے ہو۔ تاکہ سر پر برقعہ کا بوجھ نہ پڑے اور ہاتھ مقید نہ ہو جائیں۔

بس اب باہر نکلنے کا پردہ شرفا کی عورتوں کا اشارہ گیا کہ ایسا بڑا کپڑا اوپر ہو جو خود زینت نہ ہو بلکہ عورت کے حُسن اور زینت کو چھپائے اور ضروریات کے مطابق اُسے ایسا کر لیا جائے کہ ہوا بند نہ ہو۔ دکھائی اچھی طرح دے۔ گراں نہ ہو۔ پیروں میں نہ اُلجھے۔ شریعت کی صرف ایک شرط ہے وہ پوری ہو کر جس طرح کے آرام اور آسائش کی باتیں کوئی اس میں اختراع کر سکتا ہے کرے۔ لوگ اس میں جیبیں تک لگا لیتے ہیں۔ یوروپین

نومسلمہ کے لئے لمبا کوٹ اور ٹوپی اور ٹوپی میں نقاب لگ کر جلباب بن سکتا ہے۔

۳ سوائے امہات المومنین کے باقی سب شریف عورتوں کا اپنے گھروں کے اندر پردہ

یہ تیسرا پردہ ہے جو باہر جانے کا نہیں بلکہ گھروں کے اندر کرنے کا ہے اور یہ تمام عورتوں پر حاوی ہے۔ سوائے امہات المومنین کے۔ (امہات المومنین اس لئے اس حکم سے باہر ہیں کہ ان کے لئے الگ احکام بیان ہو چکے ہیں اور ان کے گھر الگ الگ اپنے نج کے مملوکہ گھر تھے ان میں کوئی اور شریک نہ تھا نہ کسی کو وہاں آنے اور رہنے کی اجازت تھی) اس پردہ کا حکم یہ ہے کہ چونکہ ہر شخص کے متعلقین یا رشتہ دار اس کے گھر میں آتے رہتے ہیں اور اکثر جگہ لوگ مشترک مکانوں میں رہتے ہیں یا الگ مکان بھی ہو تو اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ پوری علیحدگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایک ہی حویلی کے مختلف حصوں میں مختلف رشتہ دار یا قریبی رہتے ہیں۔ یا کوٹھے پر ایک گھر رہتا ہے اور دوسرا نیچے۔ پھر شہریت کی کی وجہ سے اکثر ایک دوسرے کے گھروں میں لابدی نظر پڑتی ہے۔ اور غربا میں تو یہ بات درجہ کمال کو پہنچی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک چھت کے نیچے کئی کئی لوگ گذارہ کرتے ہیں۔ اسی طرح زمیندار طبقہ میں۔ غرض سوائے امراء اور رئیسوں کے ساری دنیا میں خواہ شہر کے لوگ ہوں یا گاؤں کے یہ حالت میسر نہیں آسکتی کہ ہر میاں بیوی کا بالکل الگ اور باپردہ مکان ہو اور ایسا ہو جہاں کسی کی نظر کسی وقت بھی نہ پڑ سکے۔ یا جس میں کسی کے عزیز اور رشتہ دار یا نوکر کسی وقت بھی نہ آسکیں۔

اس لئے شریعت نے لوگوں کی آسانی کے لئے یہ حکم دیا کہ ایسے حالات میں مرد اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور عورتیں اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور ہر طرح کی بے حیائی سے بچیں کوئی کلام وغیرہ بھی بے حیائی کا نہ کریں جو کسی کے کان میں پہنچے اور عورتوں کو

چاہیئے کہ ان حالات میں ہمیشہ دوپٹہ یا اوڑھنی کا اس طرح بُکل ماریں کہ سر اور سینہ ڈھکے رہیں۔ اور اپنی زینت (سوائے ایسی زینت کے جسے چھپا نہیں سکتیں) سوائے اپنے محرم رشتہ داروں کے کسی اور کے سامنے کھول کر نہ بیٹھیں۔ اور پیروں میں زیور ہوں تو چھنکا چھنکا کر نہ چلیں کہ خواہ مخواہ اس طرف نامحرم مرد کا خیال جائے۔ ہاں اگر کوئی ضعیفہ عورت ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ گھر میں اوڑھنی اس طرح پابندی سے نہ اوڑھے بشرطیکہ اس نے زینت نہ کر رکھی ہو۔ لیکن اگر ضعیفہ بھی احتیاط ہی رکھے تو بہتر ہے۔ بس اب شرعی پردہ کا معاملہ بالکل سادہ ہو گیا۔ دو باتیں رہ گئیں کہ :-

(۱) زینت کیا ہے ؟ (۲) اور الا ما ظھر منھا سے کیا مراد ہے ؟

زینت

زینت کہتے ہیں بناؤ سنگار آرائش کو۔ اور وہ دو قسم کی ہے یعنی (۱) ایک تو وہ بیرونی آرائش ہے جو انسان کو سنوار دے اور بارونق کر دے۔ اس لئے زیورات اور بال جو سنوارے جاتے ہیں۔ چوٹی جس کی بناوٹ اور ساخت میں ہی تکلف ہوتا ہے مہندی، پوڈر سرخی جو رخساروں کو مزیّن کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خاص طور کے دلکش رنگدار بیل بوٹے دار یا گوٹے تلّے کے زرق برق کپڑے نیز خوشبوئیں کلائی کی گھڑی۔ غرض تمام ایسی چیزیں جو بناؤ سنگار اور حُسن کے چمکانے کو عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ سب زینت میں داخل ہیں اور ان سب کا ایسے گھروں میں ظاہر اور نمایاں کرنا جہاں ہر وقت نامحرم کی نظر کا احتمال ہو منع ہے۔ سوائے الا ما ظھر منھا کے یعنی جن کو چھپایا نہیں جا سکتا مثلاً چیزوں میں سے انگلیوں کی انگوٹھی یا چھلا یا ہاتھوں کی مہندی ایسی زینت ہے جس کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ بغیر ہاتھوں کے باہر رکھے کام نہیں ہو سکتا۔ یا چہرہ۔ یا ایسی چوڑیاں ہاتھوں کی یا پیروں کے آواز نہ دینے والے زیور جو ہمیشہ استعمال میں

رہتے ہیں۔ اسی طرح اوڑھنی کا رنگ۔ قد، چال آواز۔

۲۔ دوسری زینت عورت کے اپنے جسم کی وہ خصوصیات ہیں جن سے خدا تعالیٰ نے کسی عورت کو خاص طور پر ممتاز کیا ہو۔ سر اور سینہ تو ہر عورت کو ڈھانکنا ہی ہے کیونکہ بال اور چھاتی بہر حال عورت کی مخصوص زینت ہیں سوائے ضعیفہ کے۔ سو ان دو چیزوں کو اوڑھنی سے چھپانے کا حکم تو لفص سے ثابت ہے۔ مگر ان کے سوا خدا تعالیٰ کسی کو آنکھ ایسی دیتا ہے کہ وہ اس کے لئے خاص اور ممتاز زینت ہوتی ہے۔ کسی کی ناک اسی طرح چہرہ کی نمایاں اور مخصوص زینت ہوتی ہے۔ کسی کا تمام چہرہ حُسن کی کان ہوتا ہے۔ کسی کی گردن جاذبِ نظر اور نہایت خولصورت ہوتی ہے۔ کسی کا رنگ ایسا سرخ و سفید اور چمکدار آب و تاب والا ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کی نظر کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کسی کی چال اور کسی کی آواز میں سخت کشش ہوتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ بعض عورتوں کو بعض بعض اعضاء اور خولصورتیاں ایسی اعلیٰ اور نمایاں اور فتنے میں ڈالنے والی دیتا ہے کہ وہ اُن کے لئے خاص زینت کا حُکم رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب عورتوں میں نہیں ہوتا۔ خاص خاص میں ہوتا ہے۔ پس جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عورت کے چہرہ کا حُسن زینت خاص کی حد تک پہنچ گیا ہے یا اُس کے فلاں فلاں اعضاء اُس کے حسن کی زینت ہیں تو ان کو وہ عورت خاص طور پر چھپائے۔ سوائے ایسے حالات کے کہ ان کا چھپانا اختیار سے باہر ہو۔ مثلاً آواز۔ چال۔ قد۔ ایسی عورت کا ماظھر منھا یہی تین چیزیں ہیں۔ باقی جو اوسط صورت شکل کی عورتیں ہیں وہ صرف اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ زیورات یا بیرونی زینت جیسے ذکر ہو چکا ظاہر نہ کریں۔ اپنے زیور نہ چھنکائیں۔ اور آس پاس رہنے والے مرد بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور ہر وقت خدا کا خوف دلوں میں رکھیں۔ تو فتنوں کا باب بند رہے گا۔ بلکہ ایسی زینت نامحرم مرد کو چھوڑ غیر معتبر عورتوں کو بھی نہ دکھائے تا کہ ان کی معرفت کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔ اور کوئی شریر عورت اس عورت کے حُسن کا ذکر غیروں میں مشہور نہ کرتی پھرے۔

الاما ظھر منھا

شریعت نے اجازت دی ہے کہ وہ زینت جس کا چھپانا اختیار سے باہر ہو۔ اسے بیشک ظاہر کردے۔ اس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ مگر یہ بھی مختلف طبقوں میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ مثلاً ایک امیر عورت اپنی کئی ایسی زینتوں کو چُھپا سکتی ہے جن کو ایک مزدور عورت ظاہر کرنے پر مجبور ہے ورنہ روٹی کس طرح کما سکے۔ سو اس استثناء کے تحت مزدور، غریب اور محنتی عورتیں جو اپنے ہاتھ سے کام کرتی ہیں اپنے جسم کے بعض حصے کھُلے رکھ سکتی ہیں۔ اور یہی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا فتویٰ ہے۔ ایسی عورتوں کو بپاس شرم وحیا اپنے کچھ اعضاء کھولنے ضروری ہیں جو مختلف حالات میں مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے کھیت میں کام کرنے کے وقت بعض دفعہ ان کو اپنا پاجامہ اُونچا کرنا پڑتا ہے یا بعض دوسرے کاموں میں اپنے ہاتھ بازو تک برہنہ کرنے پڑتے ہیں۔ یہی حال مختلف پیشوں کا بھی ہے۔

اسی طرح طبیب کے سامنے بعض حالات میں بہت کچھ پردہ ہٹانا پڑتا ہے۔ پھر **ماظھر منھا** کی حدود پر ملک کا رواج۔ سوسائٹی، خاندان کی عزت۔ اور عورت کی سوشل پوزیشن کا بھی بہت اثر ہے۔ امیروں کا **ماظھر منھا** اور ہے بادشاہوں کا اور غریبوں کا اور۔ اور پیشہ وروں کا اور۔ جوان عورتوں کا اور لڑکیوں کا اور۔ ادھیڑوں کا اور۔ اور بوڑھیوں کا اور۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنا کھیت اور اپنی دکان بھی اپنے گھر کے حکم میں ہی ہے۔ یعنی یہ گھروں والا پردہ جیسا اپنے گھر میں رکھا جاتا ہے ویسا ہی اپنی دکان یا اپنے کھیت میں رکھنا چاہیئے۔ بازار میں سے گذرنے اور شارع عام کا پردہ الگ ہے جو پہلے بیان ہو چکا۔ وہاں خمر کی جگہ جلباب ضروری ہے تاکہ مُنہ پر گھونگٹ رہے۔

(۴) چوتھا خاص اوقات کا پردہ ہے جو بچوں اور نوکروں تک سے ہے۔

یہ پردہ گھروں اور مکانوں کا نہیں بلکہ پرائیویٹ کمروں کا ہے اور اس لئے اوپر کے طبقہ کے لوگوں سے اس کا تعلق ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دن میں تین وقت میں جب میاں بی بی علیحدہ اپنے پرائیویٹ کمرہ میں ہوں تو اس وقت اپنے بچے اور گھر کے پروردہ بھی بغیر اجازت حاصل کئے ان کمروں میں داخل نہ ہوں۔ یہ خلوت کے وقت کا پردہ ہے۔ اس پر یہاں زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھدار لوگ اس کی ضرورت کو خود تسلیم کرلیں گے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے شرعی پردہ کا بیان ایسا واضح کر دیا ہے کہ اب ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے اور پھر اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے ایک مکان میں شہر سے باہر رہتا ہے اور وہاں کوئی نامحرم نہیں آتا۔ نہ کسی گھر سے وہاں نظر پڑتی ہے تو کوئی حرج نہیں کہ عورتیں وہاں اپنی زینت اس طرح نہ ڈھانکیں جس طرح بیان ہو چکا۔

پردہ کی فرضیت اگرچہ سب شرعی ذمہ داریوں کی طرح بلوغت سے ہی شروع ہوتی ہے۔ مگر عادت ڈالنے کے لئے لڑکیوں کو ۱۰ سال کی عمر سے یہ احتیاطیں شروع کرائی جائیں تاکہ ان کو مشق ہو جائے۔

سات سال کی عمر سے لڑکی میں لڑکی ہونے کا احساس پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس عمر کے بعد سے اسے غیر لڑکوں میں بہت مل کر نہ کھیلنے دیا جائے۔ پھر ۱۰ سال کی عمر میں وہ نامحرموں سے بے تکلفی چھوڑ دیں۔

اب جبکہ شرعی پردہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عورتوں کو صحت کی خاطر

سیر کرانا۔ باہر لے جانا۔ پیدل پھرانا اور جنگل میں دوڑنا بھاگنا منع نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔ اور شارع عام سے ہٹ کر اپنے باغات یا ایسی جگہوں میں جہاں غیر لوگ بے تکلف نہ آسکتے ہوں۔ برقعہ یا جلباب اُتار ڈالنے کا کوئی حرج نہیں۔ وہاں صرف وہی پردہ ہوگا جو گھروں کے اندر کا پردہ ہے۔ یعنی خمر والا پردہ۔ اور اگر سب محرم ہی ساتھ ہوں اور مثلاً باغ یا پارک میں غیر آدمی کا آنا منع ہو تو پھر بے تکلف ہو کر اوڑھنیاں بھی اتار دیں یا زیور بھی چھنکاتی پھریں یا اپنی زینت بھی ظاہر کریں تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

رواج کی سختی توڑ دو

اس زمانہ میں جبکہ خالص غذائیں ملنی مشکل ہو گئی ہیں اور لوگوں پر غربت بہت طاری ہے۔ گھی دودھ آٹا وغیرہ سب اشیاء ناقص ملتی ہیں تعلیم کا بوجھ دماغ پر زیادہ پڑنے لگا ہے اور دق سِل وغیرہ امراض بکثرت مخلوقات کو خصوصاً عورتوں کو ہلاک کئے جاتے ہیں تو صحت کے لئے زیادہ تگ و دو کرنی چاہیئے اور عورتوں اور لڑکیوں کو تازہ ہوا زیادہ بہم پہنچانی چاہیئے۔ چلنا پھرنا، ورزش بھاگ دوڑ، سورج کی روشنی، جنگل کا سبزہ۔ کھیتوں کی ہوا روزانہ یا جہاں تک توفیق ہو۔ ان نعمائے الٰہی سے عورتوں کو فائدہ اٹھانے دو۔ اور رواجی پردہ کے اس حصّہ کو توڑ دو جس کی وجہ سے عورتیں گھروں سے باہر سیر یا ورزش کے لئے یا مدرسہ جانے کے لئے نہیں نکل سکتیں۔ یا سفر نہیں کر سکتیں یا زنانہ انجمنوں اور مفید کمیٹیوں میں شامل نہیں ہو سکتیں یا نمائش سینما اور سرکس نہیں دیکھ سکتیں (مگر تھیٹر جو عموماً اس ملک میں ہوتے ہیں وہ عورتوں کے دیکھنے کے ناقابل ہیں بلکہ ایک حصّہ سینما کا بھی) جب برقع یا جلباب موجود ہے تو تانگہ یا موٹر پر چادریں کسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ دو دو قدم پر جانے کے لئے ڈولی کی۔ غیر مردوں سے ضرورت کے وقت عورتیں بات چیت کر سکتی ہیں۔ قابلِ اطمینان اور معزز دوکانوں سے سودا خرید سکتی ہیں۔ (مگر جیسی

اس زمانہ میں بکثرت لوگوں کی اخلاقی حالت گری ہوئی ہے یہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی مرد اپنا محرم ان کے ہمراہ ہو اور سوائے مجبوری کے تنہا نہ نکلیں)

فوری تغیّر خطرناک ہے

جن علاقوں میں رواجی پردہ سخت قسم کا ہے وہاں یکدم عورتوں کو گھر سے نکال کر اور ایک چادر پہنا کر باہر لئے پھرنا اور ایک فوری تغیّر سارے کنبہ میں پیدا کر دینا اور انگشت نما ہونا خطرناک ہے۔ ہر چیز جو شرعاً فرض نہ ہو اسے بتدریج چھوڑنا چاہیئے۔ شرع نے پردہ کی حد مقرر کر دی ہے مگر یہ نہیں کہا کہ جو اس سے زیادہ پردہ کرے اُسے پکڑ کر باہر نکالو۔ اگر اس معاملہ کو بتدریج درست نہ کیا جائے گا بلکہ فوری تغیر پیدا کیا جائے گا۔ تو بعض اخلاقی نقصانات پہنچنے کا احتمال ہے۔ پس ایسے علاقوں میں عورتوں اور اپنے دیگر رشتہ داروں کو شرعی پردہ کی حقیقت سے آگاہ کرو۔ پھر رواج کی سختیاں ان کو سمجھاؤ پھر یہ بتاؤ کہ اس زمانہ میں رواجی حصہ کی وجہ سے بعض نقصانات عورتوں کی صحت اور تعلیم کو پہنچ رہے ہیں۔ اور ان کا نتیجہ خراب ہے پھر آہستہ آہستہ عملی تغیر پیدا کرو۔

ہماری جماعت کے لئے تو جو اُسوہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے خود قائم کر دیا ہے۔ وہ کافی ہے۔

غرض خلاصہ شرعی پردہ کا یہ ہے۔

(ا) باہر نکلنے کا پردہ :۔ یہ سب کے لئے ایک ہی طرح کا ہے۔

(ب) گھروں کے اندر کا پردہ :۔ یہ دو قسم کا ہے اور صرف نامحرموں سے ہے۔

(۱) امہات المومنین کا مخصوص حکم (احزاب)

(۲) دوسری مسلمان عورتوں کا حکم (نور)

(ج) خلوت کے اوقات کا پردہ :۔ یہ اپنے بچوں اور گھر کے خادموں تک سے ہے اور صرف مخصوص اوقات میں ہے۔ اس کے بعد آئندہ مضمون میں انشاء اللہ اس امر کو واضح کروں

گا کہ امہات المومنین کا پردہ کیوں دوسری عورتوں سے زیادہ سخت تھا۔ دوسرے یہ کہ شرعی پردہ پر لوگوں کے کیا اعتراض ہیں اور ان کا کیا جواب ہے۔

ضروری نوٹ :۔ اس مضمون کو دیکھ کر میرے ایک نہایت بزرگ دوست نے کچھ نوٹ میری کاپی پر کر دیئے تھے۔ ان کی رائے میرے نزدیک ایسی وقعت رکھتی ہے کہ میں اس کا یہاں درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وھو ھذا۔

نوٹ نمبر ۱۔" دجالی فتنہ بہت پھیل گیا ہے۔ اس زمانہ میں عورتوں کی تعلیم اور صحت کا خیال کر کے اگر پردہ میں احتیاطی پہلو اختیار نہ کیا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود۔ مارگزدیدہ مُردہ شود۔ کیونکہ زہریلی آب وہوا سخت پھیلی ہوئی ہے اور اس زہریلی ہوا میں عورتوں کو علم حاصل کرنے اور عقل اور تربیت کے لئے اگر پھرایا جائے۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تعلیم اور تربیت کرتے کرتے ایمان ہی ہاتھ سے جائے۔ جس تعلیم اور تربیت کی لوگوں کو اس زمانہ میں خواہش ہے وہ پچھلے زمانہ میں نہ تھی۔ باوجود اس کے انہی عورتوں کے پیٹ سے انبیاءؑ اور اولیاء پیدا ہوتے رہے۔ دراصل احمدیوں کو دجّالی فتنہ کا علاج کرنا چاہیئے۔ عورتوں کی ایسی تربیت تو یورپ کی تقلید ہے۔ عورتوں کو تعلیم دیتے دیتے اور ان کی صحت ٹھیک کرتے کرتے کہیں ایمان ہی ہاتھ سے نہ جائے۔ یورپ کا مقصود دُنیا ہے اور احمدی کا مقصد آخرت ہے۔ تریدون عرض الدنیا واللّٰہ یرید الاٰخرۃ۔"

نوٹ نمبر ۲۔" جس کی آواز یا چال یا قد فتنہ میں ڈالنے والی ہیں اس کو بالکل ہی پردہ میں رہنا چاہیئے بشرطیکہ شکل بھی اچھی ہے۔ بقول حضرت خلیفۂ اوّل (اللہ آپ سے راضی ہو) حُسن دنیا میں بہت کم ہے۔ اس لئے ایسی عورتیں دنیا میں بہت کم کوئی کوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایسی ایک آدھ کو عام کے فائدوں کے لئے قربان کرنا چاہیئے۔ ایسی عورتیں خدا نے صرف حُسن کے نمونہ کے لئے پیدا کی ہیں۔" (م۔م)

O

مجھے افسوس ہے کہ باوجود واضح طور پر اظہار مطلب کے پھر بھی بعض احباب نے اس ایک اصلی نکتہ کو نہیں سمجھا جو میں نے اپنے پہلے مضمون میں بیان کیا ہے۔ اور وہی ایک اصلی نکتہ ہے جس کے سمجھ لینے سے پھر یہ مضمون صاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک دوست یہ مضمون پڑھ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ:-

"عورت جب باہر نکلے تو کیا اس کا مُنہ الاماظھر منھا میں نہیں آسکتا۔"

اس سوال سے معلوم ہوا کہ انہوں نے وہ بنیادی بات ہی نہیں سمجھی جس پر میں نے اس مضمون کو قائم کیا ہے اور وہ بنیادی بات یہ ہے کہ خُمر والا پردہ جس میں زینت اور الاماظھر منھا کا ذکر ہے وہ گھر سے باہر جانے والی عورت کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ پس یہ سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسی طرح ایک صاحب کہتے ہیں کہ:-

"جب عورت باہر نکلے تو کیا کیا زینت چھپائے؟"

یہ سوال بھی غلط ہے کیونکہ زینت کا سوال بھی خُمری پردہ یعنی اس پردہ کے متعلق ہے جو گھروں کے اندر کرنا چاہیئے نہ کہ جلبابی پردہ کے متعلق جو باہر نکلنے کا ہے۔ اسی طرح ایک اور صاحب پوچھتے ہیں کہ:-

"کیا عورتیں سر پر مفلر یا شال باندھ کر باہر نکل سکتی ہیں؟ کیونکہ مفلر بھی خمر میں داخل ہے اور شال یا مفلر میں مُنہ ضرور کھُلا رہے گا۔"

میرا جواب پھر یہی ہو گا کہ مفلر یا شال چونکہ خُمر یا اوڑھنی کی جگہ استعمال ہو گا اس لئے وہ گھر سے باہر پردہ پر حاوی نہ ہو گا۔ ہاں اگر گھروں میں اوڑھنا چاہیں تو وہ خمر کا قائم مقام ہو سکتا ہے بشرطیکہ ایسی طرز کا اور اتنا بڑا ہو کہ سینہ کے آگے بھی اس کا ایک حصّہ پڑا رہے۔

میں پھر قارئین کرام کو اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ میں نے عام طور پر تین قسم کے پردے بیان کئے ہیں۔ اب میں ان کا نام بھی رکھ دیتا ہوں:۔

۱۔ "حجابی پردہ" صرف امہات المومنین کے لئے اپنے گھروں کے اندر۔

۲۔ "جلبابی" پردہ۔ سب کے لئے گھروں سے باہر۔

۳۔ "خمری" پردہ۔ سوائے اُمّہات المومنین کے باقی سب مومنات کے لئے اپنے گھروں کے اندر

جلبابی پردہ

جو عورتوں کو باہر نکلتے وقت کرنا چاہیئے۔ باہر نکلنے کے وقت کا صرف ایک ہی قسم کا پردہ ہے اور وہ جلبابی ہے۔ اس میں کسی بڑے کپڑے کے اوڑھ لینے کا حکم ہے اور چہرہ ضرور اس میں چھپے گا۔ کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنے سارے بدن پر ایک بڑی چادر اوڑھ لیں اور اپنا سب کچھ ڈھک لیں۔ مثلاً اگر سادہ چادر ہے تو گھونگٹ نکال لیں۔ اور اگر برقعہ ہو تو اس کا نقاب یا جالی اس کے منہ کے آگے رہے جس سے راستہ معلوم رہے مگر اپنا منہ سامنے والوں کو نظر نہ آسکے۔ پس اس پردہ میں یہ کوئی بحث ہی نہیں کہ کیا کیا زینت کھولی جائے اور کیا کیا باتیں الاّ ما ظھر منھا میں داخل نہیں اس پردہ کے حکم میں قطعاً ایسی کسی بات کی طرف اشارہ بھی نہیں۔ تعجب ہے کہ لوگ بحث کرتے ہیں اس پردہ کے متعلق اور پیش کرتے ہیں وہ آیت جو گھروں کے اندر کے لباس اور پردہ کے متعلق ہے۔ جو قطعاً ایک غیر متعلق بحث ہے۔ جلبابی پردہ میں صرف ایک حکم ہے وہ یہ کہ عورت ایک بڑے کپڑے سے اپنا بدن ڈھک لے اور بس۔

خمری پردہ

دوسرا پردہ جو خمری ہے اور جس کی آیت کو اکثر زیر بحث لایا جاتا ہے۔ وہ صرف گھروں کے اندر کا پردہ ہے۔ باہر کا نہیں ہے۔ اور اس کی وجوہات میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ سوائے شاذ و نادر کے تمام دنیا کی معاشرت اس طرح کی ہو چکی ہے کہ خواہ شہر ہوں یا گاؤں ایک دوسرے کے گھر میں لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔ مثلاً ایک متوسط الحال شخص ہے اس کے پانچ چھ بیٹے ہیں۔ وہ ان سب کی شادی کر کے جب بہوؤں کو گھر میں لائے گا تو کیا ہر ایک کے لئے شہر سے باہر نیا مکان چار چار پانچ پانچ ہزار روپیہ خرچ کر کے بنائے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ سب اسی کے گھر میں رہیں گے۔ حالانکہ سب بھائی اپنی بھاوجوں کے نامحرم ہوں گے۔ پس ضرور ہوا کہ شریعت ایک پردہ ان حالات کے ماتحت ایسی عورتوں کے لئے قائم کرتی اور ان کی حفاظت کرتی۔ سو ایسا پردہ شریعت نے قائم کر دیا اور اس کا نام خمری پردہ ہے۔ اس میں صرف ایک بات ضروری ہے وہ یہ کہ عورت اوڑھنی یا دوپٹہ یا مناسب شال سر پر اس قسم کی اوڑھ لے جس سے بال ڈھک جائیں۔ اور اس کا حصہ اس کے سینہ کے بھی آگے آجائے۔ بس یہ کم از کم ہے۔ مُنہ کھلا رہے۔ ہاتھ کھلے رہیں۔ اور کام کاج کے ضروری اعضاء کھول سکتی ہے۔ ہاں زینت یعنی زیورات وغیرہ چھپائے۔ مثلاً اگر ماتھے پر زیور ہے تو ذرا دوپٹہ نیچے کو کھسکا لے۔ یا کانوں میں زیور ہیں تو اسی بُکل میں کان پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر عورت کا چہرہ نہایت ہی خوبصورت اور فتنہ میں ڈالنے والا ہو تو وہ اُسی خُمر کا گھونگٹ نکال کے رکھے۔ اور یہ باتیں کوئی نئی نہیں ہیں۔ ہندوستان پنجاب کے سب شہروں میں شرفاء میں بلکہ ادنیٰ لوگوں تک میں رائج ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ سختی سے رائج ہیں جتنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ درحقیقت خمری پردہ عزیز رشتہ داروں اور ہمیشہ گھر میں آنے جانے والے "نیم محرموں" کا پردہ ہے۔

اس سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں۔ اور اسی لئے اس میں زینت اور الا ما ظھر منھا کے الفاظ داخل کئے گئے ہیں کہ حسبِ حالات اور حسبِ رواج اور حسبِ ضرورت اس قسم کے پردہ میں کمی بیشی ہوتی رہے۔ مثلاً جب وہی حسین وجمیل عورت ذرا پختہ عمر کی ہو جائے اور اس کی نوجوانی کا حُسن اُس آب وتاب کا نہ رہے تو پھر وہ اپنا مُنہ بیشک کھول دے۔ اسی طرح زمینداروں میں اپنا کھیت اور تاجر پیشہ عورتوں میں اپنی دوکان بھی گھر کا حکم رکھتی ہے۔ وہاں عورتوں کا کام ایسا ہی ہوتا ہے جیسے اپنے گھروں میں اس لئے وہاں بھی گھری پردہ ہو گا کیونکہ وہ غیر جگہ نہیں ہے بلکہ غرباء اور محنتی عورت کے لئے وہ اس کا اپنا گھر ہی ہے اس لئے دکاندار عورت اپنی دکان میں اور زمیندار عورت اپنی کھیتی میں اُسی لباس میں کام کر سکتی ہے جس میں وہ اپنے گھر میں رہتی۔ یعنی گھری پردہ کے ساتھ۔

اُمہات المومنین کی خصوصیت کیا تھی؟

اب ہم اس بات کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ امہات المومنین کے پردہ میں کیوں بعض خصوصیات داخل کی گئی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعددِ ازدواج کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ :-

(۱) عورتوں کے لئے دینِ اسلام کی معلمہ خواتین پیدا کی جائیں۔

(۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے اندرونی اخلاق عادات معاملات عبادات اور حالات اُمّت کو مختلف اور متعدد طریقوں سے معلوم ہو سکیں۔

اور یہ کام ایک عورت سے نہیں چل سکتا تھا بلکہ کئی عورتیں اس کام کے لئے ضروری تھیں اور ان معلمہ خواتین کے لئے ضروری تھا کہ :-

۱۔ وہ ہر وقت اپنے گھروں میں حاضر رہیں۔ کیونکہ اگر وہ بھی اور عورتوں کی طرح محلہ محلہ اور گھر گھر پڑی پھرتیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حالات اور دین کے مسائل پوچھنے والے مرد اور عورتیں بڑی مصیبت میں پڑ جاتے۔ اُمہات المومنین کے گھر گویا مدرسوں کی طرح تھے اور دن رات وہ مدرسے کھُلے رہتے تھے۔ پس جس طرح مدرسہ کے اوقات میں ایک مدرس کا مدرسہ میں حاضر رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح ان کی حاضری اپنے گھروں میں ضروری تھی تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی مرد یا عورت دین کا علم سیکھنے آئے اور اُن کو غیر حاضر پا کر ناکام جائے۔

۲۔ عورت کی زینت اور سنگار اور بناؤ صرف خاوند کے راضی کرنے اور اس کے خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ دُنیا کے سب سے بڑے تارک الدنیا شخص تھے اس لئے آپ کے خوش کرنے کے لئے ان کو زینت الجاہلیۃ کی ضرورت نہ تھی۔ پھر چونکہ آپ کی وفات کے بعد ان کے لئے نکاح حرام تھا اس لئے بھی ان کو زینت کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ کیونکہ جب خاوند کرنا ہی نہیں تو اس قسم کی مردوں کو لبھانے والی زینت سے کیا کام۔ اس لئے بر خلاف تمام عورتوں کے امہات المومنین کے لئے رواجی زینت اور بناؤ سنگار (طہارت اور صفائی الگ چیز ہے) منع کر دیا گیا تھا۔ ان کی شان دنیا میں اُستاد اور مبلغ کی شان تھی اور ان کا وجود اُمت کے لئے قربان ہونے کی خاطر بنایا گیا تھا۔ اُن کی جو پوزیشن تھی وہ اس بات کی طلبگار تھی کہ وہ اپنا نفس، اپنی خواہشات اور اپنے سر آرام کو دین اور امت کے لئے نثار کر دیں۔ وہ امت کی عورتوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نائب تھیں اور جس طرح خود حضور کی زندگی محض خلق خدا کے لئے تھی۔ اسی طرح آپؐ کی ازواج بھی محض دین کے لئے وقف تھیں۔ اسی لئے تو قرآن مجید فرماتا ہے کہ

یا نسآء النبی لستن کاحدٍ من النساء۔

یعنی نبی کی بی بیو تم دنیا کی اور عورتوں کی طرح نہیں ہو بلکہ تمہارا خاص مشن ہے جس

کو نہیں پورا کرنا ہو گا۔

۳۔ پھر جب ایک طرف ان کو دُنیا کا استاد بنا دیا گیا اور عورتوں کے سوا ہر قسم کے مرد بھی گروہ در گروہ ان کی خدمت میں دین سیکھنے کے لئے آنے لگے اور دوسری طرف باوجود جوان ہونے کے ان کو نکاح کی ممانعت کر دی گئی تو ضرور تھا کہ ان کی حفاظت اور طہارت کا سامان بھی دوسروں سے بڑھ کر کیا جاتا۔ سو یہ حکم ملا کہ تم استادانہ لہجہ میں لوگوں سے بات کیا کرو۔ ہرگز بات چیت میں اور عورتوں کی سی نرمی اور ملائمت اور لجاجت نہ ہو۔ دروازہ پر پردہ پڑا رہے تاکہ لوگ باہر ہی سے بات کر لیا کریں۔ اور اتفاقی نظر بھی کسی کی ان پر نہ پڑے۔ اور لوگ ان کو اماں جان کہہ کر خطاب کریں اور اپنے تئیں صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ ان کا بیٹا سمجھیں۔ غرض ان پاک عورتوں کے حالات دُنیا کی دوسری عورتوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس لئے ان کے لئے خاص ہدایات اور احکامات نازل ہوئے تھے۔ اور یہ احکام گھر کے پردہ کے ہی متعلق تھے۔ اگر اتفاقیہ ان کو باہر جانا پڑتا تھا تو اس کے متعلق ان کے لئے بھی وہی احکام تھے جو دوسری تمام مومنات کے لئے تھے کیونکہ مومنات کا جلبابی پردہ اتنا کافی اور وافی تھا کہ امہات المومنین کے لئے اس میں کسی ایزادی کی ضرورت نہ تھی۔ جب سر اور جسم اور چہرہ سب کچھ ڈھک جائے تو پھر کسی اور مزید احتیاط کی کچھ حاجت نہیں رہتی۔ ہاں گھروں کے اندر کا پردہ چونکہ دوسری مومنات کا بہت نرم ہے اس لئے امہات المومنین کے لئے اس پردہ میں زیادتی کی گئی۔ وجہ یہ کہ امہات المومنین کے پاس ان کے گھر پہ ہر قسم کے غیر آدمی ہر وقت تعلیم حاصل کرنے کے لئے (دوسری عورتوں کا یہ حال نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔

پردہ پر اعتراضات

اس کے بعد ہم بعض ان اعتراضات کو لیتے ہیں جو پردہ پر لوگ کیا کرتے ہیں۔

سوال:۔ پردہ اگر عمدہ اور مفید چیز ہوتا تو کیوں اسلامی ممالک مثلاً ترک اور افغانستان کے لوگ اسے چھوڑ دیتے۔

جواب:۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ مفید شرعی پردہ کے ساتھ غیر مفید حصہ، رواجی پردہ اتنا سخت تھا کہ لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے پردہ بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اگر ہمیشہ سے شرعی پردہ پر عمل رہتا تو وہ اتنا سخت نہ تھا نہ اس میں یہ قید تھی کہ عورتیں گھروں میں مقیدرہیں۔ پس جب رواج نے اتنی سختی کی کہ ترازو کا ایک پلڑہ بہت جھک گیا اور اعتدال نہ رہا تو لازمی بات تھی کہ تنگ آکر وہ لوگ اب ترازو کا دوسرا پلڑہ بہت جھکا دیتے۔ اسی کو "ری ایکشن" کہتے ہیں۔ اور یہ بے اعتدالی نتیجہ ہے۔ پہلی بے اعتدالی کا۔

دوسری وجہ اس کی یورپ کی اندھا دھند تقلید ہے جو مادی خیالات کے لوگ ہر ملک میں کر رہے ہیں۔ نہ سوچتے ہیں نہ غور کرتے ہیں نہ موازنہ کرتے ہیں بلکہ جس طرف اور جس طرح یورپ ان کو نچاتا ہے وہ ناچتے ہیں۔ یہ حالت یورپ کے رُعب اور اپنے دین سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ خود عورتیں بھی آزادی چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم بھی مردوں کی طرح آزاد پھریں۔ دُنیا سے ملیں جُلیں۔ تماشے دیکھیں ناچ گانا تھیٹر ہر لُطف کو چکھیں۔ بلکہ خود گائیں ناچیں۔ اور کیا وجہ کہ لوگ ہمارے حُسن کی قدر نہ کریں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل میں ہر شخص قانون اور مذہب سے آزادی چاہتا ہے۔ مرد بھی چاہتے ہیں کہ کیا وجہ ہم محنت کریں۔ کیوں نہ جس کا مال چاہیں اُٹھالیں۔ اور جس عورت کو پسند کریں اپنے قبضہ میں

لے آئیں۔جو دشمن ہو اُسے مار ڈالیں۔اور جو بھی خواہش ہو اسے پورا کرلیں۔مگر انہوں نے دیکھا کہ یہ آزادی سوسائٹی کے تباہ کرنے اور مُلک کا امن برباد کرنے کا باعث ہے۔ اس لئے قانون اور مذہب کے نیچے پناہ لے کر انہوں نے خود اپنی اس مہلک آزادی پہ قید لگادی اور نقصان دہ خواہشات کو ملک کے امن اور سوسائٹی کی بہتری پر قربان کر دیا۔ نفسِ انسانی کی مثال ایک گھوڑے کی مانند ہے جو اپنے جوہر اور قابلیت اسی وقت دکھاتا ہے جب وہ پابند ہو اور اس کے مُنہ میں لگام ہو نہ یہ کہ بے لگام اور ہر طرح غیر مفید ہو۔ سو جس طرح مردوں نے اپنے تئیں بہت سی باتوں میں آزادی کھو کر مقیّد کر دیا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی شرعی پردہ ایک مناسب قید ہے۔بیشک وہ کامل آزادی میں روک ہے مگر یہ روک اخلاقی صحت اور سوسائٹی کے امن اور گھروں کی راحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔پس وہ عورتیں جو آزادی چاہتی ہیں وہ یہ سوچ لیں کہ آج تو بیشک ان کو یہ آزادی بہت لذّت دہ معلوم ہوگی۔مگر پھر چند سال بعد قدرتًا وہ اس کی مزید قسط کی طلب گار ہونگی پھر اس سے اگلی قسط کی یہاں تک کہ ان کی حالت یورپ کی آزاد منش عورتوں کی طرح ہو جائے گی ....

...... جہاں عورت عورت نہیں بلکہ مرد ہے کیونکہ وہ مردوں والا علم حاصل کرتی ہے۔ ان کی طرح خود کمائی کرتی ہے۔تنہا رہتی ہے۔شادی اور اولاد کے قیود سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔برتھ کنٹرول پر عمل کرتی ہے اور .... اس مقام سے بہت آگے پہنچی ہوئی ہے جس درجہ پر ایشیا کا کوئی بڑے سے بڑا آزاد منش بھی کبھی پہنچا ہوگا۔پس غور کرو کہ کیا یہ آزادی تمہیں پسند ہے؟ کیونکہ پردہ کا دور کرنا اس زمانہ میں یقینًا رفتہ رفتہ عورتوں کو اسی راستہ پر لے جائے گا۔جس پر ان سے پہلے ان کی یورپین بہنیں گذر چکی ہیں۔دنیا میں ہر شخص کی ہر قوم کی ہر نفس کی آزادی کی ایک حد ہے اگر عورتیں اس حد سے باہر قدم نکالیں گی جو اسلامی شریعت نے ان پر مقرر کی ہے تو وہ یاد رکھیں کہ وہ سخت نقصان

اُٹھائیں گی۔ ہاں جو حصّہ شرع نے اُن پر نہیں لگایا اور وہ تکلیف دہ ہے۔ اُسے بیشک دُور کر دیں وہ خدا جو تمہارے نفسوں پر تم سے زیادہ مہربان ہے تمہاری بہتری کے لئے ایک تجویز مقرر فرماتا ہے۔ اگر اسے قبول نہ کرو گی تو تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ اس دُنیا میں تمہارے اعلیٰ جوہر اور آئندہ عالم میں تمہارے نیک ثمرات برباد ہو جائیں گے۔

سوال:۔ پردہ اگر احکامِ دین میں داخل ہے تو پھر بتلائیے کہ نہ کرنے والی عورت پر اسلام نے کیا سزا مقرر کی ہے؟ اگر نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ پردہ ضروریاتِ دین میں داخل نہیں ہے۔

جواب:۔ بیشک پردہ احکام دین میں داخل ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اس کے متعلق مومنوں کو مخاطب کر کے صاف احکام موجود ہیں۔ مگر پردہ اسلام نے نیکی اور تقویٰ کے برقرار رکھنے اور دلی پاکیزگی اور طہارت میں امداد دینے کے لئے قائم کیا ہے۔ اس لئے اس کے نہ کرنے والے پر تعزیر اور سزا نہیں ہے۔ یہ تو ایک نیکی ہے۔ تقویٰ کی ایک شاخ ہے۔ پرہیز گاری کا ایک شعبہ ہے پس نہ کرنے والا جسمانی اور قانونی تعزیر کے نیچے نہیں آئے گا۔ اسلام نے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے مگر کیا کسی ایسے شخص کے لئے کوئی سزا مقرر کی ہے جو علم حاصل نہ کرے؟ قرآن نے تقویٰ کی باریک در باریک راہوں پر چلنے کے احکام پیش کئے ہیں مگر کیا جو اعلیٰ درجہ کا متقی نہ ہے اس کے لئے قید یا تازیانہ وغیرہ سزا تجویز کی ہے؟ اسی طرح صدقات اور تہجد اور نوافل وغیرہ پر بہت زور دیا ہے مگر کیا یہ بھی کہا ہے کہ جو صدقہ نہ دے اس کو ۲۰ دُرّے مارے جائیں اور جو نفل نہ پڑھے اُسے ۵۰ درّے اور جو تہجّد گذار نہ ہو اسے ۱۰۰ درّے۔ پردہ بھی نیکی اور تقویٰ کی راہوں میں سے ایک راہ ہے۔ ان باتوں میں داخل نہیں ہے۔ جن پر سزا اور حدود قائم ہوتی ہیں۔ وہ تو تین ہی قسم کی چیزیں ہیں یعنی اموال اور دما اور اعراض کا نقصان۔ پردہ سے تو صرف نیکی اور تقویٰ میں ترقی ہوتی ہے اور انسان فتنوں اور بُرائیوں سے بچتے ہیں پس اگر کوئی

عورت اس کا خیال نہ رکھے گی تو شریعت اسے جسمانی سزا نہ دے گی ہاں اس کی نیکی پاکیزگی اور طہارت میں فرق آجائے گا اور فتنوں کا راستہ کُھلتا جائے گا۔ یہاں تک کہ آخر کار ان گناہوں کے ارتکاب تک بھی نوبت پہنچے گی جن پر شریعت نے سزا رکھی ہے۔ قرآنی شریعت نے مسلمانوں کے لئے بکثرت ایسی ہدایات دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے بدی نہیں بلکہ بدی کی جڑ کٹتی ہے اور بدی پیدا ہی نہیں ہونے پاتی اور پردہ بھی انہی باتوں میں سے ایک بات ہے جن سے بدیوں کا سدّباب ہوتا ہے اور گناہ کا بیج ہی برباد کر دیا جاتا ہے۔ پس اس پر تعزیر مقرر کرنے کے کیا معنی؟ یہ اعتراض ہی لغو اور شرعی تعزیرات کے اصول کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔

ہاں ایک قسم کی تعزیر کا ذکر قرآن میں ان عورتوں کے لئے موجود ہے جو پردہ کے اصول کو بالائے طاق رکھ کر بے حیائی کی باتیں کرتی ہیں۔ مثلاً اپنا سنگار جان بوجھ کر نامحرموں کو دکھاتی ہیں اور زینت کا اظہار کرتی ہیں اور بار بار بے شرمی کی حرکات کرتی ہیں۔ مثلاً شارع عام میں اپنی بے پردگی کرتی ہیں اور غیر مردوں سے ہنسی مذاق وغیرہ کرتی ہیں پس ایسی عورتوں کے لئے جو اسلامی پردہ کے حدود کو جان بوجھ کر بے حیائی اور بے شرمی سے توڑتی ہیں اور قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ اُن کو گھروں سے بالکل باہر نہ نکلنے دیا جائے اور ان کو قیدیوں کی طرح گھر میں رکھا جائے تاکہ وہ اپنی حرکات سے لوگوں پر بُرا اثر نہ ڈالیں پس پردہ کو خراب کرنے والیوں کی تعزیر مزید پردہ ہے تاکہ ان کی اصلاح ہو جائے۔ اور اس تعزیر کے لئے ضروری نہیں کہ عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔ بلکہ یہ کافی ہے کہ خاوند اپنی عورت کی اور باپ یا بھائی وغیرہ ولی اپنی لڑکی اور بہن کی اصلاح کریں۔

والّٰتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشھدوا علیھن
اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت حتّٰی
یتوفّٰھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا۔

یعنی وہ عورتیں جو بے حیائی کی مرتکب ہوتی ہیں ان پر چار گواہوں کی گواہیاں مل جائیں۔ تو ان کو گھروں میں روک رکھو اور باہر نکلنے نہ دو یہاں تک کہ وہ فوت ہو جائیں یا خدا ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے مثلاً وہ پوری اصلاح اور توبہ کر لیں۔ یا طلاق مل جائے یا اگر کنواری یا بیوہ ہوں تو ان کا نکاح ہو جائے وغیرہ۔

پس یہ ایک قسم کی تعزیر بھی موجود ہے۔ مگر یہ صرف ان عورتوں کے لئے ہے جو اپنا پردہ توڑ کر بے حیائی کی بھی مرتکب ہوں۔ مثلاً جیسا اس زمانہ میں بعض لڑکیاں ذرا پڑھ جاتی ہیں تو ناولوں اور بے ہودہ عشقیہ اشعار کے مطالعہ سے متاثر ہو کر رقعہ بازی اور نظر بازی اور عشق بازی میں حصہ لینے لگتی ہیں اور پردہ نظر کا اور کپڑے کا دُور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے لئے یہ شرعی تعزیر بھی موجود ہے۔ یہ حالات اس زمانہ میں بہت پائے جاتے ہیں اور یہ آوارگی دینی تعلیم کے نہ ملنے اور شرعی پردہ نہ کرنے سے ہی پیدا ہوئی ہے۔

سوال:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں جنگوں میں جاتی تھیں اور اُحد کے میدان میں تو لکھا ہے کہ ان کی پنڈلیاں تک ننگی تھیں۔ پس یہ پردہ کیسا تھا؟

جواب:۔ اُحد میں جیسا کہ آپ فرماتے ہیں یہی حال تھا۔ مگر پردہ تو اس کے دو سال بعد جاری ہوا ہے۔ یہ بات پردہ کے حکم سے پہلے کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگ کے میدان کی اور حیثیت ہے۔ وہاں کسی قوم کی موت اور زندگی کا سوال پیدا ہوتا ہے اور تمام حالات شہری معاشرت کے ساقط ہو جاتے ہیں۔ وہاں صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ کسی طرح فتح حاصل ہو۔ پس ان حالات میں عورتوں کا لڑنا یا زخمیوں کی خبر گیری کرنا وغیرہ سب جائز بلکہ فرض ہو جاتے ہیں۔ جنگ کے میدان کے حالات کو شہر کے حالات سے کیا مناسبت؟ جنگ میں جان مال مُلک عزّت دین کے

سوال کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہاں ضرورت ہر چیز کو جائز کر دیتی ہے۔

سوال :۔ جلبابی پردہ میں ہم کہتے ہیں کہ مُنہ کھلا رکھنا چاہیئے۔ آپ کے پاس اس بات کی کیا سند ہے کہ منہ کھُلا نہیں رہنا چاہیئے۔

جواب :۔ گھر سے باہر والے یعنی جلبابی پردہ کی جو آیت ہے اس میں سے ہی یہ استنباط ہوتا ہے کہ باہر نکلنے والی بیبیاں اپنا سارا مُنہ کھُلا نہ رکھیں۔ صرف اتنا کھلا رکھنا تو مجبوری ہے۔ جس سے نظر اچھی طرح آسکے۔

وہ آیت یُوں ہے۔

ذالک ادنیٰ ان یُعرفن فلا یُوذَین

یعنی مسلمان عورتیں جلباب اوڑھ کر باہر نکلا کریں۔ اس لئے کہ لوگ ان کو پہچان لیں کہ یہ مسلمان عورت آ رہی ہے اور اس وجہ سے ان کو تکلیف نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر عورتیں مُنہ کھول کر نکلا کرتیں تو پھر جلباب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرے یہ کہ یہاں جلباب کو مسلمان عورت کی پہچان کا ذریعہ قرار دیا ہے نہ کہ اُس کے چہرہ کو اگر چہرہ کھلا رہتا تو وہ چہرہ پہچان کا موجب ہوتا نہ کہ جلباب۔ مگر آیت نے یہ فرمایا ہے کہ مسلمان عورت چادر کو اس طرح اوڑھ کر باہر نکلے کہ چادر ہی اس کی پہچان کا ذریعہ ہو۔ اس لئے ثابت ہوا کہ چہرہ ضرور چھپا ہوا ہو۔ اور صرف چادر کی وجہ سے لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ مسلمان عورت ہے جو جا رہی ہے۔ اس کے جسم اور چہرہ اور اعضاء کی بناوٹ سے پتہ نہ لگے کہ کون سی عورت ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ جلبابی آیت امہات المومنین پر بھی اسی طرح حاوی تھی جس طرح دیگر مومنات پر اس لئے اگر چہرہ کھُلے رکھنے کی اجازت ہوتی تو امہات المومنین کی پہچان تو مدینہ میں ہر شخص کو پہلے ہی سے تھی۔ وہ ان کے چہروں سے بخوبی واقف تھے۔ کیونکہ وہ حجاب کے حکم سے پانچ سال پہلے ان کے سامنے بے پردہ پھرتی تھیں پھر اُن کے

بارہ میں یہ کیوں کہا گیا **ذالك ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین** یعنی جب وہ بھی باہر نکلیں گی تو جلباب ہی کی وجہ سے لوگوں کو آسانی سے معلوم ہو سکے گا کہ یہ کوئی مسلمان عورت ہے۔ حالانکہ اگر چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت ہوتی تو لوگ جلباب سے نہیں بلکہ چہرہ سے ہی فوراً پہچان لیتے کہ یہ فلاں اُمّ المومنین ہیں ان کے لئے راستہ چھوڑ دو۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ام المومنین حضرت سودہؓ ایک دفعہ باہر جا رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ امہات المومنین کے اپنے گھروں سے باہر نکلنے کے ہمیشہ مخالف تھے۔ انہوں نے ان کا ڈیل ڈول اور چال دیکھ کر آواز دی کہ اے سودہ ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مُنہ نہیں کھلا تھا۔ ورنہ عمرؓ یہ ہرگز نہ کہتے کہ ہم نے تم کو پہچان لیا۔ کیا کسی شخص کو جو مُنہ کھولے سامنے ہو کوئی دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم نے تم کو پہچان لیا۔ یہ فقرہ اسی وقت بولا جاتا ہے جب دوسرے انسان کا چہرہ وغیرہ مخفی ہو۔

سوال:۔ جلبابی پردہ میں اگر مُنہ نہ کھلا ہو تو عورت چل کس طرح سکے گی اور بغیر نظر کے وہ رستہ کیونکر طے کرے گی؟

جواب:۔ یہ کس نے کہا ہے کہ آنکھیں بند کر کے چلے۔ سینکڑوں ہزاروں حیادار عورتیں گھونگٹ نکال کر بازاروں میں جاتی ہیں۔ اسی طرح بُرقعہ کی جالی یا مصری طرز یا چادر کے نیچے دوپٹہ کا ایسا ٹکل مارنا جس سے نیچے کا نصف چہرہ باپردہ ہو جاتا ہے۔ راولپنڈی، جہلم کے علاقہ کی عورتیں ایسا ٹکل مارتی ہیں کہ اُوپر سے ماتھا بند ہو جاتا ہے اور نیچے سے نصف ناک تک۔ صرف بیچ میں سے آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ یا اگر یہ سب ناپسند ہوں تو خود کوئی نئی ایجاد کر لیں۔ تا کہ عورتیں آپ کا احسان مانیں۔

سوال:۔ مہندی زینت ہے یا نہیں؟ کیونکہ سُنا ہے کہ مسلمان عورتوں کو مہندی لگانے کا حکم ہے۔ پھر جب مجبوری سے ہاتھ باہر نکالیں گی تو ہر شخص کی نظر پڑے گی۔ اور بقول آپ کے فتنہ پیدا ہو گا۔

جواب:۔ مہندی لگانے کا کوئی حکم اسلام نے نہیں دیا۔ مرضی ہے کوئی لگائے یا نہ لگائے۔ جہاں ہندوستانی عورتیں بہت سی اور عادات میں مبتلا ہیں یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اصل میں تو یہ اس لئے لگائی جاتی تھی کہ گھر کے کام کاج اور برتن مانجنے وغیرہ سے عورتوں کے ہاتھ اکثر میلے رہتے تھے اور باوجود صاف کرنے کے ان میں نرمی اور صفائی نہ آتی تھی اس لئے مہندی کا رواج ہو گیا کہ عیب ڈھک جائے اور مہندی کی سرخی میں ہاتھوں پر جو کام کاج کرنے سے سیاہی آجاتی ہے وہ مخفی ہو جائے۔ لیکن کیا کہوں خدا شاعروں سے سمجھے انہوں نے اس مہندی کو جو ایک معمولی عیب پوش چیز تھی کہاں تک پہنچایا کہ آخر کار عاشقوں کا خون بن کر معشوقوں کے ہاتھوں اور پیروں میں اُسے جگہ ملی!

آج کل تو مہندی کا رواج ہی اٹھتا جاتا ہے اور چند دن تک غالباً وہ فریدآباد کے بازاروں میں بھی دستیاب نہ ہو سکے گی۔ پس آپ اس کے فتنہ سے نہ ڈریں۔ اگر ایسا ہی ڈر ہے تو دستانے اور جرابیں حاضر ہیں۔ ایسی عورتیں باہر نکلیں تو ان چیزوں کا استعمال کر سکتی ہیں۔

سوال:۔ پردہ صحت کے لئے مُضر ہے۔

جواب:۔ بیشک بعض جگہ کا رواجی پردہ ممکن ہے کہ صحت کے لئے مُضر ہو۔ مگر شرعی پردہ تو ایسا نہیں ہے۔ شرعی پردہ میں ہر عورت بازار میں جنگل میں باغ میں اور سفر پر جا سکتی ہے۔ گھروں کے اندر کھلے منہ پھر سکتی ہے۔ پس صحت کے لئے کسی جگہ بھی ضرر کی کوئی بات نہیں۔ دوڑنا بھاگنا۔ زنانہ کلب میں کھیل وغیرہ سب جائز ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوڑ کرنا ایک مشہور حدیث میں آیا ہے۔ رہا یہ کہ یوروپین عورتوں کی طرح ان کی صحت نہیں ہوتی اس کی وجوہات اور ہیں۔ قومی آزادی، حکومت، دولت، صحت کے قوانین پر چلنا۔ اعلیٰ غذائیں وغیرہ اس کی وجوہات ہیں جو ہندوستانی عورتوں کا کیا ذکر مردوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ جہالت، غربت افلاس ادنیٰ

خوناک اندھیرے نمناک گھروں اور متعفن گلی کوچوں کی بدولت عورتیں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مرد بھی بکثرت ہلاک ہو رہے ہیں اور مرد عورتوں کی نسبت زیادہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ کیونکہ غور سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ اوسطاً ہر بستی میں بیوہ عورتیں رنڈوے مردوں سے زیادہ تعداد میں پائی جائیں گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرد زیادہ مرتے ہیں بہ نسبت عورتوں کے۔ پس پردہ کی وجہ سے عورتوں کی ہلاکت محض ایک جھوٹا بہانہ ہے۔

سوال :- پردہ عورتوں کے علم کے حاصل کرنے میں روک ہے؟

جواب :- یہ بھی غلط ہے۔ جہاں ایسا رواجی پردہ ہے کہ عورت اپنی آواز غیر مرد کو نہیں سُنا سکتی اور مرد غیر محرم عورت سے بات چیت نہیں کر سکتا۔ وہاں ممکن ہے کہ علم حاصل کرنے میں دِقّت ہو مگر اسلام اس کا ذمہ دار نہیں۔ اسلامی پردہ حالانکہ امہات المؤمنین کے لئے دیگر مومنات سے بہت زیادہ سخت تھا مگر علم حاصل کرنا تو الگ وہ تو سارے جہان کی معلّمہ بنی ہوئی تھیں۔ اور دُور دُور سے لوگ ان کے پاس دین حاصل کرنے آتے تھے۔ پس یہ عذر آپ کا بالکل غلط ہے۔ علم کو پردہ سے تعلق نہیں۔ پرائمری تعلیم لڑکیاں بلوغت سے پہلے حاصل کر سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ پڑھانا ہو تو ان کو وہ علم پڑھاؤ جو عورتوں کے مناسب حال ہوں۔ باپ بھائی خاوند لڑکے اپنے گھروں میں علم کا چرچا قائم رکھ سکتے ہیں اور عورتوں کو بہت کچھ تعلیم دے سکتے ہیں۔ گھر میں ہر مضمون کی مفید کتابیں مطالعہ کے لئے مہیا ہو سکتی ہیں۔ قرآن اور دینی کتابیں مترجم مل سکتی ہیں۔ باقی بی اے یا مولوی فاضل یا ادیب فاضل بنانا کم از کم میری رائے میں بالکل لغویات ہے۔ کیونکہ یہ ڈگریاں اور علوم مردوں کی روٹی کمانے کے لئے ہیں اور خدا نے عورت کو روٹی کمانے والے علوم پڑھنے کے لئے نہیں پیدا کیا۔ بلکہ اس لئے کہ مرد اسے کما کر کھلائے اور وہ گھر کا انتظام اور بچوں کی تربیت کرے۔ اور ان کو نیک اور دیندار بنائے۔ ان کو وہ علوم جن میں خانہ داری، نرسنگ، ابتدائی حفظانِ صحت۔ بچوں کی نگرانی اور ان کا پالنا

اور تربیت وغیرہ داخل ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں میں ہی سیکھ سکتی ہیں۔ اور اپنے ہی مردوں سے ان کتابوں پر عبور کر سکتی ہیں۔ ایم اے یا بی اے پاس عورت کا دماغ ایک مرد کا دماغ ہو جاتا ہے اس میں سے نسائیت کا جوہر نکل جاتا ہے۔ اور اس سے کسی مرد کی شادی ایسی ہے جیسے کسی مرد کی دوسرے مرد کے ساتھ شادی ہو۔ لیکن خوشیاں مناتے ہیں کہ خوب جوڑا ملا۔ دونوں ایک سے علم کے میاں بیوی مل گئے۔ حالانکہ ایک ماہ بعد ایسی بیوی بلائے جان ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح دو مردوں کا میاں بیوی ہونا خلاف فطرۃ ہے۔ ایسے ہی ایسی عورت کا بیوی بننا جو پوری مردانہ تعلیم پائی ہوئی ہو ناممکن ہے کیونکہ چند روز کے بعد ہی یہ "علم والی" عورت خاوند سے اسی طرح بیزار ہو جاتی ہے جیسے آج کل امریکہ اور یورپ میں ہو رہا ہے۔ جہاں اب تعلیم یافتہ عورت عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور بسبب مرد ہونے کے وہ نہ عورت کے فرائض بجا لا سکتی ہے۔ نہ مرد کے لئے باعث راحت اور رحمت اور مودت ہو سکتی ہے چنانچہ دیکھ لو کہ کئی ایسی تعلیم یافتہ عورتیں ایک ایک سال میں بیس بیس طلاقیں حاصل کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بسبب مرد بن جانے کے پھر کسی مرد کے گھر میں بس نہیں سکتیں۔ عورت کا کمال یہ ہے کہ وہ عورت ہی رہے اور اپنے ہی دائرہ میں ترقی کرے یا اگر مردانہ علوم میں کامل ہو جائے تو پھر شادی اور خانہ آبادی نہ کرے۔ کیونکہ یہ حالت عورت کا کمال نہیں ہے بلکہ تنزل ہے۔ انشاء اللہ عورتوں کی تعلیم کے مضمون پر میں آئندہ کسی وقت مفصل اپنے خیالات کا اظہار کروں گا اور موجودہ طرز جو عورتوں کی تعلیم کی لوگ اختیار کرتے جاتے ہیں ان کے خطرات اور بد نتائج اور یورپ کی کورانہ تقلید کے نقصانات پر تفصیل سے بحث کروں گا۔ کیونکہ یہ بڑا لمبا اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ وباللہ التوفیق۔

سوال:۔ لنڈن کے بازار میں ایک چادر یا برقعہ پوش عورت گذر رہی ہو جہاں موٹروں کی کثرت کی وجہ سے ہر ۲۰ یا ۳۰ سیکنڈ پر پولیس کانسٹیبل کبھی ایک طرف کے لوگوں کو گذارتا ہے کبھی دوسری طرف کے۔ ایسے موقعہ پر اس کے منہ پر گھونگٹ ہو یا الجھنے والا

والا پردہ ہو تو عورت کی جان کا خطرہ ہے۔ وہاں جلبابی پردہ نہیں چل سکتا۔

جواب :۔ بیشک ایسے موقعہ پر چادر یا برقعہ نہیں چل سکتا مگر وہ لوگ اگر چاہیں تو اپنے ہی لباس میں جلبابی پردہ بنا سکتے ہیں۔ یعنی لمبا کوٹ، ہیٹ اور اس کے گرد باریک نقاب۔ اب بھی کئی معزز یورپین عورتیں ایسا لباس پہنتی ہیں۔ ذرا سی ترمیم کی ضرورت ہے۔

یہ کون کہتا ہے کہ جب یورپین عورت مسلمان ہو جائے اور پردہ کرنا چاہے تو وہ ہندوستان کا ہی برقعہ یا چادر پہنے۔ وہ اپنے ملک کے لباس میں خفیف سی ترمیم کے بعد وہی حالت جلباب والی پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح ٹوپی کی جگہ شال سے سر اور چہرہ کا ایک حصّہ چھپا سکتی ہے بلکہ چھتری سے بھی مدد لے سکتی ہے۔ رومن کیتھولک ننوں کو دیکھو۔ کیا یہ لندن میں نہیں پھر سکتیں ؟ اگر یہ پھر سکتی ہیں تو ایک مسلمان عورت بھی پھر سکتی ہے۔ ننوں کا لباس اور نقاب مل کر پورا جلبابی پردہ بن جاتا ہے۔ اگر نقاب اٹھانا ہو تو چہرہ کا نچلا حصّہ صرف ایک رومال سے چھپ سکتا ہے جو بائیں ہاتھ سے منہ پر رکھ لیا جائے۔ غرض عمل کرنا ہو تو ہر طریق سے ہو سکتا ہے۔ اور ٹالنا ہو تو خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ والسلام

(ریویو آف ریلجنز اگست، ستمبر ۱۹۲۸ء)

قرآنِ کریم میں حضرت لوط علیہ السلام کا قصّہ

اس قصہ میں مشکل مقام صرف اُس بات کا جھگڑا ہے ۔جہاں حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹیوں کا ذکر آتا ہے ۔ اور قرآن میں دہ دو جگہ ہے ۔ ایک تو سورۂ ہود میں

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِىْ ضَيْفِىْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِىْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ (ہود : ۷۹،۸۰)

ترجمہ :۔ اور اس کی قوم (غصّہ سے) اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور (یہ پہلا موقعہ نہ تھا) پہلے (بھی) وہ (لوگ نہایت خطرناک) بدیاں کرتے تھے۔ اُس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (جو تمھارے ہی گھروں میں بیاہی ہوئی) ہیں ۔ وہ تمھارے لئے اور تمھاری آبرو کے بچانے کے لئے نہایت پاک (دل اور پاک خیال) ہیں۔ پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میرے مہمانوں (کی موجودگی) میں مجھے رُسوا نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی (بھی) سمجھدار آدمی نہیں ہے

اُنھوں نے کہا کہ تو یقیناً معلوم کر چکا ہے کہ تیری لڑکیوں کے متعلق ہمیں کوئی بھی حق (حاصل) نہیں ہے اور جو (کچھ) ہم چاہتے ہیں اُسے تو جانتا ہے۔

اور دوسری جگہ سورہ حجر میں

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَلَا تُخۡزُوۡنِ ○ قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ○
قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ (الحجر: ۶۹تا۷۱)

ترجمہ: (جس پر) اس نے (اُن سے) کہا (کہ) یہ لوگ میرے مہمان ہیں۔ تم (انھیں ڈراکر) مجھے رُسوا نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور مجھے ذلیل نہ کرو اُنھوں نے کہا کیا ہم نے تمھیں ہر ایرے غیرے کو اپنے پاس ٹھہرانے سے روکا نہ تھا اُس نے کہا (کہ) اگر تم نے (میرے خلاف) کچھ کرنا (ہی) ہو تو یہ میری بیٹیاں (تم ہی میں موجود ہی) ہیں (جو کافی ضمانت ہیں)

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کے ساتھ ہی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں آئے تھے یہاں کچھ بستیاں اس مقام پر تھیں۔ جہاں آج کل بحر مردار یا DEAD SEA واقعہ ہے۔ ان میں سے سدوم ایک بستی تھی جن کے لوگ خاص قسم کی بدکاری میں مبتلا تھے۔ یعنی ان کے ہاں لواطت کا بہت زور تھا۔ وہاں حضرت لوط آباد ہوگئے۔ جب کچھ مدت وہاں رہتے گذری۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو رسول مقرر کر کے تبلیغ اُس قوم کی اُن کے سپرد کر دی۔ انہوں نے جب انہیں ان بدافعال سے منع کیا تو ساری قوم دشمن ہوگئی۔ اول تو یہ وجہ کہ وہ غیر ملک اور غیر قوم کے آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کا جتھا نہ تھا۔ کیونکہ کوئی ان پر ایمان نہیں لایا تھا۔ تیسرے یہ کہ وہ ہر وقت ان کو ناجائز افعال سے منع کرتے رہتے تھے۔ غرض تبلیغ کیا شروع ہوئی روز جھگڑا رہنے لگا۔ پاس اور بھی گاؤں تھے۔ حضرت لوطؑ وہاں کے لوگوں کو بھی تبلیغ کیا کرتے تھے اور وہ لوگ بھی ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ ان باہر کے لوگوں کی آمد و رفت سدوم میں وہاں کے باشندوں کو پسند نہ تھی۔ بلکہ یہی ان کی سب سے بڑی وجہ شکایت لوط علیہ السلام کے خلاف رہا کرتی تھی۔ کہ باہر کے لوگوں کو یہ شخص ہماری بستی میں لاتا ہے۔ اور یہ ہم کو سخت ناگوار ہے۔

ایسا نہ کیا کرے ورنہ ہم اسے نکال دیں گے۔

غرض یہ جھگڑے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جب اتمامِ حجت ہو چکی اور موعود عذاب کا وقت آگیا۔ اور کسی کے ایمان لانے کی امید نہ رہی۔ تو عذاب کے فرشتے متمثّل ہو کر شام کے وقت بطور مہمانوں کے حضرت لوطؑ کے ہاں آئے۔ بستی کے لوگوں کو بھی رات کو پتہ لگ گیا کہ لوطؑ کے ہاں آج پھر کچھ مہمان باہر سے آئے ہیں۔ دن کے وقت تو نو واردوں کے آنے سے وہ ناراض ہوتے ہی تھے۔ یہ رات کو آنا اور پھر شب بھر گاؤں میں ٹھہرنا بس غضب ہی ہو گیا۔ سارے چڑھ دوڑے۔ اور گھر کے آگے جمع ہو گئے۔ غُل مچنے پر حضرت لوط علیہ السلام باہر تشریف لائے۔ دیکھا۔ تو فرمایا بھائیو! خدا سے ڈرو۔ یہ کیا مظاہرہ اور کیسا بلوہ ہے مہمانوں کے سامنے تو خدا کے لئے مجھے ذلیل نہ کرو۔ انہوں نے جواب دیا۔ کیا ہم تمہیں ہر روز منع نہیں کرتے تھے کہ غیر علاقہ کے لوگوں کو یہاں نہ بلایا کرو۔ اب سیدھی طرح یا ان کو ابھی کھڑے کھڑے نکال دو۔ اور خود بھی نکل جاؤ ورنہ ہم دوسری طرح تمہاری خبر لیں گے۔ کیا تمہاری صلاح ہے کہ یہاں کوئی چوری یا ڈاکہ زنی کی واردات ہو جائے۔ غرض جب بہت غُل غپاڑہ ہوا۔ اور مہمانوں کے سامنے بے عزتی کا خوف بھی۔ تو ان روز روز کے لڑائی جھگڑوں اور فسادوں سے بچنے کی ایک ترکیب حضرت لوط علیہ السلام کو سوجھی۔ وہ یہ کہ میں تو غریب الوطن آدمی ہوں۔ میرا ان پر کوئی اثر نہیں۔ ایک شرط پر ان سے صلح کر لیتا ہوں۔ تاکہ امن ہو جائے۔ وہ یہ کہ میں اپنی دونوں نا کتخدا لڑکیوں کی شادی اس غیر قوم کے لڑکوں سے کر دوں۔ تاکہ حقِ قرابت قائم ہو جائے۔ اور ان کو مجھ پر بسبب ان رشتوں کے اعتماد پیدا ہو جائے اور اجنبیت جاتی رہے۔ کیونکہ ایسے رشتے قومی جھگڑوں اور برادری کے فسادوں کے دُور کرنے میں بہت کارگر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی مغلوں اور راجپوتوں نے بھی کیا۔ اور ساتھ ہی غیریت بھی کم ہو جانے کی وجہ سے یہ لوگ غالباً میری نصیحتوں کو بھی سُن لیا کریں گے اور ان پر عمل کریں گے۔ غرض حضرت لوطؑ نے اپنی طرف سے اس مسلسل فساد کے دُور کرنے کی یہ

تجویز پیش کی۔ کہ خدا کے لئے ان جھگڑوں اور ذلیل کارروائیوں اور عداوتوں کو چھوڑ دو۔ میں تو صلح کا خواہاں اور تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اگر مجھے غیر سمجھ کر یہ حرکتیں کرتے ہو تو بہتر ہوگا کہ صُلح کی خاطر ہماری تمہاری آپس میں رشتہ داری ہو جائے۔ دیکھو اس وقت میری دو بیٹیاں جوان موجود ہیں۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ ان سے زیادہ نیک اور پاک لڑکیاں تمہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ ان دونوں کی شادیاں میں تمہارے ہی دو لڑکوں سے کر دیتا ہوں جن سے بھی تم منظور کرو۔ بشرطیکہ تم امن سے رہو اور خوامخواہ روز روز کے فتنے نہ پیدا کیا کرو۔

مگر وہ بھلا کہاں سنتے تھے۔ وہ تو خود لوطؑ کی طرف سے ہی بھرے بیٹھے تھے اور دو ٹوک فیصلہ کرنے آئے تھے۔ کہنے لگے۔ سُنو جی! یہاں تو بیرونی لوگوں کے آنے اور ٹھہرنے کا جھگڑا ہے۔ تمہاری بیٹیوں کا کوئی ذکر اور تعلق نہیں۔ نہ ہمیں ان سے کوئی سروکار ہے۔

مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ (ہود: ۸۰)

ترجمہ:۔ تیری لڑکیوں کے متعلق ہمیں کوئی بھی حق (حاصل) نہیں ہے۔

بلکہ تم جانتے ہو۔ جس لئے ہم آئے ہیں۔ ہم تم سے تعلق بڑھانے اور صلح کرنے نہیں آئے۔ بلکہ اس لئے آئے ہیں۔ کہ اب تم کو یہاں سے نکال کر چھوڑیں

اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ (النمل: ۵۷)

ترجمہ:۔ (اے لوگو) لوط کے خاندان کو اپنے شہر سے نکال دو۔

آج آخری فیصلہ ہمارا تمہارا ہے۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ کہ تمہارے ہاں کچھ آدمی باہر کے اب بھی اندر چھپے بیٹھے ہیں۔

غرض یہ سلسلۂ جنبانی صُلح کی ناکام رہی اور لوط علیہ السلام گھر کے اندر آ گئے اور غالباً حضرت لوط علیہ السلام معہ لواحقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرح گھر کے دوسرے دروازہ یا پچھواڑے سے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اس بستی سے نکل گئے۔ اس پاک جماعت کے نکل جانے کے بعد وہ پہاڑ جس پر سدوم واقعہ تھا۔ اور جو

ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ پھوٹ پڑا اور اس بستی پر آگ اور پتھروں کا مینہ جیسا کہ ایسی آتش فشانی یا VOLCANIC ERUPTIONS کے وقت ہوا کرتا ہے۔ برسا۔ ساتھ ہی زمین بھی شق ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ ایک جھیل وہاں بن گئی جسے آج کل جھیل مُردار کہتے ہیں۔

یہ کُل واقعہ ہے۔ اب بتاؤ۔ کہ سوائے بھلی بات کے اس میں کوئی بُری بات بھی ہے جو لوط علیہ السلام کی طرف منسوب کی جا سکے۔ ان چند باتوں کا واضح کرنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ قرآن کی عبارت سے کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ فرشتے لڑکوں کی شکل میں متمثّل ہو کر آئے تھے وہاں تو مہمان لکھا ہے۔ کہیں لڑکے ہونے کا اشارہ تک نہیں بلکہ تورات میں بھی نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ لڑکوں کو دیکھ کر وہ لوگ جمع ہو کر آ گئے تھے۔ غلط ہے۔ عذاب کے فرشتے تو تحت ہیبت ناک اور غضب والی ڈراؤنی شکلوں والے ہوں گے۔ جیسا کہ غلاظٌ شدادٌ ہوتے ہیں۔ خونخوار آنکھوں اور بڑی بڑی داڑھیوں والے نہ کہ امرد۔ پھر لواطت کا کیا موقع تھا۔ ان کو لڑکا سمجھنا ساری غلطیوں کی جڑ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود قرآن کہتا ہے۔ کہ وہ اس وقت بدفعلی کے ارادہ سے نہیں آئے تھے۔ بیشک یہ ہر جگہ لکھا ہے کہ اس قوم میں یہ بُری عادت رائج تھی۔ مگر کیا یہ عادت آج کل ہندوستان کے بعض شہروں کے لوگوں میں خاص طور پر رائج نہیں ہے؟ مگر پھر بھی ایسے لوگ جتھے باندھ کر اس کام کے لئے ڈھنڈورہ پیٹتے ہوئے لوگوں کے دروازوں پر جمع نہیں ہو جایا کرتے

(روزنامہ الفضل ۲۷ مئی ۱۹۳۸ء)

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوبَ

یعنی

حضرت ایوب کا قِصہ قرآن مجید میں

حضرت ایوب علیہ السلام کا قِصہ قرآن مجید میں صرف دو جگہ اور وہ بھی بہت اختصار کے ساتھ آیا ہے۔ ایک تو سورۃ انبیاء میں دوسرے صٓ میں۔ میں اس جگہ دونوں جگہ کی آیات درج کر دیتا ہوں۔ تاکہ پڑھنے والے کے لئے سہولت ہو اور حوالہ دیکھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

۱۔ سورۃ صٓ کی آیات

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۞ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۞ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۞ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ

(ص ۴۲-۴۵)

ترجمہ :۔ اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر جب اُس نے اپنے رب کو یہ کہتے ہوئے پکارا کہ مجھے ایک کافر دشمن نے بڑی سخت تکلیف اور عذاب پہنچایا ہے (ہم نے اسے کہا کہ) اپنی سواری کو ایڑی مار۔ یہ (سامنے) ایک نہانے والا پانی ہے جو ٹھنڈا بھی ہے اور پینے کے قابل بھی (یعنی صاف ہے) اور اور ہم نے اس کو اس کے اہل بھی دیئے اور اُن جیسے اور بھی اپنے رحم سے دیئے اور عقل والوں کے لئے ایک نصیحت کا سامان بھی بخشا۔ اور (ایوب سے کہا کہ) اپنے ہاتھ میں ایک کھجور کے گچھے دار ٹہنی پکڑ لے اور اس کی مدد سے تیزی کے ساتھ سفر کر (یعنی اس سے مار مار کر سواری کے جانور کو دوڑا) اور حق سے باطل کی طرف مائل نہ ہو۔ ہم نے اس (یعنی ایوب) کو صابر پایا وہ بہت اچھا بندہ تھا۔ وہ یقیناً خدا کی طرف کثرت سے جھکنے والا تھا۔

۲۔ سورۃ الانبیاء کی آیات

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَکَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ (الانبیاء: ۸۴-۸۵)

ترجمہ :۔ اور (تو) ایوب کو (بھی یاد کر) جب اس نے اپنے رب کو پکار کر کہا کہ میری حالت یہ ہے کہ مجھے تکلیف نے آپکڑا ہے اور اے خدا! تُو تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پس ہم نے اُس کی دُعا سُنی اور جو تکلیف اُس کو پہنچی ہوئی تھی اُس کو دُور کر دیا

اور اس کو اس کے اہل (و عیال) بھی دیئے اور اُن کے سوا اپنی طرف
سے رحم کرتے ہوئے اور بھی دیئے اور ہم نے اس واقعہ کو عبادت گزاروں
کے لیے ایک نصیحت کا موجب بنایا ہے ۔

پس کُل یہ ذکر آنجناب کے قصہ کا قرآن مجید میں آیا ہے ۔ اس میں سے سورۃ انبیاء
کی آیات تو بالکل سادہ اور بغیر کسی جھگڑے والی بات کے ہیں لیکن سورۃ صٓ کی ان آیات
کے متعلق اس قدر مشکلات مفسرین نے ڈال دی ہیں کہ خدا کی پناہ ۔ یہاں تک کہ معاملہ انبیاء
کی توہین اور اللہ تعالیٰ کی پاک صفات پر حملہ کی نوبت تک پہنچ گیا ہے ۔ اس قصہ کو ایسا
پیچیدہ کر دیا ہے کہ انسانی عقل کو ان آیات کے الفاظ سے دھکا دیتے ہیں جو نہایت
سادہ اور قابلِ قبول واقعات پر مشتمل ہے رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ مُفرحات کی حد
تک پہنچ گئی ہے ۔ نعوذ باللہ اور کس وجہ سے ؟ صرف عجوبہ پسندی کی وجہ سے جو کہ تمام
مفسرین نے اسرائیلی انبیاء کے لئے ضروری سمجھی ہے ۔ اگر ان آیات میں نشان شدہ آیات
کے معنی لُغت اور علم اور عقل کے مطابق کئے جاتے تو یہ نوبت نہ پہنچتی ۔

صحیح معنے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر مشہور معنی پُرانے مفسرین کے
بیان کئے جاویں ۔ اور اس کے بعد ان آیات کی حقیقت کو واضح کیا جاوے ۔ تاکہ سادہ اور
صاف معنی لوگوں کی سمجھ میں آجائیں ۔ سو وہ مشہور قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے ۔

حضرت ایوب علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر تھے ۔ اُن پر
ایک دفعہ بیماری آئی اور ایسی سخت آئی کہ تمام جسم پر زخم ہو کر کیڑے پڑ گئے ۔ حتّٰی کہ شہر
والوں نے ان کو شہر سے باہر نکال دیا ۔ اٹھارہ سال وہ جذام میں مبتلا رہے ۔ ان کی انگلیاں
وغیرہ سب جھڑ گئیں ۔ اور سب دوستوں، رشتہ داروں اور رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا ۔
صرف ایک بیوی رہ گئی ۔ جو شہر سے اُن کے لئے کھانا لاتی تھی ۔ ایک دن اس عفیفہ کو جو
ایک دو گھنٹہ کھانا لانے میں دیر ہو گئی ۔ تو حضرت ایوبؑ کو اس کی عفت پر شُبہ ہو گیا اور

ناراض ہو کر کہنے لگے کہ میں اچھا ہو گیا۔ تو خدا کی قسم تجھے سو لکڑیاں ماروں گا۔ (جو نعوذ باللہ زانی اور زانیہ کی سزا ہے) خیر اٹھارہ سال بعد خدا نے فرمایا کہ فلاں جگہ لات مار۔ انہوں نے ماری۔ ایک چشمہ وہاں سے پھوٹ نکلا۔ آپ نے اس کا پانی پیا اور نہائے تو فوراً اچھے ہو گئے۔ اچھے ہو کر قسم کے متعلق خدا سے پوچھا۔ خدا نے کہا۔ کہ یہ عورت بے گناہ تو ہے۔ مگر چونکہ تو نے قسم کھائی تھی اس لئے سو تیلیاں جمع کر کے جھاڑو کی طرح بنا کر اس بے گناہ کی کمر پر مار۔ تاکہ تیری قسم پوری ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی مری ہوئی اولاد کو پھر زندہ کیا۔ اور مزید اولاد بھی دی (یہ قصہ میں نے ایک قرآن کے حاشیہ پر سے لیا ہے)۔

یہ ہے گت جو ہمارے اہلِ قلم مفسرین نے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پاک منش بیبیوں کی بنائی ہے۔ اور جس پر اُن کو فخر بھی ہے۔ اور یہ ہے ان کے نزدیک ایک نبی جو تھوڑی سی دیر ہو جانے پر اپنی بیوی پر فوراً بدکاری کی تہمت رکھتا ہے اور بے دیکھے محض ظن پر قسم کھاتا ہے۔ کہ ضرور تجھے سو لکڑیاں ماروں گا (یعنی زانیہ کو سزا دوں گا) ذرا مجھے اچھا ہو لینے دے۔ اور یہ ہے خدا ان کا جو بجائے اس پاک دامن کو عفت مآب کہنے کے اور اپنے پیغمبر کو بدظنی سے روکنے کے خود ایک بیگناہ کو سو لکڑیاں مارنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور سزا کو کم کرنے کے لئے یہ عجیب حیلہ سکھاتا ہے کہ ان سب لکڑیوں کو ایک جھاڑو کی شکل میں باندھ لے۔ تاکہ ایک بے گناہ قربانی مجسم بیوی کو تھوڑی چوٹ لگے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن

اس مختصر بیان کے بعد اب میں ان آیات کا صاف اور دل لگتا مطلب بیان کرتا ہوں۔ اور اگر آپ کو پسند آئے۔ تو خاکسار کے لئے دُعا فرمائیں۔ ورنہ پھر اپنے لئے کوئی اور مطلب تلاش کریں۔ جو اللہ تعالیٰ کی بے عیب ذات اور اس کے رسولوں کے تقدس اور عقل اور سُنت الٰہی کے مخالف نہ ہو۔

سب سے پہلے تو میں چند باتوں کی تردید کروں گا

(۱) اوّل تو یہ کہ انبیاء علیہ السلام کو کبھی ایسی خبیث بیماری نہیں ہوتی جن کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کریں۔ کیونکہ پھر وہ فرضِ رسالت ادا نہیں کر سکتے۔ نعوذ باللہ جذام ہونا یا کیڑے پڑنا ان کے لئے ایک ایسی بیماری ہے جس سے لوگ یقیناً ان سے بھاگنے لگیں گے۔ پس یہ امر محال ہے۔ اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے[۱]۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ اٹھارہ سال یا سالہا سال کے ایک نہایت لمبے عرصہ تک ایسے بیمار نہیں ہو سکتے کہ فرائضِ رسالت نہ ادا کر سکیں۔ اگر ایوب علیہ السلام ۱۸ سال کوڑی پر شہر سے باہر پڑے رہے۔ تو انہوں نے کیا تبلیغ اور کیا تعلیم دی ہو گی اور خدا کی کون سی باتیں لوگوں تک پہنچائی ہوں گی۔ پس نہ ان کو جذام ہوا نہ کیڑے پڑے۔ نہ بہت لمبی مدت تک بیکار پڑے رہے۔ یہ سب لغویات ہیں جن کو عقلِ سلیم اور تعلیمِ اسلامی دھکے دیتی ہے۔ اصل صرف اتنی ہے کہ وہ کچھ مدت کے لئے بیمار ضرور ہوئے تھے۔ اور اس بیماری کی ان کو سات روز جیسا کہ توریت میں مذکور ہے نہایت سخت تکلیف بھی رہی تھی۔ (ایوب ب ۲۔ ۱۳) مگر نہ ان کے ہاتھوں پیروں اور زبان نے جواب دے دیا تھا اور نہ اُن کو کوئی قابلِ نفرت یا بدبودار بیماری تھی۔ جیسا کہ ان آیات

---

[۱] ایک دفعہ حضور نے فرمایا۔ اور مَیں نے اپنے کان سے سنا کہ خدا تعالیٰ چوڑھے کو نبی نہیں بناتا۔ کیونکہ لوگوں پر اس کی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ وہ اُسے کہیں گے۔ کل تو ہمارا پاخانہ اٹھاتا تھا۔ اور آج (اس سے آگے الفاظ یاد نہیں رہے) میں کہتا ہوں نبی خاندانی، خوبصورت اور عقلمند ہونا چاہیئے۔ حضور کی تقریر کا مطلب اسی قسم کا تھا۔ م م

سے ہی ثابت ہو جائے گا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ حضرت ایوبؑ کے ذمہ قرآن مجید کوئی ایسی بات نہیں لگاتا کہ ان کو ان کی بیوی کی طرف سے کبھی کوئی بدظنی ہوئی ہو۔

۴۔ نہ یہ بیان کرتا ہے کہ انہوں نے سو لکڑیاں مارنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ صرف یاروں کی قصہ خوانی ہے یا یہودیوں کی لغویات جن کو سُن کر مفسرین اسلامی مسحور ہو گئے اور عجوبہ سمجھ کر فوراً رونقِ تفسیر کے لئے ان کو داخلِ کتب کر لیا۔ قرآن مجید نے تو یہ اصول مقرر فرمایا ہے۔ الطیبات للطیبین ۔ والطیبون للطیبات۔ پس تمام پیغمبروں حتیٰ کہ لوطؑ اور نوحؑ کی کافر اور مخالف بیبیاں بھی خواہ وہ سلسلۂ حقہ کی کتنی ہی مخالف ہوں مگر بدچلن اور بدکار نہیں ہو سکتیں چہ جائیکہ ایوبؑ کی۔

ایوبؑ کی بیماری

اب میں اصل قصہ کو جس طرح کہ میں اسے قرآنی الفاظ سے سمجھا ہوں اور دوستوں کے سامنے رکھتا ہوں۔ وباللہ التوفیق ۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ حضرت ایوبؑ ایک دفعہ بیمار ضرور ہوئے تھے اور بیماری بھی بہت تکلیف دہ تھی ۔ غالباً پھوڑے پھنسیاں یا اغلباً سخت قسم کی خارش ہوگی جو بہت ایذا دیتی ہے اور کچھ مدت تک برابر چلتی ہے اور درمیان میں بعض نہایت سخت تکلیف کے دن بھی آتے ہیں۔ جس میں بے قراری ، بے خوابی ، درد وغیرہ سب عوارض موجود ہو جاتے ہیں۔ اور مشہور بھی یہی ہے کہ ان کو کوئی جلدی بیماری تھی اور تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بھی بطور علاج ان کو ایک چشمہ میں نہانے اور اس کا پانی پینے کا حکم دیا تھا اس سے واضح ہے کہ جلدی بیماری ہی تھی اور تورات میں بھی لکھا ہے کہ اُسے جلتے ہوئے چھوڑے ہوئے اور وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنے تئیں کھجلانے لگا۔ اور راکھ پر بیٹھ گیا۔

(ایوب باب ۲ آیت ۸) حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو بھی ایک دفعہ خارش کا مرض ہوگیا تھا۔ یہ ۱۸۹۲ء کے قریب قریب کا واقعہ ہے اور کچھ مدت برابر حضور کو اس کی تکلیف رہی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی یہ بیماری زیادہ تکلیف دہ تھی۔ جیسا کہ ان کی دُعا سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء: ۸۴)

ترجمہ:۔ کہ میری حالت یہ ہے کہ مجھے تکلیف نے آپکڑا ہے اور اے خدا! تُو تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے

پس نصب، ضُرّ اور عذاب کے الفاظ سے جسمانی بیماری ہی کی تکلیف معلوم ہوتی ہے۔

بیماری کے لئے ایوب کی دُعا

جب بیماری نے بہت تکلیف دی تو حضرت ایوبؑ نے دُعا کی کہ

رَبَّہٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (صٓ: ۴۲)

یعنی اے میرے رب مجھے شیطان نے دُکھ اور عذاب میں ڈال دیا ہے مطلب یہ ہے کہ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہوتا جاتا ہے۔ تو ہی اس مصیبت کو دُور کر۔ اس آیت پر آگے چل کر بھی بحث ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بیماری کا علاج

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس کا علاج بتاتے ہیں

۱۔ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۲۔ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ ۳۔ وَّشَرَابٌ

ترجمہ:۔ (ہم نے اُسے کہا کہ) اپنی سواری کو ایڑی مار۔ یہ (سامنے) ایک

نہانے والا پانی ہے جو ٹھنڈا بھی ہے اور پینے کے قابل بھی (یعنی صاف ہے)
اور آگے ایک جملہ معترضہ جو قرآن مجید کی عام عادت ہے لاکر چوتھا جزاس نسخہ کا بتایا۔
۴۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ (ص: ۴۵)
ترجمہ: اور (ایوب سے کہا کہ) اپنے ہاتھ میں ایک کھجور کی گچھے دار ٹہنی پکڑ لے اور اس کی مدد سے تیزی کے ساتھ سفر کر (یعنی اس سے مار مار کر سواری کے جانور کو دوڑا۔
یہ چار جسمانی علاج اس مرض کے خدا نے ان کو بتائے۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ پہلا علاج

رَكَضَ کے مشہور لغوی معنے دوڑنا اور تیز چلنا بھی ہیں۔ اور سب لغات میں لکھے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی دوسری جگہ یہی معنے کئے ہیں چنانچہ فرمایا
لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ (انبیاء: ۱۴)
ترجمہ: (تب ہم نے کہا) دوڑو نہیں، اور ان چیزوں کی طرف جن کے ذریعہ سے تم آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔
پس حکم یہ ہوا۔ کہ اس بیماری کے لئے تم تیز قدم یا دوڑ کر چلا کرو۔ اگر صرف اُرْكُضْ ہوتا تو شبہ پڑ سکتا تھا کہ سواری پر سیر کیا کرو۔ گھوڑا دوڑایا کرو۔ بیل گاڑی پر ہوا خوری کیا کرو۔ مگر بِرِجْلِكَ کہہ کر واضح کر دیا کہ ان میں سے کوئی بات بھی کہنے والے کی مُراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اپنے پیروں سے یعنی پیدل سیر کیا کرو۔ پیدل تیز رفتاری سے چلا کرو۔ کیونکہ نہ صرف اس مرض کے لئے تازہ ہوا اور غذا ضروری ہے۔ بلکہ پیدل چلنا بھی ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف علاج کی نوعیت معلوم ہوگئی بلکہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایسے بیمار تھے کہ شدت مرض کے چند دنوں کے بعد وہ چل پھر سکتے تھے۔ اور ان کی انگلیاں

اور پیر اور ٹانگیں گل سڑ نہیں گئی تھیں۔ بلکہ وہ تیز قدم روزانہ سیر کرنے کے قابل تھے کیونکہ ایسی سیر بہت فرحت اور شگفتگی پیدا کرتی ہے اور پسینہ آکر ردّی مواد جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔

دوسرے معنے اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حکم خداوندی ہے کہ فلاں جگہ جا کر ٹھوکر مارو۔ یا ایڑی مارو۔ تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹے گا۔ تم وہی پانی پینا اور اسی سے غسل کرنا۔ ہمیں ان معنوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی عصا مار کر پہاڑ میں سے ایک چشمہ نکالا تھا۔ اور سرسبز پہاڑی ملکوں میں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ البتہ ایسی جگہ کا تعین کر دینا خدا کے فضل اور وحی الٰہی کے غیب سے ہوا تھا۔ اب آپ کی مرضی ہے۔ خواہ پہلے معنے پیدل سیر و ورزش کے لیں۔ خواہ ٹھوکر مار کر چشمہ نکلنے کے لیں ہمیں کوئی انکار نہیں۔ دوسری صورت میں وہ چشمہ اسی طرح ان کی ٹھوکر سے پھوٹ کر نکلا جس طرح موسیٰؑ یا اسمٰعیلؑ نے نکالا تھا اور پہلی صورت میں خدا تعالیٰ نے ان کو ایک چشمہ کا پتہ دیا کہ فلاں جگہ واقع ہے اس کا پانی پیو اور اسی کے پانی سے نہاؤ اور روز وہاں پیدل ڈبل مارچ کرتے جایا کرو۔ اور آیا کرو۔ یہ تمہارا علاج ہے

هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ علاج نمبر ۲ و ۳

یہ چشمہ تمہاری بیماری کے لئے شفا ہے۔ اس میں نہاؤ اور اس کو پیو۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چشمہ گندھک وغیرہ اجزاء سے مرکب تھا۔ جو جلدی بیماریوں اور خارش وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔ اب بھی دنیا کے تمام ملکوں میں جلدی امراض کے لوگ ایسے چشموں پر جاتے اور وہیں نہاتے اور انہی کا پانی پی کر شفا پاتے ہیں۔ پس ایک علاج سیر پیدل دوسرا علاج غسل اس چشمہ کے پانی سے اور تیسرا علاج اس پانی کو پینا تھا۔ آگے چل کر چوتھا علاج فرمایا یعنی وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ علاج نمبر ۴

یعنی اپنے ہاتھ میں ایک ضِغْث لے ضِغْث کے معنی لغت میں ہیں سبز اور خشک گھاس یا سبز اور خشک ٹہنیوں یا شاخوں کا گٹھا۔ مثلاً چند سبز شاخیں لے کر خشک گھاس یا ٹہنی سے اس کو اس طرح باندھ لیا جائے کہ وہ جھاڑو یا چَوری کی طرح ایک مکھیاں اُڑانے والی چیز بن جائے۔ پس جب زخموں یا پھوڑے پھنسیوں کا علاج ورزش سے اور غسل سے بطور دوا سے ہی ہوا۔ پانی پینے سے ہوا تو ضروری ہے کہ جسم کے زخموں کی مکھیوں، مچھروں کیڑوں اور ان آفتوں سے بھی پوری حفاظت کی جائے تاکہ مکھی کے بیٹھنے کی وجہ سے اس میں کیڑے وغیرہ نہ پڑ جائیں اور یہ چَوری یا ہری شاخیں ڈریسنگ کا کام کریں۔

خُذْ بِيَدِكَ سے معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ اُن کے ہاتھ ایسے خراب نہیں ہو گئے تھے کہ کیڑے پڑ گئے ہوں یا انگلیاں جھڑ گئی ہوں۔ بلکہ ایسے تھے کہ وہ ان سے دن کو جسم پر چَوری چھیلنے کا کام لے سکتے تھے۔ فَاضْرِبْ بِهٖ یعنی اس چوری کو اپنے ہاتھ سے ہلایا کر تاکہ زخم یا پھوڑے حشرات الارض سے محفوظ رہیں۔ ضَرَبَ کے معنے حرکت کرنا لغوی طور پر بھی ہیں۔ اور ضَرَبَ کا لفظ تو عربی میں ہر فعل کی جگہ آسکتا ہے اور اردو میں ہم یوں ترجمہ کر سکتے ہیں کہ اپنے ہاتھ میں ایک مُٹھا شاخوں کا لے کر ہلایا کر یا اس سے مکھیاں وغیرہ ہٹایا کر۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہوا۔ کہ ہرگز یہاں یا کسی اور جگہ مارنے کا اشارہ یا کنایہ بیوی کی طرف نہیں۔ بلکہ ایوبؑ کے سارے قِصّہ میں کہیں ان کی اہلیہ کا مذمت کے ساتھ ذکر نہیں۔ نہ یہ ذکر ہے کہ سَو عدد شاخیں لے۔ نہ کہیں ان کے اس قسم کھانے کا ذکر ہے کہ میں اپنی بیوی کو کسی قصور کی وجہ سے اچھا ہو کر سزا دوں گا۔ بلکہ ایوب کے قِصّہ میں صرف

ان کو بیماری کے علاج کا ذکر ہے۔ اور ایسا علاج ہمارے ملک میں بھی رائج ہے۔

پس جسمانی علاج تو یہاں ختم ہوا۔ یعنی

۱۔ سیر کرو مگر پیدل

۲۔ فلاں چشمے کے پانی سے نہایا کرو۔

۳۔ اسی چشمہ کا پانی پیا کرو

۴۔ پھوڑے پھنسیوں یا زخموں سے مکھیوں اور حشرات الارض کو ہٹانے کے لئے ٹہنیوں کی ایک چوری بنالو۔ اور اس کو اپنے جسم پر جھلا کرو۔

فاضرب بہ کا صرف یہ مطلب ہے کہ ان شاخوں یا جھاڑو کے ساتھ مار۔ کسے مار؟ یہ محذوف ہے۔ اور آپ نے اس محذوف سے مراد ان کی صورت لی ہے۔ جس کا نہ کوئی ذکر ہے نہ مناسبت ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ جس چیز کو مارنا ہے وہ محذوف ہے۔ مگر وہ عورت نہیں ہے بلکہ شاخوں اور چوری کے لحاظ سے وہ مکھیاں، مچھر، حشرات الارض وغیرہ ہیں جو زخموں اور پھوڑے پھنسیوں کو گندہ اور خراب کرتے ہیں۔ پس معنے یہ ہوئے کہ اس شاخوں کے مُٹھے سے ان نقصان دہ چیزوں کو مارا اڑایا کر۔

ولاتحنث

لُغت میں لاتحنث کے معنی قسم نہ توڑنے کے بھی ہیں۔ اسی لئے مفسروں نے فرض کرلیا کہ انہوں نے ضرور قسم کھائی ہوگی۔ پھر خدا نے ان کو ایک حیلہ سکھایا۔ کہ سو چھڑیوں کا ایک مُٹھا بنا کر صرف ایک دفعہ اس سے اپنی بیوی کو مارنا کہ قسم کا عہد پورا ہو جائے۔ اور اگرچہ وہ بے گناہ ہے۔ مگر تو ضرور اس کو ایک دفعہ سو دُرّے لگا ہی دے۔ اگرچہ تیرا ظن غلط ہی ہے۔ (عہد کا پُورا کرنا دوسرے کے فائدہ کے لئے تھا مگر اب علماء ظواہر نے لفظ عہد کو لے لیا ہے۔ خواہ اس سے دوسرے کو نقصان ہی پہنچے۔ مگر تاکید یہ ہے کہ

عہد کو ضرور پورا کرو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ)

واضح ہو کہ حِنۡث کے معنی جس طرح قسم توڑنے کے ہیں۔ اسی طرح تمام لغات میں اس کے دوسرے معنے حق سے باطل کی طرف جھکنے اور میلان کرنے کے بھی آئے ہیں۔ اور مفرداتِ راغب نے حنث کے معنی ذنب یعنی گناہ کے کئے ہیں۔ خود قرآن مجید نے بھی اپنی ایک اور آیت میں یہی معنے کئے ہیں

وَکَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ (الواقعہ : ۴۷)

یعنی وہ بڑے گناہ پر اصرار کرتے تھے۔

اور حافظ روشن علی صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے اپنے ترجمہ میں یہاں حِنۡث کے معنی گناہ ہی کے کئے ہیں۔ پس ولا تحنث کے معنی ہوئے کہ باطل یعنی غلطی کی طرف مائل نہ ہو اور گناہ کی بات نہ کر۔ قسم توڑنے کے معنے کی نہ سیاق وسباق اجازت دیتا ہے۔ نہ کوئی اور وجوہات۔

ہاں آپ اب مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ایوبؑ کو خدا نے کیوں فرمایا کہ دیکھ غلطی نہ کر ذنب نہ کر۔ گناہ اور باطل کی طرف مت جھک۔ تو اس کی وجہ کیا ہے۔

سُنیئے اب میں اس کی وجہ عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اجسام کی تربیت کرتا ہے۔ اسی طرح اخلاق اور رُوح کی تربیت بھی اپنے کلام اور الہام سے کرتا رہتا ہے۔ جسمانی نسخہ کے چار اجزاء تو ان کو خدا نے بتائے۔ مگر ایک غلطی روحانی اُن سے سرزد ہو چکی تھی۔ اس کی اصلاح اور درستگی بھی نہایت ضروری تھی جس پر ان کو متنبہ کیا گیا اور وہ غلطی یہ تھی کہ ایوبؑ نے دُعا کرتے ہوئے کہا تھا کہ

اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ (صٓ : ۴۲)

یعنی شیطان نے مجھ کو ایذا اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ یہ دُعا اپنے ایک نبی کے مُنہ سے سُنی ایسی نامناسب اور حیرت انگیز تھی۔ کہ خدا تعالیٰ نے انہیں فوراً منع فرمایا

کہ آئندہ کبھی ایسی بات مُنہ سے نہ نکالنا۔ کیا ہمارے پیارے بندوں خصوصاً نبیوں پر عذاب بھی آسکتا ہے۔ کیا شیطان ان کو مَس کر کے بیماری اور ایذا لگا سکتا ہے؟ ابنیاء پر خواہ کتنی سخت بیماریاں آئیں وہ کبھی عذاب کا رنگ نہیں رکھتیں۔ بلکہ ہمیشہ بطور اصطفاء کے آتی ہیں۔ اور شیطان کا نام تو ایسی جگہ بالکل ہی غیر موزوں اور نامناسب ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: ۴۳)

ترجمہ: جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا کبھی تسلط نہیں ہوگا۔

اور فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ: ۱۹)

ترجمہ: پھر وہ تمہارے قصوروں کے سبب سے تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے۔

اور لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۳۹)

ترجمہ: انھیں نہ کوئی (آئندہ کا) خوف ہوگا اور نہ وہ (سابق کوتاہی پر) غمگین ہوں گے۔

اور اِنِّیْ لَایَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ (النمل: ۱۱)

ترجمہ: میں وہ ہوں کہ رسول میرے حضور میں ڈرا نہیں کرتے۔

وغیرہ آیات کے بالکل برخلاف اس دُعا میں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اگر رسولوں پر عذاب آنے لگے تو پھر امان ہی اُٹھ جائے چنانچہ آپ قرآن مجید کو اوّل سے آخر تک پڑھ جائیں۔ عذاب یعنی سزا کا لفظ سینکڑوں مقامات (قریباً ۳۱۵) جگہ میں استعمال ہوا ہے، مگر ایک جگہ بھی وہ رسل۔ ابنیاء۔ اولیاء بلکہ مومنوں تک کے لئے بھی نہیں آیا۔ سو یہ وہ کمزوری یا حِنث یا ذنب یا غلطی تھی۔ جو ایوبؑ سے سرزد ہوئی۔ پس جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کا روحانی علاج بھی کر دیا کہ دیکھ آئندہ پھر ایسا کلمہ مُنہ پر نہ لائیو۔ یہ بہت گناہ کی بات ہے۔ آئندہ میں تجھ سے ایسی بات نہ سنوں۔ کہ مجھ پر عذاب نازل ہو رہا ہے یا شیطان کا اثر مجھ پر غالب آگیا

ہے۔ ہرگز ہرگز نہیں ۔

واضح ہو کہ بموجب اسلامی عقائد کے انبیاء بلکہ صدیقوں کو بھی مسّ شیطان نہیں ہوتا۔ جیسے کہ احادیث میں آیا ہے کہ عیسٰیؑ اور اس کی ماں مسّ شیطان سے پاک تھیں یعنی عیسٰی بسبب نبی ہونے کے اور مریم بسبب صدیقہ ہونے کے مسّ شیطان سے محفوظ تھے۔ اور پھر ایوب کیوں نہ ہوتے۔ دوسرے یہ کہ نصب اور عذاب کا واقع ہونا تو خدا کے دشمن لیکھرام جیسوں کے لئے مناسب تھا۔ جیسا کہ الہام عجل جسد له خوار له نصب وعذاب ۔ حضرت مسیح موعود کی وحی اس کے بارے میں ہے۔ اب اگر ایک نبی انہی الفاظ کو اپنے اوپر چسپاں کرنے لگے تو اللہ میاں کو بُرا لگے یا نہ لگے ۔

چنانچہ حضرت ایوبؑ نے فوراً اس غلطی سے توبہ کی اور خدا نے بھی اُن کی تعریف فرمائی ۔ کہ وہ اوّاب یعنی فوراً رجوع کرنے والا تھا اپنی غلطی سے

اب اس رجوع کا ثبوت بھی قرآن مجید سے ہی پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ اس توبہ کے بعد پھر بھی حضرت ایوبؑ برابر اپنی بیماری کے لئے دُعا کرتے رہے۔ مگر وہ دُعا یہ تھی ۔

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (انبیاء ۸۴)

یعنی مجھے بیماری کی تکلیف ہے پس اے اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ اس تکلیف کو تو مجھ سے دُور کر دے۔ یعنی انہوں نے اپنی دُعا کے الفاظ بالکل تبدیل کر دیئے۔

پس اصل واقعہ تو یہاں تک ختم ہے مگر اس ضمن میں ایک دو باتیں بیان کرنی ضروری ہیں ۔

۱۔ اوّل تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی تمام صفات قرآن مجید میں بیان کی ہیں۔ اور اکثر کی عملی تفصیل بھی دی ہے۔ اسی طرح صفتِ شفاء کا ذکر اس جگہ اور بعض اور جگہ کیا ہے۔ یعنی خدا کے دوستوں اور پیاروں کو اس کی طرف سے نسخے اور دوائیں اور ترکیبیں بیماری دفع کرنے کی بھی بتائی جاتی ہیں۔ جس طرح کہ یہاں چار تجویزیں بتائی گئیں۔ اسی طرح شہد کو بھی شفا کہا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک بیماری میں آپ کو

بعض ہدایتیں دی گئیں اور معوذتین کا ورد بتایا گیا۔ اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو "خاکسار پیپرمنٹ" اور "ھذا علاج الوقت والتدبیبی" کا الہام ہوا۔ نیز ایک دفعہ دریا کے پانی اور ریت کی مالش بطور علاج بتائی گئی تھی۔ اسی طرح روحانی غلطیوں کی اصلاح کے لئے بھی حضرت نوح سے لے کر حضرت احمدؐ تک تمام انبیاء کو ان کی غلطیوں اور لغزشوں پر تنبیہ ثابت ہے۔ اور دراصل تنبیہ کیا۔ یہ تو ایک الہامی تربیت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے دوستوں کی کرتا ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض ان آیات کے متعلق یہ ہو سکتا ہے کہ علاج کے آدھے اجزا ایک طرف ہیں اور آدھے دوسری طرف بیچ میں ایک آیت وَوَهَبْنَا لَهٗ اَهْلَهٗ الی کیوں رکھ دی گئی۔ سو یہ بات بھی قرآنی دستور اور آئین کے برخلاف نہیں ہے۔ بارہا ایک مضمون کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ تو ایک آیت بظاہر تسلسل کو توڑنے والی اندر ڈال کر پھر فوراً معاً بعد وہی مضمون آگے شروع کر دیا ہے۔ مثلاً طلاق کے مسئلہ میں جہاں پہلے بھی یہ مسئلہ ہے اور پیچھے بھی بیچ میں یہ مضمون ڈال دیا کہ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ: ۲۳۹)

ترجمہ: تم (تمام) نمازوں کا اور (خصوصاً) درمیانی نماز کا پورا خیال رکھو۔ اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔

خصوصاً قصص قرآنی میں تو ایسا بہت ہوا ہے۔ کہ تسلسل بسبب کسی آیت کے ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی آیت حقیقتہً جملہ معترضہ کے طور پر ہوتی ہے۔ سو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کو اس کی دعا کے بعد نسخہ بتایا۔ بیچ میں اپنے فضل اور انعام کا ذکر کر دیا۔ پھر وہی مضمون علاج کا شروع کر دیا۔ سو واقف حال لوگوں کے نزدیک یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ بلکہ کلام الہٰی کا خاصہ ہے کہ وہ قصہ بیان کرتے ہوئے بیچ میں صفاتِ الہٰی اور

انعاماتِ الٰہی وغیرہ کا ذکر برابر کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے سارے قصوں کا حقیقی مقصود یہی چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک دلچسپ تفاول

۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں مَیں نے اخبار "الفضل" میں بہت سے مضامین قرآن مجید کی آیات خصوصاً قصص القرآن کی تفصیلات اور حقیقت کے متعلق لکھے تھے اور محض خدا کے فضل سے بعض باتیں اس زمانہ میں ان قصص کے متعلق مجھ پر کھلی تھیں۔ مگر ان دنوں میں حضرت ایوبؑ کا یہ واقعہ مجھ پر منکشف نہیں ہوا تھا۔ ایک دن میں نے بیتِ مبارک میں خاص اسی کے لئے بہت دُعا کی جب دُعا کر کے اُٹھا۔ تو بیت کے جنوبی دروازوں میں سے مجھے دفتر ریویو آف ریلیجنز کی سیڑھیاں جو اس زمانہ میں باہر بازار کی طرف ہوا کرتی تھیں۔ نظر آئیں۔ اور میں نے ان سیڑھیوں پر ایک شخص کو چڑھتے دیکھا۔ جس کی بغل میں ایک جھاڑو تھی۔ معاً مجھے بطور تفاول کے یہ خیال آیا کہ انشاء اللہ یہ ضغث یعنی جھاڑو والا قصہ کسی وقت ضرور میری سمجھ میں آجائے گا۔ چنانچہ اس واقعہ پر کئی سال گزر گئے کہ پرسوں رات یہ مضمون قصہ ایوبؑ کا مسلسل میرے ذہن میں جس طرح میں نے اس کو یہاں لکھا ہے آگیا۔ اور میں نے اُسے احباب کے سامنے پیش کر دیا۔ یقین ہے اکثر دوست بھی اسے پسند فرمائیں گے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اور میرے لئے دعائے خیر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزا دے۔

آپ خود غور فرما کر دیکھ لیں کہ قصہ کس قدر سادہ اور روحانیت سے پُر ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کا ایک نشان ہے۔ مگر عجوبہ پسندوں کے طفیل کیسا تماشہ بن گیا ہے۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ ایک نبی بیمار ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنے فضل سے شفایابی کی تدبیریں بتائیں وہ اچھا ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اسے بیماری سے اچھا کیا

بلکہ اس کے صبر کی وجہ سے اس کے مال اور اہل و عیال میں بے حد برکت دی اور جب اُس نے دُعا مانگتے ہوئے غلطی سے بیماری کو عذاب سمجھا تو اسے اس بات سے منع فرمایا۔ اس نے بھی فوراً توبہ کی اور مناسب الفاظ دُعا کے لیے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ صرف اتنی سی بات تھی جسے الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ بنا کر لوگوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہماری چشم دید بات ہے کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی میاں عبدالرحیم خان پسر حضرت نواب محمد علی خان کے لئے دُعائے صحت کی تھی اور جب الہاماً معلوم ہوا کہ معاملہ تقدیر مبرم اور ہلاکت کا ہے۔

ایک آیت کی مشکلات کا حل

قرآن مجید میں ایک آیت آتی ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُورِیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ

(انبیا : ۳۸)

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی رکھی گئی ہے۔ میں عنقریب تم کو اپنے نشانات دکھاؤں گا۔ پس اے انسانو تم جلدی مت کرو۔ یہ آیت مجھے مدتوں دل میں کھٹکتی رہی اور تعجب اس بات پر تھا کہ اللہ تعالیٰ خود ہی تو فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کی فطرت میں جلد بازی رکھی ہے۔ پھر خود ہی نصیحت فرماتا ہے کہ میں تم کو اپنے نشانات دکھاؤں گا مگر دیکھنا جلد بازی نہ کرنا۔ پہلے خود ایک خاصیت انسان کی طبیعت اور فطرت میں رکھ دی پھر نصیحت کر دی۔ کہ دیکھنا اس فطرت کا اظہار نہ کرنا یہ تو وہی بات ہوئی کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ام
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پس انسان کو تعجیل پر مجبور کر کے اس کے برخلاف اس سے مطالبہ کرنا یہ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ بہت سوچا مگر کوئی حل اس کا سمجھ میں نہ آیا۔ کچھ مدت گذری کہ ایک دوست نے جمعہ کے دن مسجد اقصیٰ میں خطبہ سے پہلے مجھ سے کچھ باتیں کیں۔ ان کی باتوں سے یکدم میرے ذہن میں اس اعتراض کا جواب آگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ کہ ان کی وجہ سے میرا مدت کا پھنسا ہوا مسئلہ حل ہو گیا اور وہ اس طرح۔

فرض کرو اس دوست کا نام زید تھا۔ تو معاملہ یہ تھا کہ زید کے لڑکے کی ایک جگہ

شادی ہوگئی۔ زید نے کہا کہ جلسہ ۴۲ء پر رخصتانہ ہوجائے۔ لڑکی کے باپ بکر نے کہا کہ ہم اتنی جلدی انتظام نہیں کر سکتے۔ اگلے جلسہ ۱۹۴۳ء پر رخصتانہ ہونا چاہیئے۔ غرض اس طرح بحث وتمحیص کے بعد فریقین ایک درمیانی راستہ پر راضی ہوگئے۔ یعنی یہ کہ کانفرنس ۱۹۴۳ء کے موقع پر اپریل میں رخصتانہ ہوجائے۔ اور ان میں اس پر عہد وپیمان ہوگیا۔ زید و بکر دونوں چونکہ میرے بھی دوست تھے۔ اس لئے اس شادی کی باتوں کا ذکر وہ مجھ سے بھی کرتے رہتے تھے۔ فروری ۴۳ء کا ذکر ہے۔ کہ زید جو لڑکے کے باپ تھے۔ انہوں نے مجھے ایک جمعہ کے دن مسجد اقصیٰ میں کہا۔ کہ میرا لڑکا جس کا نکاح ہوا ہے۔ وہ رخصت لے کر قادیان میں آگیا ہے۔ آپ لڑکی والوں کو ایک خط لکھ دیں کہ وہ فوراً ابھی رخصتانہ کر دیں۔ میں سن کر حیران ہوا۔ اور کہا کہ بھائی صاحب بہت لے دے کے بعد ان کا اور آپ کا اس اپریل میں رخصتانہ کا معاہدہ ہوا ہے۔ اب ۲ ماہ پہلے بلا کسی خاص وجہ کے کیونکر میں ایسی نئی تحریک کر سکتا ہوں۔ وہ بمشکل اپریل پر راضی ہوئے تھے۔ اب آپ فروری فرما رہے ہیں۔ آپ نے جو ان سے عہد اور اقرار کیا تھا۔ وہ بہت ثقہ اور بزرگ لوگوں کے سامنے کیا تھا۔ یہ بات اب بالکل نامناسب ہے۔ صرف ۲ ماہ اس اقرار میں باقی ہیں۔ ابھی لڑکی والے تیار بھی نہ ہوں گے۔ آپ اتنی عجلت نہ فرمائیں۔ مگر وہ مصر رہے اور بار بار یہی فرماتے رہے کہ کیا حرج ہے۔ اب لڑکا جو رخصت لے کر آگیا ہے۔ لڑکی والوں نے جہیز امید ہے کہ تیار کر لیا ہوگا۔ ۲ ماہ کا فرق ایسا کون سا بڑا فرق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ تو اپنی تقریر میں مصروف تھے کہ ان کے اس رویہ اور تقریر سے میرے ذہن میں یکدم اس آیت کا حل آگیا۔ اور میں نے اُن سے کہا۔ کہ اب جو جی چاہیں کریں۔ ایک آیت کے متعلق مجھے دقت تھی۔ وہ آپ کی اس تقریر اور تعجیل کے رویہ کی وجہ سے حل ہوگئی ہے۔ فالحمد للہ

اب میں دوستوں کو وہ حل بتاتا ہوں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ متعدد دفعہ بعض مشکلات کلامِ الٰہی کی فوری طور پر اور اتفاقاً اسی طرح دوسرے شخصوں کی باتوں اور رویّہ سے

مجھے حل ہوگئی ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ بعض اوقات اور لوگوں کے عمل یا کلام سے کلام الٰہی کی مشکلات کا حل کروا دیتا ہے۔ ان کی باتیں تو اپنے مطلب کی ہوتی ہیں اور سمجھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بات میری اس مشکل کے حل کروانے کے لئے اور مجھے سمجھانے کے لئے بمقتضائے الٰہی واقع ہوئی ہے۔

اس شادی کے معاملہ میں زید صاحب نے رخصتانہ جلدی کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ مگر لڑکی والے لمبی مہلت چاہتے تھے۔ آخر لڑکی والوں نے ان کی عجلت دیکھ کر ان کو رعایت دینی شروع کی۔ یہاں تک کہ آخر انہوں نے کہہ دیا کہ اس مجلس مشاورت کے موقعہ پر ہم رخصتانہ کر دیں گے۔ اس سے کم مہلت دینی ہمارے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ جو تیاری ہمارے ذمہ ہے وہ اپریل سے پہلے ہرگز پوری نہیں ہوسکتی۔ اس پر فریقین کا اتفاق اور معاہدہ ہوگیا۔ مگر زید جو خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ میں نمایاں طور پر ممتاز تھے دو ماہ پہلے ہی باوجود معاہدہ اور سب حالات کے جاننے کے غُل مچانے لگے۔ اور یہ کوشش شروع کی کہ اپریل کی جگہ فروری میں ہی دلہن ہمارے گھر میں آجائے۔ ان کے اس پُرجوش رویہ کو دیکھ کر اس آیت کے معنی مجھ پر یوں کھل گئے کہ اللہ تعالیٰ بھی تو فرماتا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ اے انسانو! تمہاری فطرت میں مَیں نے واقعی تعجیل اور جلد بازی کا مادہ رکھا ہے۔ اس لئے میں تم سے اس فطرت اور جبلّت کے برخلاف جلد بازی نہ کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ (سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ) میں بھی تمہاری فطرت اور طبیعت کی اس جلدبازی اور تعجیل کے مطابق جو میں نے تمہاری جبلّت میں خود رکھی ہے جلدی ہی تم کو اپنے نشانات دکھاؤں گا۔ اور تمہاری تعجیلی فطرت کی خاصیت کو کچلوں گا نہیں۔ بلکہ تعجیل فطرتِ انسانی کے مطابق میں بھی عنقریب ہی (یہ س کا ترجمہ ہے) تجھ کو نشان دکھاؤں گا اور نامناسب دیر نہیں کروں گا مگر (فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ) تم بھی مہربانی کر کے میرے بندے زید کی طرح بے جا اور نامناسب جلدی نہ کرنا۔ اب آیت کا ترجمہ و مطلب صاف ہوگیا یعنی یہ کہ انسان کی فطرت میں عجلت ہے بس

اس عجلت کو مدِّ نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ بھی جو ان کا خالقِ فطرت ہے ان کو بہت جلدی ہی نشانات الٰہیہ دکھائے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی یہ مناسب نہیں کہ وہ ناروا اور ناجائز جلدی اور عجلت کریں جیسے مثلاً مباہلہ کے موقعہ پر خدا تعالیٰ نے انسانوں کی بے صبر اور جلد باز فطرت کے مطابق ایک سال عذاب کی میعاد رکھ دی ہے۔ اور واقعی یہ بہت تھوڑی میعاد ہے۔ لیکن بے صبر اور جلد باز انسان چاہتا ہے۔ کہ تین دن میں مباہلہ کا فیصلہ ہو جائے یا یہ کہ مباہلہ کی مجلس سے منتشر ہونے سے پہلے ہی ہم پر آگ برسنی شروع ہو جائے یا زمین ہم کو نگل جائے سو اللہ تعالیٰ نے فلا تستعجلون فرما کر اس ناجائز اور نامناسب جلدی سے منع فرمایا ہے ورنہ سَاُورِیۡکُمۡ تو خود ہی فرما دیا ہے کہ چونکہ تم جلد باز فطرت رکھتے ہو۔ اور میں نے ہی تمہیں یہ فطرت دی ہے۔ اس لئے میں خود تم کو نشانات دکھانے میں جلدی کر رہا ہوں۔ پس تم بھی اتنی مہربانی رکھنا کہ ناجائز اور نامناسب اور بے ہودہ جلدی نہ کرنا جیسے بعض ملازم کیا کرتے ہیں کہ ان کو اگر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ان کا آقا محض اس لئے تنخواہ دے دیتا ہے کہ انہیں گھبراہٹ نہ ہو۔ تب بھی وہ نالائق نوکر ۲۰ - ۲۲ تاریخ سے ہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ سو ایسی ناجائز تعجیل سے اس آیت میں روکا گیا ہے۔ اور جو فطرتی اور جائز تعجیل انسان میں ہوا کرتی ہے۔ اس کے متعلق خود ہی تسلّی دے دی ہے۔ کہ مجھے معلوم ہے کہ تم جلد باز پیدا کئے گئے ہو۔ اس لئے میں بھی جلدی ہی تمہیں نشانات دکھاؤں گا۔ نامناسب تاخیر اور دیر نہیں کروں گا۔ گویا اس آیت میں سَاُورِیۡکُمۡ کے حق کے صحیح معنوں کی طرف خیال نہیں کیا تھا۔ اور وہ میرے دوست زید نے اپنے رویہ اور تقریر سے حل کرا دیئے۔ فجزاہ اللہ یاد رہے کہ لاتستعجلون کے لفظ میں جو تعجیل ہے وہ ایسی ہے۔ جس کی بابت بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ؎

تعجیل کارِ شیاطین بود

اور استعجال کے معنی یہاں یہ ہوں گے کہ فطرتی عجلت سے بھی دو قدم آگے نکل جانا یعنی نامناسب اور ناجائز جلد بازی۔ (الفضل ۶ فروری ۱۹۴۴ء)

موت اور نیند میں قبضِ رُوح کا فرق

سورہ زمر میں آتا ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ (الزمر: ۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ جانوں کو قبض کرتا ہے۔ ان کی موت کے وقت اور جو نہیں مریں ان کی جانوں کو نیند میں قبض کرلیتا ہے۔ پھر ان روحوں کو تو روک لیتا ہے۔ جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے مگر دوسری ارواح کو واپس بھیج دیتا ہے۔ ایک وقت مقررہ تک۔

اس آیت کے متعلق بعض مشکلات پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ یہ آیت اکثر لفظ توفی کی بحث میں بھی آتی ہے۔ اور اس میں لفظی اور معنوی دقتیں بھی ہیں۔ اس لئے میرا جی چاہا۔ کہ وہ معنی اپنے احباب کے علم میں بھی لے آؤں۔ جن سے قبض روح اور روح کی واپسی نیز سونے والے اور مرنے والے میں جو فرق ہے۔ وہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس آیت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روح پر موت اور نیند کے وقت پورا پورا قبضہ کرلیتا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کیا جاگنے میں خدا کا قبضہ روح پر کامل نہیں ہوتا؟ سو واضح ہو کہ یہاں کامل قبض روح یعنی توفی سے یہ مراد ہے کہ وہ رُوح ان دونوں حالتوں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اور اس کی اپنی مرضی اپنے حواس اپنی حرکات اپنی خواہش اپنا عمل سب کچھ جاتا رہتا ہے۔ مرنے والی روح نہ سُن سکتی ہے۔ نہ بول

سکتی ہے۔ نہ اپنی مرضی چلا سکتی ہے۔ نہ اپنی کسی خواہش پر عمل کر سکتی ہے۔ نہ اس کا کوئی ارادہ بروئے کار آسکتا ہے۔ جس طرح زندہ انسان میں ہوا کرتا ہے۔ زندہ انسان کی روح برخلاف اس کے خواہ خدا کا حکم مانے یا نہ مانے۔ خواہ نیکی کرے یا بدی کرے۔ خواہ خدا کے ساتھ موافقت کرے۔ یا اس کی اور اس کے رسولوں کی مخالفت کرے۔ خواہ دیکھے۔ سُنے۔ سونگھے۔ چکھے یا لمس کرے یا نہ کرے۔ غرض مردہ کی روح محض خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ برخلاف زندہ کی روح کے جو اپنا ارادہ حواس اور اختیارات رکھتی ہے۔ پس مرنے کے بعد خدا کا کامل تصرف اس روح پر ہوتا ہے مگر زندہ کی روح کو کچھ اختیارات مالک کی طرف سے ملے ہوتے ہیں جو مرنے پر سلب ہو جاتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد اس روح کا دیکھنا، سُننا وغیرہ قطعاً اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیند میں بھی روح کو قبض کر لیتا ہوں۔ یعنی پکڑ کر اس طرح قید کر لیتا ہوں کہ نہ وہ اپنے اختیار سے سن سکتی ہے۔ نہ بول سکتی ہے۔ نہ ارادہ کر سکتی ہے۔ نہ عمل کر سکتی ہے۔ بلکہ جملہ حواس اور اعمال اس کے مُردہ کی طرح ہوتے ہیں پس کامل قبض روح یعنی انسان کی جان پر قبضہ باری تعالیٰ کا جس میں انسان کے ارادی اختیارات بالکل سلب ہو جاتے ہیں۔ صرف دو صورتوں میں ہوتا ہے۔ ایک مر کر دوسرے سوتے میں جبھی تو یہ ضرب المثل ہے کہ "سویا اور مرا برابر۔" لیکن ہم دوسری طرف یہ بھی دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ انسانی روح دونوں حالتوں میں کامل بے اختیار اور پوری تصرف الٰہیہ میں ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک مُردے اور ایک سونے والے انسان میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ جب دونوں کی روحیں خدا کے قبضہ میں آگئیں۔ تو پھر مردہ اور سونے والا ہر جہت سے ایک ہی طرح کا معلوم ہونا چاہیئے اس بات کی وجہ نہ سمجھنے سے لوگوں کے لئے مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسی دونوں روحیں خدا کے پاس قید ہو جاتی ہیں۔ ہاں مرنے والی روح کو خدا اسی قید میں روک رکھتا ہے۔ مگر سونے والے کی روح کو اس قید سے آزاد کر کے واپس کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب غلطی سے لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ سونے والے کی روح بھی عزرائیل فرشتہ نکالتا ہے اور نہ

بھی عالمِ برزخ میں مردہ کی روح کی طرح چلی جاتی ہے۔ پھر جب وہ شخص جاگتا ہے تو فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ دیکھو مُردوں کی ارواح کے تھیلوں میں سے فلاں سونے والی روح کو تلاش کرو۔ اور اسے جلدی دنیا میں فلاں جگہ پہنچاؤ۔ اگر یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے۔ تو پھر ایک مردے اور ایک سونے والے کے جسم کا ایک سا حال ہونا چاہیئے۔ اس دھوکہ میں لوگ فَيُمْسِكُ اور يُرْسِلُ کے الفاظ نہ سمجھنے کی وجہ سے پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ خدا محدود ہے۔ اور ایک تخت پر کرسی بچھا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ارواح اس کے پاس لاکھوں کروڑوں میلوں سے لائی جاتی ہیں۔ اور اس کے عرش کے نیچے رکھ دی جاتی ہیں اور پھر سونے والی روحیں تلاش کر کے واپس کی جاتی ہیں اور مرنے والوں کی وہیں تھیلوں میں بند پڑی رہتی ہیں۔ اس قسم کے عقائد کا نتیجہ یہ ہے کہ اس آیت کے معنی سمجھنے میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ حالانکہ خدا ہر جگہ ہے اور ہر جگہ اس کے قید خانے موجود ہیں۔ جہاں چاہتا ہے۔ جس روح کو قید کر سکتا ہے۔ اس لئے اس آیت کے صحیح معنے یہ ہوں گے۔ کہ مرنے والوں کی ارواح کو موت کے فرشتے قبض کر کے عالمِ برزخ میں تا قیامت قید کر دیتے ہیں۔ اور وہ دنیا میں واپس نہیں آسکتیں۔ ان کا قید خانہ بالکل الگ ہے لیکن سونے والے کی روح کو جب خدا اپنے اختیار میں لے لیتا ہے تو اس روح کو اسی دنیا میں اس کے اپنے جسم کے کسی حصّہ کو قید خانہ بنا کر قید کر دیتا ہے۔ مثلاً اس کی روح اسی کے دماغ کے کسی خانے میں مقفل کر کے قید کر دی جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ کلی خدا کے قبضہ میں آجاتی ہے۔ اور جب تک نہ جاگے وہ ایک بے اختیار قیدی کی طرح اسی خانے میں بند رہتی ہے لیکن جب وہ جاگتی ہے یا کوئی اُسے جگاتا ہے۔ تو محافظ فرشتہ فوراً قفل کھول کر اس روح کو چھوڑ دیتا ہے اور وہ با اختیار ہو کر اپنے سب کام اپنے دفتر (دماغ) میں آ کر کرنے لگتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی قید خانہ دونوں روحوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ مرنے والی روح کا قید خانہ عالمِ برزخ ہے۔ اور سونے والی روح کا قید خانہ اس کے اپنے جسم میں ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے گورنمنٹ انگریزی کا قاعدہ ہے۔ کہ تھوڑی میعاد کے قیدی کو اس کے اپنے شہر کی حوالات یا جیل میں رکھتی ہے اور عمر قیدی کو کالے پانی کی جیل میں بھیج دیتی ہے۔ ہر شخص کے

اندر بھی ایک حوالات یا قید خانہ ہے جہاں سوتے وقت اس کی روح اپنے حواس و اختیارات سے معطل ہو کر مثل ایک قیدی کے بند کر دی جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے کامل تصرف میں ہوتی ہے۔ جو بھی خواب یا نظارہ خدا چاہے۔ اس کو دکھائے۔ اس کا اپنا ارادہ قطعاً کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن جب جاگنے کا وقت آتا ہے۔ تو حوالات کے فرشتے فوراً دروازہ کھول کر اسے آزاد کر دیتے ہیں اور وہ جسم پر قبضہ کر کے اپنے اختیارات مرضی اور ارادہ استعمال کرنے لگتی ہے۔ اور یہی عمل روزانہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے مرنے کا دن آجاتا ہے۔ اس وقت موت والے فرشتے اسے چھوٹے جیل کی بجائے مستقل اور بڑے جیل خانہ میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ ایک معطل حالت میں تا یوم الحساب پڑی رہے گی۔

اس تشریح سے اس آیت کی جو مشکلات ہیں وہ حل ہو جاتی ہیں۔ اور اس فرق کی توجیہہ بھی ہو جاتی ہے۔ کہ مردہ اور سونے والے کے جسموں میں کیوں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ روح کے اختیارات اور ارادی قوت کے لحاظ سے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ یہ سب غلطی خدا کو محدود سمجھنے اور ایک غلط عقیدہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ خدا ہر جگہ ہے۔ اس کے کارکن ہر جگہ ہیں۔ اس کے قید خانے ہر جگہ ہیں۔ اور روح کو واپس بھیجنے کے معنے صرف اس کا آزاد کرنا ہے۔ اور توفّی یعنی قبض روح کے معنے اس کے سارے اختیارات سلب کر کے پورے طور پر خدائی تسلط کے ماتحت آجانے کے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ مرنے کی صورت میں تو روح کا تعلق جسم سے ہمیشہ کے لئے کٹ جاتا ہے۔ لیکن نیند کی صورت میں یہ انقطاع نہ صرف عارضی ہوتا ہے۔ بلکہ کم درجہ کا بھی ہوتا ہے۔ (روزنامہ الفضل قادیان ۲۱ ستمبر ۱۹۴۰ء)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا

حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک دُعا کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے جو یہ ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (ص : ۳۶)

یعنی اے رب مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے بعد کسی اور کو نصیب نہ ہو۔ تُو تو بڑا بخشنہار ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بھلا اتنے بڑے نبی اور یہ دُعا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ انسان ہر خوبی اور بڑائی کو اپنی ذات سے وابستہ کرنا چاہتا ہے۔ اس تین ہزار سال پہلے نبی کی دُعا کے متعلق جو اصحاب کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ اپنے پیرو مرشد یعنی حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ (حضرت مصلح موعود) کے عمل کو دیکھ لیں کہ حضور ہر بات میں سبقت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سلسلہ کی ہر بھلائی کے لئے اتنے حریص ہیں کہ چاہتے ہیں کہ یہ سب کام سب ترقیاں میرے زمانہ اور میرے عہدِ خلافت میں ہی ہو جائیں۔ نئی بیوت الحمد بن رہی ہیں۔ پرانی کی توسیع ہو رہی ہے۔ منارہ کی تکمیل کر دی۔ ہر وقت یہ فکر ہے کہ دُنیا کا کوئی مُلک ایسا نہ ہو کر وہاں احمدی مبلغ نہ پہنچ چکا ہو۔ سلسلہ کی آمد اتنی بڑھ جائے کہ اس پر آئندہ تنگی نہ آسکے۔ ہر جگہ درس جاری ہو جائیں۔ احمدیہ پریس مضبوط ہو جائے۔ جماعت کے تقوےٰ اور نیکی کا معیار نہایت بلند ہو جائے۔ احمدی تجارتیں اور کارخانے جاری ہو جائیں۔ قادیان کی ترقی ہو جائے۔ آئندہ کے لئے علماء اور کارکن تیار ہو جائیں۔ تعلیمی ادارے قائم ہو جائیں۔ نظامِ سلسلہ نہ صرف انہوں نے بنایا بلکہ یہ دُھن ہے کہ وہ ایک کامل

اور مکمل نظام ہو جائے۔ بلکہ آئندہ کے خلفاء اور آئندہ کے انتظام کے لئے بھی ابھی سے قوانین تیار کر دیئے۔ تقریر۔ تحریر۔ تفسیر ہر بات میں ہر آئندہ خلیفہ سے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔ سلسلہ کی دنیاوی اور دینی ترقی جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہوتے ہوتے ہو جائے گی وہ اس فکر میں ہیں۔ کہ آج اور میرے زمانہ میں ہی ہو جائے۔ غرض ہر طرف ایک طوفان برپا ہے نہیں چاہتے کہ کوئی امر نیک ایسا ہو جو میرے عہدِ خلافت میں تشکیل اور تکمیل نہ پالے۔ تبلیغ ہو تو ایسی ہو تعلیم ہو تو ایسی ہو۔ انتظام ہو تو ایسا ہو۔ رعب ہو تو ایسا ہو۔ جماعت کی روحانیت ہو تو ایسی ہو۔ کہ آئندہ کے لئے اسی لائن پر یہ جماعت کام کرتی رہے۔ اور میں ہر بات کا ہیڈ ہر بات کا موجد اور ہر بات میں لیڈر رہوں۔ اور فتح کا سہرا میرے سر بندھے۔ بس اسی کے معنی یہ ہیں کہ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ۔ آپ روز یہ نظارہ ملاحظہ کر رہے ہیں اور پھر اعتراض کرتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام پر انہوں نے تو دُعا ہی کی تھی۔ یہاں تو عملی کارروائی بھی جاری ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کو اپنے سامنے نظارہ نظر نہیں آتا اور تین ہزار سال پہلے کی دیسی ہی ایک دُعا آپ کو کھٹکتی ہے۔ اولوالعزم فطرتیں اگلے زمانوں کا انتظار نہیں کیا کرتیں بلکہ تمام نیکی اور بھلائی اور ترقی آپ سمیٹنا چاہتی ہیں۔ پس یہ تو فطرتِ انسانی ہے کہ ہر انسان اپنی ذات کے ساتھ کوئی نہ کوئی اعلیٰ خوبی یا کمال وابستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور عزتیں مخصوص کرنا پسند کرتا ہے۔ وہی فطرتی جذبہ یہاں بھی ہے۔ اور یہی ہر نبی کرتا آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ کی دُعا مانگ کر ابوالانبیاء بن گئے اور اس فضیلت کو کسی دوسرے کے لئے نہ چھوڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم الانبیاء بن گئے اور آئندہ کے لئے کوئی نبوت کسی کے لئے نہ چھوڑی (سوائے اس کے جو ان کے صدقہ سے ہی ہے) حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اتنی حیاً لا یزید علیہ غیری من بعدی کی دُعا مانگ کر محبت الٰہی کے اس مقام پر پہنچے کہ اب کسی غیر کو بغیر حضور کا طفیلی بننے کے اس دائرہ میں قدم رکھنا محال ہو گیا۔

اب بنی اسرائیل کی سلطنت میں گھن لگ گیا ہے اور زوال کے دن قریب ہیں۔ میری قوم دُنیا داری اور عیاشی میں پڑ گئی ہے۔ اب ان سے سلطنت کی وسعت ہونی مشکل ہے۔ اس لئے یہ دعا کی کہ اے خدا میں تو مر ہی جاؤں گا اور آئندہ سلطنت بڑھانے والا کوئی نظر نہیں آتا اتنی سی سلطنت تو چند دنوں میں ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتی ہے۔

اگر لائق انسانوں کا پیدا ہونا امر مقدر نہیں ہے۔ تو تو اپنے فضل سے کم ازکم یہی کر کہ میری سلطنت کو ہی اتنا وسیع کر دے کہ اسے ٹوٹنے اور برباد ہونے میں ایک لمبا عرصہ صرف ہو اور بنی اسرائیل بجائے سو دو سو سال کے ہزار سال تو دنیا میں بعزت رہ سکیں۔ پس خود مجھے ہی نئی فتوحات اور علاقے تسخیر کرنے کی توفیق دے۔ اگر میرے بعد نالائق بھی ہوں گے تو بھی ایک زیادہ بڑی سلطنت ٹوٹنے میں بہت دیر لگے گی

بجائے اس موجودہ سلطنت کے جو جلد فنا ہونے کی اہلیت رکھتی ہے۔

اس پر خدا تعالیٰ نے ان کو وہ پہاڑی علاقے جن میں جن رہتے تھے عطا کر دیئے تاکہ سلطنت کے حدود اور فرنٹیر مضبوط ہوسکیں۔ اور بیرونی حملہ آور اس کو آسانی سے نہ توڑ سکے۔ اور سلطنت کا قیام دیر تک رہ سکے۔ نیز فرمایا کہ ہم نے جہاز اور تجارتیں کرنا سلیمان کو سکھا دیا تاکہ دولت جمع کر سکے اور سرحد کے پہاڑی علاقے جہاں جنات و شیاطین رہتے تھے (استعارہ) ان کے ہاتھ پر فتح کرا دیئے یا تابع کر دیئے تاکہ اس کی سلطنت زیادہ پائدار رہ سکے۔ کیونکہ آئندہ بادشاہ اگر نالائق بھی ہوں تب بھی ایک زیادہ وسیع اور زیادہ مضبوط سلطنت دیر میں برباد ہوتی ہے۔ بہ نسبت ایک چھوٹی اور غیر محفوظ اور مفلس سلطنت کے۔ پس جب سلیمان نے دیکھا کہ میرے جانشین نالائق ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کی عظمت چند دن میں اُڑا کر رکھ دیں گے تو وسعت سلطنت کی دُعا کی کہ نالائقوں کو اس سلطنت کے اڑانے میں بھی دیر لگے۔ اور یہود کا اقتدار تا دیر قائم رہے جیسے ایک لائق باپ جب اپنی اولاد کو نالائق دیکھتا ہے تو کمائی اور روپیہ جمع کر کے چھوڑ جاتا ہے کہ یہ تو کمانے سے رہے میں ہی ان کے لئے کافی سرمایہ جمع کر جاؤں۔

اکبر تک کی فتوحات ہندوستان میں کئی پشت تک چلیں اگر وہ اس وسعت فتوحات کا انتظام نہ کرتا تو شاید شہنشاہ جہانگیر کے سامنے ہی اُس کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا۔

یاد رہے کہ یہ آیت صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ وہ سلطنت ایک معمولی سلطنت تھی۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے بعد آج تک دنیا میں کسی اور کو ویسی عظیم الشان سلطنت نہیں ملی۔ مطلب صرف یہ ہے کہ قوم یہود کو اس شان کی سلطنت نہیں ملی۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے سے لوگوں کو یہ ضرورت پیش آئی کہ جب انہوں نے دوسری عظیم الشان اور سلیمانؑ کی سلطنت سے بہت زیادہ بڑی بڑی سلطنتیں تاریخی طور پر دیکھیں تو ان کو فرضی توجیہیں کرنی پڑیں کہ ہوا ان کی مطیع تھی اور کوہ قاف کے دیو پری جنات ان کے تابع تھے اور ان کو اسمِ اعظم معلوم تھا۔ یہ صرف اس لئے کہ سلیمان کی سلطنت کو کسی نہ کسی رنگ میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ثابت کر سکیں۔ حالانکہ یہ دُعا اور اس کا اثر صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ یعنی سلسلہ موسویہ میں اُن جیسا زبردست بادشاہ کوئی نہیں ہوا۔ اور بس۔ اگر یہ مفسرین اس آیت اور اس دُعا کو بنی اسرائیل کی سلطنت تک محدود رکھتے تو نہ کوہ قاف پر سلیمانی سلطنت کو وسیع کرنا پڑتا نہ جن و انس اور ہوا پانی پر ان کا تسلط تسلیم کرنا پڑتا۔ اور بہت ساری غلط بیانیوں اور فرضی قصہ کہانیوں کے گھڑنے سے بچ جاتے۔

اس تمام بیان سے ثابت ہوا کہ

۱۔ یہ دُعا صرف سلسلہ بنی اسرائیل اور یہودی سلطنت کے لئے ہے۔

۲۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ آئندہ اعلیٰ کارکن یہودیوں میں نظر نہ آتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ ان کی سلطنت کی حدود ہی مضبوط اور وسیع ہو جائیں تاکہ وہ دیر تک محفوظ رہ سکے۔

۳۔ تیسرے یہ دعا جیسا کہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں انسانی فطرت کا ایک مظاہرہ ہے۔ ہر نبی بلکہ ہر انسان عظمت اور بڑائی کا خواہشمند ہے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق

ہر ایک ایسی ہی دُعا کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ جس طرح حضرت سلیمانؑ نے وسعتِ سلطنت کی دُعا کی اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں نبوت کے محصور ہو جانے کی دُعا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا نبی بننے اور صرف اپنی امت میں نبوت کے اجراء کی دُعا کی اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے محبتِ الٰہی کا ٹھیکہ لیا اور حضرت خلیفۃ المسیح جو کر رہے ہیں وہ ہم سب کے سامنے ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خدائی صفات واحد ھو اکبر وغیرہ کا مظہر ہی ہے۔ پس یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ آپ کو ایک ہنسی کی بات سناؤں۔ میں بھی ایک ایسی دعا کبھی کبھی مانگ لیا کرتا ہوں۔ مثلاً یا اللہ مجھے اپنی جنت میں ایک مخصوص نعمت ایسی دیجیو کہ وہ اور کسی جنتی کے ہاں نہ ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود اسے نوش فرمانے کے لئے ہفتہ میں ایک دفعہ ضرور میرے ہاں تشریف لایا کریں۔ یہ بھی اسی قسم کی فطرت کا ایک مظاہرہ ہے۔ گو لوگوں کے نزدیک یہ بات مذاق سمجھی جائے مگر جو ہنستے ہیں وہ انسان کی حقیقی فطرت سے ناواقف ہیں۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

لَاتَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَانَوْمٌ (آیۃ الکرسی)

نہیں آتی اس کو اُونگھ اور نہ نیند (ترجمہ) (البقرہ: ۲۵۶)

قرآن مجید کا شاید ہی کوئی حصّہ ہو جس پر دشمنوں نے اعتراض نہ کیا ہو۔ پس آیت الکرسی جیسی مہتم بالشان آیت کس طرح ان کی زد سے باہر رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس پر بھی اعتراض کر دیا اور نقص یہ نکالا۔ کہ یہ بات بلاغت کے برخلاف ہے کہ اونگھ کا ذکر پہلے کیا جائے اور نیند کا بعد میں۔ بلکہ یوں چاہیئے تھا کہ اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ کیونکہ جب کسی نقص کا ازالہ کرنا مقصود ہو تو زیادہ بُری چیز کو پہلے رکھتے ہیں اور عبارت اس طرح ہونی چاہیئے تھی کہ خدا تعالیٰ میں نہ صرف یہ کہ نیند کا نقص او سکر وری نہیں ہے بلکہ نیند تو الگ رہی وہ تو اونگھتا تک بھی نہیں۔ یہ کیا فضول بات ہے۔ کہ اس کی تعریف میں یہ کہا جائے کہ نہ وہ چند منٹ غافل ہوتا ہے۔ بلکہ رات بھر بھی نہیں سونا صحیح یوں ہوتا کہ نہ صرف وہ رات بھر نہیں سوتا بلکہ چند منٹ کے لئے بھی غافل نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ نیند کیا اُسے تو اونگھ بھی نہیں آتی برخلاف اس کے آیت کے الفاظ میں اونگھ کو مقدم کیا ہے۔ حالانکہ نیند کے لفظ کو مقدم کرنا اور زیادہ بُری چیز کو پہلے رکھنا چاہیئے تھا۔ یہاں اُلٹ کیوں ہے؟

مجھے بھی ان کا یہ اعتراض کھٹکا کرتا تھا۔ اور اس کے حل کے لئے کئی دفعہ میں نے غور کیا مگر سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آج یکدم ذہن میں ایک جواب اس اعتراض کا سوجھ گیا اور میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے احباب کو بھی اس تاویل سے خوش وقت کر دوں۔ سو واضح ہو کہ معترضین کا یہ اصول ٹھیک ہے کہ زیادہ بڑے نقص کو پہلے رکھنا چاہیئے اور ہم ان کی دلیل کو مانتے

ہیں اور اسی لئے قرآن مجید نے بھی زیادہ بُری چیز کو پہلے رکھا ہے۔ صرف ان کی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اونگھ نیند کی نسبت زیادہ بڑا نقص اور زیادہ بُری چیز ہے۔ کیونکہ اونگھ نسبتاً زیادہ مضحکہ خیز اور زیادہ انسانی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ اور خود انسان کے لئے بھی زیادہ حقیر کن حالت ہے۔ جیسے مثلاً ایک آدمی سوتا ہے۔ اور دوسرا بیٹھا ہوا اونگھ رہا ہو تو ہم پہلے کی بابت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے سو رہا ہے۔ مگر دوسرے شخص کے مضحکہ خیز جھٹکے۔ اس کا زور زور سے جھومنا۔ اس کا ادھر ادھر گرنا اور عجیب ہیئت کذائی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے۔ مگر اونگھ پر غالب نہیں آسکتا۔ اور باوجود ارادہ کے اونگھ سے مغلوب ہوتا جاتا ہے۔ اونگھ اس سے کھیل رہی ہے۔ وہ لاچار ہے۔ اور اس کی حالت ہنسی کے قابل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اونگھ نیند سے زیادہ انسان کی کمزوری اور عجز کو آشکارا کرتی ہے۔ آدمی اس سے لڑتا ہے۔ مگر وہ اس کا تماشا بناتی ہے۔ کسی مجلس میں اونگھنے والے کی طرف دیکھو تو تعجب آتا ہے اس کی اضطراری اور بے ڈھنگی حرکات کا ملاحظہ کرو تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ آنکھیں نیم وا ہیں جھٹکے پر جھٹکے لگ رہے ہیں۔ کبھی آگے گرتا ہے کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔ ہوشیار ہونے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا شکست خوردہ مغلوب ہے بغرض عجیب قابلِ مضحکہ نظارہ ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مسجد اقصےٰ میں کوئی جلسہ تھا۔ ہم لوگ بیٹھے تھے اور حضرت اقدس مسیح موعودؑ (آپ پر سلامتی ہو) لیکچر دے رہے تھے کہ مجلس میں ایک صاحب اونگھنے لگے کبھی وہ ایک طرف کے لوگوں پر جا پڑتے تھے کبھی دوسری طرف کے لوگوں پر آخر وہ یک دم اس طرح پیچھے گرے کہ ان کی ٹانگیں سامنے کے لوگوں کے کندھوں پر تھیں۔ اور سر پچھلے آدمی کی گود میں اور دونوں ہاتھ بڑے زور سے دائیں اور بائیں طرف والے آدمیوں کے مونہہ پر لگے۔ ساتھ ہی انہوں نے بے اختیار ایک چیخ بھی ماری۔ اور مجلس کو درہم برہم کر دیا۔ دیکھنے والوں کا یہ حال تھا کہ ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے مگر حضور کے پاس ادب سے دم بخود تھے۔ یہ حقارت اور

ہنسی کا نظارہ سونے والوں میں کبھی نہیں دیکھا جاتا۔ اسی طرح ایک اور صاحب تھے۔ اُن کا اونگھتے اونگھتے اس زور سے فرش پر سر ٹکرایا کہ سب لوگ پریشان ہو گئے۔ اور وہ سخت شرمندہ اور چوٹ الگ لگی۔ یہ سب باتیں نیند میں نہیں ہوتیں۔ وہ بے شک ایک کمزوری اور غفلت کی صورت ہے۔ مگر اس کے ساتھ ذلت مضحکہ خیزی اور شرمندگی وابستہ نہیں ہے۔ پس کلامِ الٰہی نے بھی زیادہ بڑے نقص اور زیادہ بُری چیز ہی کو اس آیت میں پہلے رکھا ہے۔ اب اس روشنی میں اگر آپ آیت کی ترتیب کو دیکھیں گے۔ تو وہ بالکل صحیح اور صاف اور بلیغ نظر آئے گی اور معترضین کا وسوسہ باطل ہو جائے گا۔ اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ جو ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے۔ اسے نہ ذلیل اور ادنیٰ قسم کی نیند (یعنی اُونگھ) آتی ہے۔ نہ طبعی اور باعزت قسم کی۔

فرض کیجئے کہ آپ اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے خدا کا تصور باندھیں جو اپنے تخت پر پڑا سوتا ہے۔ تو زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہیں گے کہ یہ خدائی کے قابل نہیں کیونکہ اپنی مخلوق سے غافل ہے۔ مگر حقارت کا جذبہ آپ کے اندر پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اسی تصور میں آپ ایسے وجود کو اُونگھتا دیکھ لیں تو یقیناً اس نظارہ کے بعد آپ اس سے سخت متنفر ہو جائیں گے۔ بس یہ فرق ہے نیند اور اُونگھ میں۔

(روزنامہ الفضل قادیان ۹ دسمبر ۱۹۴۲ء)

مُقَطَّعَاتِ قرآنی

بعد از حمد و ثنائے خدا و درُود بر مصطفےٰ و صلوٰۃ بر میرزا یہ خاکسار جمیع برادران احمدیت کی خدمت میں بعد السلام علیکم کے عرض کرتا ہے کہ سالہا سال سے خاکسار کے دل میں مقطعاتِ قرآنی کے حل کرنے کا خیال رہتا تھا۔ اور ان کے سمجھنے کے لئے دعائیں بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جو جو بھی تحریریں ان کی تفسیر کے متعلق مجھے مل سکتی تھیں۔ ان کو بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ لیکن میرا دل کبھی اُن توجیہات پر پورے طور سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور یہی دُعا رہی کہ خدایا تو اپنے فضل سے ان کا حقیقی حل سمجھا۔ اور ان کی اصلیت کو منکشف فرما۔ آخر قریباً دو سال ہوئے کہ اسی ادھیڑ بُن میں یکدم بجلی کی روشنی کی ایک کرن نے راستہ سمجھا دیا۔ بلکہ روشن کر دیا۔ اور حروفِ مقطعات کی متعدد توجیہات میں سے ایک حقیقت اور کیفیت مجھ پر ظاہر کر دی۔ اس فوری القاء کے بعد اس کی روشنی میں مَیں نے بطور خود راستہ آگے نکالنا چاہا اور کئی باتیں خدا تعالیٰ کے فضل سے اس کی تائید میں پیدا ہو گئیں۔ چند دوستوں سے بھی ذکر کیا مگر عموماً ان کو اس معاملہ میں زیادہ شوقین نہ پایا۔ حالانکہ قرآنِ مجید کا سچا عشق دنیا میں صرف ایک جماعت کو ہے۔ اب جبکہ میری تحقیق ایک حد تک پہنچ گئی اور خود میرے مطمئن کرنے کو کافی ہو گئی۔ تو میں نے خیال کیا کہ ایک دعوتِ عام کے ذریعہ سے اس بات کو اخبار میں شائع کراؤں تاکہ دوسرے تمام دوست خاص کر جو ان باتوں کے اہل ہیں اور شوق رکھتے ہیں اور ان کو آگے چلانے اور راستوں کو آگے کھول لینے کے مشتاق ہیں وہ اس پر غور کریں اور جو چیز قبول کرنے والی ہو اُسے قبول کریں اور جو ردّ کرنے والی ہو اُسے ردّ کریں اور جو مزید تشریح کی محتاج ہو اس کی

تشریح اور تفسیر کریں۔ اور اس سے مجھے بھی اطلاع دیں۔ کیونکہ ابھی بہت سی باتیں زیادہ روشنی کی محتاج ہیں۔ اور غور و فکر کے بعد زیادہ بہتر صورت میں یا نئی صورت میں کہی جا سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی روشنی میں ایک اور نئی حقیقت اور نئی توجیہہ اور تفسیر انہی حروف مقطعات کی کسی دوست کو مل جائے ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام بے حد وسیع ہے اور اس کے معانی طرح بطرح اور رنگ برنگ کے ہیں جو مختلف ذہنوں اور مختلف دماغوں کی مناسبت سے لوگوں پر کھولے جاتے ہیں ۔ پھر آگے سننے والے بھی اپنی لیاقت، طبیعت اور مناسبت کے لحاظ سے کوئی ایک معنی کو پسند کرتا ہے اور کوئی دوسرے کو اور کوئی تیسرے کو۔ پس میں جو اب ایک نئے معنی مقطعات کے بیان کرنے لگا ہوں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ گزشتہ معانی منسوخ سمجھے جائیں بلکہ یہ ایک نیا قدم ہے اور نئے معنی ہیں جو پہلے لوگوں کے معانی کو منسوخ نہیں کرتے بلکہ صرف اتنی بات ہے کہ میرے نزدیک یہ توجیہہ گزشتہ توجیہات سے زیادہ نمایاں، زیادہ بہتر اور زیادہ قرین قیاس ہے۔ ورنہ کلامِ الٰہی تو ایک لا انتہا سمندر ہے ۔ اور کسی ایک معنی یا مطلب پر اس کا حصر کر لینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی یہ دعوےٰ کرے کہ سنگترہ صرف ایک مفرّح دِل پھل ہے۔ اس کے سوا اس میں کوئی اَور خاصیت نہیں۔ سو جب مخلوقاتِ الٰہی میں سے ہر چیز میں لاتعداد خاصیتیں ہیں اور ہر زمانہ میں نئی نئی ظاہر ہو رہی ہیں۔ اسی طرح مقطعات کے مطلب کو بھی صرف ایک معنی میں محصور کر دینا نادانی ہے ۔ ہاں یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک شخص یہ کہے۔ فلاں معانی دوسرے معانی سے زیادہ روشن واضح اور صاف ہیں۔ یا میرا ذہن اور میری طبیعت ان کو زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ دوسرے سب معانی غلط ہو گئے ۔ پس مقطعات کی نئی توجیہہ کر کے میں کسی سابقہ بزرگ کی یا صحابی کی نعوذ باللہ توہین نہیں کرنا چاہتا۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ ان کے معنی غلط ہیں۔ ہاں یہ کہتا ہوں کہ یہ ایک نئے معنے ہیں اور غور کرنے کے لائق ہیں اور میرے نزدیک گزشتہ لوگوں کی توجیہات سے زیادہ وسیع اور زیادہ قرین قیاس ہیں اور بس ۔

جو احباب اس مضمون سے اختلاف رکھتے ہوں۔ اُن کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مہربانی فرما کر تمام مضمون پڑھ کر پھر اپنے اختلاف کا اظہار کریں۔ درمیان میں اُلجھنا شروع نہ کر دیں۔ ممکن ہے آگے چل کر ان کے اعتراض کا جواب مضمون کے اندر ہی انہیں مل جائے۔ یا غور کرنے کے بعد خود ان کے اپنے ہی ذہن میں آ جائے۔

مقطّعات اور حرُوفِ مقطّعات

قرآن مجید کی اٹھائیس سورتوں پر مضمون سورۃ شروع ہونے سے پہلے آپ نے کچھ بظاہر بے معنی حروف دیکھے ہوں گے۔ ان کو مقطعات اور حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرۃ کے سر پر الٓمٓ۔ ایک مقطعہ ہے اور اس میں تین حروف ہیں الف۔ لام میم اسی طرح سورہ مریم کے سر پر کٓھٰیٰعٓصٓ ہے۔ اس میں پانچ حروف مقطعات ہیں۔ ۱۔ کاف ۔۲۔ ھا ۔۳۔ یا ۔ ۴۔عین ۔ ۵۔ صاد ۔ ان تمام مقطعات کے حرف ہمیشہ الگ الگ پڑھے جاتے ہیں۔ ملا کر نہیں پڑھے جاتے اور نمایاں اور لمبا کر کے پڑھنے کیلئے ان پر عموماً مدّ اور کھڑی زیر بھی ہوتی ہے۔ پس مقطعات اور حروفِ مقطعات میں ابھی آپ فرق سمجھ لیں۔ الٓمٓ الٓرٰ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ یہ مقطعات کہلاتے ہیں اور الف۔ لام ۔ میم یا الف ۔ لام ۔ را ۔ یا کاف ۔ ھا ۔ یا ۔ عین ۔ صاد ۔ یہ حروفِ مقطعات ہیں۔

مقطّعات

کل مقطّعات قرآنی بمعہ مکررات ۲۸ ہیں۔ عام طور پر سورہ نوٗن کا نٓ بھی اس میں شامل کر کے ۲۹ مقطعات کہے جاتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک نٓ مقطّعات میں نہیں ہے۔ جس کی وجوہات میں اپنی جگہ پر بیان کر دوں گا۔ انشاءاللہ

قرآن مجید میں حسب ذیل ۱۳ مقطعات ہیں۔

الٓمٓ ۔ الٓمٓصٓ ۔ الٓرٰ ۔ الٓمٓرٰ ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ ۔ طٰہٰ ۔ طٰسٓمٓ ۔ طٰسٓ ۔ یٰسٓ ۔ صٓ ۔ حٰمٓ ۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ ۔ قٓ ۔

لیکن یہ ایک ایک دفعہ قرآن میں وارد نہیں ہوئے۔ بلکہ بعض کئی کئی دفعہ وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۱۳ مقطعات ۲۸ جگہ وارد ہوئے ہیں۔

الٓمٓ (۶ دفعہ) الٓمٓصٓ (ایک دفعہ)۔ الٓرٰ (پانچ دفعہ) الٓمٓرٰ (ایک دفعہ) کٓھٰیٰعٓصٓ (ایک دفعہ) طٰہٰ (ایک دفعہ) طٰسٓمٓ (دو دفعہ) طٰسٓ (ایک دفعہ) یٰسٓ (ایک دفعہ)۔ صٓ (ایک دفعہ) حٰمٓ (۶ دفعہ) حٰمٓ عٓسٓقٓ (ایک دفعہ) قٓ (ایک دفعہ) اس طرح کل تعداد مقطعات کی ۲۸ ہے۔

الم ۔ المص ۔ الرا ۔ المرا ۔ کھیعص ۔ طہٰ ۔ طسم ۔ طس یسٰ ۔ ص ۔ حٰم ۔ حٰم عسق ۔ ق ۔ اس طرح کل تعداد مقطعات کی ۲۸ ہے۔

مقطّعات کی جماعت بندی

جماعت بندی یا GROUPING کے لحاظ سے بظاہر (۱) ایک کلاس الٓمٓ کی ہے۔ جس میں الٓمٓصٓ بھی شامل ہے (۲) دوسری کلاس الٓرٰ کی ہے جس میں الٓمٓرٰ بھی شامل ہے۔ (۳) تیسری کلاس ط کی ہے جس میں طٰہٰ ۔ طٰسٓمٓ ۔ طٰسٓ داخل ہیں۔ (۴) چوتھی کلاس حٰمٓ کی ہے جس میں حٰمٓ عٓسٓقٓ بھی شامل ہے ۵۔ یٰسٓ ۔ (۶) صرف حرف صٓ (۷) صرف حرف قٓ

گو اس کلاس بندی میں اور طرح بھی ترمیم ہو سکتی ہے مگر یہ صحیح ہے کہ قرآنی ترتیب کے مطابق الٓمٓرٰ ۔ الٓرٰ کی کلاس میں داخل ہے ۔ نہ کہ الٓمٓ کی کلاس میں۔ اب میں سورۃ وار مقطعات لکھتا ہوں۔

بقرہ	الٓمّٓ	مومنون	..
آل عمران	الٓمّٓ	نور	..
نساء	..	فرقان	..
مائدہ	..	شعراء	طٰسٓمّٓ
انعام	..	نمل	طٰسٓ
اعراف	الٓمّٓصٓ	قصص	طٰسٓمّٓ
انفال، توبہ	..	عنکبوت	الٓمّٓ
یونس	الٓرٰ	روم	الٓمّٓ
ھود	الٓرٰ	لقمان	الٓمّٓ
یوسف	الٓرٰ	سجدہ	الٓمّٓ
رعد	الٓمّٓرٰ	احزاب	..
ابراہیم	الٓرٰ	سبا	..
حجر	الٓرٰ	فاطر (یا ملٰئکۃ)	..
نحل	..	یٰس	یٰسٓ
بنی اسرائیل	..	صافات	..
کہف	..	صٓ	صٓ
مریم	کٓھٰیٰعٓصٓ	زمر	..
طٰہٰ	طٰہٰ	مومن	حٰمٓ
انبیا	..	حم سجدہ (فصّلت)	حٰمٓ
حج	..	شوریٰ	حٰمٓ عٓسٓقٓ
زخرف	حٰمٓ	محمد (قتال)	..

دخان	حٰمٓ	فتح	..
جاثیہ	حٰمٓ	حجرات	..
احقاف	حٰمٓ	قٓ	ق

اس کے آگے مقطعات کا سلسلہ بند ہے۔ اوپر ۱/۲ قرآن کی سورتوں کے نام آ گئے ہیں۔ ۱/۲ قرآن اس کے بعد بغیر مقطعات کے ہے ۔

حروف مقطّعات

ان مقطعات میں جو حروفِ تہجی آئے ہیں۔ اُن حروف کا نام حروفِ مقطعات ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح مقطعات ۱۳ ہیں۔ اسی طرح حروف مقطعات بھی تیرہ ہیں جو درج ذیل ہیں ۔

حروف مقطعات قرآنی ترتیب کے مطابق

ا ل م ص ر ك ہ ی ع ط س ح ق = ۱۳

حروف مقطعات بترتیب حروف تہجّی

ا ح ر س ص ط ع ك ل م ہ ی = ۱۳

ہر ایک حرف کتنی دفعہ مقطعات میں موجود ہے

ا	۱۳ دفعہ	ح	۷ دفعہ
م	۶ دفعہ	ك	۱ دفعہ

س	۵ دفعہ	ل	۱۳ دفعہ
ص	۳ دفعہ	م	۱۷ دفعہ
ط	۴ دفعہ	ھ	۲ دفعہ
ع	۲ دفعہ	ی	۲ دفعہ
ق	۲ دفعہ		

آمدم برسر مطلب

مقطعات اور حروفِ مقطعات کے روشناس کرانے کے بعد اور یہ بیان کرنے کے بعد کہ یہ مقطعات بظاہر بے معنی الفاظ نظر آتے ہیں۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ پھر ان کا مطلب کیا ہے۔ اور اس مطلب کے سمجھنے کے کیا اصول ہیں۔ یونہی اپنی طرف سے ایک شخص ایک بے معنی لفظ کے کوئی معنی کرے اور دوسرا دوسرے معنی کر دے اور تیسرا تیسرے معنی کرنے لگے۔ تو بلا قرائن عقلی اور قرآنی دلائل و وجوہات کے ہم اس کو محض تفسیر بالرائے کہیں گے مثلاً قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدُ میں قاف کا مطلب قاھر۔ قہار۔ قدیر۔ قادر۔ قل۔ قال اللہ۔ قدرت۔ اِقْتَرَبَ السَّاعَۃُ۔ قلم۔ قلب۔ قیامت، قرآن۔ قارون۔ یا قاب قوسین اگر کوئی شخص کرے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس کے لئے کوئی قرینہ لفظی یا معنوی یا قرآنی اشارہ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرما یا عقلِ سلیم اور ادبِ لطیف کی تائید بھی تو پیش کرو۔ کیونکہ یونہی بغیر کسی وجہ اور ثبوت کے ایسے معنے تسلیم کر لینے نہایت نامناسب ہوں گے۔ محض قٓ والا لفظ ہونا کافی نہیں۔ تائیدی اور معنوی ثبوت بھی تو ہونا چاہیئے۔ پس کسی نہ کسی قسم کے دلائل بھی ضروری ہیں جن سے ہمارے کئے ہوئے معنوں کی تائید ہو سکے۔

اصل اور جڑ کو پکڑنا چاہیئے

دوسری بات یہ ہے کہ یونہی تیرہ مقامات میں سے کسی ایک کے معنے کر لینے اور باقیوں کے متعلق سکوت اختیار کرنا مثلاً الٓمّٓ کے معنی انا اللّٰہ اعلم کہہ کر باقی پر سکوت اختیار کر لینا ٹھیک اصول نہیں۔ اگر انکشاف حقیقت ہوا ہے تو سب مقطعات پر یا اکثر پر تو حاوی ہونا چاہیئے۔ مثلاً الٓمّٓ کے معنے ہم نے کسی سے پوچھے۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ الف اللہ کا لٓ جبریل کا اور م محمد کا ہے۔ لیکن اسی اصول کے ماتحت اگر پوچھا جائے کہ عٓسٓقٓ سے کس کس کا نام مراد کیا جاوے گا تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے شخص سے پوچھا کہ الٓمّٓ کے معنی کیا ہیں؟ کہنے لگے اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ پوچھا کیا ثبوت؟ کہا حضرت ابن عباسؓ یا حضرت مجاہد نے یہ تفسیر کی ہے۔ پھر پوچھو کہ باقی بارہ مقطعات کی تفسیر ابن عباسؓ یا مجاہد کی بیان کردہ لاؤ تو خاموشی۔ پھر کہو کہ اگر وہ بارہ مقطعات کی تفسیر نہیں کر گئے۔ تو کم از کم کوئی اصول ہی بتا گئے ہوں گے یا اس اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ سے تم خود ہی کوئی اصول باقی قفل کھولنے کے لئے وضع کر دو تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ جی خدا کا کلام ہے۔ اس پر جتنے حروف آئے ہیں وہ سب خدا کے نام ہیں۔ مثلاً صٓ سے مراد صادق وغیرہ طٰ سے مراد لطیف وغیرہ۔ غرض اسماء الٰہی میں کہیں بھی کوئی ویسا حرف مل جائے۔ بس جھٹ اس لفظ کو پکڑ کر آگے رکھ لیا کرو اور وہی ان حروفِ مقطعات کے معنی ہیں۔ سو ایسا طریقہ تو اندھیر نگری ہے۔ علمی اور تسکین قلب کرنے والا طریقہ نہیں ہے پس ہمیں ان مقطعات کے حل کے لئے ایک اصل ڈھونڈنا چاہیئے کہ اصولاً یہ مقطعات ہیں کیا چیز؟ نہ یہ کہ جن حروفِ مقطعات کو چاہا آگے رکھ کر جو چاہے معنی کر دیئے۔ اور اب تک تو پرانے لوگ شاید یہی کرتے رہے ہیں۔ اصولاً پہلے یہ نہیں معلوم کیا گیا۔ کہ مقطعات ہیں کیا؟ پھر اگر

تفصیلات میں کچھ غلطی رہ جائے تو حرج نہیں اس کا درست کر لینا آسان ہے مگر مقطعات کی اصلیت ہی معلوم نہ ہو۔ جھٹ سٓ کے معنی سلام، سمیع، قدوس، واسع یا طٓ کا مطلب معطی۔ مقسط۔ لطیف، باسط۔ یا صٓ کا مطلب بصیر، مصور، صمد وغیرہ لینے لگ جائیں۔ تو سوائے اس کے کہ سننے والا بے اختیار ہنس دے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ پس لازم ہوا کہ پہلے ہم جڑ اور اصلیت مقطعات کی معلوم کریں۔ اور یہی وہ بات تھی جس کی طرف توجہ نہ کرنے سے پہلے مفسر عموماً فرضی اور اندازی معنی کرتے رہے اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

مُقَطّعَات کی اصلیّت

یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کا رحم تھا۔ کہ کچھ مدت گزری کہ ایک دن بجلی کی طرح بلا کسی دقتی غور و خوض کے یہ ایک بالکل نئی بات میرے دل میں پڑی کہ قرآنی مقطعات دراصل سورۂ فاتحہ کے ہی ٹکڑے ہیں اور ان کی یہی اصلیت ہے۔ اس وقت نہ مجھے کبھی یہ خیال آیا تھا اور نہ یہ بات کبھی اس سے پہلے پڑھی یا سنی تھی۔ نہ اس کی کوئی دلیل میرے پاس تھی۔ نہ کوئی قرینہ ذہن میں آیا تھا۔ بالکل ایک دعوٰے ہی دعوٰے تھا۔ جس کا ثبوت میرے پاس کوئی نہ تھا۔ مگر میں نے قرآن کریم کھول کر کچھ توجہ اور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا۔ کہ یہ بات صحیح ہے۔ اور مجھے بعض قرائن اور باتیں ایسی مل گئیں۔ جن سے مجھے انشراح صدر ہو گیا کہ تمام مقطعات صرف فاتحہ کی آیات اور فاتحہ کے الفاظ کا اختصار ہیں۔ اور جس جس سورۃ پر کوئی مقطعہ موجود ہے۔ وہ سورۃ الحمد کی اُس آیت یا لفظ کی تفسیر ہے جس کا اختصاراً وہ مقطعہ ہے۔ مثلاً تمام مقطعات کی تفصیل میں جانے کے بغیر اس وقت صرف آپ کے سمجھنے کے لئے میں الٓمٓ ہی کو لیتا ہوں جو سورۂ بقرہ کے سر پر ہے۔ تفصیلی ذکر آگے چل کر انشاء اللہ کروں گا یہ الٓمٓ الفؔ اور لٓ اور مٓ کا مجموعہ ہے۔ الف

سے مراد انعمت علیہم کا گروہ ہے ل سے ضالین مراد ہیں اور م سے مغضوب علیہم۔ غرض اس سورۃ میں اکثر ذکر تفصیلی طور پر انہی تین جماعتوں کا ہوگا۔ پھر جب ہم اس سورۃ کو پڑھتے ہیں تو شروع میں متقین کا اور اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا اور اگلے رکوع میں دونوں قسم کے منافقین (ضالین کا ذکر ہے۔ پھر آگے چل کر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی فہرست میں جابجا موسیٰ، ابراہیم، اسمٰعیل اسرائیلی اور ابتدائی بنی اسرائیل، سلیمان وغیرہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ذکر اور مسلمانوں کا حال آخر تک پھیلا ہوا ہے اور مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یعنی یہودیوں کی کرتوتوں کا تفصیلی ذکر اور کفارِ عرب کی کارروائیاں اور ضَالِّيْنَ میں عیسائیوں کا ذکر اور عقائد اور منافقین کا ذکر برابر ساری سورۃ میں چلتا ہے اور اکثر یہی ذکر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اور مضامین آتے ہیں۔ ان کی وجہ انشاء اللہ آگے چل کر بیان ہوگی۔ تو اس طرح سے فاتحہ کی آیات یا الفاظ مختصر کر کے قرآن مجید کی بہت سی سورتوں پر لکھے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والا یہ سمجھ لے کہ فاتحہ کی فلاں آیت کی تفسیر اس سورت میں بیان کی گئی ہے۔ سو یہ ہے اصلیت ان مقطعات کی جن سے عموماً لوگ ناواقف ہیں۔ اب میں وہ قرائن اور دلائل بیان کروں گا جن سے اس اصل کو سمجھنے میں عقلی مدد ملے گی اور قرآن کی تائید کا بھی بیان کروں گا جو اس دعوے میں مجھے حاصل ہے۔

ثبوت بذمہ مدعی

چونکہ مدعی کے ذمہ ہر دعویٰ کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس لئے میں بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بعض دلائل بیان کروں گا لیکن بعض باتیں اہلِ علم کے کرنے کی ہوتی ہیں اور ان کا ذہن ایسی مہتم بالشان بات کو اُڑا کر پھر اس کے لئے ثبوت و قرائن خود مہیا کرتا ہے اور نئی نئی شاخیں اور دلائل پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اہلِ علم اصحاب سے خصوصاً انہیں

جن کو قرآن مجید سے شغف ہے میری یہ درخواست ہے کہ میرا یہ خاکہ چونکہ نہایت مختصر ہو گا اس لئے وہ خود بھی اس مسئلہ پر غور کریں اور صرف (جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے) فوری انکار نہ کریں۔ بلکہ سوچیں۔ اور اگر یہ اصل اور حل مقطعات کا ان کو کچھ بھی معقول معلوم ہو۔ تو اس کے لئے مزید تائیدی دلائل اور علمی قرائن مہیا کریں۔ میں نے تو صرف اپنی ذاتی اور شخصی تسلی کے لئے بعض قرائن جمع کئے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اصحاب جماعت کے زیادہ وسیع دائرہ کے لئے مزید علمی ثبوت اس کی تائید کے جمع کر سکیں گے۔ فجزاہم اللہ

قرینہ اوّل

یہ ہے کہ اب تک مقطعات کے جو معنے کئے جاتے رہے ہیں وہ مبہم۔ بلا دلیل اور غیر تسلی بخش ہیں اور اکثر علماء سالفین اسی طرف گئے ہیں کہ یہ مقطعات الٰہی اسرار میں سے بعض اسرار ہیں۔ یا یہ کہ غالباً یہ خدا کے نام ہیں۔ مگر تعین ندارد۔ پھر یہ کہ مقطعات کو ایک لڑی میں پرویا نہیں گیا۔ بلکہ جیسی ضرورت ہوئی معنے کر لئے۔ اور وہ بھی نہایت مجمل اور مبہم۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ مقطعات کی پشت پر کوئی اصل تسلیم نہیں کی گئی۔ اب جبکہ ہم نے بتا دیا کہ یہ سب فاتحہ کی آیات ہیں اور جن سورتوں پر آئی ہیں ان سورتوں میں مخصوص طور پر فاتحہ کی اس آیت یا ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے تو اب ایک دلکش اصل اور مسلسل غیر مبہم با دلیل وجہ اور کنجی ہمارے ہاتھ میں آ گئی جس سے ہم سب خزانہ ان مقطعات کا بیک وقت کھول سکتے ہیں۔

قرینہ دوم

دوسرا قرینہ میرے دعویٰ کے ثبوت میں یہ ہے کہ تمام حروفِ مقطعات خود سورہ فاتحہ میں موجود ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں جو نہ ہو۔ اب میں سورہ فاتحہ کے حروف لکھتا ہوں اور نیچے

دوسری سطر میں حروف مقطعات لکھتا ہوں۔

حروف فاتحہ۔ ا ب ت ح د ذ ر س ص ض ط ع غ ق ک ل م ن و ی۔

۳۰ حروف

حروفِ مقطعات: ا ۔ ح ر س ص ط ع ق ک ل م ہ ی ۱۴ حروف

اس فہرست سے یہ معلوم ہوگیا کہ تمام کے تمام حروفِ مقطعات فاتحہ میں موجود ہیں۔ نیز یہ کہ سات حروفِ تہجی ایسے ہیں جو سورۃ فاتحہ میں موجود نہیں ہیں یعنی ث ۔ ج خ ز ش ظ ف ۔ اگر خدانخواستہ اِن حروف میں سے ایک حرف بھی حروفِ مقطعات میں آجاتا تو میرا سارا دعوٰے ہی باطل اور تہس نہس ہوکر رہ جاتا۔ مگر میرے دعوٰے کی صحت پر یہ بھی ایک زبردست قرینہ ہے کہ کوئی حرف بھی حروفِ مقطعات میں سے فاتحہ کے حروف سے باہر نہیں ہے۔ حالانکہ کئی حروفِ تہجی ایسے ہیں جو فاتحہ میں پائے نہیں جاتے۔

قرینہ سوم

تیسرا قرینہ ان مقطعات کے فاتحہ کی آیات ہونے کا یہ ہے کہ ہر مفسر کا قاعدہ ہے کہ وہ جب کسی آیت یا شعر یا عبارت کی تفسیر کرتا ہے۔ تو اس کو بطور متن کے ضرور پہلے لکھ دیتا ہے۔ پھر آگے اس کی تعبیر یا تفسیر مفصل کرکے لکھتا ہے۔ یہی طریقہ مفسرین والا اللہ تعالیٰ نے بھی سورتوں میں اختیار کیا ہے یعنی پہلے بظاہر ایک بے معنی لفظ لکھا ہے۔ پھر اس کے بعد ایک سورۃ بطور تفسیر اُس لفظ کے بیان کی ہے۔ پس بظاہر حالات ہر سورۃ جس پر مقطعات آئے ہیں۔ اس مقطعہ کی تفسیر ہے جو اس کے سر پر لکھا گیا ہے۔ اور یہی دُنیا کے جُملہ مصنفوں کا طریقہ ہے۔ خواہ کسی زبان اور کسی مضمون کے ہوں۔ گویا مقطعات وہ ہیڈنگ یا سُرخیاں ہیں۔ جن کی تفصیل یا تفسیر ان سورتوں میں بیان ہوئی

ہے۔ اسی عالمگیر مروّجہ اصُول پر قرآن بھی چلتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ یہ سُرخیاں الحمد کے ہی اجزاء ہیں۔ اس طرح ثابت ہے کہ خود قرآن کے فرمودہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ارشادات کے ماتحت سارا قرآن مجید خود سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ اور دوسری طرف بموجب مروّجہ طریقہ مفسرین بظاہر یہ بے معنی الفاظ اکثر سورتوں سے پہلے اس طرح لکھے ہیں۔ کہ گویا وہ سورتیں انہی الفاظ کی تفسیر ہیں۔ پس ایک طرف قرآن فاتحہ کی تفسیر ہے۔ دوسری طرف نظر آتا ہے کہ قرآنی سورتیں ان مقطعات کی تفسیر ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مقطعات ہی فاتحہ ہیں۔ کیونکہ جب ایک طرف یہ فرمایا گیا۔ کہ قرآن فاتحہ کی تفسیر ہے۔ دوسری طرف ہمیں اپنی آنکھوں سے عقلی اور رواجی طور سے نظر آتا ہے کہ قرآنی سورتیں ان مقطعات ہی کی تفسیر ہے تو لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مقطعات کوئی الگ چیز نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ ہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تفسیر کی غرض سے قرآنی سورتوں پر ان مقطعات کی صورت میں پھیلا دیا گیا ہے۔

قرآن فاتحہ کی تفسیر ہے

ہماری جماعت کا یہ مشہور عقیدہ ہے کہ قرآن کا متن فاتحہ ہے۔ اور باقی قرآن اس فاتحہ کی تفسیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی یہی فرمایا ہے کہ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے یا اُمّ القرآن ہے اور صحابہؓ میں ام القرآن کا لفظ فاتحہ کے لئے بکثرت رائج تھا۔ اور یہ بات احادیث کی کتابوں سے ثابت ہے۔ پس جب اس سورۃ کو قرآن کی ماں کہا گیا۔ تو اس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ قرآن اس کی تفسیر ہے اور یہ قرآن کا متن ہے۔

علاوہ اس کے خود قرآن بھی فاتحہ کو متنِ قرآن کہتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر: ۸۸)

ترجمہ:۔ اور ہم نے یقیناً تجھے سات دہرائی جانے والی (آیات) اور (بہت بڑی) عظمت والا قرآن دیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ ہم نے تجھے سات آیتیں مکررات ذاتی والی عنایت کی ہیں۔ اور قرآنِ عظیم عطا فرمایا ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ فاتحہ ہی سبعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ ہے اور یہی قرآنِ عظیم ہے۔ یہ معنی بخاری اور ترمذی دونوں میں بلکہ دیگر احادیث کی کتب میں بھی موجود ہیں۔ جہاں آپؐ نے فرمایا۔

لَاُعَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ اَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْاٰنِ .... قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهٗ (بخاری پارہ ۱۸ صفحہ ۴۳ مترجم مولوی وحیدالزمان)

اس حدیث کا ترجمہ مولوی وحیدالزماں صاحب یوں کرتے ہیں۔ "فرمایا وہ الحمد کی سورت ہے اس میں سات آیتیں ہیں جو دوبارہ پڑھی جاتی ہیں۔ اور یہی سورۃ وہ بڑا قرآن ہے جو مجھ کو دیا گیا۔" پس سبع المثانی بھی یہی سورت ہے جس میں سات آیات ہیں اور یہی قرآنِ عظیم بھی ہے۔ قرآنِ عظیم کا لفظی ترجمہ ہی متنِ قرآن ہے۔ کیونکہ متن میں وہ سارا بلکہ اس سے زیادہ مضمون مخفی ہوتا ہے جو کسی تفسیر میں بیان ہو۔ یہاں عظیم کا لفظ بلحاظ تعداد آیات کے نہیں بلکہ عظمت مضمون کے ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب فاتحہ قرآنِ عظیم ہے تو باقی قرآن جو ہے وہ کتاب مفصل قرآنِ مبین اور قرآنِ حکیم ہے۔ جیسا کہ قرآن کا خود دعویٰ ہے یعنی فاتحہ کی تفصیل اور تفسیر کرنے والا اور متن کو بیان کرنے والا اور قرآنِ عظیم یعنی الحمد کی حکمتیں اور معارف بیان کرنے والا گویا دوسرے الفاظ میں تفسیر فاتحہ ہے۔ پس اس آیت کی رُو سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کے مطابق فاتحہ قرآنِ عظیم ہے۔ یعنی متن قرآن جس میں سب مضامین بھرے ہوئے ہیں۔ اور اس کے

اندر ساری عظمتیں قرآن کی مخفی ہیں اور باقی قرآن اس کی تفصیل اس کا بیان اور اس کی حکمتیں ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے فاتحہ کو قرآنِ عظیم کہا گیا۔ اور باقی قرآن کو قرآنِ عظیم نہیں کہا گیا۔ بلکہ اس کو کتاب مفصل قرآنِ مبین اور قرآنِ حکیم کا نام دیا گیا۔ سو ہم نے قرآن سے ہی یہ استنباط کر دیا۔ کہ فاتحہ متن ہے اور قرآن اس کی تفسیر۔ پس جب ایک طرف مفسر خود کہتا ہے کہ قرآن فاتحہ کی تفسیر ہے۔ دوسری طرف بجائے فاتحہ کے کچھ مقطعات سورتوں کے سر پر بطور متن کے لکھے ہوئے ہیں۔ تو یہ ظاہر ہو گیا۔ کہ یہ مقطعات دراصل فاتحہ کے ہی اجزاء ہو سکتے ہیں۔ جن کی تفسیر ان سورتوں میں مذکور ہے کوئی علیحدہ اور نئی چیز نہیں۔

چوتھا قرینہ

چوتھا قرینہ یہ ہے کہ اگر تمام مقطعات کو ایک سطر میں خوشخط اور صاف صاف لکھا جائے۔ تو اگرچہ یہ الفاظ بظاہر بے معنی ہیں۔ اور ہر مقطعہ کا سورۂ فاتحہ کا جزو ہونا غور اور فکر کے بعد واضح ہوتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے صرف ظاہری نظر سے بھی کچھ تھوڑی سی پہچان یہاں ایسی رکھ دی ہے کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی بعض مقطعہ کو دیکھتے ہی بول پڑے گا کہ یہ تو فاتحہ کی فلاں آیت کا اختصار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور طرف اس کا ذہن نہیں جائے گا۔ مثلاً الٓمٓ۔ کٓهٰیٰعٓصٓ۔ قٓ۔ صٓ۔ الٓرٰ وغیرہ کو دیکھ کر ناواقف آدمی کہہ دے گا کہ مجھے معلوم نہیں ان کا کیا مطلب ہے۔ مگر طٰسٓمٓ کی بابت اس کو اگر پوچھا جائے کہ بھلا یہ کس قرآنی آیت کا اختصار ہو سکتا ہے تو فوراً وہ کہہ دے گا یہ مقطعہ تو صِرَاطَ مُسْتَقِيْمَ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ پس جہاں خدا تعالیٰ نے بارہ مقطعات پردہ کے پیچھے اوجھل کر دیئے ہیں کہ انسان کی معمولی نظر ان کی کنہہ کو جلدی نہ معلوم کر سکے وہاں ایک مقطعہ کو بطورِ نمونہ نہایت واضح طور پر ایسا بنا دیا ہے کہ اس کی بناوٹ دیکھ کر ہی انسان فوراً یہ بول اُٹھے کہ ہو نہ ہو یہ تو صراطِ مستقیم کا مخفف شدہ

مقطعہ ہے۔ پس جہاں سے بھی یہ نتیجہ نکلا۔ جب ایک مقطعہ الحمد کے ایک حصّہ کا اختصار معلوم ہوتا ہے تو دوسرے مقطعات بھی غالباً فاتحہ ہی کے ٹکڑے ہوں گے صرف غور کرنے اور سوچنے کی دیر ہے مشتے نمونہ فردارے

پانچواں قرینہ

پانچواں قرینہ سب سے زبردست ہے اور وہ یہ ہے کہ فاتحہ کو خود اللہ تعالیٰ نے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ فرمایا ہے۔ یعنی وہ سات آیتیں جو مثانی ہیں۔ مثانی کے معنی لوگوں نے عجیب عجیب کئے ہیں یعنی سورۂ فاتحہ بار بار پڑھی جاتی ہے اس لئے مثانی ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیا قرآن کی اور آیات اور درود اور تسبیح اور دعائیں یہ سب بار بار نہیں پڑھے جاتے۔ پس یہ کوئی ایسا امتیاز نہیں ہے۔ دوسرے معنی یہ کئے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں ایک دفعہ نازل ہوئی اور دوسری دفعہ مدینہ میں۔ یہ توجیہہ بھی قابلِ اعتنا نہیں ممکن ہے یہ درست ہو۔ مگر دو دفعہ صرف فاتحہ کی آیات ہی نازل نہیں ہوئیں۔ بلکہ قرآن میں بہت سی آیات ہیں جو دو دو تین تین سات سات۔ دس دس دفعہ نازل ہوئیں۔ اور آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تو اکتیس دفعہ نازل ہوتی ہے۔ سو یہ کوئی خصوصیت فاتحہ ہی کی نہیں۔ بلکہ اور بہت سی آیات کی بھی ہے۔ پس صرف دہرایا جانا یا ایک دفعہ سے زیادہ نازل ہونا کوئی خاص خصوصیت فاتحہ کی نہیں۔ اب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جس کی طرف عربی دان خود رجوع کریں۔ مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ مثانی مثنٰی کی جمع ہے۔ (تسہیل العربیہ) یعنی اس کی سب آیتیں دو دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ اور مفرداتِ راغب میں بھی اس کے معنے مکرّر کے لکھے ہیں اور مثانی ان چیزوں کو کہتے ہیں جو ما بعد الاوّل ہوں یعنی ایک دفعہ کے بعد مکرّر آئیں اور بخاری کتاب التفسیر میں بھی یہی ذکر ہے کہ فاتحہ دوبارہ نازل ہوئی ہے۔ اور مثانی کا ترجمہ وہاں مولوی وحید الزماں صاحب نے بھی

بھی کیا ہے۔ کہ "جو دوبارہ پڑھی جاتی ہیں۔" پس خلاصہ کلام یہ ہوا کہ سورۂ فاتحہ سات آیتوں والی وہ سورت ہے۔ جو ساری کی ساری مکرّر یعنی دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔ دوسری طرف جب ہم قرآنِ مجید کا رویہ دیکھتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ جو آیت بھی اس میں دوسری تیسری یا زیادہ دفعہ نازل ہوئی ہے وہ تحریر میں آگئی ہے اور قرآن میں موجود ہے۔ یہ نہیں کہ ایک آیت جب دوسری دفعہ نازل ہو تو اُسے تحریر میں نہ لایا جائے۔ جبکہ جتنی دفعہ وہ نازل ہوئی ہے۔ اتنی ہی دفعہ وہ تحریر قرآن میں موجود ہے۔ پس ضروری ہے کہ فاتحہ بھی جب مکرّر نازل ہوئی ہے تو قرآن میں کسی دوسری جگہ موجود ہو۔ ورنہ دعوٰے مثانی ہونے کا غلط ثابت ہوتا ہے۔ اب ہمیں سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ جب ایک فاتحہ موجود ہے تو دوسری فاتحہ کو تلاش کریں۔ مگر تلاش کرنے پر وہ ہمیں کہیں نہیں ملتی اب آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کہاں ہے ؟

سو دوسری فاتحہ یہی تو ہے جو مقطعات کی صورت میں نازل ہو کر سارے قرآن میں پھیلی پڑی ہے اور باوجود مثانی یعنی مکرّر تحریر ہو جانے کے بھی اب تک لوگوں کو نظر نہیں آئی۔ پس آپ یا تو اس دلیل کو ملنیئے اور اپنی آنکھیں فاتحہ مکرر سے روشن کیجئے۔ ورنہ آپ ایک عظیم الشان قرآنی صداقت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ اور اگر یہ دوسری فاتحہ نہیں ہے۔ تو پھر آپ فرمائیے کہ وہ مکرّر فاتحہ کہاں مخفی ہے ؟

ایک اعتراض کا جواب

ان قرائن کے بعد اب میں ایک ضروری اعتراض کا جواب لکھتا ہوں جو اس ضمن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ جب سارا قرآن فاتحہ ہی کی تفسیر ہے تو پھر بہت سی سورتوں پر مقطعات کیوں نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ قٓ کے بعد آخر قرآن تک کوئی مقطعات نہیں ہیں۔ اور درمیان میں نسا، مائدہ، انعام۔ انفال۔ نحل۔ بنی اسرائیل۔ کہف۔ انبیا ر

حج۔ مومنون۔ نور۔ فرقان، احزاب، سبا۔ فاطر۔ صافات۔ زمر۔ محمد۔ فتح۔ حجرات جیسی بڑی سورتیں باوجود اس کے کہ وہ فاتحہ ہی کی تفسیر ہیں۔ کیوں مُقَطّعات سے خالی ہیں ؟

اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ جب ایک مقطعہ مثلاً الٓمّٓ کی ایک سورت قرآن میں آگئی تو اس کے بعد جتنی سورتیں بغیر مقطعات کے ہوں گی وہ سب اسی مقطعہ الٓمّٓ کے ماتحت ہی ہوں گی۔ مثلاً سورۃ آل عمران جس پر الٓمّٓ ہے۔ اس کے بعد نساء، مائدہ اور انعام بغیر مقطعات کے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا مقطعہ بھی الٓمّٓ ہی ہے۔ اور جب تک نیا مقطعہ آئندہ سورۃ پر ظاہر نہ ہو۔ وہی مقطعہ چلتا رہے گا۔ یہ توجیہہ ایک عمدہ توجیہہ ہے بشرطیکہ اس پر سے ایک اعتراض ہٹا دیا جائے اور وہ اعتراض یہ ہے کہ اس اصول کے ماتحت پھر خود آل عمران پر بھی الٓمّٓ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہی سورۃ بقرہ والا الٓمّٓ کافی تھا۔ آل عمران پر دوبارہ الٓمّٓ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پے درپے سات سورتوں میں حٰمٓ لانے کی کیا حاجت تھی ؟ صرف پہلا حٰمٓ کافی تھا۔

دوسرا ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ مثلاً قٓ قرآن مجید کا آخری مقطعہ ہے یا بقول بعض لوگوں کے نٓ آخری مقطعہ ہے جس کے بعد سورۃ الناس تک کوئی مقطعہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ سورۃ قٓ یا سورۃ نٓ سے آخر قرآن تک یہی قٓ یا نٓ کا مقطعہ ان باقی سب سورتوں کا بھی مقطعہ ہے ؟ لیکن قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قٓ یا نٓ کے معنے باقی کی ہر صورت پر حاوی نہیں ہوتے۔ یعنی یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ نٓ کے بعد کی تمام کی تمام سورتیں ساری ہی ہم مطلب ہیں بلکہ مضامین میں اس قدر اختلاف ہے کہ سوائے ایک خاص مقطعہ کے ان کے مضامین نہ قٓ کے ماتحت آتے ہیں نہ نٓ کے۔

اب اعتراض مندرجہ صدر کا جواب میں اپنے علم کے مطابق دیتا ہوں جس سے اُوپر کی دونوں توجیہات کے بدلے میں ایک نئی توجیہہ پیش کروں گا۔ جو اگر قابلِ قبول ہو

تو اسے بھی ذہن میں مستحضر رکھا کریں۔

اعتراض یہ تھا کہ جن سورتوں پر مقطعات نہیں ہیں کیا وہ اَلْحَمْدُ کی تفسیر سے باہر ہیں اور اگر باہر نہیں ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان پر مقطعات نہیں آئے ؟

دوسرا اعتراض مثانی کے متعلق

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے جو معنی مثانی کے کرکے فاتحہ سے ان کو مخصوص کر دیا ہے تو شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ایک اور جگہ یہ آیت نازل کی ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ...... (الزمر: ۲۴)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے بہتر سے بہتر بات یعنی وہ کتاب اُتاری ہے، جو متشابہ بھی ہے اور اِس کے مضمون نہایت اعلیٰ ہیں۔ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اُن کے جسموں کے رونگٹے اس کے پڑھنے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب اگر مثانی کے معنے مکرر نازل ہونے والی کے ہیں۔ تو یہاں تو یہ مثانی کا لفظ قرآنِ مجید کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ کیا یہاں بھی آپ وہی معنے اور مطلب لیں گے۔

۱۔ جواب اوّل: میں خود تو اس آیت کو بھی فاتحہ پر ہی لگاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک سورۃ احسن الحدیث نازل کی ہے۔ اور وہ سورۃ مثانی ہے۔ یہاں احسن الحدیث کے معنی سورۃ فاتحہ ہی ہیں۔ کیونکہ تمام قرآن میں احسن الحدیث یعنی سب سے اعلیٰ اور احسن سورۃ فاتحہ ہی ہے اور احسن الحدیث کے دوسرے لفظی معنے قرآن العظیم ہی کے ہیں۔ عظیم بمعنی احسن اور حدیث بمعنی قرآن کے یا ایک جملہ فاتحہ کو قرآنِ عظیم یعنی عظیم الشان پڑھنے کے لائق کلام کہا گیا ہے۔ تو دوسری جگہ اسی فاتحہ

کو بہترین کلام فرمایا گیا ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ یہاں فاتحہ کو کتاب متشابہ بھی کہا گیا ہے اور بسبب عجیب در عجیب اور کثرت و وُسعتِ معانی کے جس قدر فاتحہ کی آیات متشابہ ہیں ویسی قرآن کی اور کوئی آیات متشابہ نہیں ہیں ۔

(۲) جواب دوم یہ ہے کہ اگر قرآنِ مفصّل پر ہی ان آیات کا اطلاق مان لیا جائے۔ تو بھی یہاں مثانی کے یہ معنے نہیں کہ قرآن کی ہر آیت دوبارہ نازل ہوئی ہے۔ یا ہر آیت قرآن کی متشابہ ہی ہے۔ بلکہ یہ کہ اس میں سینکڑوں ایسی آیات ہیں جو مکرّر نازل ہوتی ہیں۔ اور ہزاروں ایسی ہیں جو متشابہ بھی ہیں۔ اگر بموجب آیت مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ کے اس میں محکم آیتیں بھی ہیں۔ پس یہ آیت مثانی والی سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کے مخالف معنی نہیں دیتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں صرف مکررات کا ذکر ہے جو قرآن مجید میں بکثرت ہیں اور وہاں سات مکررات کا ذکر ہے۔ یعنی سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کا۔ دوسرے لفظوں میں الحمد کی ساتوں آیات کو مکررات کہا ہے مگر قرآنِ مفصّل کی مکررات کی تعیین نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ کہہ دیا ہے کہ اس کی بہت سی آیات مکرّرات میں سے ہیں اور بہت سی متشابہ ہیں۔

خلاصہ کلام

یہاں تک تو مقطعات کا اصولی بیان تھا یعنی یہ کہ :-

۱۔ یہ فاتحہ کی آیات یا الفاظ کے اختصارات ہیں۔

۲۔ جس سورت پر جو حروف ہیں۔ اُن کے مطابق اس صورت میں فاتحہ کی تفسیر ہے۔

۳۔ جن سورتوں میں مقطعات نہیں ہیں یا جن میں ہیں ان میں بھی ایک مجمل تفسیر سورۂ فاتحہ کی ہوتی ہے۔ وہ اس لئے کہ ہر سورۃ کے سر پر فاتحہ کا خلاصہ اور اس کی آیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ موجود ہوتی ہے۔ پس کوئی سورت اس وجہ سے فاتحہ کے اثر اور تفسیر سے خالی نہیں ۔

۴۔ تمام قرآنِ مجید فاتحہ کی ہی تفسیر ہے ۔

۵۔ قرآنِ عظیم فاتحہ ہی ہے

۶۔ فاتحہ کے سوا دوسرا قرآن تو قرآنِ مبین (مفسر) قرآنِ حکیم (اُمّ الکتاب کی حکمتیں کھولنے والا) کتابِ مُفَصّل (تفسیر کرنے والی کتاب) ہے ۔

۷۔ مکرّر نزول فاتحہ کا مقطعات کی صورت میں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ ہے۔ کہ ساتوں آیتیں مکرّر نازل ہوکر صورت تحریر میں قرآن کے اندر موجود ہیں ۔

۸۔ تمام حروفِ مقطعات سورۂ فاتحہ میں موجود ہیں۔ اور کوئی ایسا نہیں جو سورہ فاتحہ میں داخل نہ ہو ۔

۹۔ مقطعات میں سے بعض ایسے ہیں جو نمایاں طور پر فاتحہ کے ٹکڑے نظر آتے ہیں ۔ مثلاً طٰسٓمٓ یا عسٓقٓ جو مخفف ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دو آیات کا ۔ یہ تو موٹی نظر سے دکھائی دیتے ہیں۔ باقی اسی طرح باریک نظر سے اور مقطعات کو ان سورتوں کے مضمونوں کے ساتھ تطابق دینے کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔ یعنی یہ دو مثالیں تو واضح ہیں۔ باقی ایسی واضح نہیں تاکہ سوچنے والوں اور محنت کرنے والوں کے لئے راستہ کھلا رہے ۔

مُقَطَّعَات میں حروفِ مُقَطَّعَات کی ترتیب

حروف مقطعات کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اسی ترتیب سے ہوں جس ترتیب سے وہ اس آیت میں واقع ہوئے ہیں ۔ جن کا وہ مقطعہ ہیں ۔ مثلاً میں پہلے ذکر

کرچکا ہوں کہ الـمٓ سے مراد اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور ضالین اور مغضوب علیہ لوگ ہیں۔ یعنی الف سے مراد اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور ل سے ضالین اور م سے مراد مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ لیکن سورہ فاتحہ میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا ذکر پہلے ہے اور ضالین کا آخر میں۔ پس بظاہر مقطعہ کی شکل امّل ہونی چاہیئے تھی۔ مگر چونکہ اس میں ترتیل اور روانی نہیں رہتی۔ اور چونکہ ہر حرف کسی لفظ یا آیت کا اختصار ہے۔ دوسرے حروف کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے برعایت روانیٔ تلاوت و ترتیل وہ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ مثلاً کٓهٰيٰعٓصٓ مفصلہ ذیل تین آیات کا اختصار ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ...... اصلی ترتیب کے لحاظ سے اسے کٓهٰيٰعٓصٓ ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ تلاوت کی روانی اور ترتیل میں حرف عین پر سخت ناگوار ٹھوکر لگتی تھی۔ اس لئے ترتیب حروف بدل دی۔ پس یہ ضروری نہیں کہ یہ حروف آیات ہی کی ترتیب کے موافق ہوں۔ بلکہ وہ ترتیل اور قرأت کی سہولت کے مطابق ہوں گے۔ اسی طرح طٰهٰ جو اِهْدِنَا الْمُسْتَقِيْمَ کا مخفف ہے۔ بجائے هٰطٰ کے طٰهٰ پڑھا جائے گا۔ کیونکہ یہ معاملہ خوش آوازی اور ترتیل سے پڑھنے کے متعلق ہے۔

ایک مقطعہ کئی معنوں اور کئی مقاموں کے لئے آسکتا ہے

دوسری بات مقطعات میں یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک مقطعہ یا ایک حرف مقطعہ بعینہٖ ایک ہی آیت یا ایک ہی لفظ کے لئے مخصوص کر دیا جاوے۔ گویا کہ وہ ایک معرفہ کی طرح ہو جائے۔ بلکہ جس طرح ریلوے میں این۔ ڈبلیو۔ آر (N.W.R) سے مراد نارتھ ویسٹرن ریلوے تو ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جہاں کسی ریل کے ڈبہ پر این کا حرف دیکھا وہاں ہمیشہ اس کے معنی نارتھ ہی لئے جائیں۔ ایک ہی مال گاڑی کے ایک ڈبہ میں این ڈبلیو

آر میں این کے معنی نارتھ کے ہوں گے اور جس ڈبہ پہ این۔جی۔ایس۔آر (N.G.S.R) لکھا ہوگا۔اس کو ہم نظام گارنٹیڈ سٹیٹ ریلوے پڑھیں گے۔یہ نہیں کہ وہاں بھی این کو نارتھ کا مخفف سمجھیں۔یہ نکتہ علاوہ دنیا کے رواج کے ہیں نے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہامات سے بھی سمجھا ہے۔حضور کو اپریل ۱۹۰۸ء میں الہام ہوا کہ میاں منظور محمد صاحب کی بیوی مرض سل سے بیمار ہے۔اس کی نسبت الہام ہوا ہے۔ حم۔ تلک آیات الکتاب المبین " فرمایا کہ لفظ حم میں بیمار کا نام بطور اختصار ہے۔" (یعنی محمدی بیگم) مگر ایک سال پہلے یعنی اپریل ۱۹۰۷ء میں حضور کو یہی الہام ہوا کہ "حٰمٓ ٥ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ " فرمایا کہ حم مقطعات میں کسی کا نام ہے۔" آگے سارے باقی متعلقہ الہامات پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر یہ سب سلسلہ الہامات غیر مبائعین کے لئے ہے پس یہاں حٰمٓ جو کسی کا نام ہے وہ محمود ہی ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں۔پس یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ جسطرح کبھی محمدی بیگم کے لئے حم آسکتا ہے تو کبھی محمود کے لئے۔ تو ایک ہی مقطعہ بوقت ضرورت مختلف اشخاص یا آیات کے لئے بولا جاسکتا ہے۔جہاں وہ حروف پائے جاتے ہوں۔نیز ان الہامات سے یہ بھی استنباط ہوتا ہے۔حٰمٓ کا مقطعہ اسماء کے لئے استعمال ہونا چاہیئے۔چنانچہ میری تحقیق میں وہ الحمد کے سب اسماء الٰہی کا ہی نمائندہ ہے۔یعنی فاتحہ کی آیات نمبر ۲۔۳۔۴ کا۔

اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح ایک ہی مقطعہ دو مختلف معنی دے سکتا ہے۔اُسی طرح ایک آیت یا ایک لفظ کے لئے موقع اور محل کے لحاظ سے الگ الگ کئی مقطعات بن سکتے ہیں۔مثلاً سٓ اور قٓ دونوں مستقیم کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ صٓ اور طٓ دونوں صراط کے لئے مخفف کئے جا سکتے ہیں حٰمٓ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی جگہ بھی آسکتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی جگہ بھی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے مجموعہ کے لئے بھی

پس جس سورۃ پر یہ مقطعہ ہوگا۔ ہم اس کے مضامین کو دیکھ کر فتوے دیں گے کہ اس سورۃ کے مضامین کے لحاظ سے یہ مقطعہ فاتحہ کی کس آیت یا کن آیات کے مجموعہ کا اختصار ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مقطعہ کے حروف ان آیات میں موجود ہوں اور نہ صرف موجود ہوں بلکہ ضروری حصہ ان کا موجود ہو۔ مثلاً صراط کے حروف مقطعات یا صؔ یا طؔ ہو سکتے ہیں مگر ر اور الف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اختصار کے وقت ہمیشہ نمایاں حروف کو سامنے لایا جاتا ہے۔

ایک آیت کے لئے کئی مقطعات ہو سکتے ہیں۔ یہ بات عام ہے اور معیوب نہیں۔ مگر ایک مقطعہ کے معنی اکثر جگہ ہمیشہ الگ الگ ہوں۔ یہ بات نہایت شاذ ہے۔ کیونکہ ایسا ہو تو احسن نہیں رہتا۔ پس یہ بات گو شاذ ہے مگر ممکن ہے۔

نٓ حروف مقطعات میں نہیں ہے

میرے نزدیک سورۃ قلم میں جو 'ن' ہے وہ مقطعات میں نہیں ہے۔ اور اس کے چند دلائل ہیں۔

۱۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ نون ایک بامعنی لفظ ہے جس کے معنی دوات کے سب عربی ڈکشنریوں میں لکھے ہیں۔ اور مقطعات کے بذاتِ خود کوئی معنی کسی جگہ نہیں ہوئے۔

۲۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر مقطعہ کے بعد یا آیت کا نشان ہے یا وقف کا نشان ہے۔ مگر ن کے بعد نہ آیت ہے نہ وقف۔ پس وہ مقطعہ نہ ہوا۔ یعنی کٹا ہوا ٹکڑا جو اگلی آیت سے علیحدہ ہو۔ بلکہ وہ ایک صاف اور روان عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ دوات اور قلم اور جو کچھ ان سے لکھا جاتا ہے (ان کے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہوگا) کہ تو اے محمدؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے۔ پس جو لفظ ایک مسلسل آیت کا بامعنی حصہ ہے وہ مقطعہ نہ ہوا۔

۳۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حرف نٓ فاتحہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نہ کسی خاص

لفظ یا آیت کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ضآلین کا نمائندہ آپ اسے بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ ضالین کا نمائندہ یا ض ہوسکتا ہے یا آل۔ ین تو فقط جمع کی علامت ہے۔ ضال کی اصلیت اس میں نہیں پائی جاتی۔

مقطعات کے بعد رموز

قرآن میں ۱۳ مقطعات ہیں جو ۲۸ جگہ وارد ہوئے وہ تیرہ حسب ذیل ہیں۔
۱۔ الٓمٓ ۲۔ الٓمٓصٓ ۳۔ الٓرٰ ۴۔ الٓمٓرٰ ۵۔ کٓھٰیٰعٓصٓ ۶۔ طٰہٰ
۷۔ طٰسٓمٓ ۸۔ طٰسٓ۔ ۹۔ یٰسٓ ۱۰۔ صٓ۔ ۱۱۔ حٰمٓ ۱۲۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ
۱۳۔ قٓ۔ ان میں سے۔

الٓمٓ ۝ الٓمٓصٓ ۝ کٓھٰیٰعٓصٓ ۝ طٰہٰ ۝ طٰسٓمٓ ۝ یٰسٓ ۝
حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ ان آٹھ کے بعد آیت کا نشان ہے۔

الٓرٰ قف الٓمٓرٰ قف طٰسٓ قف صٓ قف قٓ قف

ان مقطعات کے بعد آیت کا نشان نہیں بلکہ صرف وقف کا نشان ہے۔ آیت آگے جاکر ختم ہوتی ہے۔

اس سے میں یہ استنباط کرتا ہوں کہ جن مقطعات کے بعد آیت کے نشان ہیں وہ خود پوری ایک آیت یا کئی آیات کے نمائندے ہیں۔ ورنہ ان کے آگے آیت کا نشان چہ معنی دارد۔ لیکن جن مقطعات کے بعد صرف وقف کی علامت ہے اور آیت نہیں ہے وہ پوری آیت یا زیادہ کے نمائندہ نہیں ہیں۔ بلکہ خاص لفظ یا الفاظ کے نمائندہ ہیں مثلاً۔

۱۔ الٓمٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ
ترجمہ: یہی کامل کتاب ہے، اس (امر) میں کوئی شک نہیں۔

۲۔ حٰمٓ ۝ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝

ترجمہ: یہ (یعنی اس سورۃ کی آیات) ایک مدلل کتاب کی آیات ہیں۔

۳۔ طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ○ (طٰهٰ ۲،۳)

ترجمہ: ہم نے تجھ پر (یہ) قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو دکھ میں پڑ جائے۔

وغیرہ میں طٰهٰ اور حٰمٓ اور الٓمٓ پوری آیت ہے کیونکہ اس کے بعد آیت کا نشان ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ طٰهٰ اختصار ہو۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا جو ایک پوری آیت ہے۔ یا الٓمٓ اختصار ہو اَلْحَمْدُ کی آخری آیت کا۔ جیسے کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے یا حٰمٓ اشارہ ہو۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ تین آیات کا جو مجموعہ ہیں۔ اسمِ اعظم اُمّ الصفات الٰہیہ کا۔ لیکن ہیں یہ سب پوری آیتوں کے نمائندے۔

برخلاف اس کے جن مقطعات کے آگے صرف وقف کا نشان ہے اور آیت کا نشان نہیں ہے۔ مثلاً

۱۔ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ ○ (صٓ: ۲)

۲۔ الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○ (یوسف: ۲)

۳۔ قٓ قف وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ○ (قٓ: ۲)

تو ظاہر ہے کہ یہاں صٓ یا قٓ یا الٓرٰ فاتحہ کی کسی پوری آیت کے نمائندہ نہیں ہیں بلکہ صرف کسی لفظ خاص کے یا بعض الفاظ کے نمائندہ ہیں۔ کیونکہ الٓرٰ اور تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ مل کر قرآن کی صرف ایک آیت محسوب ہوتی ہے۔ پس یہ مقطعات خود پوری آیت نہیں ہیں۔ بلکہ بعض بعض خاص الفاظ کے نمائندے ہیں۔ مثلاً غالباً ص سے مراد صرف صراط ہے اور ق سے مراد صرف مُسْتَقِيْم ہے اور الٓر سے مراد غالباً صرف اللہ اور رب ہے۔ یا ممکن ہے کہ کوئی اور لفظ ہوں۔ مگر یہ پانچ مقطعات خود پوری آیت نہیں ہیں۔ اور نٓ جیسا میں نے پہلے بیان کیا، نہ آیت رکھتا ہے نہ وقف، اور اپنی

آیت میں بسبب اپنی معانی کے ایک مسلسل بامعنی فقرہ بنا دیتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک وہ حروفِ مقطعات میں سے نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(نوٹ: المرٰ کو جو میں نے الٓمٓ کی فوج کی بجائے الٓرٰ کی فوج میں رکھا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ اس کے بعد وقف کا نشان ہے نہ کہ آیت کا۔ برخلاف اس کے المٓصٓ کے بعد آیت کا نشان ہے۔ پس وہ الٓمٓ کی فوج میں داخل ہے)۔

سورۂ فاتحہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

یہ نمبر لگائی ہوئی سات آیات فاتحہ کی ہیں۔ اور آئندہ اکثر جگہ اختصار کے طور پہ میں صرف آیت کے نمبر پہ اکتفا کر دوں گا۔ مگر اس سے پہلے ایک دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ (۱) چونکہ ہر سورت پہ بلا استثنا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ خود موجود ہے۔ اور ہر سورۃ میں صفتِ رحم کے ماتحت (جو اُمّ الصفات ہے) کچھ مضمون ضرور موجود ہے۔ اس لئے اس آیت کو کسی مقطعہ یا حرفِ مقطعہ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پوری بسم اللہ لکھ کر پھر اس کا مقطعہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ (یاد رہے کہ قرآن میں ایک سورۃ بنام سورۃ توبہ بغیر بسم اللہ کے پائی جاتی ہے۔ مگر اکثر لوگ واقف ہیں کہ وہ الگ سورۃ نہیں ہے بلکہ سورۂ انفال کا حصّہ ہے) دوسری وجہ بِسْمِ اللّٰہ کا مقطعہ نہ ہونے کی یہ بھی ہے۔ کہ خود فاتحہ میں دوسری جگہ یہ آیت الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ موجود ہے۔ اور مقطعہ

حٰمٓ میں اَلْحَمْدُ سے لے کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک تمام اسمائے الٰہی داخل ہیں پس بسم اللہ کے الگ مقطعہ کی یا اس کے لئے خاص حروفِ مقطعات کی کوئی ضرورت نہیں ۔

حروفِ مُقَطَّعَات فاتحہ کی آیتوں میں

اب ہم فرداً فرداً ہر حرف کو لیتے ہیں کہ وہ فاتحہ کی کس کس آیت میں آیا ہے۔ سو پہلے ایک لائن میں ہم ان حروف کو لکھیں گے ۔ پھر ہر حرف کے نیچے فاتحہ کی آیت کا نمبر دیں گے ۔ اس گنتی میں پہلی آیت بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ چھوڑ دی گئی ہے ۔ جس کی وجہ اوپر بیان کر دی گئی ہے

حروف مقطعات	ا	ح	ر	س	ص	ط	ع	ق	ك	ل	م	ه	ی
نمبر آیت فاتحہ	۲	۲	۲	.	.	.	.	.	.	۲	۲	.	.
〃	۳	۳	۳	.	.	.	.	.	.	.	۳	.	.
〃	۴	.	.	.	.	.	.	.	۴	۴	۴	.	.
〃	۵	.	.	۵	.	.	۵	.	۵	.	.	.	۵
〃	۶	۶	۶	۶	۶	۶	.	۶	.	۶	۶	۶	۶
〃	۷	.	.	.	۷	۷	۷	.	.	۷	۷	۷	۷

حروف مقطعات فاتحہ کے الفاظ میں

اِن الفاظ کی مدد سے آپ مقطّعات کے متعلق خود سوچ کر کوئی نتیجہ نکال سکیں گے ۔

ا ۔ الله ۔ الحمد ۔ الرحمٰن ۔ الرحیم ۔ ایاك ۔ اهدنا ۔ انعمت علیهم

ل ۔ الله ۔ مالك ۔ ضالّین ۔

م : مٰلِكِ ۔ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ مُسْتَقِيْمَ ۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔
مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

ص : صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ الآیۃ

ر : رحمٰن ۔ رحیم ۔ ربّ ۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

ك : مالك ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہ : اِهْدِنَا ۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

ی : يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ ضالین

ع : عالمین ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔

ط : صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ ۔

س : اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ الْمُسْتَقِيْمَ ۔

ح : اَلْحَمْدُ ۔ الرَّحْمٰنِ ۔ الرَّحِيْمِ

ق : مُسْتَقِيْمَ

مقطّعات کے تعین کا قاعدہ

مقطعات کا تعین یعنی یہ معلوم کرنا کہ فلاں مقطعہ فاتحہ کی فلاں آیت یا فلاں الفاظ کا اختصار ہے ۔ یوں کیا جاتا ہے کہ پہلے اس مقطّعہ کے حروف سے حسبِ فہرست مندرجہ بالا کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ان حروف سے کیا کیا آیتیں اور کیا کیا الفاظ فاتحہ کے بن سکتے ہیں ۔ چنانچہ مثلاً الٓمّٓ سے کئی آیات یا الفاظ کی طرف اشارہ نکل سکتا ہے ۔

اس کے بعد آپ کو وہ سورۃ یا سورتیں پڑھنی چاہئیں ۔ جن کے سر پر الٓمّٓ لکھا ہو ۔ پھر جو مضامین بکثرت اور مرکزی طور پر اس سورۃ میں بیان ہوں ۔ ان کے مناسبِ

حال آپ مقطعات کے حروف کے معنی لے کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقطعہ فاتحہ کی فلاں آیت کا مقطعہ ہے۔ کیونکہ آیت میں اس کے حروف موجود ہیں اور سورۃ میں اس کے مطالب موجود ہیں۔ مثلاً حٰمٓ کے حروف سے معلوم ہوا کہ یہ حروف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ۔ رحمٰن ۔ رَحِیْم ۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ مستقیم ۔ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۔ مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ میں پائے جاتے ہیں۔ پھر آپ حٰمٓ والی چھ سورتیں یعنی مومن، سجدہ، زخرف، دخان ۔ جاثیہ ۔ احقاف سب کو پڑھ جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سب سورتیں مکی ہیں اور اکثر حصہ ان کا توحید اور صفات واسماء و افعالِ الٰہی سے بھرا پڑا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ حٰمٓ کی سورتوں میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک کا بیان اکثر ہے۔ باقی جو لفظ ہم نے جمع کئے تھے ان کا کوئی نمایاں ذکر نہیں ہے۔ پس حٰمٓ اختصار ہوا۔ سورۃ فاتحہ کی آیات نمبر ۲ ۔ ۳ ۔ ۴ کا اور بس اسی طرح آہستہ آہستہ آپ سب کی حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔

قٓ کے متعلق کسی قسم کا جھگڑا ہی نہیں کیونکہ یہ فاتحہ میں صرف ایک ہی جگہ لفظ مُسْتَقِیْمَ میں ہی آیا ہے۔ اور اس سے سوائے مُسْتَقِیْمَ کے لفظ کے ساری آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی مراد نہیں لی جا سکتی۔ کیونکہ ق کے بعد آیت نہیں ہے بلکہ وقف ہے۔

ص اور ط کا تعین بھی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ لفظ صراط کا اختصار ہے اور صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ والی آیتوں میں آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب ط کسی مقطعہ میں آتی ہے۔ تو فاتحہ کی آیت نمبر ۶ والی صراط مراد ہوتی ہے۔ اور اگر ص کسی مقطعہ میں آئے تو آیت نمبر ۷ والی صراط مراد ہوتی ہے۔ غرض اسی طرح حروف کو ایک طرف دیکھ کر اور سورتوں کے مضامین کو دوسری طرف پڑھ کر اور غور کر کے تعین کرتے چلے جاؤ۔ فی الحال جو میں نے نتیجہ نکالا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ ممکن ہے اس میں بعض غلطیاں ہوں۔ مگر اس کے لئے مطالعہ ان سورتوں کا ضروری ہے۔ اور یہ بات خاص محنت

چاہتی ہے۔ اگر مستعد اور شوقین لوگ اس روشنی میں توجہ کریں تو کئی مفید باتیں نکال سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو فی الحال میری نظر میں ہے۔

الٓمٓ : میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ ضالین اور مَغْضُوْبِ عَلَیْھِم کا ذکر ہے۔ یعنی فاتحہ کی آیت نمبر ۷ چنانچہ بقرہ میں یہ تفسیر نہایت نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اور مومنین انبیاء اور آدم کے حالات۔ نیز ابلیس اہلِ کتاب کافروں اور منافقوں کی کرتوتوں سے یہ سورۃ اوّل سے آخر تک بھری پڑی ہے۔

سورہ شوریٰ کی حٰمٓ ○ عسٓقٓ ○ میں حٰمٓ والی آیات ۲، ۳، ۴ کے علاوہ (یعنی اسمائے الٰہی کے علاوہ) اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ والی دو آیتیں یعنی نمبر ۵ اور ۶ مزید اس میں داخل ہے۔ جس مضمون بھی کرتی ہے کیونکہ اس کے آخر میں یہ آیت آتی ہے کہ

وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (الشوریٰ: ۵۳-۵۴)

ترجمہ: اور تو یقیناً لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف لا رہا ہے۔ اللہ کے راستہ کی طرف جو اس کا بھی مالک ہے جو آسمانوں میں ہے اور اس کا بھی جو زمین میں ہے۔ سُنو! سب باتیں خدا ہی کی طرف جاتی ہیں (یعنی تمام باتوں کی ابتداء اور انجام خدا ہی کے ہاتھ میں ہے)

اور سورۃ کا مضمون بھی ایسا ہی کہتا ہے۔

یٰسٓ کا مقطعہ دو حروف مقطعات سے مرکب ہے۔ ی سے یوم الدین یعنی آیت نمبر ۴ اور س سے صراط مستقیم والی آیت نمبر ۶۔ چنانچہ اس سورۃ میں جو قرآنِ مجید کا دل کہلاتی۔ ایمان کے اصولوں اور آخرت اور حشر بالبعد الموت ہی کا ذکر ہے۔

چنانچہ صراط مستقیم کے متعلق تو اس میں دو آیتیں واضح بھی موجود ہیں۔

۱۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۔ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔(یٰسٓ : ۴-۵)

ترجمہ: یقیناً تو رسولوں میں سے ہے اور سیدھے راستہ پر ہے!

۲۔ وَاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۔ (یٰسٓ : ۶۲)

ترجمہ: اور صرف میری عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی ضرورت اور رسالت کی ضرورت اور اس کا فائدہ۔ دشمنوں پر عذاب۔ انعاماتِ الٰہی۔ برزخ، حشر، اہلِ جنت، اہلِ دوزخ خلقِ آخر وغیرہ کا یعنی صراط مستقیم اور یوم الدین دونوں کا ذکر ہی اس سورۃ کے مرکزی نقطے ہیں۔

الٓرٰ کا مقطعہ کامل آیت نہیں ہے اس لئے اس کی تفسیر اللہ اور رب کے لفظوں سے ہی ہوتی ہے۔ یہ کئی سورتوں پر آتا ہے۔ مگر اس کی رآ کے متعلق یہ خیال کہ اس سے رحمٰن مراد لیا جائے یا رحیم یا ربّ۔ مجھے یہ بات صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں ممد ہوئی۔ کہ ان سب سورتوں میں کئی کئی مضامین ہیں۔ لیکن ایک الٓرٰ والی سورۃ ایسی بھی ہے جس میں صرف ایک ہی مضمون ہے یعنی یوسف۔ پس اس سورۃ کے مضامین نے یہ تعین کرا دیا کہ یہ سورۃ تمام کی تمام ربوبیتِ الٰہی کے بیان میں ہے۔ یوسف علیہ السلام کا بچپن میں رویا دیکھنا۔ پھر بھائیوں کا سلوک۔ پھر خدا کی ربوبیت جو کنوئیں میں، قافلہ میں، جنگل میں اور عزیزِ مصر کے ہاں اور قید خانہ میں اور بادشاہ کے دربار میں اور ملازمت میں۔ ہر حال اور ہر ترقی کے وقت اس کے ساتھ رہی اور اس کی ربوبیّت کرتی رہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے یہ را رب کی ہے اور کسی لفظ کی نہیں۔ پھر دیکھا تو اور سب الٓرٰ والی سورتوں میں بھی ربوبیت کے ذکر کو نمایاں طور پر پایا۔ اس لئے ان الفاظ کا یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سورتیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ذکر سے مخصوص ہیں اور اَلْحَمْد کی آیت ۲ کی جزو ہیں۔

الٓمّٓ اور الٓمّٓصٓ درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ الٓمّٓ میں اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ اور ضالین گروہوں کا ذکر ہے اور الٓمّٓصٓ میں ان کے راستے اور طریقہ (ص = صراط) کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ ابلیس کی چالاکیاں، سبت والوں کے مکر۔ انبیأ کے مخالفین کے حیلے۔ بنی اسرائیل کا بگڑنا۔ سامری کی شرارتیں وغیرہ میں صراط یعنی طریقہ کا حصہ زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ آیت کے لحاظ سے الٓمّٓ بھی آیت نمبر ۱ ہے اور الٓمّٓصٓ بھی آیت نمبر ۱ ہے اور الٓمّٓصٓ میں شیطان کہتا ہے

لَاَقۡعُدَنَّ لَہُمۡ صِرَاطَکَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (الاعراف: ۱۷)

ترجمہ: اس لئے میں ان (انسانوں) کے لیے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھ جاؤں گا۔

اور شعیبؑ کی قوم کو حکم ہوتا ہے

وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (الاعراف: ۸۷)

ترجمہ: اور ہر رستہ پر (اس نیت سے) نہ بیٹھا کرو کہ جو اللہ پر ایمان لائے اس کو اللہ کے رستے سے ڈراؤ

غرض ان طریقوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ان لوگوں کی چالاکیوں سے صراطِ مستقیم مشتبہ ہو جائے۔

سورۃ رعد کا الٓمّٓرٰ۔ یہ الٓرٰ والی سورتوں کی جماعت میں داخل ہے نہ کہ الٓمّٓ والی جماعت میں۔ کیونکہ اس کے آگے آیت کا نشان نہیں بلکہ یہ نامکمل آیت ہے اور آگے صرف علامت وقف ہے پس الٓرٰ کے مطابق اس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اذکار کے علاوہ قریباً ساری سورت میں کفارِ مکہ (یعنی مغضوب علیھم کے گروہ) کو ہی مخاطب کیا گیا ہے۔

پس یہ مقطعہ الٓمٓ چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا میم اس میں ترتیلی ٹھوکر پیدا کرتا تھا۔ اس لئے اس ٹھوکر سے بچنے کے لئے نیز بلحاظ روانیٔ ترتیل کے اُسے الٓمٓ بنا دیا گیا۔

طٰهٰ ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

طسم ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سورۃ طٰهٰ کا وزن اِس طرز کا ہے کہ اس کا مقطعہ طٰهٰ کے وزن پر ہونا چاہیئے اور طٰسٓمّٓ والی سورتوں کی آیتوں کی بناوٹ ایسی ہے۔ کہ ان سے پہلے طٰسٓمّٓ آنا چاہیئے۔ مثلاً دیکھو

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (طٰهٰ: ۴-۳)

ترجمہ: ہم نے تجھ پر (یہ) قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تُو دُکھ میں پڑ جائے (یہ تو) صرف (خدا سے) ڈرنے والے انسان کے لیے راہ نمائی اور ہدایت (کے لیے) ہے۔

غرض اس سورۃ کی آیات کھڑی زبر پر ختم ہوتی ہیں۔ اس لئے مقطعہ بھی اسی وزن کا لایا گیا۔ برخلاف اس کے طسم کی دونوں سورتوں یعنی شعراء اور قصص میں آیتوں کا قافیہ طٰهٰ کی طرح الف لئے ہوئے نہیں ہے بلکہ یوں ہے۔

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء: ۴)

ترجمہ: شاید تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا کہ وہ کیوں نہیں مومن ہوتے۔

پس مبین۔ مومنین۔ خاضعین معرضین یا مومنون۔ مفسدین

وارثین وغیرہ کا ترتیلی جوڑ طٰسٓمٓ سے ہی لگ سکتا ہے۔ اور تشقیٰ۔ یخشیٰ علیٰ۔ استویٰ کے قوافی کا جوڑ طٰہٰ سے ہی لگ سکتا ہے پس یہ ترتیلی خوبصورتی کے لیے ہے ورنہ دونوں جگہ آیت وہی ہے۔

طٰسٓ (نمل) بھی ایک ایسا مقطعہ ہے کہ اس کے بعد آیت کا نشان نہیں۔ یعنی یہ پوری آیت کا نمائندہ نہیں ہے۔ بلکہ آیت نمبر ۶ کے بعض الفاظ کا۔ غالباً اِھْدِنَا کو چھوڑ کر صرف الفاظ صراط مستقیم کا نمائندہ ہے۔ جیسے کہ ملکہ سبا کو بطفیل حضرت سلیمانؑ مخصوص طور پر سیدھا راستہ مل گیا تھا کہ ایک بادشاہ نے اس پر چڑھائی کر کے اُسے مسلمان بنایا تھا۔ یہ ایسی ہدایت نہیں جس کے لئے کوئی دعائے اھدنا کیا کرے۔ بلکہ یہ ایک غیر معمولی راستہ صراط مستقیم پانے کا تھا۔ اس لئے اس سورۃ کا مقطعہ بھی نا تمام رہا۔ یعنی طٰسٓ۔ صراط مستقیم ہی رہا۔ نہ کہ پوری آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

غرض میں نے مختصر طور پر مقطعات قرآنی پر ایک نئے رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ ایک تفصیلی راستہ بھی کھول دیا ہے۔ کہ لوگ غور کر کے انفرادی طور پر ہر مقطعہ کے متعلق اور زیادہ صفائی سے علم حاصل کریں۔ اس وقت تو میں نے ایک نامکمل سا ڈھانچہ بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ بات بہت تلاوت اور غور چاہتی ہے۔ جو اصول میں نے بیان کئے ہیں۔ وہ میرے نزدیک پختہ ہیں۔ لیکن ہر مقطعہ کا تعین اور تفصیل وقت اور مطالعہ چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہر الٓمٓ کے وہی ایک معنی نہ ہوں۔ جو سورۂ بقرہ میں واضح ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ہر حٰمٓ کے وہی ایک معنی نہ ہوں جو سورۂ مومن میں ہیں۔ پس ترقی ہو سکتی ہے اور مزید اصلاح بھی مگر اصل وہی رہے گا۔ کہ یہ سورہ فاتحہ کے اجزاء ہیں۔

نمونہ تطبیق کا یعنی سورۂ مریم اور کٓھٰیٰعٓصٓ

یہاں میں بطور نمونہ ایک مقطعہ کا تفصیلی ذکر کروں گا۔ اور پھر اس سورۃ میں اس مقطعہ کے مضامین اور تطبیق ہونا بتاؤں گا۔ تاکہ آپ مقطعہ کے مضامین اور اس کی سورۃ کے مضامین خود بھی چیک کر سکیں۔ اور پھر چیک کر کے یہ معلوم کر سکیں۔ کہ آیا تطبیق ٹھیک اُترتی ہے یا نہیں۔ یہی وہ رستہ ہے جس پر چلنے سے آپ مزید انکشافات اور ترجیحات اس مضمون میں کر سکیں گے۔ انشاءاللہ۔ اب میں قرآن مجید کے سب سے بڑے مقطعہ کٓھٰیٰعٓصٓ اور اس کی تفسیر یعنی سورۂ مریم کے مضامین کی تطبیق ذرا تفصیلاً کرنے لگا ہوں۔ تاکہ میرا تمام بیان جواب تک کرتا چلا آیا ہوں آپ کے سامنے مبرہن اور روشن ہو جائے۔

واضح ہو کہ کٓھٰیٰعٓصٓ سورہ فاتحہ کی تین آیات کا مقطعہ ہے۔ یعنی آیت نمبر ۵، آیت نمبر ۶ اور آیت نمبر ۷ کا۔ دوسرے الفاظ میں میرا یہ مطلب ہے کہ یہ مقطعہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کا مختلف خلاصہ یعنی مقطعہ ہے جس میں ک اور ع سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ مراد ہے۔ اور ۂ اور یٰ سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ مراد ہے۔ اور ص سے مراد صِرَاطَ الَّذِیْنَ ..... الآیۃ یعنی آخری آیت فاتحہ کی مراد ہے۔

اس کے بعد ہم سورۂ مریم کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو ہم کو صراحتًا اور نہایت نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اس سورۃ میں اکثر یہی مضامین آئے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو الفاظ ایسے غیر مبہم ہیں۔ کہ ایک ناواقف کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یقیناً فاتحہ کی انہی آیات کا بیان اور انہی کی تفسیر ہو رہی ہے۔ لیجئے سنتے جائیے۔

سب سے پہلے حضرت ذکریاؑ کی دعا ہے یہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر ہے۔

کیونکہ استعانت کے معنے دُعا مانگنے ہی کے ہیں ۔ اسی طرح آگے چل کر حضرت مریم صدیقہؑ کی دُعا کا ذکر ہے ۔ آگے چل کر بلکہ ساتھ ہی ساتھ منعم علیہ گروہ کا ذکر ہے ۔ جس میں ذکریا ۔ مریم صدیقہ ۔ یحییٰ ۔ ابراھیم ۔ موسیٰ ۔ ہارون ، اسمٰعیل ۔ اسحاق ۔ لیعقوب ادریس ۔ آدم ۔ نوح علیہم السلام کا بیان ہے ۔ اور ان کے بیان میں یہ آیت آتی ہے ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ ق (مریم : ۵۹)

ترجمہ : یہ سب کے سب وہ لوگ تھے ، جن پر خدا نے نبیوں میں سے انعام کیا تھا ۔ اُن (نبیوں) میں سے جو آدم کی اولاد تھے ۔

ان کے ہمراہ مغضوب علیہم اور ضالین کا ذکر بھی چل رہا ہے جن کا ذکر کہیں نام لے کر اور کہیں مجمل ہے ۔ مثلاً ابراہیمؑ کے باپ کا ذکر اور اس کی کج بحثی اور اس کے مظالم ابراہیمؑ پر ۔ پھر ایک جگہ فرمایا

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ..... (مریم : ۶۰)

ترجمہ : پھر اُن کے بعد ایک ایسی نسل آئی جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے پس وہ عنقریب گمراہی کے مقام تک پہنچ جائیں گے ۔

پھر مومنوں کا ذکر فرمایا

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ..... (مریم : ۶۱)

ترجمہ : سوائے اس کے جو توبہ کرے گا اور ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا ۔

پھر جنمیوں کا ذکر آگے آتا ہے ۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ج (مریم: ۶۹)

ترجمہ: پس تیرے رب کی قسم ہم (جو تیرے رب ہیں) ان لوگوں کو (پھر ایک دفعہ) اُٹھائیں گے اور شیطانوں کو بھی (اُٹھائیں گے اور) پھر ان سب کو جہنم کے گرد ایسی صورت میں حاضر کریں گے۔ کہ وہ زانوؤں کے بل گرے ہوئے ہونگے

پھر متقیوں کو فرماتا ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ..... (مریم: ۷۳)

ترجمہ: اور ہم متقیوں کو بچالیں گے۔ اسی طرح سورۃ کے آخر تک یہ مضمون اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لوگوں اور مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَالِّيْن کے متعلق چلتا رہتا ہے۔ ضالین کا مخصوص ذکر حسب ذیل آیات میں ہے۔

۱۔ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ج (مریم: ۷۶)

ترجمہ: تو کہہ دے کہ جو شخص گمراہی میں (پڑا) ہو (خدائے) رحمٰن اسے ایک عرصہ تک ڈھیل دیتا جاتا ہے۔

نیز لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (مریم: ۳۹)

ترجمہ: لیکن وہ ظالم آج بہت بھاری گمراہی میں مبتلا ہیں

عیسائیت کا ذکر مخصوص طور پر ان آیات میں آتا ہے۔

۲۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ لا سُبْحٰنَهٗ ط (مریم: ۳۶)

ترجمہ: خدا کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔ وہ اس بات سے پاک ہے۔

۳۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ط لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا (مریم ۸۹، ۹۰)

ترجمہ: اور یہ لوگ) کہتے ہیں کہ (خدائے) رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے (تو

کہہ دے) تم ایک بڑی سخت بات کہہ رہے ہو۔

۴۔ وَمَا یَنْبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ؕ (مریم: ۹۳)

ترجمہ: اور (خدائے) رحمٰن کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔

آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے متعلق جو بیان موجود ہے۔ اس میں صراحتاً اور نہایت واضح طور پر یہ آیت آتی ہے۔

وَاِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ

(مریم: ۳۷)

ترجمہ: اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اُسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

نیز یہ آیت یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَھْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا (مریم: ۴۴)

ترجمہ: اے میرے باپ! مجھے ایک خاص علم عطا کیا گیا ہے جو تجھے نہیں ملا پس (باوجود اس کے کہ میں تیرا بیٹا ہوں) تو میری اتباع کر میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

پھر جو دعائیں ہیں وہ سب اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے ماتحت ہیں۔ مثلاً حضرت ذکریاؑ اور حضرت مریمؑ کی تفصیلی دُعائیں ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول کہ

وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا (مریم: ۴۹)

ترجمہ: اور صرف اپنے رب کے حضور دعائیں مانگوں گا (اور) یقیناً میں اپنے رب کے حضور دُعا کرنے کی وجہ سے بدنصیب نہیں ہوں گا۔

اسی طرح اِیَّاكَ نَعْبُدُ کی تفسیر اور ذکر میں

۱۔ عبدہٗ ذکریا

۲۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (مریم: ۳۶)

ترجمہ: اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اُسی کی عبادت کرو۔

۳۔ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ط (مریم: ۴۵)

ترجمہ: اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کر

۴۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (مریم: ۵۹)

ترجمہ: جب اُن کے اُوپر (خدائے) رحمٰن کا کلام پڑھا جاتا تھا، تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے

۵۔ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ط (مریم: ۶۲)

ترجمہ: (یعنی ان جنتوں میں) جو ہمیشہ رہنے والی ہیں اور جن کا (خدائے) رحمٰن نے اپنے بندوں سے ایسے وقت میں وعدہ کیا ہے جبکہ وہ اُن کی نظروں سے ابھی پوشیدہ ہیں۔

۶۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا (مریم: ۶۴)

ترجمہ: یہ وہ جنّت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اُن کو کریں گے جو متقی ہوں گے۔

۷۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ط (مریم: ۶۶)

ترجمہ: (وہ) آسمانوں کا (بھی) رب ہے اور زمین کا بھی (رب) اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان (ہے) پس (اے مسلمان) اس کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر ہمیشہ قائم رہ

اِن سب میں ایاک نعبد کی تفصیل اور تفسیر ہے۔

غرض تمام مضامین سورۂ مریم کے اوپر آ گئے اور سب کے سب الا ماشاء اللہ

انہی تین آیاتِ فاتحہ کی تفصیل اور تفسیر ہیں۔ اگر شبہ ہو تو خود پڑھیے اور لطف اٹھائیے اور چشمِ بصیرت روشن کیجئے۔ یہ سورت بہت لمبی نہیں ہے۔ صرف ۵ امنٹ میں آپ کو یقین آجائے گا۔ کہ میرا یہ دعوےٰ کہ یہ فاتحہ کی تین پچھلی آیتوں کی تفسیر ہے بالکل سچا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ سورۃ کٓھٰیٰعٓصٓ اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی بھی تفسیر ہے پس معلوم ہوا کہ کٓھٰیٰعٓصٓ دراصل فاتحہ ہی کی پچھلی تین آیتوں کا مقطعہ ہے اور یہی ہم نے ثابت کرنا تھا سو کر دیا۔ اسی طرح اگر آپ خود ان مقطعات سے دلچسپی لیں تو آپ پر بھی انشاءاللہ تعالےٰ مزید علم منکشف ہوگا اور ہر صورت سے یہ دعویٰ سچا ثابت ہوگا کہ مقطعات دراصل دوسری دفعہ نازل شدہ فاتحہ یا مکررات آیاتِ فاتحہ ہیں۔ اور جس طرح تفسیر کے وقت ایک مفسر پہلے متن کو رکھتا ہے۔ پھر اس کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جس سورۃ کے اوپر فاتحہ کے یہ حصے رکھ دیئے ہیں۔ ان میں مخصوص طور پر فاتحہ کی ان آیات یا الفاظ کی تفسیر ہے اور جس سورۃ پر کوئی مقطعہ نہیں ہے وہ صرف بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تفسیر ہے۔ سو وہ بھی سورۂ فاتحہ ہی کی ایک آیت ہے۔

میں نے اپنی نوٹ بک میں تمام مقطعات کو ان کی سورتوں کے مضامین سے تطبیق دیا ہے۔ لیکن چونکہ مضمون نہایت لمبا ہو جاتا تھا اور میرا مقصد صرف راستہ دکھانا تھا۔ اس لئے اتنے پر اکتفا کیا گیا۔ اب میں جملہ احباب اور پڑھنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر یہ مضمون ان کو خوش وقت کرے تو عاجز کے لئے دعائے خیر فرمائیں۔ والسلام

تحدیثِ نعمت

سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مقطعات کے متعلق اس نے مجھے ایک نیا راستہ بتایا۔ اور ساتھ ہی تحدیث بالنعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ سے مقطعات کے حل کی تلاش کی فکر لگی رہتی تھی۔ ایک دن بغیر تفکر اور تدبر کے یکدم بجلی کی طرح

محض اسی کے فضل سے یہ نکتہ میرے دل میں گھس گیا۔ کہ مقطعات فاتحہ ہی ہیں، جب اس پر میں نے غور کیا تو اسے درست پایا۔ پھر جب میں نے مقطعات کو جمع کیا اور ان کے معنے اور تفسیر سورتوں پر لگانے لگا۔ تو نٓ کے معنے اور تعین کو درست نہ پایا۔ اور اس چیز نے مجھے بہت پریشان کیا۔ کہ نٓ مقطعات میں فٹ نہیں آتا۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی دن گزر گئے۔ تو یکدم قرآن کریم کی یہ آیت دل پر القا ہوئی۔

اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ

(یوسف: ۵)

ترجمہ: (یقین مانیئے) میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو (بھی رؤیا میں) دیکھا ہے (اور مزید تعجب اس پر ہے کہ) میں نے اُن کو اپنے سامنے سجدہ کرتے دیکھا ہے۔

پس معاً مجھے تسلی ہوئی کہ نٓ واقعی مقطعات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ کُل مقطعات تیرہ ہی ہیں اور لطف یہ کہ حروفِ مقطعات بھی تیرہ ہی ہیں اور تیرہ مقطعات میں سے دو نہایت روشن اور نمایاں ہیں۔ ایک تو حٰمٓ کا مقطعہ جو بسبب صفاتِ الہٰی کا جامع ہونے اور فاتحہ کی دوسری تا چہارم آیات کا مقطعہ ہونے کے ایک نمایاں افضلیت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ عالیہ پر حاوی ہے۔ دوسرا مقطعہ جو اس سے کم درجہ پر ہے۔ مگر باقی سب پر نمایاں ہے وہ الٓمٓ کا مقطعہ ہے جو بسبب انعمت علیھم اور مغضوب علیھم اور ضآلین کے بیان کے انسانی تمام حالات پر حاوی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں مقطعات تعداد کے لحاظ سے بھی زیادہ ہیں۔ اور حٰمٓ اور الٓمٓ سات سات دفعہ آیات میں وارد ہوتے ہیں۔ اور باقی مقطعات کی نسبت اپنی تعداد اور معانی کے لحاظ سے سورج اور چاند کی طرح نہایت روشن چمکدار اور ساتھ ہی اس آیت سے مجھے یہ بھی خوشی ہوئی کہ ان مقطعات کا یہ علم جو مجھے معلوم

ہوا ہے۔ یہ بھی خدا کے فضل سے ہی ہے اور صحیح ہے اور جو کچھ تائیدی طور پر میں نے خود غور و فکر سے لکھا ہے۔ وہ بھی خدا ہی کا فضل ہے۔ ورنہ ایک جاہل اور کم علم بندہ کیا اور اس کی تفتیش کیا ؟

و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

گر اصل فاتحہ۔ قرآن اس کی ہے تعبیر
مقطعات ہیں پھر سورتوں پہ کیوں تحریر
سو یاد رکھ۔ کہ یہ الحمد ہی کے ہیں ٹکڑے
یہ سورتیں انہی اجزا کی کرتی ہیں تفسیر

مضمونِ مُقَطّعَات پر بعض اعتراضات اور اُن کے جواب

(۱)

نٓ کا مقطعہ اور حضرت خلیفہ اوّل (اللہ آپ سے راضی ہو)

اس بارہ میں ایک بزرگ دوست یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "نٓ" حرف مقطعہ ہے اور بے معنی ہے۔ اور یہ جو آپ نے اس کے معنے دوات کے کئے ہیں یہ غلط ہیں۔ جواباً عرض ہے کہ یہ معنی میں نے نہیں کئے بلکہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کے یہ معنی ان کی کتاب میں سے نقل کئے گئے ہیں۔ کہ "دوات اور قلم اور جو کچھ اُن سے لکھا جاتا ہے (اُن کے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہوگا) کہ تو اے محمدؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے۔

حضرت خلیفہ اوّل کے درسِ قرآن کے نوٹوں کے پہلے ایڈیشن صفحہ ۲۷۶ پہ یہ مرقوم ہے۔

آیت ۱۔ نٓ۔ دوات۔ فرمایا قلم دوات کو لو اور جو علوم دنیا میں پیدا ہوئے سب کو جمع کرو..... بلکہ فرمایا۔ قلم اور دوات کے ساتھ جو کچھ آئندہ بھی کبھی لکھا جائے گا اس سے..... اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اب قلم و دوات کا زمانہ

آنے والا ہے ۔

مکرمی شیخ یعقوب علی صاحب کے شائع کردہ ترجمہ اور نوٹوں میں جو وہ بھی حضرت خلیفہ المسیح اوّل کے نوٹ ہیں حسب ذیل لکھا ہے :۔

" دوات اور قلم کی قسم جو کچھ (اُن سے) لکھنے ہیں یا لکھیں گے ۔" اس سورۃ کو ن سے شروع کیا گیا ہے ۔ ن کے معنی دوات کے ہیں ۔ یعنی دوات اور قلم کو ہم پیش کرتے ہیں ..... ن سے مراد دوات ہے ۔ اس کے لئے ترتیب آیات تائید کرتی ہے ۔ (سیپارہ تبارک الذی ۔ سورۃ قلم ۔ شیخ یعقوب علی صاحب)

لغت کی کتابیں

۱۔ تسہیل العربیہ ۔ نون بمعنی دوات

۲۔ اقرب الموارد ۔ النُّون ۔ الدّواۃ

۳۔ لغات القرآن عبد الحی عرب ۔ النُّون الدّواۃ قال تعالیٰ ن والقلم

یہ لغات بھی مفرداتِ راغب اور خلیفہ اوّل (اللہ آپ سے راضی ہو) کے درسوں کا خلاصہ ہے پس معلوم ہوا کہ سورہ قلم کے ن کے معنی ہی یہاں دوات کے کئے گئے ہیں ۔ نہ کہ " نون " کے ۔

ن کا مطلب اور ترجمہ حضرت خلیفہ المسیح ثانی کے درس میں

ضمیمہ درس القرآن اخبار الفضل ۲۰ مارچ ۱۹۲۸ء از حضرت خلیفہ المسیح ثانی :۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ قسم ہے ن کی اور قسم ہے قلم کی اور اس کی جس کو وہ لکھتے ہیں ۔

"..... اس لئے یہ معنی ہوئے کہ دوات اور قلم اور وہ جو لکھا جاتا ہے ۔ اس

کی قسم ..... اس رسول کی شہادت کے طور پر دوات اور قلم اور اس سے جو لکھا جائے گا پیش کرتے ہیں۔ کہ اس سے یہی ثابت ہوگا کہ تو بڑا عقلمند ہے۔ (یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قلم کا واؤ قسمیہ سے ہے۔ ماقبل نٓ پر بھی حاوی ہو سکتا ہے۔)

اب جبکہ قرآن مجید کے دو عظیم الشان مفسروں نے اس ن کے معنے دوات کے کئے ہیں۔ تو پھر ہم کو ان کی بات ہی ماننی پڑے گی۔

باقی یہ بات کہ نٓ اور نُونٓ میں فرق ہے۔ یہ بھی بالکل معمولی بات ہے۔ ہر ڈکشنری میں حرف نٓ کا نام نُونٓ ہی لکھا ہے اور نونٓ کا مطلب نٓ ہی بیان کیا ہے۔ اسی طرح نٓ خفیفہ اور نٓ ثقیلہ کو نونِ خفیفہ اور نونِ ثقیلہ بھی لکھتے ہیں۔

(۲)

حروفِ مُقطّعات پر مدّ

ایک اور صاحب پوچھتے ہیں کہ حروفِ مقطعات پر مدّ کیوں ہے۔ جیسے الٓمٓ یٰسٓ وغیرہ پر۔ سو اس کی وجہ ظاہر ہے یعنی یہ مقطعات خود آیت ہیں اور ان کے بعد آیت کا نشان موجود ہے۔ پس جب یٰسٓ جو ایک پوری آیت ہے پڑھی جائے گی اور اس کے بعد کی لمبی لمبی آیتیں اس کے بعد پڑھی جائیں گی تو ضروری ہے آیتوں کے آخری الفاظ کی طرح مقطعات کے آخری حروف کو بھی لمبا کر کے پڑھا جائے۔ تاکہ آیات ترتیل میں ہم وزن رہیں۔ پس جس طرح یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ میں ہم حکیم کو لمبا کر کے بموجب قاعدہ قرأت کے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہم یٰسٓ کا سین بھی لمبا کر کے پڑھیں۔ اس لئے اس پر مدّ ڈال دیا گیا۔ کہ دوسری تمام آیات کے آخری الفاظ کی طرح مقطعہ والی آیت کا آخری حصّہ بھی کھینچ کر اور لمبا کر کے پڑھا جائے۔ پس یہ وجہ ہے مدّ ڈالنے کی اور لمبا کر کے پڑھنے کی۔ البتہ جہاں کھڑا زبر ہو۔ جیسے کہ الٓرٰ

میں وہاں وہ کھڑا از بر ہی مد کا قائم مقام ہو جائے گا۔

(۳)

ایک اعتراض یہ ہے کہ قسط نمبر ۱۱ میں مضمون کے آخر میں آپ نے حٰمٓ اور الٓمّٓ کو لکھا ہے کہ وہ قرآن مجید میں سات سات دفعہ وارد ہوئے ہیں۔ حالانکہ الٓمّٓ صرف چھ سورتوں کے سر پہ ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کریں۔ جواباً عرض ہے کہ میں نے جیسا کہ اس مضمون میں کسی جگہ بیان کیا ہے۔ المّٓصٓ کو بھی الٓمّٓ ہی سمجھا ہے۔ برخلاف اس کے المّٓرٰ کو الٓمّٓ کی جماعت سے خارج کیا ہے۔ المّٓصٓ اور الٓمّٓ دراصل ذرا سے فرق کے سوا جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ دراصل الٓمّٓ ہی ہے۔ اس لئے اسے گنتی میں شریک کر لیا گیا ہے۔ صٓ کا حرف صرف ایک مزید چیز ہے۔ جیسے کہ حٰمٓ کی فہرست میں ایک جگہ عسق ایک زیادتی ہے۔ مگر باوجود اس کے اسے حٰمٓ ہی کی گنتی میں رکھا گیا ہے۔

(۴)

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مثلاً الٓمّٓ کے لفظ کو آپ نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور مغضوبْ اور ضالّینْ کا مخفف یا مقطعہ قرار دیا ہے تو بموجب آج کل کے انگریزی رواج کے ان سب الفاظ کا پہلا حرف مقطعہ میں آنا چاہیئے نہ کہ درمیان کا جیسے کہ آپ نے ضالین کا درمیانی لام لے لیا ہے۔ حالانکہ ضٓ لینا چاہیئے تھا درمیانی حرف لینے کا قاعدہ غلط ہے۔ اس کی توجیہہ کریں۔

جواباً عرض ہے کہ آپ تو الٓمّٓ کے معنی اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ کیا کہتے ہیں۔ ان کو بھی اس انگریزی قاعدہ کی رُد سے غلط کہہ دیں۔ کیونکہ الف سے مراد انا اور لٓ سے مراد اللہ اور مٓ سے مراد اَعْلَمُ آپ بیان کیا کرتے ہیں۔ اگر درمیان کا حرف بموجب آپ کی رائے کے نہیں آنا چاہیئے تو پہلے آپ خود رجوع کریں۔ کیونکہ لٓ اللہ کا پہلا حرف نہیں

ہے۔ اور مَرا عِلم کا آخری حرف ہے اسی طرح آپ طٰسم کے مقطعہ میں طٰ کے معنی لطیف کرتے ہیں۔ یہاں بھی طٰ درمیانی حرف ہے۔ پس یہ دیگراں رانصیحت والی بات کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی اور جب معزز عربی نژاد صحابہؓ نے الٓمٓ کے معنے اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ کے کئے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کی زبان میں یہ بات بالکل جائز ہے۔ گو موجودہ زمانہ کی انگریزی میں اس کا رواج نہ ہو۔ اور خواہ آپ اس کے معنوں کے قائل نہ ہوں۔ تب بھی آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ مستند اہلِ عرب کے نزدیک یہ ترکیب جائز ہے۔ اور جو چیز اہلِ عرب کے نزدیک جائز ہے۔ وہ کسی دوسری زبان کے معیار پر پرکھنے سے ناجائز نہیں ہوسکتی۔

(۵)

ایک بزرگ نے یہ اعتراض کیا کہ مقطعات کو دو کلاسوں میں تقسیم کرتے ہوئے آپ نے ایک جماعت وہ رکھی ہے جس کے بعد آیت ہے اور دوسری وہ کلاس رکھی ہے جن کے بعد وقف کا نشان ہے۔ حالانکہ آیتوں اور وقف کے نشان تو بعد کی ایجاد ہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے ہی نہیں۔ پس یہ آپ کی لاعلمی اور بے وقوفی ہے۔ اس حصّہ کو کاٹ دیں۔

جواباً میری طرف سے یہ عرض ہے کہ یہ درست ہے کہ قرآنی تحریر میں ○ نشان آیت کا اُس زمانہ میں لکھا نہیں جاتا تھا مگر آیتیں تو موجود تھیں۔ اور خود قرآن مجید میں ان آیات کا صریح ذکر ہے سنیئے۔

۱۔ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران:۸)

ترجمہ: جس کی بعض (آیتیں تو) محکم آیتیں (ہیں جو) اس کتاب کی جڑ ہیں اور کچھ اور (ہیں) جو متشابہ ہیں۔

۲۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۔۔۔۔ (البقرہ: ۲۵۳)

ترجمہ: یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم تجھے پڑھ کر سناتے ہیں۔ اس حالت میں کہ تو حق پر قائم ہے۔

۳۔ الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (یونس ۲:)

ترجمہ: الٓرٰ یہ (یعنی اس سورۃ کی آیتیں) کامل (اور) پُرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔

۴۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (البقرہ ۱۰۰)

ترجمہ: اور ہم نے تجھ پر یقیناً کھلے کھلے نشان نازل کئے ہیں

۵۔ لَقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (حم سجدہ ۴۵:)

ترجمہ: تو وہ (ٹوکنے والے) کہہ سکتے تھے کہ اس کی آیتیں کھول کر کیوں نہیں بیان کی گئیں۔

وغیرہ وغیرہ پھر سب سے بڑھ کر فاتحہ کو سبع من المثانی کہہ کر اس کی آیات کی گنتی بھی تعین کر دی ہے۔ اسی طرح آپ تمام قرآن کو دیکھ لیں۔ آیتوں کے نشان خواہ لگے ہوں یا نہ ہوں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہاں سے یہاں تک ایک آیت ہے۔ آیت تو اپنے قافیوں اور خواتیم اور مضمون سے پہچانی جاتی ہے۔ جس طرح ہر زبان میں فقروں کی بناوٹ سے ہم بتا دیتے ہیں کہ یہ فقرہ یہاں سے یہاں تک ہے۔ آگے نیا فقرہ شروع ہوتا ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرونِ اولیٰ کے لوگ آیتوں پر پورا ٹھہرا نہیں کرتے تھے۔ بس اس ٹھہرنے کا نام آیت ہے خواہ اس کے تحریری طور پر غیر عربی لوگوں کے لئے بعد میں مقرر کئے جائیں۔

کیا احادیث میں نہیں آتا کہ جو سورہ کہف کی دس پہلی اور دس پچھلی آیتیں تلاوت کرے گا، وہ فتنۂ دجل سے محفوظ رہے گا؟ کیا اگر قرونِ اولیٰ میں لوگوں کو آیتیں معلوم نہ تھیں تو اس حدیث کے معنے ہی کیا ہوئے؟ کیا صحابہؓ کے اقوال میں متعدد جگہ ایسے

الفاظ نہیں آتے کہ بقدر چالیس آیات حضور یا ہم لوگ پڑھا کرتے تھے اور ایک جگہ تو آیا ہے کہ حضورؐ رات بھر نماز میں آیت ان تعذبھم عبادك ......الایۃ پڑھتے رہے۔

پس سورتوں اور آیتوں کا تعین تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کرا دیا تھا۔ باقی تحریر میں بچوں اور عجمیوں کے لئے آیتوں کے نشان اگر کسی نے بعد میں لگا دیئے تو اس کا کیا حرج ہے۔ بلکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی آیات کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے کہ ان اوقاف کی بابت کسی کو شبہ رہ ہی نہ سکتا تھا۔ اور فاتحہ کی تو ایک ایک آیت حضور نے صحابہؓ کو الگ الگ گنوائی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ تو خدا یوں فرماتا ہے اور جب بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو خدا یوں فرماتا ہے۔ اور جب کہتا ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنَ تو خدا یوں فرماتا ہے۔ غرض اسی طرح حضورؐ نے فاتحہ کی سب آیتیں گنی ہیں۔ پس آپ کا اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آیتیں نہ تھیں۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آیتیں تو تھیں صرف نشانات آیت نہ تھے۔ اور وقف یعنی آیت سے کسی قدر کم ٹھہرنے کا علم بھی سب کو تھا۔ ہاں نشانِ وقف و آیت وغیرہ عجمیوں کے لئے بعد میں لکھنے تجویز کئے گئے۔ سو اس سے اصل مطلب میں کیا فرق پڑ گیا؟ ابتدائی زمانہ میں تو قرآن مجید پر زبر زیر بھی نہ تھے۔ تو کیا یہ کہہ دیا جائے کہ اس وقت قرآن کسی اور طرح کا پڑھا جاتا تھا۔ اسی طرح قرونِ اولیٰ کے عرب ہر آیت پر پورا ٹھہرتے تھے اور وقف پر اس سے کم وقفہ دیتے تھے۔ سو اب بھی یہی حال ہے اور جب بھی یہی حال تھا۔ زیادہ ٹھہرنے کا نام آیت اور کم ٹھہرنے کا نام وقف ہے۔

(۶)

ایک صاحب اعتراض فرماتے ہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ کی آیت سورۃ فاتحہ کا جزو نہیں

ہے یہ محض آپ کی زبردستی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس جو قرآن آیات کے نمبر والا ہے اُسے دیکھ لیں۔ اگر شک ہو تو فاتحہ کی سات آیات بغیر بسم اللہ کے گن کر دکھا دیں۔ کیونکہ فاتحہ کی بغیر بِسْمِ اللہ کے صرف چھ آیتیں رہ جاتی ہیں۔ خواہ باقی قرآنی سورتوں میں بسم اللہ محسوب ہو یا نہ ہو۔ مگر فاتحہ بغیر بسم اللہ کے کامل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بغیر اس کے فاتحہ کی سات آیات کی گنتی پوری نہیں ہوتی۔ (۷)

پھر ایک اعتراض یہ ہے کہ جب مقطعات بے معنی الفاظ ہیں۔ تو پھر آپ نے بسم اللہ کو مقطعہ کیوں کہا ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی دراصل تو بِسْمِ اللہ مقطعہ نہیں ہے۔ بلکہ فاتحہ کی ایک آیت اور فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ مگر صرف سمجھانے کی خاطر اُسے وہاں مقطعہ کہہ دیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآنی سورتوں میں یا تو مقطعات کی تفسیر ہے یا بسم اللہ کی۔ اس لئے اسے بھی ایک مقطعہ یا اُم المقطعات کا نام دے دیا گیا ہے۔ ورنہ دراصل اس میں مقطعات والی خاصیتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ کسی آیت کا اختصار نہیں ہے۔ بلکہ خود ایک پوری بامعنی آیت ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ہر سورۃ میں اس کی تفسیر کسی نہ کسی رنگ میں موجود پائی جاتی ہے۔

(۸)

ایک نیا قرینہ

ایک اعتراض یہ ہے کہ مقطعات فاتحہ کی آیات اور الفاظ کا اختصار سمجھنا آپ نے کسی زبردست اور مضبوط دلیل سے ثابت نہیں کیا۔ بعض قرائن پیش کئے ہیں جو خود کچھ زبردست نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ جو معانی آپ اِن مقطعات کے پہلے مانا کرتے تھے وہ کن دلائل اور پختہ حسابی تشریحات پر مبنی ہیں ؟ کہ اُن کو ماننے کے لئے

توآپ تیار ہیں۔ مگر ان کے ماننے کے لئے آپ کو ایک اور ایک دو کی طرح دلائل اور براہین درکار ہیں۔ مہربان من! خدا تعالیٰ۔ رسالت، قیامت اور سب چیزیں جو ایمانیات میں داخل ہیں ان کا انحصار بھی بعض قرائن پر ہوتا ہے نہ کہ رویت پر۔ پھر یہاں رویت والی دلیلیں ہم کس طرح دکھا سکتے ہیں؟ کلامِ الٰہی تو روحانیات میں داخل ہے اور اس کے تمام حقائق و معارف حسابی میزان پر نہیں بلکہ روحانی میزان پر تولے جاتے ہیں۔ اور قرائن انشراح صدر اور ایمانی تشریحات پر ان کا مدار ہوتا ہے۔ پس ایسا مطالبہ غلط ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ہمارے قرائن لغو اور کمزور نہیں ہیں۔ مثلاً سبعًا من المثانی والا قرینہ کیا کوئی کمزور دلیل ہے؟ بلکہ سو دلائل پر بھاری ہے۔ اور بغیر ہماری توجیہہ کے اور سب توجیہات مقطعات کی ان کو کسی نظام کے ماتحت نہیں لاتیں۔ پس یہ بھی ایک عمدہ دلیل ہماری صحت خیال کی ہے۔ نیز بعض مقطعات کا صراحتاً فاتحہ کی بعض آیات کا اختصار ہونا اور نظر آنا نہایت عمدہ دلیل ہے۔ اس بات پر کہ باقی مقطعات بھی فاتحہ ہی کی آیات ہیں۔ پھر کُل حروفِ مقطعات کا فاتحہ میں موجود پایا جانا کیسی عجیب دلیل ہے جس کو رد کرنا آسان نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن مجید میں سات یا سات سے کم آیتوں والی بارہ سورتیں ہیں۔ مگر عجیب تر بات یہ ہے کہ کسی ایک سات یا اس سے کم آیتوں والی قرآنی سورت میں بھی تمام حروفِ مقطعات فاتحہ کی طرح موجود نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ ماعون میں حرف قؔ موجود نہیں۔ سورہ کافرون میں حؔ۔ سؔ۔ صؔ۔ طؔ موجود نہیں ہیں۔ اور سورۃ الناس میں ح اور ط موجود نہیں ہیں۔ گویا حکمتِ الٰہی ارادۃً ۱۴ حروفِ مقطعات صرف فاتحہ میں ہی رکھے ہیں۔ باقی سات یا کم آیتوں والی قرآنی سورتوں میں جو ۱۲ عدد سورتیں ہیں کسی ایک میں بھی پورے حروفِ مقطعات نہیں پائے جاتے۔ پس یہ ایک نیا قرینہ قائم ہوگیا کہ صرف فاتحہ میں تمام حروفِ مقطعات موجود ہیں اور اس کے برابر کی کسی اور سورۃ میں یہ موجود نہیں ہیں۔ اور یہ بارہ سورتیں حسب ذیل ہیں :

قدر، عصر، فیل - قریش - ماعون - کوثر - کافرون - نصر - لہب - اخلاص - فلق اور ناس ۔

(۹)

ذیل میں پوری آیتوں کے مقطعات کا ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے آپ کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی ۔ نامکمل آیت یا الفاظ کے مقطعات کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔

۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؀ .... اس کا کوئی مقطعہ نہیں ہے ۔

۲۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ
۳۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؀
۴۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؀
} حٰمٓ ۲،۳،۴

۵۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؀
۶۔ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ؀ .... طٰہٰ - طٰسٓمٓ (۶)
۷۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ } الٓرٰ - الٓمٓصٓ (۷)

} عٓسٓقٓ ۵،۶
} کٓہٰیٰعٓصٓ ۵،۶،۷
} یٰسٓ ۴،۵،۶

(نوٹ) یٰسٓ کی بابت میں نے پہلے لکھا تھا کہ یہ فاتحہ کی آیت ۴ اور ۶ کا مقطعہ ہے ۔ مزید غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے یہ آیات ۴ - ۵ ، ۶ تینوں کا مقطعہ ہے ۔ جیسا کہ یہاں اس نقشہ میں ظاہر کیا گیا ہے ۔)

(۱۰)

باوجود ان سب کے میں پھر یہی کہتا ہوں کہ ممکن ہے میرے مضمون میں کئی غلطیاں ہوں اور یہ آئندہ غور کرنے والوں کا کام ہے کہ وہ غلطی کو چھوڑ دیں ۔ اور صحیح اور دلپسند چیز کو لے لیں اور عاجز کے حق میں دُعائے خیر کریں ۔ میرے نزدیک یہ غلطیاں بعض مقطعات میں ہو سکتی ہیں ۔ فاتحہ کا ان مقطعات کے اصل ہونے پر میں پختگی سے قائم رہوں گا ۔ پس یہ

خطا شاخوں میں ہو سکتی ہے۔ اصل دعوے میں نہیں۔

مذکورہ بالا اعتراضات کے سوا اور کوئی اعتراض کسی طرف سے میرے کان میں نہیں پڑا۔ اس لئے فی الحال اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ صرف شائقین سے ایک ضروری درخواست یہ ہے کہ وہ ساری قسطیں مقطعاتِ قرآنی کی لے کر یکدم ان کو ضرور پڑھ جائیں۔ اس طرح امید ہے کہ مضمون ایک تسلسل کے ساتھ اُن کے ذہن میں آجائے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جو یہ مضمون چھپا ہے اس کے نقائص بھی دُور ہو جائیں گے۔

مُقطّعاتِ قرآنیہ کے متعلق بعض نئی باتیں

جب سے میں نے ایک نئی روشنی مقطعاتِ قرآنی پر ڈالی ہے۔ تب سے ہی قسم قسم کے اعتراضات اس حل کے متعلق میں سنتا رہتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان اعتراضات کے جواب بھی سمجھ میں آتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ بات زیادہ روشن اور واضح ہوتی جاتی ہے کہ مقطعات سورہ فاتحہ کی مخفف شدہ آیات کے سوا اور کچھ نہیں ہیں معترضین کا سب سے بڑا دعوٰی یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ اس اعتراض کا جواب میں اپنے رسالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر بعض باتیں مزید بھی علم میں آتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اگر مقطعات اسماء الٰہی ہیں تو پھر الٓمّٓ اور الٓرٰ کو ایک فقرہ یا مضمون بنا کر کیوں بتایا جاتا ہے۔ بلکہ چاہیئے تھا کہ آپ ان حروف سے الگ الگ تین اسماء الٰہی نکالتے۔ نہ یہ کہ اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ اور اَنَا اللّٰہُ اَرٰی کی عبارت بنا کر اس کے معنی پیش کرتے۔ حالانکہ دوسری جگہ بلا کسی دلیل اور قرینہ کے آپ صٓ سے صادق اور قٓ سے قادر حٰمٓ سے حمید مجید مراد لیتے ہیں۔ اور تیسری جگہ نٓ کے معنی دوات تسلیم فرماتے ہیں جو خدا کا نام نہیں ہے۔ اور چوتھی جگہ کٓھٰیٰعٓصٓ میں کریم۔ ہادی۔ عزیز اور صَادِقُ الوعد لے کر آپ کو ی کے متعلق مشکل آپڑی کیونکہ یہ کسی اسم الٰہی کے پہلے نہیں آتی۔ اس لئے مجبوراً اسے یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ (المؤمنون : ۸۹) بنا دیا۔

ترجمہ: وہاں اس کے عذاب کے خلاف کوئی دوسرا پناہ نہیں دے سکتا۔

(دیکھو قرآنِ مجید کا حاشیہ ترجمہ حافظ روشن علی صاحب)

پس خود مدعی کو بھی کسی جگہ قرار نہیں اور یہی ثبوت ہے۔ اِس بات کا یہ مقطعات اسمائے الٰہی نہیں ہیں۔ اسی طرح یٰسٓ کے معنے اے سردار اور طٰہٰ کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا کر ان کو بھی مجبور ہو کر اسماءِ الٰہی سے خارج کر دیا۔ اور اپنے دعویٰ سے خود ہی دستبردار ہو گئے اور مقطعات کے ایک یونی فارم معنی کہیں بھی نہ کر سکے جیسے کہ ہم نے کئے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حقیقۃ الوحی کے حاشیہ صـ۱۳۳ پر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے الٓمّٓ کے معنی اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ کر کے پھر ان معنوں کی منطقیانہ توجیہہ بھی کی ہے۔ اِس لئے ہم کو وہی معنی ماننے چاہئیں جو حضرت مسیح موعود نے فرمائے ہیں۔ میرا جواب یہ ہے۔ کہ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ تو ابن عباسؓ یا مجاہدؒ کے کئے ہوئے معنے ہیں۔ حضرت مسیح موعود نے ہرگز نہیں کئے۔ البتہ آپ نے پرانے معنوں کو صرف تسلیم کر کے ان کی منطقیانہ توجیہہ کی ہے۔ لیکن باوجود اس توجیہہ کے خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اس تحریر کے بعد کی ایک تحریر میں جو حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۲۳ پر ہے۔ ارقام فرماتے ہیں

"اگر کہو کہ خدا کے الہام میں اُسی وقت کیوں معنی نہ کھولے گئے۔ تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ مقطعاتِ قرآنی کے اب تک معنے نہیں کھولے گئے۔ کون جانتا ہے۔ کہ طٰہٰ کیا چیز ہے۔ اور نٓ کیا چیز ہے۔ اور کٓھٰیٰعٓصٓ کیا چیز ہے۔" (حقیقۃ الوحی)

یہ تحریر اُسی کتاب کی ہے۔ جس کی پہلی تحریر پہ آپ نے سند پکڑی تھی۔ اور یہ بعد کی تحریر ہے۔ کیونکہ وہ صفحہ ۱۳۳ پر تھی اور یہ صفحہ ۲۲۳ پہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) ان معنوں کو یقینی طور پر صحیح نہیں مانتے بلکہ پُرانے مشہور معنوں کو لے کر ان کی ایک منطقی توجیہہ فرماتے ہیں اور بس۔ یہاں تو حضور نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ حضور پر یا کسی اور پر مقطعات کے معنے نہیں کھولے گئے اور صفحہ ۱۳۳ کی تحریر

مقطعات کی پُرانی تفسیروں کا ہی ایک بیان ہے ورنہ حضور مقطعات کو اپنی زندگی کے آخر تک منکشف شدہ نہیں مانتے رہے۔ اور یہی حق ہے۔

تیسری زبردست الہامی دلیل جو مجھے ملی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی ایک وحیٔ مبارک ہے۔

حٰمٓ ۝ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ۝

یہ الہام قرآن کی آیت نہیں ہے۔ بلکہ غیر قرآنی وحی ہے جو حضور کو ہوئی۔ اور اس میں مقطعہ حٰمٓ کے معنی بتائے گئے ہیں۔ یعنی حٰمٓ کیا ہے۔ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں (نہ کہ کچھ اور) اور یہی میرا دعویٰ ہے۔ کہ تمام مقطعات فاتحہ کی آیات ہیں۔ نہ کہ کچھ اور۔ اور میں نے بھی حٰمٓ سے فاتحہ کی آیات نمبر ۲۔۳۔۴ مراد لی ہیں اور الہام بھی اسی کے مطابق ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ خود قرآن مجید کی سورہ دخان میں زقوم کا لفظ ایک پوری آیت

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان: ۵۰)

کا مُخفّف ہے (حضرت مسیح موعود در اسلامی اصول کی فلاسفی)

پس یہ ایک عمدہ نمونہ ہے مقطعات کی تفسیر کے لئے کہ وہ بھی ایک یا کئی آیتوں کے مخففات ہیں۔ اور خود قرآنی مثال سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کون سی حجت ہو سکتی ہے۔ اور جس طرح زقّوم مقطعہ ہے ایک آیت کا اسی طرح مقطعات بھی قرآن ہی کی آیات کے اختصارات ہیں۔

باب پنجم

حضرت محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

سلام بحضور سیّد الانامؐ

بہ درگاہِ ذی شانِ خیر الانامؐ　　شفیعِ الورٰی ۔ مرجعِ خاص وعام
بصد عجز و منت ۔ بصد احترام　　یہ کرتا ہے عرض آپ کا اِک غلام
کہ اے شاہِ کونین عالی مقام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

حسینانِ عالم ہوئے شرمگیں　　جو دیکھا وہ حسن اور وہ نورِ جبیں
پھر اُس پر وہ اخلاقِ اکمل ترین　　کہ دُشمن بھی کہنے لگے آفریں
زہے خُلقِ کامل ۔ زہے حُسنِ تام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

خلائق کے دل تھے یقیں سے تہی　　بُتوں نے تھی حق کی جگہ گھیر لی
ضلالت تھی دُنیا پہ وہ چھا رہی　　کہ توحید ڈھونڈے سے ملتی نہ تھی
ہوا آپ کے دم سے اُس کا قیام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

محبت سے گھائل کیا آپ نے　　دلائل سے قائل کیا آپ نے
جہالت کو زائل کیا آپ نے　　شریعت کو کامل کیا آپ نے
بیان کر دیے سب حلال وحرام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

نبوت کے تھے جس قدر بھی کمال　　وہ سب جمع ہیں آپ میں لامحال
لیا ظلم کا عفو سے انتقام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

مقدّس حیات اور مطہر مذاق　　اطاعت میں یکتا عبادت میں طاق
سوارِ جہانگیر یکراں بُراق　　کہ بگذشت از قصرِ نیلی رواق
محمّد ہی نام اور محمّد ہی کام
علیكَ الصلوٰة علیكَ السلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حُلیہ مبارک

قد۔ میانہ قد سے ذرا نکلتا ہوا۔ جسم خوش اندام اور گٹھا ہوا۔ جسامت میں معتدل۔

رُعب:۔ آپؐ کو دیکھ کر عظمت اور ادب پیدا ہوتا تھا۔ بدن نہایت جامہ زیب تھا۔

سر:۔ بڑا اور خوبصورت۔ بال سیدھے۔ لیکن قدرے بل دار کان کی لَو تک سر میں تیل ڈالا کرتے تھے۔ مانگ درمیان میں رکھتے تھے اور زینت کر کے آئینہ دیکھا کرتے۔

چہرہ:۔ چودھویں کے چاند کی طرح چمک دار۔ سفید رنگ جس میں سُرخی دمکتی تھی۔ کشادہ رو۔ خوش خو۔ سنجیدہ

پیشانی:۔ فراخ و بلند۔ ابرو خمدار۔ بالوں سے پُر۔ پیوستہ نہ تھے۔ دونوں کے درمیان ایک رگ تھی۔ جو جلال کے وقت نمایاں ہو جاتی تھی۔

ناک:۔ اونچی اور قدرے لمبی۔

ریش مُبارک:۔ بھری ہوئی اور سیاہ۔ فوت ہوتے وقت سر اور داڑھی میں ۱۷ سے زیادہ سفید بال نہ تھے۔

رخسار سبک۔ دہن فراخ۔ دانت:۔ چمکدار باریک۔ جب تبسم فرماتے تو بجلی کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ اُحد کی لڑائی میں ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔

آنکھیں:۔ سیاہ بڑی بڑی سرمگیں۔ ان میں ڈورے تھے۔ پلکیں لمبی تھیں۔

گردن:۔ تصویر کی گردن کی طرح۔ صفائی میں چاندی کی مانند

سینہ اور شکم:۔ سینہ سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط تھا۔ سینہ اور شکم

ہموار۔ بلکہ سینہ قدرے ابھرا ہوا۔ اور خوب چوڑا۔ چوڑے شانے۔

پشت اور مہر نبوت :۔ دونوں بازو اور شانوں پر قدرے بال۔ پشت پر دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی۔ یہ ایک سُرخ سیاہی مائل اُبھرا ہوا مسّہ تھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر تھا اور گول گھنڈی کی مانند شکل میں تھا۔ اس پر کچھ بال تھے۔ اور گرداگرد اس کے تِل تھے (یہ علامت اہل کتاب کی روایات میں آپؐ کے حلیہ کے متعلق بطورِ نشان کے موجود تھی)۔

کلائی :۔ دراز۔ ہتھیلی فربہ گوشت سے پُر اور نرم۔ انگلیاں لمبی۔

جوڑ :۔ تمام جوڑ مضبوط اور چوڑے۔ تمام ہڈیاں بھی بھاری اور چوڑی تھیں۔

پنڈلیاں :۔ پُر گوشت اور سخت۔

پیر :۔ قدم ہموار اور صاف اور بھرے ہوئے کشادہ۔ تلوے گہرے۔ راتوں کو عبادت میں کھڑے کھڑے پَیر سُوج جایا کرتے تھے۔

چال :۔ سبک اور تیز رَو۔ گویا بلندی سے اُتر رہے ہیں۔ رفتار میں کوئی آپ کے ساتھ نہ رہ سکتا تھا۔ بے تکلفی سے تیز چلتے تھے۔

کلام :۔ شیریں کلام۔ واضح بیان۔ بلا ضرورت نہ بولتے تھے۔ نرم گو تھے۔ اکثر خاموش رہتے۔ جب بولتے تو الفاظ علیحدہ علیحدہ اور صاف صاف واضح ہوتے تھے۔ کلام مختصر اور جامع اور فصیح و بلیغ اور موثر کرتے۔ چلّا کر نہ بولتے تھے۔ بات کرنے میں اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔ ملنے والوں سے مزاج پرسی کرتے۔ لوگوں کو پہلے سلام کرتے۔ کسی کا عیب بیان نہ کرتے۔ نہ کسی کا عیب تلاش کرتے نہ ناجائز جرح کرتے تھے۔ کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ کبھی منہ سے کوئی فحش کلام نہیں نکلا۔

مزاج :۔ نرم مزاج تھے۔ کبھی کسی مخاطب کی حقارت نہ کرتے تھے۔ نہ کسی نعمت کی مذمت کرتے تھے۔ مزاح بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی جھوٹ نہ ہوتا تھا۔

قوت :۔ بہت طاقتور انسان تھے ۔ اَن تھک قویٰ تھے۔ عرب کے مشہور پہلوان ابو رکانہ کو تین دفعہ پے در پے کشتی میں پچھاڑا۔ باوجود اس کے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی خادم کسی عورت کو نہیں مارا۔ نہ جنگ میں کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ قوت رجولیت ۴۰ آدمیوں کے برابر عطا ہوئی تھی۔ ۲۵ سال تک عملی اور اصلی برہمچریہ کا نمونہ دکھایا۔ روایت ہے آپؐ سب سے زیادہ اپنی شہوت پر قابو رکھنے والے شخص تھے ۔

خوشبو :۔ نہایت پسند تھی۔ اور ہمیشہ استعمال فرماتے تھے ۔

صفائی :۔ بہت محبوب تھی۔ دانت اور بدن اور لباس نہایت صاف رکھتے تھے اور دوسروں کو اس کا حکم کرتے تھے۔ بدبو اور گندگی سے سخت نفرت تھی ۔

ہنسنا :۔ جب کسی کو ملتے تو تبسم اور کشادہ روئی سے ملتے۔ خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے۔ قہقہہ نہ مارتے تھے ۔ بلکہ مُسکراتے تھے ۔

غصہ :۔ اپنے نفس کے لئے غضب نہ کرتے تھے۔ غصہ صرف امرِ حق کی مخالفت کے وقت آتا تھا اور کبھی اتنا نہ آتا کہ بے قابو ہو جاتے۔ غصہ میں بھی ہمیشہ حق ہی فرماتے تھے ۔

رونا :۔ کبھی کبھی رقّتِ قلب اور دوسروں پر شفقت اور رحم دلی کی وجہ سے یا خُدا کا کلام سُن کر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے ۔

سونا :۔ کم سوتے تھے اور بہت ہشیار سوتے تھے۔ خراٹے بھی لے لیا کرتے تھے۔ بستر کمبل اور بوریے کا تھا۔ یا ایسی چارپائی پر سوتے تھے کہ اس کے نشان بدن پر پڑ جاتے تھے۔

گھر کے تقسیم اوقات :۔ تین حصوں میں وقت تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لئے ایک گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے اور ایک اپنے آرام کے لئے اس حصہ میں سے بھی لوگ وقت لے لیتے تھے۔ جب کوئی آپ کے پاس ملنے جاتا تو اُسے کچھ نہ کچھ کھلا دیا کرتے تھے ۔

کھانا :۔ ہمیشہ ہلکے پیٹ کھاتے تھے۔ کھانے میں بلکہ کسی بات میں تکلف نہ تھا۔ کثرت سے روزے رکھتے۔ کھانے کا عیب اور نقص کبھی بیان نہ کرتے۔ سہارا لگا کر نہ کھاتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں اور غلام کی طرح بیٹھتا ہوں۔ کبھی تین روز متواتر روٹی سے پیٹ نہیں بھرا۔ ہر طیب اور پاکیزہ چیز کھا لیتے تھے۔

مجلس :۔ اُٹھتے بیٹھتے بلکہ ہر حرکت اور سکون کے وقت اللہ کا ذکر کرتے اور استغفار کرتے رہتے تھے۔ مسجد میں کوئی معین جگہ بیٹھنے کی نہ تھی۔ آپ کی مجلس حلم و علم حیاء صبر اور امانت کا نمونہ ہوتی تھی۔ اس میں آوازیں بلند نہ ہوتی تھیں۔ نہ کسی کو ذلیل کیا جاتا تھا۔ نہ کسی کی پردہ دری ہوتی تھی۔ مقرب صحابہ اس طرح بیٹھتے تھے۔ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ کسی کے کلام کی آپ کی مجلس میں بیقدری نہ کی جاتی تھی۔ جس پر سب ہنستے آپؐ بھی تبسم فرماتے۔ اور جس بات پر سب تعجب کرتے۔ آپ بھی کرتے تھے۔ پردیسیوں اور جنگلیوں کی بے تمیز گفتگو پر تحمل فرماتے۔ کبھی مجلس میں پیر پھیلا کر نہ بیٹھتے۔ اور نہ آنکھ کے اشارہ سے بات کرتے۔ کبھی پہلو کی چیز کو دیکھنا چاہتے تو پورے پھر کر دیکھتے تھے۔ یعنی کن انکھیوں سے نہ دیکھتے تھے۔ اسی طرح کسی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سوچ میں ہیں۔

صحت اور مرض الموت :۔ صحت آپؐ کی بالعموم اچھی رہتی تھی۔ بیمار بہت کم ہوتے تھے۔ جہاں تک میں علامات اور حالات کو معلوم کر کے نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ غالباً آپ کی وفات ٹائی فائڈ یعنی محرقہ میعادی سے ہوئی جسے ہندوستان میں موتی جھرہ اور پنجاب میں تورکی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (روزنامہ الفضل ۷؍ اگست ۱۹۲۸ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے محامد کلامِ الٰہی میں

خواہ تمام دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف وتعریف۔ لاانتہا زمانوں تک طرح طرح کے پیرایوں میں کرتی رہے۔ اور انسانی دماغ آپؐ کی نعت ومحامد میں قرنوں مصروف رہے۔ پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ جو حقیقی تعریف اعلیٰ درجہ کی نعت خلاقِ دوجہاں اور واقفِ اسرارِ کون ومکاں بیان کرسکتا ہے وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔

نہ تو کوئی انسان آپؐ کے محامد کے کنہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ کوئی پورے طور پر بیان کرسکتا ہے۔ اس لئے جس قدر بھی محامد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بیان کئے گئے ہیں۔ وہ محض آپؐ کے جزوی کمالات ہیں۔ جن پر اپنے اپنے مذاق کے مطابق ہر طبقہ کے مادحین نے وقتاً فوقتاً اظہارِ خیالات کیا ہے۔ میں ایک طرف تو آج کل بستر علالت پر پڑا ہوں اور دوسری طرف ایڈیٹر صاحب "الفضل" کی تاکید پر تاکید ہے کہ کوئی مضمون دو۔ جو خاتم النبیینؐ نمبر میں درج کیا جائے۔ اگرچہ اُن کی اس فرمائش کی تعمیل ان پہ احسان نہیں۔ بلکہ خود لکھنے والے کے لئے عین سعادت ہے۔ تاہم بیماری بھی مجبور کر رہی ہے کہ دماغ پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ خود کوئی مضمون سوچ کر ناقص اور ناتمام صورت میں لکھتا۔ مجھے اس میں بہت آسانی نظر آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعض اُن محامد پر ناظرین کو توجہ دلاؤں جو خود خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں حضورؐ کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔ اور جو گو الفاظ میں حد درجہ مختصر ہیں لیکن تمام انسانی محامد کی

اصل اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ کیرکٹر اور حقیقی قوتِ قدسی اور تعلق باللہ۔ اور شفقت علےٰ خلق اللہ کو بہترین پیرایہ میں بیان کرنے والے ہیں ۔

یاد رہے کہ مندرجہ ذیل نعت، صرف ایک حصّہ ہے ۔ آپؐ کے اُن تمام محامد کا جن سے کلامِ الٰہی بھرا پڑا ہے ۔ مگر یہ چند آیات مخصوص طور پر مشہود اور مشہور ہیں ۔ اس لئے تبرکاً و تیمناً ان کو لکھ دینے اور ان کا ترجمہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ۔ تاکہ میں بھی امسال اس پرچہ کے ذریعہ سعادت اور ثواب میں شریک ہوں ۔ ورنہ ؎

اُو چہ میدارد بمدحِ کس نیاز
مدحِ او خود فخرِ ہر مدحت گرے
استِ اُو در روضۂ قدس و جلال
واز خیالِ مادحاں بالاترے

(۱)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ : ۱۲۸)

یعنی اے ہر طبقہ کے انسانو! یہ عظیم الشان رسول تم میں سے ہی تمہارے پاس مبعوث ہو کر آیا ہے ۔ ایک طرف تو اس کی خیر خواہی کا یہ عالم ہے ۔ کہ تمہیں تکلیف دینے والی باتیں اسے بہت شاق گزرتی ہیں ۔ دوسری طرف تمہارے فوائد کا نہایت ہی درجہ خواہشمند ہے ۔ اور تیسری طرف مومنوں کے لئے حد درجہ کی شفقت اور رحم اپنے دل میں رکھتا ہے ۔

(۲)

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (اعراف ۱۵۸، ۱۵۹)

یعنی میں اپنی رحمت کو اُن لوگوں سے مخصوص کر دوں گا جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ جو "وہ نبی" کے نام۔ اور اُمّی کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ اور یہ پیشگوئی اہلِ کتاب کے پاس تورات اور انجیل دونوں میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ یہ نبی ہر اچھی بات کا حکم کرتا ہے۔ اور ہر بُری بات سے منع کرتا ہے۔ پاک اشیاء کو حلال ٹھہراتا ہے اور ناپاک اشیاء کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور مخلوقات کی تمام مصیبتوں کے بوجھ اور طوق جو اُن پر لدے ہوئے تھے۔ اتارتا ہے۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائے۔ اور انہوں نے اس رسول کو قوت دی۔ اور اس کی مدد کی۔ اور اس نور کی پیروی کی۔ جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ اے رسولؐ! تو بھی کہہ دے۔ کہ اے تمام لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس خدا کی بادشاہی آسمان و زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وُہی مارتا ہے۔ پس اس خدا۔ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ جو "وہ نبی" کے نام اور اُمّی کے لقب سے مذکور ہے۔ اور جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اُس کی پیروی کرو۔ تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

(۳)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۱۰۸)

یعنی اے رسولؐ! ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا۔ مگر رحمت بنا کر تمام عالمین کے لئے

(۴)

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح: ۹ تا ۱۱)

یعنی ہم نے تجھ کو مخلوقات کے لئے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ تو ماننے والوں کو خوشخبری دینے والا۔ اور منکرین کو عذاب سے ڈرانے والا ہے۔ تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ اس کے رسول کو قوت دو۔ اور اس کی تعظیم کرو۔ اور اللہ کی صبح و شام تسبیح کرو۔ اے رسول! وہ سب لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ دراصل خود اللہ ہی کی بیعت کرتے ہیں۔ گویا تیرا ہاتھ نہیں۔ بلکہ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہوتا ہے۔

(۵)

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح ۲۹:۳۰)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ تمام اور دینوں پر دینِ اسلام کو غالب کر کے دکھا دے اور خدا کافی ہے۔ اس کا مددگار۔ محمدؐ اللہ کا رسول ہے

اور جو لوگ اُس کی جماعت میں ہیں۔ وہ کافروں پر رعب رکھتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں۔ تو ان کو دیکھتا ہے۔ کہ وہ رکوع اور سجدے میں پڑے ہوئے۔ خدا کا فضل۔ اور اس کی رضامندی طلب کرتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے چہروں پر عبودیتِ الٰہی کے آثار چمکتے ہیں ......

(۶)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(آل عمران : ۱۶۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ ان میں سے ہی ایک رسول اُن کے لئے مبعوث کیا۔ جو خدا کے کلام کی آیتیں ان کو سناتا ہے۔ ان کو ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب اللہ اور حکمت کی باتوں کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس کے آنے سے پہلے یہی لوگ سخت گمراہی میں مبتلا تھے۔

(۷)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران : ۱۶۰)

یعنی یہ بھی خدا کی ایک بڑی رحمت ہے۔ کہ اے رسول! تو ان لوگوں کے لئے نرم دل اور رقیق القلب ہے۔ اگر تو ذرا بھی سخت زبان یا سنگدل ہوتا۔ تو یہ سب لوگ تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔

(۸)

النَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ

(احزاب ۔ ۷)

یعنی یہ نبی بہت ہی شفقت کرنے والا ہے مسلمانوں پہ۔ ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ۔ اور اس کی بیبیاں اُن کی مائیں ہیں۔

(۹)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (احزاب: ۲۲)

یعنی اے لوگو! تمھارے لئے یہ رسولؐ بہترین نمونہ ہے پیروی کرنے کے لیے۔ اس شخص کے واسطے جو خدا کی رحمت اور آخرت میں کامیابی چاہتا ہے۔ اور اللہ کو بہت یاد رکھتا ہے

(۱۰)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ۴۶۔۴۷)

یعنی اے نبی ہم نے تجھ کو گواہ۔ خوشخبری دینے والا۔ عذاب الٰہی سے ڈرانے والا۔ خدا کے حکم سے اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا۔ اور ہدایت کا چمکتا ہوا سورج بنا کر دنیا کی طرف بھیجا ہے۔

(۱۱)

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب: ۵۷)

یعنی اللہ۔ اور اُس کے فرشتے اس نبی پہ خاص رحمتیں۔ اور درود بھیجتے ہیں۔ سوائے

مسلمانو! تم بھی اس پر باقاعدہ درود اور سلام کی دعائیں بھیجا کرو۔

(۱۲)

اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ○ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ○ (کوثر ۲:۴)

یعنی اے محمدؐ! ہم نے تجھ کو اولاد۔ اور ہر نعمت بکثرت اور بے انتہاء عطا کی ہے۔ پس تو بھی اپنے رب کے حضور نماز پڑھ اور قربانی کر۔ تیرا دشمن ہمیشہ نامراد اور لاولد رہے گا۔

(۱۳)

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح ۲-۵)

کیا ہم نے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا۔ اور تیرے اس بوجھ کو جس نے تیری کمر توڑ دی تھی۔ تجھ پر سے ہٹا نہیں دیا۔ بلکہ تیرے ذکر کو خوب بلند کیا۔ (جس کا ایک نمونہ سیرت النبیؐ کے جلسے بھی ہیں۔)

(۱۴)

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ..... (النجم ۴-۵)
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی

یعنی یہ رسول۔ کوئی کلام خواہشِ نفسانی کے ماتحت نہیں کرتا۔ بلکہ وحی الٰہی کے ماتحت اس کے جملہ اقوال وافعال ہیں...... اسی طرح یہ مخلوق اور خالق کے درمیان شفیع ہے۔ اور جس طرح دو کمانوں کی تاریں درمیان میں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح الوہیت انسانیت کی کمانوں کے درمیان بطورِ خطِ مستقیم کے ہے۔ اور ان دونوں کے آپس کے تعلق کا ذریعہ ہے

(۱۵)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ (احزاب ۴۱)

اللہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب : ۴۱)

یعنی گو محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم لوگوں میں سے کسی مرد کا جسمانی باپ نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہ ہے اور اس حیثیت سے سب مسلمانوں کا روحانی باپ ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کا درجہ ہے۔ کہ یہ خاتم النبیّین ہے۔ یعنی تمام انبیاء کے سب کمالات کو اپنے اندر جمع کرنے والا ہے۔ اور ان کا فیضان اپنی اُمت میں جاری کرنے والا ہے۔ اس لئے تمام انبیاء سے اس کا درجہ افضل اور بزرگ تر ہے۔

(۱۶)

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم : ۵)

تو عظیم الشان اخلاق والا انسان ہے۔

(۱۷)

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران : ۳۲)

یعنی اے رسول تو لوگوں میں اعلان کر دے۔ کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو۔ پھر خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور تم محبوبِ الٰہی بن جاؤ گے۔

(الفضل ۶ر نومبر ۱۹۳۲ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

میرا ارادہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حالات چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور قصّہ کے پیرایہ میں لکھے جائیں۔ تاکہ ہمارے بچے اور جوان آپؐ کی سوانح اور آپؐ کے زمانہ کے واقعات سے کسی حد تک واقف ہو جائیں۔ مَیں ان حالات کے بیان کرنے میں نہ تو تسلسل کا پابند ہوں گا کہ ابتداء سے شروع کروں اور تاریخ وار حالات لکھوں۔ نہ استنباط اور استدلال وغیرہ کروں۔ بلکہ سادہ اور صاف الفاظ میں بچوں اور ناواقف نوجوانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور اس زمانہ کے حالات میں سے ایک ورق پیش کر دیا کروں گا تاکہ ہمارے بچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوانح سے باخبر ہو جائیں۔ وباللہ التوفیق۔

پہلے تین مُسلمان

حضرت عفیفؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں جاہلیت کے زمانہ میں ایک دفعہ مکہ میں آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ کپڑا اور خوشبو اپنے گھر والوں کے لئے خریدوں۔ اس کام کے لئے میں حضرت عباسؓ کے پاس گیا۔ اور بیٹھ کر سودا کرنے لگا۔ ہم لوگ اس وقت ایسی جگہ پر بیٹھے تھے۔ جہاں سے کعبہ میں نظر پڑتی تھی۔ اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک جوان آیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ باندھ کر کعبہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک لڑکا آیا۔ اور اس شخص کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک عورت آئی اور اُن کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں اس جوان نے رکوع کیا۔ تو ساتھ ہی عورت اور لڑکے نے بھی رکوع کیا۔ پھر وہ جوان رکوع سے اُٹھا تو لڑکا اور عورت بھی ساتھ ہی اُٹھے۔ پھر جوان نے سجدہ کیا۔ تو باقی دونوں نے بھی سجدہ کیا۔ میں نے یہ نظارہ دیکھ کر کہا کہ عباس! یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں واقعی بڑی تعجب کی بات ہے۔ یہ جوان میرا بھتیجا محمدؐ عبداللہ کا بیٹا ہے اور یہ لڑکا علیؓ میرے بھائی ابوطالب کا بیٹا ہے۔ اور یہ عورت محمدؐ کی بی بی خدیجہ ہے۔ میرا بھتیجا محمدؐ کہتا ہے کہ اس کا خدا آسمان اور زمین کا پروردگار ہے۔ اور اسی نے محمدؐ کو اس دین کا حکم دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی قسم اس وقت ان تینوں کے سوا اور کوئی شخص اس دین میں داخل نہیں ہے۔

ظالم چچا

ایک صحابی (ربیعہ نام) بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابولہب کو عکاظ کے میلے میں دیکھا۔ کہ وہ رسولِ خداؐ کے پیچھے پیچھے کہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہ اے لوگو یہ شخص گمراہ ہو گیا ہے۔ کہیں تمہیں بھی تمہارے باپ دادا کے مذہب سے گمراہ نہ کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے آگے آگے تیز قدم چلے جاتے تھے۔ وہ بھی آپؐ کے پیچھے لگا چلا جاتا تھا۔ ہم سب لوگ جو عمر میں لڑکے ہی تھے۔ ابولہب کے ساتھ ہوتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی وہ نظارہ ہے۔ کہ ایک شخص پھر پھر کر پیچھے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کے بال لمبے تھے۔ اور وہ سب سے زیادہ گورا اور خوبصورت تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ کون ہے لوگوں نے کہا یہ محمدؐ ہے۔ عبداللہ کا بیٹا۔ پھر میں نے پوچھا۔ کہ یہ شخص کون ہے جو ان کو پتھر

مارتا اور بُرا بھلا کہتا چلا جا رہا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔
(عکاظ مکہ کے پاس ایک جگہ تھی۔ جہاں خرید و فروخت کی منڈی لگا کرتی تھی اور بڑا میلہ ہوتا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے)

بچوں سے جھوٹ نہ بولو

ایک صحابی (عبداللہؓ) بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے۔ اس وقت میں بچہ تھا۔ اور کھیل رہا تھا۔ میری والدہ نے کہا۔ عبداللہ! یہاں آؤ۔ تمہیں ایک چیز دوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اُسے کیا دو گی؟ میری والدہ نے کہا۔ چھوارا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے۔ اگر تم بچوں سے کوئی وعدہ کرو۔ اور پھر اُسے پورا نہ کرو تو ایک جھوٹ تمہارے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا۔

شراب کی حرمت اور صحابہؓ کی اطاعت

شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی نہیں پی۔ مدینہ میں جب شراب حرام ہونے کا حکم نازل ہوا۔ تو آنحضرتؐ نے اس کا ڈھنڈورا دلوا دیا۔ اس وقت ابوطلحہؓ کے مکان پر صحابہؓ کی ایک مجلس میں حضرت انسؓ ان لوگوں کو شراب پلا رہے تھے کہ باہر سے ڈھنڈورا کی آواز آئی۔ ابوطلحہؓ نے انسؓ سے کہا۔ کہ بیٹا دیکھو تو یہ شور و غل کیسا ہے وہ باہر جا کر دریافت کر کے آئے اور کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔ ابوطلحہؓ نے انسؓ سے کہا کہ یہ سب شراب لنڈھا دو۔ چنانچہ لوگوں نے اس کثرت سے شراب گرائی کہ مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہنے لگی۔ اور وہ لوگ جو دن رات اس کے عادی تھے۔ انہوں نے پھر کبھی بھول کر بھی اسے منہ نہیں لگایا۔

مہمان نوازی

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کافر مہمان ہو کر آیا۔ آپؐ نے اس کی خوب خاطر تواضع کی اور رات کو اوڑھنے کے لئے اپنا کپڑا بھی اُسے دیا۔ اور اپنے ہاں ہی سلایا۔ وہ نالائق علی الصبح ہی چلا گیا۔ اور آپؐ کے دیئے ہوئے بستر کو بھی شرارت سے پاخانہ کی نجاست سے بھر گیا۔ دن چڑھے آپؐ نے اس کا حال دریافت فرمایا تو معلوم ہوا۔ کہ چلا گیا ہے۔ اور بستر وغیرہ کو گندہ کر گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کپڑے کو لے کر دھونا اور صاف کرنا شروع کیا۔ صحابہؓ نے عرض بھی کیا۔ حضورؐ ہم اسے صاف کر دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں وہ میرا مہمان تھا۔ اس لئے اس کی غلاظت کو صاف کرنا بھی میرا ہی حق ہے۔ اتنے میں اس مہمان کو یاد آیا۔ کہ میں کوئی ضروری چیز وہیں بھول آیا ہوں۔ واپس آیا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نجاست خود صاف کر رہے ہیں۔ آپؐ نے دیکھ کر کچھ شکوہ شکایت نہ کی۔ بلکہ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ یہ حالت دیکھ کر اس کے دل پر آپؐ کے اخلاق کا اتنا اثر ہوا کہ وہیں مسلمان ہو گیا۔ آپؐ نے اس کی گندگی کیا دھوئی کہ کفر سے ہی اُسے پاک کر دیا۔

(یہ واقعہ حضرت مسیح موعودؑ (آپ پر سلامتی ہو) سُنایا کرتے تھے)

بادشاہ دوجہاں کی محل سرا کا ایک نظارہ

ایک دفعہ حضرت عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپؐ کے بالا خانہ پر حاضر ہوئے۔ دیکھا۔ کہ آپؐ ایک بورئیے پر لیٹے ہیں اور سوائے تہہ بند کے اور کوئی کپڑا آپؐ کے بدن پر نہیں۔ اور جسم پر بورئیے کے نشان پڑ گئے ہیں اور گھر میں سوائے مٹھی بھر جَو کے اور کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے یہ حالت دیکھ کر آنسو رواں ہو گئے

آپؐ نے فرمایا۔ عمرؓ کیوں روتے ہو۔ وہ بولے یارسولؐ اللہ کیوں نہ روؤں۔ آپؐ کی تو یہ حالت۔ اور قیصر و کسریٰ دُنیا کے مزے اُڑا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ اے عمرؓ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہمارے لئے آخرت ہو۔ اور اُن لوگوں کے لئے صرف دنیا کے عیش و آرام ہوں۔

(یہ مدینہ میں اس زمانہ کا واقعہ ہے۔ جب مسلمانوں کو فتوحات میسّر آ چکی تھیں)

آپ بیتی

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ نبیوں میں سے ایک نبی تھے ان کو اپنی قوم نے اتنا مارا کہ ان کے جسم کو لہولہان کر دیا۔ مگر وہ نبی اس تکلیف پر بھی اپنے منہ پر سے لہو پونچھتے جاتے تھے۔ اور کہتے جاتے تھے۔ کہ اے اللہ میری قوم کو معاف کر۔ انہوں نے ناواقفی میں یہ غلطی کی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے محبت کی وجہ

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے آپؐ کی ایک بی بی صاحبہ نے عرض کی کہ آپؐ عائشہؓ سے کیوں سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عائشہؓ کے سوا اور کسی بی بی کے بستر میں مَیں ہوں۔ تو مجھے وحی نہیں ہوتی۔ یعنی عائشہؓ کے کپڑے اور وہ خود اتنی پاک صاف ہے۔ کہ جب وہ میرے پاس ہوتی ہے تو وحی برابر آتی ہے۔ دوسری بی بیوں کا یہ حال نہیں۔ (اس سے یہ مطلب نہیں کہ دوسری عورتیں پاک صاف نہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ عائشہ کی ظاہری و باطنی پاکیزگی اس درجہ کمال کو پہنچی ہوتی ہے۔ کہ وحی کا فرشتہ وہاں آنے سے نہیں رُکتا۔ دوسروں کی حالت ان سے کم ہے)

نوٹ :۔ اس سے اس بات کا رد ہو گیا۔ کہ عائشہ اپنے حسن و نوجوانی یا باکرہ ہونے کی وجہ سے آپ کو عزیز تھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم نے پیٹ بھر کر چھوارے کھائے اور جی بھر کر پانی پیا۔ (آپؐ کا زمانہ تو ہم نے فقر و فاقہ میں ہی کاٹا۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خود بھی کم کھاتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی پیٹ بھر کر کبھی نہ کھایا نہ پیا۔

کسرٰے کے کنگن

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہؓ سے فرمایا۔ کہ سراقہ تمہارا کیا حال ہو گا۔ جب تم ایران کے شہنشاہ کسرٰے کے کنگن اور کمر بند اور تاج پہنو گے۔ سراقہؓ بچارے یہ بات سُن کر حیران رہ گئے۔ آپؐ کے اس فرمانے کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں کسرٰے کے کنگن اور کمر بند اور تاج مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے سراقہؓ کو بلا کر وہ چیزیں پہنا دیں اور فرمایا۔ اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر کہو۔ اللہ اکبر۔ سب تعریف اس خدا کی ہے جس نے شہنشاہ کسرٰے کے زیورات (جو اپنے تئیں لوگوں کا پروردگار کہا کرتا تھا) لے کر بنی مدلج کے ایک بدو سراقہؓ کو پہنا دیئے۔

زمانہ جاہلیت کا ایک مرغوب طعام

ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ جاہلیت کے زمانہ میں ہم سفر کے لئے نکلے جنگل میں مجھے ایک ہرن کے پَیر مل گئے۔ میں نے ان کو لے لیا اور پانی میں بھگو دیا۔ پھر ایک مٹھی بھر

جو بھی کسی قافلہ والے سے دستیاب ہو گئے۔ ان کو پتھروں سے پیس لیا۔ پھر میں نے اپنے اونٹ کی فصد لی اور خون لے کر ان سب چیزوں کو ایک ہانڈی میں ڈال کر پکایا اور خوب مزے سے کھایا۔ زمانہ جاہلیت میں یہی کھانا سب سے لذیذ سمجھا جاتا تھا۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ خون کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا میٹھا سا ہوتا ہے۔

دختر کشی

ایک دن ایک صحابیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی جاہلیت کے زمانہ کا قصہ بیان کرنے لگے کہ یا حضرت میری ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میں نے عرب کے دستور کے موافق اسے زندہ درگور کرنا چاہا۔ جنگل میں جا کر ایک گڑھا کھودا۔ پھر لڑکی کو وہاں لے گیا۔ اور گڑھے میں دھکیل کر جلدی جلدی اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دب گئی۔ جب میں مٹی ڈال رہا تھا۔ تو وہ معصوم آبا آبا کہہ کر چیختی تھی اور مجھ سے ہی مدد مانگتی تھی۔ مگر میں نے بھی دل کو پتھر کر لیا۔ اور جب وہ بالکل دب گئی۔ تب گھر کو واپس آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ قصہ سنا تو آپؐ کے آنسو بے اختیار جاری ہو گئے۔ اور فرمایا کہ اس قصہ کو پھر دوہراؤ۔ انہوں نے دوبارہ بیان کیا۔ آپؐ سنتے جاتے تھے۔ اور آپؐ کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے۔ اکثر لوگ لکھتے ہیں۔ کہ عرب میں دختر کشی کی رسم عام نہ تھی۔ کہیں کہیں اور بہت کم جاری تھی۔ مگر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ
شُرَكَآؤُهُمْ (الانعام: ۱۳۸)

ترجمہ:۔ اور اسی طرح مشرکوں میں سے بہتوں کو ان کے شریکوں نے ان کے ہلاک کرنے کے لیے اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کرنے کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرنا خوبصورت کر کے دکھایا تھا۔

یعنی کثرت سے مشرکین رسمِ دختر کشی میں مبتلا تھے۔ اسی طرح حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے روبرو دختر کشی کا اپنی قوم قریش میں ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جاہل بدو ہی نہیں بلکہ عرب کے چوٹی کے قبیلے بھی اس میں مبتلا تھے۔

شہید لڑکا

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے بدر کی طرف جانے لگے۔ تو آپؐ نے مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کا جائزہ لیا۔ اس وقت ایک مسلمان لڑکا بھی شہادت کے شوق میں فوج میں آملا۔ جب معائنہ ہونے لگا۔ تو وہ لڑکا لوگوں کے پیچھے چھپتا پھرتا تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے پوچھا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگا۔ میں اس لئے چھپتا ہوں کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے چھوٹا سمجھ کر واپس کر دیں۔ حالانکہ میں لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب کرے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ اور فرمایا تم ابھی چھوٹے ہو۔ لڑائی میں نہ جاؤ۔ وہ بچارا رونے لگا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اجازت دے دی۔ اس کی تلوار بہت لمبی تھی۔ آپؐ نے اسے اپنی ایک چھوٹی تلوار اس کے قد کے مطابق عنایت کی۔ پھر وہ بدر کے جنگ میں ہی شہید ہو گیا۔ اور اس کی خواہش پوری ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔

بس کیا اِتنا ہی فاصلہ ہے

بدر کا میدانِ جنگ گرم تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو آج خدا تعالےٰ کے راستہ میں مارا جائے گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ ایک صحابی عمیرؓ اس وقت صف میں کھڑے چھوارے کھا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنتے ہی کہنے لگے۔ واہ۔ وا۔ نہ ہے نصیب کیا میرے اور جنّت کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ ہے۔ کہ میں مارا

جاؤں! یہ کہہ کر انہوں نے باقی چھوارے اپنے ہاتھ سے پھینک دیئے اور تلوار سونت کر دشمنوں پر جا پڑے اور برابر لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے اور جنت میں داخل ہو گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عجیب جنّتی

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مجلس میں لوگوں سے پوچھا۔ اچھا کوئی ایسا جنّتی بتاؤ۔ جس نے ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھی ہو۔ حاضرین خاموش ہو گئے۔ اور جواب نہ دے سکے۔ اس پر ان صحابیؓ نے سنایا کہ ایک شخص تھے عمروؔ نام وہ مدینہ میں رہتے تھے۔ مگر مسلمان نہ ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کے اور سب رشتہ دار مسلمان ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ وہ کہیں باہر سفر پر گئے کہ اُحد کی لڑائی پیش آگئی۔ اور مسلمانوں کا لشکر مدینہ سے نکل کر اُحد کے مقام پر آگیا۔ اور لڑائی شروع ہو گئی۔ اتنے میں وہ عمروؔ بھی سفر سے واپس آگئے اور مدینہ میں آتے ہی پوچھا۔ کہ میرے چچا کے بیٹے کہاں ہیں۔ لوگوں نے کہا۔ کہ اُحد میں۔ پھر انہوں نے اپنے اور رشتہ داروں اور دوستوں کے متعلق پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سب اُحد میں گئے ہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے فوجی لباس پہنا۔ ہتھیار لگائے اور گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا اُحد کا رُخ کیا۔ مسلمانوں نے انہیں دیکھ کر کہا۔ اے عمرو۔ تم کافر ہو۔ اس وقت ہم سے الگ رہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں اب کافر نہیں رہا۔ میں ایمان لے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے کفار کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ اور خوب جان توڑ کر لڑے۔ جب جنگ ختم ہو گئی۔ تو یہ بھی مُردوں میں سے سسکتے ہوئے ملے۔ مگر ابھی جان باقی تھی۔ اس لئے انہیں اُن کے رشتہ دار مدینہ میں اُٹھا لائے۔ کسی نے ان سے اس وقت سوال کیا۔ کہ عمرو۔ تم اپنی خواہش یا مطلب کے لئے لڑے تھے۔ یا صرف اللہ اور رسول کے لیے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ جب میں مدینہ پہنچا تو کافر تھا۔ پھر یک دم مجھے ایک جوش آیا۔ ایمان میرے اندر داخل ہو گیا اور

میں سیدھا میدانِ جنگ میں پہنچا۔ اور کافروں سے لڑ کر اس حال کو پہنچا۔ یہ جنگ میں نے صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لئے لڑی تھی پھر انہی زخموں سے ان کی وفات ہوگئی۔ سو یہ ایسے جنتی ہیں کہ جنہوں نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔

(روزنامہ الفضل ۲۲ مئی ۱۹۲۸ء)

حضرت علیؓ کا اسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے اوّل پہلے دن حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں۔ اور آپؐ کے ساتھ انہوں نے نماز پڑھی۔ ان دنوں حضرت علیؓ بھی آپ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ جب انہوں نے دونوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو عرض کیا کہ اے بھائی یہ کیا چیز ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ یہ خدا کا دین ہے۔ جو اس نے انسانوں کے لئے پسند کیا اور اپنے پیغمبروں کو اس کی تبلیغ کے لئے بھیجا ہے۔ میں تمہیں اس اللہ کی طرف اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں اور لات وعزیٰ سے انکار کرنے کی ترغیب دیتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ تو ایسی بات ہے جو آج سے پہلے میں نے نہیں سُنی تھی۔ اس لئے میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اپنے باپ ابو طالب سے مشورہ نہ کر لوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات پسند نہ تھی کہ جب تک ان کو ان کے ظاہر کرنے کا حکم نہ ہو۔ لوگوں میں افشائے راز ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ اے علیؓ اگر تم اسلام نہیں لاتے تو کم از کم اس بات کو ابھی پوشیدہ رکھو۔ اس پر حضرت علیؓ اس بات کو خاموش رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی۔ اور صبح اُٹھ کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ اے محمدؐ کل آپ نے مجھے کیا کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے کہا تھا کہ تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور لات وعزیٰ کا انکار کرو۔ حضرت علیؓ نے اس کو منظور کر لیا اور اسلام لائے۔ اس وقت حضرت علیؓ کی عمر دس برس کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کے دوسرے دن

مسلمان ہوئے تھے۔ پھر کچھ مدت تک صرف یہی تین شخص دنیا میں خدا کی نماز پڑھا کرتے تھے۔
یہاں تک کہ گھر سے باہر کے لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ایمان لائے۔

نکاح کی تاکید

عکافؓ نام ایک صحابی تھے۔ وہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؐ نے ان سے پوچھا اے عکاف تمہاری عورت ہے انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم تندرست اور مالدار ہو۔ عرض کیا ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ آپؐ نے فرمایا پھر تم شیطان کے بھائی ہو۔ یا تو تم عیسائی درویش بن جاؤ کیونکہ وہ کنوارے رہتے ہیں۔ اگر ہم میں رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ ہم کر رہے ہیں تم بھی وہی کرو۔ نکاح کرنا ہماری سنت ہے اور جو شادی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ اے عکاف تم پر افسوس جلدی شادی کرو

عکاف نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ آپؐ جس سے چاہیں میرا نکاح کر دیں۔ میں نکاح کر لوں گا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا خدا کا نام لے کر میں نے کلثوم کی بیٹی کریمہ سے تمہارا نکاح کر دیا۔

سب نبیوں نے بکریاں چرائی ہیں

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اور حضرت موسٰی علیہ السلام بھی۔ اور میں بھی نبوت سے پہلے مکہ کی پہاڑی اجیاد پر بکریاں چرایا کرتا تھا۔

اسی طرح آپؐ نے ایک دن فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ آپ نے بھی۔ فرمایا ہاں میں نے بھی۔ مزدوری پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

بیوقوفی کی حد

ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ہمارے خاندان کے لوگ ایک بُت کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اس بُت کا نام یغوث تھا۔ اسی طرح ایک سیسے کا بُت دوسرے خاندان کے پاس تھا۔ اس کی شکل عورت کی طرح تھی۔ ایک اور بُت کو بھی ہم پوجا کرتے تھے۔ اس کا نام ذوالخلصہ تھا۔ ان کے سوا ہم پتھروں کی بھی پوجا کیا کرتے تھے۔ جہاں کہیں اچھا سا پتھر دیکھتے اُسے اُٹھا لیتے۔ پھر جب اس سے زیادہ کوئی اچھا پتھر مل جاتا تو پہلا پتھر پھینک دیتے اور نئے کی پوجا کرنے لگتے۔ جب سفر میں ہمارے اونٹ پر سے ایسا کوئی پتھر اسباب میں سے نکل کر گر پڑتا۔ تو ہم کہا کرتے کہ ہمارا خدا گر پڑا۔ اب کوئی اور پتھر ڈھونڈو۔ غرض یہی بیہودگیاں رہا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہو کر ہم کو اِن باتوں سے نجات دی۔

دُختر کشی کی سزا

ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ میری والدہ زمانہ جاہلیت ہی میں مر گئیں۔ مگر وہ بڑی نیک اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے والی اور خوبیوں والی بی بی تھیں۔ کیا ہم اُمید رکھیں کہ خدا تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ تو بتاؤ کہ کبھی انھوں نے کسی لڑکی کو زندہ درگور بھی کیا تھا یا نہیں؟ اس صحابی نے عرض کیا ہاں یارسولؐ اللہ یہ کام تو انہوں نے کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پھر تو وہ دوزخ کی سیر کر رہی ہیں۔

دینِ حق کا متلاشی

ایامِ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست تھے۔ وہ آپؐ کے نبی مبعوث ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ مگر اُن کے بیٹے سعید جو حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔ وہ آپؐ کے دعوے کرنے کے بعد جلد ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ آپؐ کے اُن دوست کا نام زید بن عمرو تھا۔ یہ اپنی زندگی میں سچے دین کی تلاش میں لگے رہتے تھے۔ ایک خدا کی عبادت کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میرا خدا ابراہیمؑ کا خدا ہے۔ اور میرا دین ابراہیم کا دین ہے۔ اور جو جانور بتوں کے نام پر ذبح کیا جاتا تھا اس کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ بکری کو خدا نے پیدا کیا اور خدا نے ہی آسمان سے پانی برسایا اور خدا نے ہی اُس کے لئے گھاس پیدا کی۔ پھر تم اس کو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کرتے ہو۔ اسی طرح وہ لڑکیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دینے کے مخالف تھے۔ اور لوگوں کو اپنے پاس سے روپیہ دے کر ان کی لڑکیاں لے آیا کرتے تھے۔ اور ان کی پرورش کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنے گھر سے دینِ حق کی تلاش میں نکلے اور یہودیوں کے پاس خیبر میں پہنچے مگر ان کا دین انہیں پسند نہ آیا۔ کیونکہ وہ لوگ خدا کی عبادت بھی کرتے تھے اور ساتھ ساتھ شرک بھی کرتے تھے۔ کہنے لگے۔ یہ وہ دین نہیں جس کی تلاش میں میں گھر سے نکلا ہوں۔
وہاں سے چلتے وقت ایک بڈھا یہودی نیک مرد اُن سے ملا۔ اور کہنے لگا کہ جس قسم کا دین تم ڈھونڈتے ہو۔ اس کا پابند سوائے ایک درویش بزرگ کے اور کوئی نہیں اور وہ فلاں جگہ حجرہ میں رہتا ہے۔ یہ سُن کر زید اس درویش کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں اس نے ان سے پوچھا۔ کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ زید نے کہا۔ میں مکہ کا باشندہ ہوں۔ درویش بولا۔ کہ جس چیز کی تم تلاش میں ہو۔ وہ تمہارے مُلک بلکہ تمہارے اپنے ہی شہر مکہ میں آگئی ہے۔ کیونکہ وہاں ایک نبی پیدا ہونے والا ہے۔ اور اس کے نشان کے لئے جو ستارے

نکلنے تھے وہ نکل چکے۔ باقی جتنے دین تم نے دیکھے ہیں وہ سب گمراہی پر ہیں۔ پھر زید وہاں سے مکہ واپس آ گئے۔ مگر افسوس کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی مر گئے۔ وہ دُعا کیا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ اگر مجھے تیری عبادت کرنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔ مگر افسوس کہ مجھے کچھ خبر نہیں۔ حضرت عمرؓ کے والد خطاب نے ان کو مکہ سے دُور ڈال دیا تھا۔ بیچارے پہاڑیوں پہ رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی چھپ کر شہر میں بھی آجایا کرتے تھے۔

کون ہے اس سے زیادہ خوش نصیب
یار کے قدموں میں نکلے جس کا دم

جب اُحد کی لڑائی میں بڑا گھمسان ہوا۔ اور کافروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو مصعبؓ نے آپؐ کے آگے سے دشمنوں کو ہٹانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ خود شہید ہو گئے۔ اور ابو دجانہؓ جو آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ بھی بہت زخمی ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو صدمہ پہنچا۔ آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور ہونٹ زخمی ہو گیا۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا۔ کوئی ہے جو اس وقت ہمارے لئے اپنی جان قربان کرے۔ پانچ انصاریوں کی جماعت لبیک لبیک حاضر حاضر کہتی ہوئی آگے کو لپکی۔ ان میں ایک صحابی زیادؓ بھی تھے۔ یہ لوگ کفار کے حملہ سے آپ کی حفاظت کرتے رہے۔ اور ایک ایک کر کے پروانوں کی طرح شمع کے اوپر نثار ہو کر گرتے گئے۔ یہاں تک کہ زیادؓ کے سوا باقی سب شہید ہو گئے۔ آخر یہ بھی لڑتے لڑتے زخموں سے چُور ہو کر گر پڑے۔ اتنے میں اور مسلمان آپ کی حفاظت کو پہنچ گئے۔ اور انہوں نے مارتے مارتے دشمنوں کو ذرا پیچھے ہٹا دیا۔ اس وقت زیادؓ ابھی سسک رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ذرا تم میرے پاس ہو جاؤ اور اور اپنے قدموں میں ان کا سر رکھ لیا۔ یہاں تک کہ اس خوش قسمت عاشقِ زار نے آپ کے قدموں میں اپنی جان خدا کو سپرد کی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندان اور قوم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی سب مخلوقات میں سے خدا نے حضرت ابراہیم کی اولاد کو فضیلت دی۔ پھر حضرت ابراہیم کی اولاد میں حضرت اسماعیل کو بڑا بنایا۔ پھر حضرت اسماعیل کی اولاد میں قریش کی قوم کو باقی سب پر فضیلت دی۔ پھر قریش میں سے بنو ہاشم کو سب پر منتخب کیا۔ پھر بنو ہاشم میں سے مجھے سب سے بڑا بنایا۔ سو میں آدم کی اولاد میں سب سے افضل اور تمام نبیوں کا سردار ہوں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

حیادار مزدور (زمانہ جاہلیت)

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب قریش کے لوگ کعبہ کی تعمیر کے لئے پتھر جمع کرنے لگے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اور لوگوں کے ساتھ پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے۔ ایک دن آپ اسی طرح پتھر ڈھو رہے تھے۔ اور اس وقت آپ کے بدن پر صرف ایک تہ بند تھا۔ آپ کے چچا عباس نے دیکھا کہ آپ کے شانے پتھروں سے چھلے جاتے ہیں۔ ان کو ترس آیا اور کہنے لگے اے بھتیجے تم اپنی تہ بند اتار کر پتھروں کے نیچے رکھ لو۔ یہ کہہ کر عباسؓ نے بڑھ کر خود ہی آپ کا تہ بند کھینچ لیا۔ اور آپ کے شانوں پر رکھ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ننگے ہو گئے۔ آپ کو اپنے ننگے ہونے کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس موقعہ کے سوا آپ کو کبھی کسی نے ننگا نہیں دیکھا۔

(عرب کے لوگ ایک دوسرے کے سامنے ننگے ہو جانے کو عیب نہیں سمجھتے تھے ۔ بلکہ خانہ کعبہ کا طواف بڑے شوق سے ننگے ہو کر کیا کرتے تھے۔ اس بد رسم کو بھی آنحضرتؐ نے ہی فتح مکہ کے بعد حکماً منع فرمایا)

عرب میں بُت پرستی کا رواج دینے والا (زمانہ جاہلیت)

حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ سے کعبہ میں صرف ایک خدا کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کے بعد صدیوں تک یہی حال رہا وہاں نہ کوئی بُت تھا نہ تصویر۔ نہ وہاں کے لوگ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل اور متعلقین میں سے تھے کوئی شرک کرتے تھے۔ آخر ایک بدبخت عمرو بن لحی پیدا ہوا جس نے دوسرے ملکوں میں بُت پرستی ہوتے دیکھی تو وہاں سے کئی بُت مکہ میں لے آیا اور کعبہ میں رکھ دئے اس زمانہ سے قریش میں بُت پرستی پھیل گئی یہی شخص تھا جس نے بُتوں کے نام پر جانور چھوڑنے کی رسم عرب میں ایجاد کی تھی۔ پھر تو بُت پرستی کو وہ ترقی ہوئی کہ خاص کعبہ میں ۳۶۰ بُت نصب کر دیئے گئے۔ اور حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، مریم اور عیسٰی علیہم السلام کی تصاویر بھی دیواروں پر بنا دی گئیں۔ اور خدائے قدوس کا حرم نجس بتوں کا گھر بن گیا۔ آنحضرتؐ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے جہنم کا نظارہ دیکھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ عمرو بن لحی بھی اس میں بڑا عذاب بھگت رہا ہے ۔

لمبے ہاتھ (مدینہ)

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں جمع ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ ہم میں سے کون مرنے کے بعد سب سے پہلے آپ سے ملے گی۔ آپ نے فرمایا جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں۔ امہات المومنینؓ نے لکڑی لے کر

اپنے اپنے ہاتھ ناپنے شروع کر دیئے۔ حضرت سودہؓ کے ہاتھ سب سے لمبے نکلے۔ مگر آنحضرتؐ کے بعد سب سے پہلے حضرت زینبؓ نے وفات پائی۔ وہ آپؐ کی بیبیوں میں سب سے زیادہ سخی تھیں۔ اس وقت لوگوں نے سمجھا کہ لمبے ہاتھ سے آپ کی مراد سخاوت تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر (سنہ وفود)

صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھیں تو لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ بادشاہ لوگ بغیر مہر کا خط نہیں پڑھتے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انگوٹھی چاندی کی بنوائی اور اس پر یہ الفاظ نقش کرائے محمد رسول اللہ یہ تصویر اس مہر کے نقش کی ہے پھر آپ اس انگوٹھی کو پہنے رہتے اور آپ کے سب خطوط پر اس کی مہر لگا کرتی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہی۔ پھر حضرت عمرؓ کے پاس پھر حضرت عثمانؓ کے پاس حضرت عثمانؓ سے ایک دفعہ ایک کنوئیں میں گر پڑی۔ پھر بہترا اسے تلاش کیا۔ اور کنوئیں میں غوطہ لگانے والے اندر اُترے۔ اور مٹی تک کنوئیں کی باہر نکال ڈالی۔ مگر انگوٹھی کا پتہ نہ چلا۔

پانچ نمازوں کی تعلیم (شروع نبوة مکی)

ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ شروع زمانہ نبوت ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فجر کی نماز ادا کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ نماز ادا کی۔ جب ظہر کا وقت آیا۔ تو پھر جبرائیلؑ آئے اور ظہر کی نماز پڑھی۔ آنحضرتؐ نے بھی ان کے ساتھ پڑھی۔ اور عصر کا وقت آیا۔ تو پھر اسی طرح دونوں نے عصر کی نماز پڑھی۔ اسی طرح اس دن مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھی گئیں۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ کہ آپ کے لئے نمازوں کے اسی طرح پڑھنے کا حکم ہوا ہے۔

بدبختوں کی کرتوت (مکہ)

ابنِ مسعودؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک دن آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے کئی دوست بھی پاس ہی مجلس لگائے بیٹھے تھے۔ آپ کو دیکھ کر ایک ان میں سے بولا۔ کہ اس وقت فلاں اُونٹنی ذبح ہوئی ہے۔ کوئی جاکر اس کی اوجھڑی اٹھالاوُ اور جب محمد سجدہ میں جائے تو اس وقت وہ اوجھڑی اس پر رکھ دے۔ پھر خوب تماشہ ہو۔ یہ سُن کر ایک آدمی جس کا نام عقبہ تھا۔ اُٹھا۔ اور جاکر اس اوجھڑی کو لایا پھر موقعہ تاکتا رہا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو اس نے اس کو آپؐ کی پیٹھ پہ دونوں شانوں کے بیچ میں رکھ دیا۔ وہ کم بخت لوگ یہ دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ اور ایک دوسرے پہ ہنسی کے مارے گرتے پڑتے تھے۔ ادھر اوجھڑی کے بوجھ کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ سے سر نہ اُٹھا سکتے تھے۔ آخر حضرت فاطمہؓ آئیں اور اُنھوں نے بڑی مشکل سے اس بوجھ کو آپؐ کی پیٹھ پر سے کھینچ کر زمین پر پھینکا تو آپؐ نے سر اُٹھایا اور فرمایا" یا اللہ اِن شریروں سے سمجھ۔" یہ دُعا ان بدمعاشوں کو بُری لگی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ کعبہ میں دُعا مقبول ہوتی ہے۔ پھر آپؐ نے نام لے لے کر اُن کے لئے بددُعا کی۔ اور کہا یا اللہ ابوجہل سے سمجھ۔ یا اللہ عتبہ اور شیبہ سے سمجھ یا اللہ ولید اور اُمیہ سے سمجھ اور ساتویں کا نام بھی لیا جو مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ ابنِ مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بدر والے دن ان ساتوں کی لاشوں کو بدر کے کنوئیں میں پڑا ہوا دیکھا

جانوروں پر ظلم کا نتیجہ

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مجھے جنت اور دوزخ دونوں دکھائے گئے۔ میں نے دوزخ میں ایک عورت کو دیکھا کہ بلی اسے نوچ رہی ہے۔ میں نے پوچھا اسے کیوں یہ عذاب ہوتا ہے۔ تو مجھے بتایا گیا۔ کہ اس عورت نے ایک بلّی کو باندھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بھوکی پیاسی مر گئی۔ نہ تو خود کھانے کو دیا نہ اُسے چھوڑا کہ کیڑے وغیرہ کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتی۔

اسلامی جہاد کی حقیقت

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ بعض لوگ عداوت اور دشمنی کی وجہ سے جنگ کرتے ہیں اور بعض اپنی قوم یا ملک کی حمیت اور حمایت میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ خدا کے لئے جہاد وہ جنگ ہے۔ جو اس لئے کی جائے کہ صرف اللہ کے نام کا بول بالا ہو۔ نہ کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے ہو۔ نہ دوستی اور حمیت کی وجہ سے (پس مال لوٹنا یا دشمنی نکالنا جو وجوہات جہاد ہمارے مخالفین بیان کرتے ہیں۔ اس کا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنی زبان سے رد کر دیا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک نواسے کا انتقال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیٹی حضرت زینبؓ کا ایک بچہ تھا۔ ایک مرغ نے اس کی آنکھ میں چونچ مار دی۔ وہ زخم پک گیا اور آنکھ میں پیپ پڑ کر ورم دماغ تک چڑھ گیا اور اسی تکلیف سے وہ معصوم فوت ہو گیا۔ (اسی لئے مرغوں اور مرغیوں سے

چھوٹے بچوں کی حفاظت کرنی چاہیئے ۔) جب وہ بچہ مرنے لگا تو حضرت زینبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ لڑکے کی نزع کی حالت ہے۔ آپؐ تشریف لائیں۔ آپؐ نے ان کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور فرمایا کہ بچے ہمارے پاس خدا کی امانت ہیں تم صبر کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ حضرت زینبؓ نے پھر آدمی بھیجا۔ کہ آپؐ ایک دفعہ ضرور تشریف لائیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ بچہ کی جانکنی کی حالت دیکھ کر آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ ایک صحابی نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ یہ آنسو کیسے ؟ آپ نے فرمایا۔ یہ آنسو اس شفقت کی وجہ سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ اور خدا بھی اپنے انہی بندوں پر زیادہ رحم کرتا ہے جو بہت رحم دل ہوتے ہیں۔

لڑکے کی فرمانبرداری

حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نوجوان ہی تھا۔ (۱۵-۱۶ سال کا) کہ میں نے ایک رات خواب میں دوزخ کو دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر ڈرا۔ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا۔ تم اس سے نہ ڈرو۔ میں نے اس خواب کا ذکر اپنی بہن ام المومنین حضرت حفصہؓ سے کیا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا۔ "عبداللہ اچھا آدمی ہے۔ کاش کہ وہ تہجد کی نماز بھی پڑھا کرے۔" جب عبداللہ ابن عمرؓ کو آپؐ کے اس فرمانے کی خبر پہنچی تو اسی دن سے تہجد کی نماز باقاعدہ پڑھنے لگے اور مرتے دم تک اس میں ناغہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ رات کو بہت ہی کم سوتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ خصوصیتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے اصحاب سے فرمایا کہ مجھے ۵ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔

۱۔ ایک تو ایسا رعب ہے جو مہینے بھر کی مسافت تک غالب رہے۔
۲۔ دوسرے تمام زمین میرے لئے پاک کرنے والی اور مسجد بنا دی گئی ہے سو میری اُمت میں جس کسی شخص پر نماز کا وقت آجائے تو وہ وہیں زمین پر نماز پڑھ لے۔ اور پانی نہ ہو تو زمین سے ہی تیمم کرلے۔
۳۔ میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا ہے۔ اور مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے یہ جائز نہ تھا۔ غرضیکہ جمع کرنے پر دیا جاتا تھا۔
۴۔ چوتھے مجھے قیامت میں شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔
۵۔ پانچویں ہر نبی اپنی قوم کی طرف ہی بھیجا گیا مگر میں تمام دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

رنگروٹ کی عمر

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ احد کے دن فوج کے جائزہ کے وقت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا۔ مگر آپؐ نے مجھے لڑائی میں جانے کی اجازت نہ دی اس وقت میری عمر ۱۴ سال کے قریب تھی۔ پھر خندق کی لڑائی میں آپؐ کے سامنے پیش ہوا۔ تو آپؐ نے مجھے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔

مجھ سے زیادہ کون غریب ہے ؟ (مدینہ)

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ کہ یا رسولؐ اللہ میں برباد ہوگیا۔ آپؐ نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے اپنا روزہ توڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں ایک غلام اس کے بدلے آزاد کرنے کے لئے دستیاب ہوسکتا ہے۔ اس نے عرض کیا نہیں۔

آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم دو مہینے کے لگاتار روزے رکھ سکتے ہو۔ عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو۔ اُس نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ چپ ہو رہے اور وہ شخص بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ٹوکری کھجوروں کی لایا اور آپؐ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے فرمایا۔ کہ وہ روزہ توڑنے والا کہاں ہے۔ وہ بولا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ لو یہ کھجوریں اُٹھا لو۔ اور خیرات کر دو۔ اس نے کہا یا رسول اللہ کیا اپنے سے زیادہ محتاج کو دوں؟ خدا کی قسم مدینہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک گھر بھی میرے گھر سے زیادہ محتاج نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کی یہ بات سن کر ہنسے اور فرمایا کہ اچھا جاؤ۔ اپنے بال بچوں کو ہی کھلا دو۔

ترتیب ہجرت

مدینہ کے صحابہؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ ہجرت سے پہلے اسلام سکھانے کے لئے ہمارے پاس مصعبؓ اور ابن ام کلثوم نابینا آئے تھے۔ پھر ہجرت کا حکم ہوا۔ تو بلالؓ، سعدؓ اور عمارؓ ان کے بعد حضرت عمرؓ معہ بیس مہاجرین کے تشریف لائے۔ پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ حضرت ابو بکرؓ اور ایک غلام کے۔ پھر حضرت علیؓ آپ کے تشریف لانے کے بعد آئے۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔

مدینہ والوں نے کبھی ایسی خوشی نہیں منائی تھی جیسی آپ کے تشریف لانے پر منائی۔ یہاں تک کہ مدینہ کی لونڈیاں خوشی کے مارے گھر گھر کہتی پھرتی تھیں کہ اللہ کے رسولؐ ہمارے ہاں آئے! اللہ کے رسول ہمارے ہاں آئے!!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا فقر اور صحابہؓ کا ایثار

ایک دفعہ ایک مہمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آیا۔ آپؐ نے اپنے سب گھروں میں آدمی بھیج کر کھانا منگوایا۔ مگر کہیں کچھ نہ ملا۔ اور سب بی بیوں نے یہی کہلا بھیجا۔ کہ پانی کے سوا ہمارے ہاں اور کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ سے فرمایا۔ کہ کوئی ہے جو اس مہمان کو آج اپنے ہاں لے جائے۔ اور کھانا کھلائے۔ یہ سُن کر انصار میں سے ایک صحابی اُٹھے۔ اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ان کو اپنے ہاں لے جاؤں گا۔ چنانچہ وہ ان کو گھر لے گئے۔ اور اپنی بی بی سے کہا۔ کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں۔ ان کی اچھی طرح خاطر کرو۔ بی بی نے میاں کو الگ لے جا کر کہا۔ کہ گھر میں تو سوائے اپنے بچوں کے کھانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس انصاری نے کہا۔ کہ بی بی تم کھانا تیار کر کے چراغ روشن کر دینا۔ اور بچوں کو کسی طرح بہلا کر سُلا دینا۔ پھر مہمان کو اور مجھے کھانے کے لئے بُلا لینا۔ چنانچہ ان بی بی نے ایسا ہی کیا۔ بچوں کو تو بہلا کر سلا دیا۔ اور کھانا تیار کر کے چراغ جلا کر مہمان کو بلایا۔ کھانا اس کے سامنے رکھا۔ اور دونوں میاں بیوی اس کے ساتھ کھانے بیٹھ گئے۔ اور جیسے کہ پہلے صلاح ہو چکی تھی۔ وہ بیوی اُٹھیں اور چراغ کی بتی درست کرنے لگیں۔ اور اس ترکیب سے چراغ بجھا دیا۔ ان دنوں میں دیا سلائیاں نہ تھیں۔ اس لئے چراغ بُجھ جاتا۔ تو اس کا پھر جلانا بڑا وقت لیتا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اندھیرے میں ہی کھانے بیٹھ گئے۔ وہ مہمان تو کھانا کھاتے رہے۔ مگر یہ میاں بیوی دونوں صرف خالی منہ اسی طرح چلاتے رہے جس سے مہمان یہ سمجھے۔ کہ وہ بھی کھا رہے ہیں۔ غرض مہمان نے تو پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا۔ اور گھر والے اور ان کے بچے سب بھوکے سو رہے۔ جب صبح ہوئی تو وہ انصاری صبح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی مسجد میں حاضر ہوئے۔ آپؐ ان کو دیکھ کر ہنسے اور فرمایا کہ تم میاں بیوی کی رات والی بات سے اللہ تعالیٰ کو بھی ہنسی آگئی۔ اس کے بعد ان

لوگوں کے ایثار کی تعریف قرآن مجید میں بھی نازل ہوئی۔ (رضی اللہ عنہم)

پیاسے شہید

ابوجہل کے ایک بیٹے تھے۔ ان کا نام تھا عکرمہؓ۔ وہ بھی فتح مکہ کے زمانہ تک آنحضرتؐ سے لڑائیاں لڑتے رہے۔ آخر واحد خدا کو غلبہ اور بتوں کی شکست دیکھ کر وہ مسلمان ہوگئے۔ اور جیسے پہلے کفر کے جوش میں آپؐ سے دشمنی کرتے تھے۔ مسلمان ہوکر اس سے بڑھ کر جوش کے ساتھ اسلام کی خدمت کرنے لگے۔ اُنکے مرنے کا قصہ عجیب ہے۔ ایک جنگ (یرموک) میں یہ زخمی ہو کر گر رہے۔ ان کے ساتھ اور مسلمان بھی زخمی پڑے تھے۔ جب لوگ ان مجروحین کو میدانِ جنگ سے اُٹھا کر لائے تو ان زخمیوں میں سے ایک شخص حارثؓ نے پانی مانگا۔ جب پانی آیا تو عکرمہ نے پانی کی طرف دیکھا۔ حارثؓ نے یہ دیکھ کر پانی لانے والے سے کہا کہ یہ پانی عکرمہ کو پلا دو۔ جب عکرمہ نے پانی لیا۔ تو ایک تیسرے مسلمان نے جن کا نام عیاش تھا۔ ان کی طرف پیاسی نظر سے دیکھا۔ عکرمہؓ نے پانی بغیر چکھے واپس کر دیا۔ اور لانے والے کو کہا کہ یہ پانی عیاشؓ کو دے دو جب وہ شخص عیاشؓ کے پاس پانی لے کر پہنچا تو لتے ہیں ان کا دم نکل چکا تھا۔ وہ عکرمہؓ کی طرف مڑا اور پانی لے کر جھکا تو دیکھا کہ وہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ وہاں سے ہٹ کر وہ حارثؓ کے پاس پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ تھی سچی ہمدردی اور ایثار صحابہ کا۔ اور یہی وہ لوگ تھے۔ جو پہلے دنیا میں بدترین گمراہ اور لوگوں کا حق مار لینے والے اور پانی کے بدلے انسانی جانوں کو تلف کر دینے والے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نظر نے ان کی کایا پلٹ دی۔ اور انہیں خاک سے کندن بنا دیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔

عدل

فاطمہ نام ایک خاندانی عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چوری کی۔ اور چوری کی سزا یہ تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ کئی لوگوں نے آپس میں کہا۔ کہ یہ عورت بڑے معزز خاندان کی ہے۔ کوئی جرأت والا اس کی سفارش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر کرے تو اچھا ہو۔ مگر کسی کو اس بات کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اُسامہؓ آپ کے بہت پیارے تھے۔ انہوں نے کہا۔ اچھا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کروں گا۔ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت کی سفارش کی تو آپؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ اور فرمانے لگے۔ کہ بنی اسرائیل میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی غریب آدمی چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتے ہیں مگر میں ہرگز ایسا نہیں کرسکتا۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالوں۔

شکر گذاری

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی انصاری عورتوں اور بچوں کو ایک شادی سے آتے ہوئے دیکھا۔ آپ انہیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ اور فرمایا۔ خدا گواہ ہے کہ تم لوگ مجھے سب سے زیادہ پیارے ہو۔

اصحاب صُفّہ کی حالت اور آپؐ کی ایک کرامت

حضرت ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں پڑے رہتے تھے۔ اور وہیں سوتے تھے۔ دن کو کچھ مزدوری مل گئی تو کرلی۔ ورنہ

خیر۔ نہ ان لوگوں کے اہل وعیال تھے۔ نہ اُن کے پاس مال تھا۔ نہ کسی کے ذمہ ان کا کھانا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ کی کوئی چیز آتی تھی۔ تو ان کو دے دیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی تحفہ آتا۔ تو کچھ اپنے لئے رکھ لیتے۔ اور باقی ان لوگوں کو بانٹ دیتے تھے۔ یہ لوگ آپ کی صحبت میں رہ کر دین کا علم سیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ خود فرماتے ہیں۔ کہ خدا کی قسم بعض دفعہ بھوک کے مارے میں زمین پر پیٹ لگا کر لیٹ جاتا اور بعض دفعہ پیٹ سے پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک دن میں فاقہ سے تنگ آکر لوگوں کے رستہ میں بیٹھ گیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ میرے سامنے سے گذرے۔ میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھا اور صرف اس لئے کہ مجھے کچھ کھلاویں۔ مگر انہوں نے خیال نہ کیا۔ اور مطلب بتا کر چل دیئے۔ پھر حضرت عمرؓ گذرے۔ میں نے ان سے بھی اسی مطلب کے لئے ایک آیت پوچھی۔ مگر وہ بھی مطلب بتا کر یونہی چلے گئے۔ کچھ دیر گذری اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہیں سے گذرے اور مجھے دیکھ کر مسکرائے اور میرے دل کی بات اور چہرہ کی حالت سمجھ گئے۔ اور فرمانے لگے۔ اے ابو ہریرہ۔ میں نے کہا۔ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلُ اللّٰه۔ فرمایا میرے ساتھ چلو۔ میں آپؐ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ مجھے گھر میں لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک پیالہ دودھ کا وہاں رکھا ہے۔ آپؐ نے پوچھا یہ کہاں سے آیا۔ گھر والوں نے کہا۔ یہ آپؐ کے لئے ایک عورت تحفہ دے گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابو ہریرہؓ جاؤ سب اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار گذری۔ اور میں نے خیال کیا کہ اتنا سا تو دودھ ہے کس کس کے پیٹ میں جائے گا۔ بہتر تو یہ تھا۔ کہ یہ سب مجھے مل جاتا تو کچھ سہارا ہو جاتا۔ اب یہ سب اصحاب صفہ آئیں گے تو میرے لئے خاک بچے گا۔ مگر خیر میں اُٹھا اور سب صفہ والوں کو اندر گھر میں بلا لایا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ اے ابو ہریرہ اب تم ان سب کو یہ دودھ پلاؤ۔ میں نے وہ پیالہ لیا۔ اور ایک آدمی کو دیا۔ اس نے پیٹ بھر کر دودھ اس میں سے پیا اور پھر وہ پیالہ مجھے واپس دے دیا۔ میں نے دوسرے شخص کو وہ پیالہ دیا۔ اس نے اپنا پیٹ بھر کر مجھے واپس کیا۔

اسی طرح ایک ایک کر کے میں دیتا جاتا تھا۔ اور وہ لوگ سیر ہو کر مجھے پیالہ واپس کرتے جاتے تھے۔ جب سب پی چکے۔ تو میں نے وہ پیالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھایا۔ آپؐ اسے ہاتھ میں لے کر مسکرائے اور مجھ سے فرمانے لگے کہ اب فقط تم اور میں باقی رہ گئے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں یا رسول اللہ آپؐ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور اسے پیو۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ اور جتنی خواہش تھی پی لیا۔ آپؐ نے پھر کہا اور پیو۔ میں نے اور پیا۔ آپؐ نے پھر کہا اور پیو میں نے بمشکل اور کچھ پیا۔ اور عرض کیا۔ کہ اب میرے پیٹ میں ذرہ جگہ باقی نہیں رہی۔ اس پر آپؐ نے وہ پیالہ خود لے لیا اور بسم اللہ اور الحمدللہ پڑھ کر باقی بچا ہوا نوش فرمالیا۔

شراب نے لنگڑا کر دیا

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ ایک قبیلہ کے آئے انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے ملک کی آب و ہوا اچھی نہیں۔ اس لئے ہم چھوارے بھگو کر ان کا پانی پیا کرتے تھے۔ کیا ہم ایسا کر لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ مگر کسی شراب کے برتن میں چھوارے نہ بھگونا ورنہ چھواروں کے پانی میں ہی نشہ پیدا ہو جائے گا۔ اور تم وہ نشہ والا پانی لے کر ایک دوسرے سے لڑنے لگو گے اور یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ ایک کی تلوار سے دوسرے کا پیر زخمی ہو جائے گا۔ اور وہ بیچارا عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو جائے گا۔ آپؐ کی یہ بات سُن کر وہ لوگ بہت ہی ہنسے آپؐ نے پوچھا اتنا کیوں ہنستے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ایک دفعہ ایسا ہی ہو چکا ہے۔ ہم لوگوں نے شراب کے برتنوں میں چھوارے بھگو دیئے۔ پھر جو ان کا پانی پیا تو ایسا نشہ ہوا کہ ہم آپس میں ہی لڑ پڑے اور یہ لنگڑا شخص جو سامنے کھڑا ہے۔ اس کو ایسی تلوار لگی کہ بیچارا ہمیشہ کے لئے ایک ٹانگ سے معذور ہو گیا۔

اربعین از کلامِ حضرت سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص میری اُمّت کو دین سمجھانے کے لئے چالیس حدیثیں یاد کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقہا میں اُٹھائے گا۔ اور میں اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہی دوں گا۔"

اس کلامِ مقدس پر عمل کر کے میں نے بھی ایک مجموعہ چالیس احادیث کا اس طرح سے انتخاب کیا ہے کہ اس کا حفظ کرنا اور سمجھنا عوام الناس بلکہ عورتوں اور کم تعلیم یافتہ بچوں کے لئے بھی آسان ہو۔ یعنی اکثر احادیث صرف دو لفظی ہیں۔ اور جو سہ لفظی بھی ہیں ان میں ایک لفظ ایسا موجود ہے جسے ہر ایک اردو دان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس چہل حدیث کو قبول فرمائے اور لوگوں کے لئے نافع بنائے۔

۱۔ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ

دین کا خلاصہ خیر خواہی ہے۔ خواہ وہ مخلوق کی خیر خواہی ہو۔ خواہ رسول کی خیر خواہی ہو۔ خواہ خدا کی خیر خواہی یعنی جو سلسلہ خدا نے قائم کیا ہے۔ اس کی ترقی میں کوشاں رہنا۔ اور تبلیغ میں رسول کی ہر طرح کی امداد کرنا اور مخلوقات پر شفقت کرنا۔

۲۔ اِجْتَنِبُوا الْغَضَبَ

سخت غصہ سے بچو۔ کہ وہ عموماً گالی گلوچ فساد یا قتل تک کا باعث ہوتا ہے۔

۳- اَدُّوْا زَكٰوتَكُمْ

تم اپنی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔ کیونکہ زکوٰۃ قوم کے غرباء کی امداد ہے۔ اور تمہارے مالوں کو پاک کرتی ہے۔

۴- اِحْفَظْ لِسَانَكَ

تم اپنی زبان کی حفاظت کر۔ بہتان، جھوٹ اور غیبت سے لڑائی اور فساد کی باتوں سے فحش اور گندہ کلامی سے۔

۵- اَرْحَامُكُمْ اَرْحَامُكُمْ

یعنی تمہارے رشتہ دار آخر تمہارے اولوالارحام ہی ہیں۔ اس لیے ان کی دلداری سلوک اور امداد دوسروں سے زیادہ چاہیئے۔

۶- اَرْشِدُوْا اَخَاكُمْ

اپنے بھائی کو ہدایت کر۔ یعنی بذریعہ تعلیم و تربیت یا وعظ و نصیحت اُن کی بھلائی میں لگے رہو تاکہ وہ نیک بن جائیں۔

۷- اِشْفَعُوْا تُوْجَرُوْا

سفارش کیا کرو تم کو سفارش کا بھی اجر ملے گا۔ دنیا میں بعض کام سفارش سے چلتے ہیں۔ اگر کسی مستحق کی سفارش کرنے سے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ تو ہرگز دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ کسی پر ظلم نہ ہو۔

۸۔ أَسْلِمْ تَسْلَمْ

اسلام لا تو تُو ہر خرابی بُرائی اور نقصان سے محفوظ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے اسلام سلامتی کا مذہب کہلاتا ہے۔

۹۔ أَطِعْ أَبَاكَ

اپنے باپ کی اطاعت کر۔ باپ کی اطاعت اولاد کے لئے نہ صرف سعادتمندی ہے۔ بلکہ بسبب حقیقی خیر خواہ اور صاحبِ تجربہ ہونے کے بھی اس کی اطاعت مفید ہے

۱۰۔ اِعْتَكِفْ وَصُمْ

اعتکاف میں بیٹھ اور ساتھ ہی روزہ بھی رکھ یعنی اعتکاف بغیر روزوں کے نہیں ہو سکتا۔ معتکف کا روزہ دار ہونا ضروری ہے ورنہ اعتکاف باطل ہے۔

۱۱۔ أَعْلِنُوا النِّكَاحَ

نکاح اعلان کے ساتھ کیا کرو۔ یعنی تمام خفیہ نکاح نا جائز ہیں۔

۱۲۔ أَكْرِمِ الشَّعْرَ

بالوں کی عزت کر۔ یعنی ان کو پاک صاف رکھ اور کنگھی استعمال کر۔ دوسرے یہ کہ جب لڑکے کی داڑھی مونچھ نکل آئے تو اس کے ساتھ بچوں کی طرح کا سلوک نہ کر۔ تیسرے یہ کہ کوئی سفید بالوں والا آدمی ہو تو اس کے بالوں کی وجہ سے اس کی تعظیم کر۔

۱۳۔ اَلْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمُ

عملوں کا دارو مدار انجام پر ہے۔ اگر انجام اچھا ہوا تو سمجھو کہ اعمال بھی مقبول ہو گئے۔ ورنہ بیکار ہیں۔

۱۴۔ اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ

اپنی اولاد کی عزت کرو۔ تاکہ ان میں خودداری کا احساس پیدا ہو اور وہ بُری باتوں اور بُرے اعمال سے بچے رہیں۔ ہمیشہ تو تکار کر کے بچوں کو مخاطب کرنا بھی نامناسب ہے۔

۱۵۔ اُوْصِيْکُمْ بِالْجَارِ

میں تم کو ہمسایہ سے نیک سلوک کی وصیت کرتا ہوں شہری تمدن اور امن کے قیام کا یہ بھی ایک بڑا بھاری گر ہے۔

(۱۶) اَلْاَمَانَۃُ عِزٌّ

امانت داری عزت ہے۔ امین کو دنیا میں اتنی عزت ہے کہ ہر رسول نے اپنی قوم کو انی لکم رسولٌ امین کہہ کر پہلے اپنی عزت کو تسلیم کروالیا۔ پھر ان کو پیغامِ حق پہنچایا۔

۱۷۔ اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ

دائیں طرف والا دائیں طرف والا ہی ہے یعنی بعض حقوق مجلس میں دائیں طرف والوں کے مقدم ہوتے ہیں۔ ان کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ مثلاً تقسیمِ طعام۔ طلبِ

مشورہ وغیرہ وغیرہ۔

۱۸۔ بَجِّلُو الْمَشَائِخَ

بزرگوں کی تعظیم کرو۔ کیونکہ ان کا علم اور تجربہ نوجوانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

۱۹۔ تَعَلَّمُوا الْیَقِیْنَ

یقین کو سیکھو۔ انسان کے تمام اعمال کا انحصار یقین پہ ہے۔ اور ایمان کا آخری مرحلہ بھی یقین ہی ہے۔ ورنہ بے یقین انسان اپنی عمر یونہی لغافلی میں ضائع کر دیتا ہے اور اپنے اعمال اور ایمان دونوں کے اعلیٰ ثمرات سے محروم رہتا ہے۔

۲۰۔ تَهَادُوْا تَحَابُّوْا

ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو تاکہ آپس میں تمہاری محبت بڑھے۔ دُنیا میں آپس میں محبت بڑھانے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہی ہے۔

۲۱۔ اَلتَّعْزِیَةُ مَرَّةٌ

تعزیت ایک دفعہ ہی کی کافی ہے۔ یعنی کوئی مر جائے تو ایک دفعہ وہاں جا کر تعزیت کرنی کافی ہے۔ یہ نہیں کہ برادری جمع ہو رہی ہے اور چالیس دن تک ہر شخص کے لئے وہاں حاضر ہونا ضروری ہے۔ یہ سب رسوم غیر اسلامی ہیں۔

۲۲۔ اَلْخَالَةُ وَالِدَةٌ

خالہ بھی ماں ہی ہے۔ یعنی اس کی عزت اور خدمت بھی ماں کی طرح کرنی چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی عورت بچے چھوڑ کر مر جائے تو اس عورت کی بہن سے شادی کرنا ایسا ہے۔ گویا کہ بچوں کی اپنی ماں واپس آگئی۔

۲۳۔ اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ

دُعا ہی تو اصل عبادت ہے۔ جن لوگوں نے عبادت کو دُعا سے الگ چیز قرار دیا ہے۔ وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ چونکہ دُعا سے بندہ کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے مغز عبادت یا یوں کہو کہ اصل عبادت دُعا ہی ہے۔

۲۴۔ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ

دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یعنی جو عمل دنیا میں کاشت کرو گے۔ اس کا پھل آخرت میں ضرور ملے گا۔ دُنیا میں نیک اعمال کر لو تو آخرت میں ان نیک اعمال کا ثمرہ تم کو ملے۔

۲۵۔ صُوْمُوْا تَصِحُّوْا

روزے رکھا کرو تا کہ صحت حاصل ہو یعنی ایک مقصد روزہ کا یہ بھی ہے کہ انسان کی صحت درست ہو جائے اور فضول مادے جسم کے جل کر جسم اعتدال کی حالت پر آجائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی بیمار ہو تو وہ بھی اسی طرح صحت حاصل کر لیا کرے۔

۲۶۔ اَلْعَیْنُ حَقٌّ

نظر لگنا سچ ہے۔ نظر لگنا چونکہ علم توجہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس لئے اس کا انکار مناسب نہیں۔ مگر یہ مضمون طوالتِ بیان چاہتا ہے۔ اس لئے یہاں اس پر بحث نہیں

ہوسکتی۔

۲۷۔ اَلصَّبْرُ رِضًا

صبر راضی بقضاء ہونے کا نام ہے نہ یہ کہ جب کچھ نہ ہوسکا تو کہہ دیا کہ ہم صبر کرتے ہیں۔ مگر دل میں خدائی تقدیر سے ناراض ہیں۔

۲۸۔ اَلْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ

غلّہ روکنے والا تاکہ جب مہنگا ہو جائے تب بیچوں۔ خدا کی رحمت سے دُور ہے ایسا شخص ہر مذہب اور ہر قوم کی نظر میں واقعی ملعون ہے اور اس کی نیّت ہی بَد ہے یعنی یہ کہ لوگ بھوکوں مرنے لگیں تو اُن سے خوب روپیہ کماؤں۔

۲۹۔ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں آپس میں برادرانہ سلوک و مروت ہونی چاہیئے۔ قرآنِ مجید نے بھی انما المومنون اخوۃٌ فرمایا ہے۔

۳۰۔ اَلْمَطْعُوْنُ شَہِیْدٌ

طاعون سے مرنے والا شہید ہے۔ یعنی اگر مسلمان طاعون سے مرے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے کیونکہ طاعون کی تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

۳۱۔ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ

وارث کے لئے وصیت منع ہے۔ یعنی جو خود شرعی وارث ہو۔ جیسے بیٹا۔ باپ

یا بیوی۔ ان کے لئے مزید وصیت کرنا منع ہے۔ جس کا حصہ شرع نے خود مقرر کر دیا ہو۔ اس کے لئے ورثہ سے زیادہ کی وصیت کرنا ناجائز ہے۔ مثلاً بہن بھائی پوتا ان کے لئے تہائی مال میں سے وصیت ہو سکتی ہے۔

۳۲۔ لَا تَعُدْ فِیْ صَدَقَتِكَ

صدقہ واپس نہ لے۔ جو چیز ایک دفعہ صدقہ کے طور پہ دے دی جائے اسے واپس لینا منع ہے۔ ہاں اگر کسی اور شخص نے صدقہ دیا ہو تو صدقہ لینے والا اپنے اس صدقہ کو بطور ہدیہ کے اپنے اور دوستوں میں تقسیم کر سکتا ہے، سوائے اس شخص کے جس نے صدقہ دیا ہو۔

۳۳۔ لَا مَهْدِیَّ اِلَّا عِیْسٰی

عیسٰی علیہ السلام (جو چودھویں صدی میں آئیں گے) کے سوا کوئی مہدی نہیں یعنی اصل امام مہدی آخر الزماں وہی ہوں گے۔

۳۴۔ اِجْتَنِبُوْا كُلَّ مُسْكِرٍ

ہر نشہ آور چیز سے بچو۔ کیونکہ ہر نشہ کی عادت صحت کی تباہی۔ عادت کی غلامی اور عقل کی کوتاہی پیدا کرتی ہے۔

۳۵۔ اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ

ولیمہ ضرور کر خواہ ایک ہی بکری کا ہو۔ ولیمہ وہ دعوت ہے جو زفاف کے بعد بطور شکریہ اور خوشی کے کی جاتی ہے۔

۳۶- اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْکَلَامِ

بات کرنے سے پہلے سلام کر لیا کرو۔ یعنی جب کسی سے ملو یا کسی مجلس میں جاؤ۔ تو پہلے سلام کرو۔ اس کے بعد جو بات کرنی ہو کر لو۔

۳۷- تَرْکُ الدُّعَاءِ مَعْصِیَۃٌ

دُعا کو ترک کرنا گناہ ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہماری حالت کو خود جانتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے مانگنا یا دُعا کرنا نامناسب ہے وہ غور فرمائیں۔

۳۸- سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ

قوم کا سردار دراصل ان کا خادم ہے۔ یعنی جو کسی قوم کا سردار ہے اسے سرداری تبھی زیب دیتی ہے جب وہ ان کی خدمت کرے۔ یا جو سردار بننا چاہے۔ اُسے چاہیئے کہ قومی خدمت میں منہمک رہے۔

۳۹- اِتَّقُوا اللّٰہَ فِی النِّسَاءِ

عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ کیونکہ وہ کمزور ہیں۔ کم علم اور محکوم ہیں پس ان کے حقوق کا خیال رکھو اور اُن کی عمدہ تربیت کرو۔

۴۰- طَلَبُ الْحَلَالِ جِھَادٌ

حلال رزق طلب کرنا بھی جہاد ہے۔ خصوصًا اس زمانہ میں تو حلال روزی حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔ چور بازار دھوکا۔ فریب ٹھگی۔ بدعہدی۔ حقوق کا غصب کر لینا۔

خیانت ایسی عام باتیں ہیں کہ حلال اور حرام میں گویا تمیز ہی نہیں رہی۔ شیر فروش کے مُنہ میں روزہ ہوتا ہے اور ہاتھ میں پانی کا لوٹا جو وہ اپنے دودھ میں ملاتا ہے۔ اسی طرح سَو روپیہ ماہوار کا ملازم حلال چوروں سے مانگتا ہے کہ جب میری تنخواہ پانچ سو روپیہ ہو جائے گی۔ تب میں نکاح کروں گا اور اس وقت تک وہ جتنے طریقے اپنی خواہشات پوری کرنے کے استعمال کرتا ہے۔ شریعت نے ان سب کو حرام قرار دیا ہے۔

(نوٹ) اس مجموعہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی اربعین کی کوئی حدیث شامل نہیں کی گئی۔ (الفضل ۲۹ اگست ۱۹۴۶ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات

حضرت زیدؓ بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انیس غزوات کئے۔ (ان میں سے بدر، احد، خندق، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین، تبوک اور خیبر کے واقعات بہت مشہور ہیں۔ احد اور حنین میں بھی اگرچہ فتح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہوئی۔ مگر مسلمانوں کو چشم زخم بھی پہنچا (اور اپنی غلطی سے)

حضرت مقدادؓ صحابی کی ایک بات

ابنِ مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ مقدادؓ نے ایک بات ایسی کہی تھی کہ مجھے وہ دُنیا کی تمام فضیلتوں سے زیادہ پسند ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر میں جانے لگے تو مسلمانوں سے جنگ پر جانے کے لئے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت مقدادؓ اُٹھے اور عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ۔ آپؐ ہم کو کبھی موسٰےؑ کے ساتھیوں کی طرح یہ کہتے ہوئے نہ سُنیں گے۔ کہ تو اور تیرا رب جاؤ اور دشمنوں سے لڑو۔ بلکہ آپؐ دیکھ لیں گے۔ کہ ہم آپؐ کے دائیں لڑیں گے اور آپؐ کے بائیں لڑیں گے۔ آپؐ کے آگے لڑیں گے اور آپ کے پیچھے لڑیں گے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی کے مارے چمکنے لگا۔

دُنیا سے آپؐ کا تعلق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ سے فرمایا کہ میرا تعلق تو دُنیا سے صرف اتنا ہے۔ جتنا کہ ایک اونٹنی سوار۔ جو گرم دوپہر میں کسی کام کے لئے منزل مارے چلا جاتا ہو۔ جب شدّت کی دھوپ اور لُو معلوم ہونے لگے وہ ایک درخت کے سایہ کے نیچے ذرا کی ذرا ستانے کو ٹھہر جائے پھر تھوڑا سا دم لے کر اپنا رستہ لے۔

شرم وحیا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی شرم وحیا کا یہ حال تھا کہ صحابہؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ پردہ نشین کنواری نوجوان لڑکی سے بھی زیادہ حیا دار تھے۔ کبھی آپؐ کی زبان سے کوئی فحش بات نہیں نکلی۔ نہ عمر بھر کوئی بے شرمی کی بات آپؐ سے سرزد ہوئی۔

خُدائی دعوت۔ وہیل مچھلی

جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سمندر کے کنارہ کی طرف ۳۰۰ آدمیوں کا ایک لشکر بھیجا اور سردارِ لشکر ابوعبیدہؓ بن جراح کو مقرر فرمایا۔ میں بھی اُسی لشکر میں تھا۔ جب ہم دُور نکل گئے۔ تو ہمارا زادِ راہ ختم ہو گیا۔ اس پہ ابوعبیدہؓ نے سارے لشکر میں جو کچھ کھانے کا تھا۔ سب جمع کر لیا۔ یہ سب مِل ملا کر دو تھیلوں کی کھجوریں نکلیں۔ اس میں سے وہ ہمیں حصّہ رسدی روزانہ تھوڑی تھوڑی کھجوریں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ آخر وہ بھی ختم ہونے پہ آگئیں۔ پھر ہم کو صرف ایک ایک کھجُور روزانہ ملنے لگی۔ آخر کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اس وقت ہم کو اس ایک کھجور کی قدر معلوم ہوئی۔ پھر ہم لوگوں نے سمندر کا رُخ کیا۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ کنارہ پہ ایک عظیم الشان مچھلی جسے عنبر (وہیل مچھلی) کہتے ہیں پڑی ہے۔ ہم سب لوگ اسی کو اٹھارہ ۱۸ دن تک کھاتے رہے اور اس کی چربی سے اپنے بدنوں پر مالش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم خوب موٹے ہو گئے۔ ایک دن ابوعبیدہؓ نے اس مچھلی کی دو پسلیاں زمین پر کھڑی کروائیں۔ تو اونٹ سوار ان کے نیچے سے صاف نکل گیا۔ پھر جب اپنے کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ مدینہ واپس آئے۔ تو سب حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ یہ تو اللہ کا بھیجا ہوا رزق تھا جو تم کو مِلا۔ اگر تمہارے پاس اس کا کچھ حصّہ موجود ہو۔ تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ اس پہ ایک شخص اُٹھا۔ اس نے ایک ٹکڑا اس مچھلی کا لا کر

آپؐ کے سامنے حاضر کیا۔ آپؐ نے اسے تناول فرمایا۔

حضرت بلالؓ حبشی پر ظلم

بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک حبشی غلام تھے۔ اُن کا مالک قریش میں سے ایک شخص تھا۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا سخت دشمن تھا۔ جب بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لے آئے۔ تو ان کے مالک کو بھی معلوم ہو گیا۔ اس نے ان کو ہر طرح دھمکایا کہ پھر کافر ہو جائیں۔ مگر یہ نہ مانتے۔ پھر ان کو مارا پیٹا۔ مگر یہ اسلام پر قائم رہے۔ آخر وہ اور ابوجہل ان کو بہت سخت تکلیفیں اور عذاب دینے لگے۔ لوہے کی زرہ پہنا کر سخت گرمی کے موسم میں ان کو مکہ کے باہر تپتے پتھروں اور جلتی ریت پر لٹا دیتے۔ دھوپ اور لُو سے ان کا بُرا حال ہو جاتا۔ اور بے ہوش ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے گلے میں رسی باندھ کر ان کو گھسیٹتے پھرتے۔ پھر کبھی ان کو ننگا دھوپ میں لٹا کر چھاتی پہ چکی کا پاٹ رکھ دیتے۔ اور ہر طرح کا دُکھ ان کو پہنچاتے تھے۔ اور سخت سخت ماریں ان پر پڑتی رہتی تھیں۔ اور وہ لوگ انھیں کہتے تھے کہ اللہ کا نام نہ لو۔ بتوں کو اپنا خدا کہو۔ پھر ہم تم کو نہیں ستائیں گے۔ مگر اس مصیبت اور بے ہوشی میں بھی سر ہلا کر اس بات کا انکار کر دیتے تھے اور کہتے تھے۔ اَحَدٌ اَحَدٌ میرا خدا تو وہی ہے جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ عذاب روزانہ ان کو دیئے جاتے تھے۔ اور وہ بیچارے صبر کرتے تھے۔ غرض مدتوں ان مصیبتوں میں رہے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے نہ رہا گیا۔ اور آپؐ نے ایک دن فرمایا۔ کہ اگر میرے پاس کچھ ہوتا۔ تو میں بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید لیا۔ اور آزاد کر دیا۔ پھر وہ حضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ یہ بلالؓ ساری عمر حضورؐ کے مؤذن رہے۔ اور مسجد نبوی میں پانچ وقت اذان دیا کرتے تھے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا انتقال ہوا۔ تو غم کے مارے مدینہ کو چھوڑ کر ملک شام میں جا بسے اور مدتوں وہاں رہے۔

ایک دن انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے بلال رضؓ تم تو ہمارے پاس سے چلے ہی گئے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم مدینہ آ کر ہماری زیارت کرو۔ یہ خواب دیکھ کر حضرت بلال رضؓ صبح اُٹھتے ہی سیدھے مدینہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اور آنحضرتؐ کی قبر مبارک پر حاضر ہوئے اور اس سے لپٹ لپٹ کر خوب روئے۔ اتنے میں حضرات حسنؓ اور حسینؓ بھی وہیں آ گئے۔ بلالؓ نے ان کو پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔ انہوں نے بلالؓ سے کہا۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ آج آپ اذان دیں۔ چنانچہ حضرت بلالؓ ان کے کہنے پر مسجد نبوی کی چھت پر چڑھے۔ اور جب انہوں نے اپنی طرز پر اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا تو سارا مدینہ ہل گیا۔ اور لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب انہوں نے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا۔ تو تمام شہر میں ایک غل برپا ہو گیا۔ اور لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ پھر جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لوگوں نے ان کی زبان سے سُنا۔ تو یہ حالت ہو گئی کہ مرد تو مرد پردہ دار عورتیں بھی مدتی بیٹی گھروں سے باہر نکل آئیں۔ اور مسجد نبوی اور مدینہ کے گلی کوچوں میں وہ کہرام مچا کہ لوگوں کے کلیجے پھٹ پھٹ گئے۔ اور خود بلالؓ بھی غش کھا کر گر پڑے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی پسندی

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ تو مسجد میں قبلہ کی جانب کسی کا بلغم لگا ہوا تھا۔ آپؐ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار پیدا ہوئے۔ پھر آپؐ نے اس کو وہاں سے کھرچا کر اس جگہ کو زعفران سے لیپوا دیا۔

چور دلی

ایک دفعہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا۔ اور عرض

کیا۔ یا رسولؐ اللہ میں نے ایک گناہ کیا ہے۔ یعنی میں ایک قبیلہ کا اُونٹ چُرا لایا ہوں۔ آپؐ نے اس قبیلہ کے لوگوں کو بلایا اور تحقیقات کی۔ تو معلوم ہوا کہ واقعی ان کا ایک اُونٹ گم ہے۔ مجرم بھی اپنے قصور کا اقراری تھا۔ اس لئے شریعت کے حکم کے مطابق آپؐ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ جب اس کا ہاتھ کٹ کر زمین پر گرا تو چور نے اس ہاتھ کو مخاطب کر کے کہا کہ ۔ اے ہاتھ تو نے تو چاہا تھا کہ میرے تمام جسم کو دوزخ میں ڈال دے۔ مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے مجھے دُنیا میں ہی سزا دے کر آخرت کے عذاب سے بچا لیا۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں اگر کسی سے گناہ یا قصور ہو جاتا۔ تو وہ فوراً حاضر ہو کر آپؐ سے بیان کر دیتا تھا۔ اور ہرگز نہ چھپاتا تھا۔ اور شریعت کی سزا بڑی خوشی سے برداشت کرتا تھا۔ اس لئے تاکہ آخرت میں نجات ہو۔ اور خدا تعالیٰ ناراض نہ رہے۔ اس طرح آپؐ کے زمانہ میں جب ایسے لوگ اپنے گناہوں کا اقرار آپ کی مجلس میں آکر کرتے تھے۔ تو اور لوگ ان کو حقیر نہ سمجھتے تھے۔ نہ ان کو طعنے دیتے تھے نہ باہر آکر ان کا ذکر ذلت کے طور پر کرتے تھے)

دانتوں کی صفائی

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ کئی صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کو دیکھ کر فرمایا۔ کہ یہ کیا وجہ ہے۔ کہ مجھے تمہارے دانت زرد اور مَیلے نظر آتے ہیں۔ تم لوگ مسواک کیا کرو۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ میری اُمت کو زیادہ تکلیف ہوگی۔ تو میں ان پر مسواک کرنا بھی اسی طرح فرض کر دیتا۔ جس طرح وضو کرنا فرض ہے۔

جاہلیت کے خون میرے پیروں کے نیچے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن خطبہ پڑھا۔ اس میں فرمایا۔
"زمانہ جاہلیت میں جس قدر خون ہوئے۔ یا جو فخر و غرور کی باتیں تھیں۔ وہ آج سب میرے پیروں کے نیچے ہیں۔ اور میں اس وقت سے ان کو مٹاتا ہوں۔ اور سب سے پہلا خون جسے میں معاف کرتا ہوں وہ میرے اپنے بھتیجے ربیعہ کا خون ہے۔"
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا تھے۔ ان کا نام تھا حارث۔ ان کے ایک بیٹے ربیعہ نام تھے۔ ان ربیعہ کو ہذیل نامی ایک عرب نے قتل کر دیا تھا۔ اور جاہلیت کے رواج کے مطابق اس وقت تک اس خون کا بدلہ نہیں لیا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک کے امن اور قبائل عرب میں صلح و صفائی کی خاطر سب سے پہلے اپنی طرف سے اپنے خاندان کے اس خون کو معاف کر دیا۔ اللھم صل علی محمد۔

صدیق اکبرؓ کا جہاد

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب مسلمان ہو چکے تو پھر انہوں نے اور لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دوستوں سے ملتے اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لا لا کر اسلام کی تعلیم اور قرآن سنانے اور کوشش کرتے۔ کہ لوگ کسی طرح آپ سے ملیں۔ اور آپ کی باتوں کو سنیں۔ چنانچہ ان کی اس کوشش سے حضرت زبیرؓ، حضرت عثمانؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ اور حضرت طلحہؓ جیسے بزرگ اسلام لائے۔ کئی مسلمان غلام تھے جن کو مسلمان ہو جانے کی وجہ سے کفار بڑے بڑے عذاب اور تکلیفیں دیتے رہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے سات غلاموں اور لونڈیوں کو خرید کر آزاد کیا۔ انہی میں سے ایک حضرت بلالؓ تھے (آنحضرتؐ کے غزوات سے صدیق اکبر کا جہاد (الفضل ۲۴ اگست ۱۹۲۸ء)

ماں اور بچہ پر رحم

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کئی دفعہ جب میں نماز پڑھاتا ہوں تو میرا ارادہ ہوتا ہے۔ کہ نماز کو لمبی کروں گا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی ہے تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں۔ تاکہ ماں کو تکلیف نہ ہو۔

مال سے بے رغبتی

عقبہؓ صحابی کہتے ہیں۔ کہ میں نے مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک دفعہ عصر کی نماز پڑھی۔ آپؐ سلام پھیرتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اتنی جلدی گھر میں تشریف لے گئے کہ لوگ حیران ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب واپس تشریف لائے۔ تو لوگوں نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ خیر تھی؟ آپؐ نے فرمایا۔ مجھے کچھ سونا یاد آگیا تھا۔ جو گھر میں پڑا رہ گیا تھا۔ اور یہ بات بُری لگی۔ کہ مجھے اس کا خیال بھی آئے۔ اس لئے جلدی سے جا کر اسے خیرات کر آیا۔

عورت کی عزّت

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے عُسفان سے مدینہ واپس آرہے تھے۔ کہ اچانک آپؐ کی اونٹنی کا پیر پھسل گیا اور آپؐ معہ اپنی بیوی صفیہؓ کے اس پر سے گر پڑے۔ ابوطلحہؓ صحابی یہ حالت دیکھ کر اپنے اُونٹ پر سے کُود پڑے۔ اور دوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے عرض کیا صدقے جاؤں۔ کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوطلحہؓ پہلے عورت کی خبر لو۔ اس پر ابوطلحہؓ نے اپنے منہ پہ کپڑا ڈال لیا۔ اور حضرت صفیہؓ کے پاس گئے۔ اور

ان پر کپڑا ڈال دیا۔ پھر سواری کو درست کیا۔ اور دونوں کو سوار کرایا۔

ہلکے پیٹ کھاؤ

ایک دفعہ ابوجحیفہ رضؓ صحابی نے عمدہ کھانا پیٹ بھر کر کھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اور وہاں بیٹھے بیٹھے زور سے ڈکار لی۔ آپؐ نے فرمایا جو لوگ دنیا میں ٹھونس ٹھونس کر کھائیں گے۔ وہ قیامت میں بھوکے رہیں گے۔ یہ نصیحت سن کر ابوجحیفہ رضؓ نے پھر کبھی ساری عمر پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا اگر رات کو کھاتے۔ تو دن کو بھوکے رہتے۔ اور دن کو کھا لیتے تو رات کو فاقہ کرتے۔

صحابہ رضؓ کا رنگ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مُردہ دل اور خشک مزاج نہ تھے۔ اپنی مجلسوں میں اشعار بھی پڑھتے تھے۔ اور جاہلیت کے زمانہ کے قصے بھی سنایا کرتے تھے ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے۔ سیر د شکار بھی کیا کرتے تھے۔ بال بچوں سے بھی مشغول ہوتے تھے لیکن جب کوئی دین کا کام آپڑتا تھا تو سب باتیں چھوڑ کر اس میں اتنے محو ہو جاتے تھے۔ کہ گویا دیوانے ہو گئے ہیں۔

صحابہ رضؓ ہمیشہ اپنے قصور کی سزا کے لئے تیار رہتے

ایک صحابی تھے سلمہ رضؓ بن صخر۔ ان سے ایک گناہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا۔ کہ مجھے پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو۔ ان لوگوں نے انکار کیا۔ اس پر وہ خود حاضر ہوئے۔ اور اپنی غلطی بیان کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ سلمہ تم اور یہ کام! انہوں نے جواب دیا۔ ہاں یا رسول اللہ۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپؐ جو سزا مناسب

ہو دیں۔ میں خدا کے حکم پر صابر رہوں گا۔

تہجد گزار لڑکا

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں اپنی خالہ کے پاس سویا (ان کی خالہ میمونہ رضؓ آنحضرتؐ کی بیوی تھیں)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باری اس دن وہیں کی تھی۔ آپؐ پچھلی رات تہجد کی نماز کے لئے اُٹھے۔ اور پوچھا۔ کہ لڑکا سو رہا ہے؟ میں نے یہ لفظ سُنے۔ تو میں بھی وضو کر کے آپؐ کے بائیں طرف نماز پڑھنے جا کھڑا ہوا۔ آپؐ نے میرا کان پکڑ کر مجھے اپنے دائیں طرف کر لیا۔

آپؐ کا ایک معجزہ

ایک دفعہ ابوہریرہؓ نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ۔ میں آپؐ کی بہت حدیثیں سُنتا ہوں مگر پھر بُھول جاتا ہوں۔ ایسا ہو کہ میں بھولا نہ کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی چادر پھیلاؤ۔ میں نے پھیلا دی۔ تو آپؐ نے اپنے ہاتھ کو چُلو کی طرح بنایا اور میری چادر میں ڈال دیا۔ اور فرمایا کہ اب اس چادر کو اپنے اوپر لپیٹ لو۔ میں نے لپیٹ لی۔ اس کے بعد پھر میں کوئی حدیث نہیں بھُولا۔

وفات کی پیشگوئی

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری دنوں میں ایک خطبہ پڑھا۔ اس میں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک بندے کو دُنیا و آخرت کے متعلق اختیار دیا۔ کہ جسے چاہے پسند کرے۔ اس بندے نے آخرت کو پسند کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ یہ بات سُن کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ بعض صحابہؓ نے کہا۔ ان کو اس بات پر رونا کیوں آیا۔ بھلا

اس میں رونے کی کون سی بات ہے۔ اچھا ہوا جو اس بندے نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو پسند کر لیا۔ (مگر بعد میں صحابہؓ کو معلوم ہوا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا ذکر کیا تھا یعنی یہ کہ خدا نے مجھے اختیار دیا کہ چاہو تو دنیا میں رہو۔ چاہے اللہ کی طرف سفر اختیار کرو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو اختیار کر لیا۔ اور چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سب سے زیادہ علم اور عقل والے تھے اس لئے وہ فوراً بات کی تہ کو پہنچ گئے) حضرت ابوبکرؓ کے اس رونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوبکر نہ روؤ۔ اے لوگو اگر سب سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان ہے تو ابوبکر کا ہے۔ سب سے زیادہ ابوبکر نے مجھ پر اپنا مال اور اپنا وقت قربان کیا ہے۔ اگر میں کسی کو خدا کے سوا جانی دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو ہی بناتا۔ ہاں وہ میرے اسلامی بھائی اور پیارے ہیں۔ دیکھو مسجد میں جن جن لوگوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ سب کو بند کر دو۔ صرف ایک ابوبکر کا دروازہ کھلا رہے۔

عمارؓ کی شہادت کی خبر دینا

جن دنوں مسجد نبوی بن رہی تھی اور صحابہؓ تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے۔ اور عمارؓ بن یاسرؓ دو دو اٹھا کر لاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی محنت کو ملاحظہ فرمایا۔ تو محبت سے ان کی مٹی جھاڑنے لگے۔ اور فرمایا افسوس اے عمار تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ تو ان کو جنت کی طرف بلاتا ہوگا۔ اور وہ تجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہوں گے۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمارؓ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں ان کی طرف سے باغیانِ خلافت سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے)

قوجی کرتب مسجد میں

ایک دفعہ حبشی گتکے باز مدینہ میں آئے۔ اور اپنا فن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

مسجد میں دکھانے لگے۔ آپؐ نے ملاحظہ فرمایا۔ اور اپنے دروازہ پر جو مسجد میں کھلتا تھا۔ اس طرح کھڑے ہو گئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اندر سے کرتب دیکھ لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر سے حضرت عائشہؓ کا پردہ کر رکھا تھا۔ (الفضل ۲؍اکتوبر ۱۹۲۸ء)

شفاعت

حضرت ابوہریرہؓ صحابی بیان کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ پکا ہوا گوشت آیا۔ آپ نے اس میں سے دست کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کھانے لگے۔ دست کا گوشت آپؐ کو پسند تھا۔ آپؐ کھاتے ہیں فرمانے لگے۔ کہ میں قیامت کے دن سب کا سردار ہوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اگلے پچھلے آدمی سب ایک میدان میں جمع ہوں گے۔ اور ہر ایک آدمی پکارنے والے کی آواز اس میدان میں سُن سکے گا۔ اور ہر طرف دیکھ سکے گا۔ سورج اس دن بہت قریب ہو جائے گا۔ اور لوگوں کو بے حد تکلیف ہو گی۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ یارو اس مصیبت میں کوئی شفاعت کرنے والا تلاش کرو۔ بعض ان میں سے کہیں گے کہ چلو آدم علیہ السلام کے پاس۔ سب ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب آدمیوں کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ اور اپنی روح آپ کے اندر پھونکی اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا۔ آپ ہماری شفاعت کیجئے۔ دیکھئے تو ہم کس مصیبت میں ہیں۔ آدم علیہ السلام کہیں گے آج میرا رب ایسے جلال میں ہے کہ نہ ایسا کبھی ہوا تھا نہ ہو گا۔ مجھے اس نے ایک درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا۔ مگر افسوس کہ میں نے اسے کھا لیا۔ میں خود آج شرمندہ ہوں اور مجھے اپنی فکر ہے۔ نفسی نفسی نفسی۔ پھر لوگ کہیں گے چلو نوح علیہ السلام کے پاس چلو۔ ان سے سب جا کر کہیں گے۔ کہ آپ زمین پر سب سے پہلے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شکر گذار بندہ رکھا۔ آپ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں۔ دیکھئے ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ وہ بھی جواب دیں گے کہ آج میرا رب اتنے جلال

میں ہے۔ کہ نہ اس سے پہلے کبھی تھا۔ نہ آئندہ ہوگا۔ اور مجھے ایک خاص دُعا مانگنے کی اجازت ہوئی تھی۔ وہ میں اپنی قوم کے برخلاف مانگ چکا ہوں اور نفسی نفسی نفسی کہیں گے پھر لوگ کہیں گے چلو ابراہیمؑ کے پاس چلو۔ جب ان کے پاس آئیں گے تو کہیں گے کہ آپؑ اللہ کے نبی اور خلیل ہیں۔ مہربانی کر کے ہماری شفاعت خدا کے سامنے کریں۔ دیکھئے ہم کس مصیبت میں ہیں۔ وہ بھی فرمائیں گے کہ میرا رب آج نہایت جلال میں ہے۔ میں نے تین غلطیاں کی ہیں اس لئے خدا کے سامنے کس منہ سے جاؤں۔ اور نفسی نفسی کہیں گے اور فرمائیں گے کہ تم لوگ موسیٰ کے پاس جاؤ۔ پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے موسیٰ آپ اللہ کے رسول ہیں اور کلیم اللہ ہیں۔ آپ ہماری سفارش خدا کے حضور کریں۔ وہ بھی کہیں گے کہ آج میرا رب نہایت جلال میں ہے۔ اور میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ اور اس قتل کا مجھے حکم نہ تھا۔ پھر وہ بھی نفسی نفسی کہیں گے اور فرمائیں گے کہ تم عیسیٰ کے پاس جاؤ. لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے۔ آپ اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ اور روح ہیں۔ آپ نے بچپن میں عقل کی باتیں کیں۔ آپ ہی خدارا ہماری سفارش فرمائیے۔ حضرت عیسیٰ کہیں گے۔ کہ آج میرا پروردگار نہایت جلال میں ہے کبھی اس سے پہلے وہ ایسے جلال میں نہ تھا۔ نہ آئندہ ہوگا۔ میں اس کام کے لائق نہیں۔ تم سب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ۔ اس پر سب لوگ میرے پاس آئیں گے۔ اور کہیں گے۔ کہ اے محمدؐ آپ خدا کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی سب اگلی پچھلی بشری کمزوریاں تک معاف کر دی تھیں۔ آپؐ اللہ سے ہماری شفاعت کیجئے۔ دیکھئے ہم کس مصیبت میں ہیں۔ اس وقت میں عرش کے نیچے جا کر سجدہ کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ خود مجھے حمد و ثنا کرنے کا طریقہ الہام کرے گا۔ وہ ایسا طریقہ ہوگا کہ پہلے کسی کو معلوم نہ تھا۔ پھر جب میں اسی طرح خدا کی تعریف کروں گا۔ تو مجھے حکم ہوگا۔ اے محمدؐ اٹھ! اور مانگ کیا مانگتا ہے۔ شفاعت کر ہم تیری شفاعت قبول کریں گے۔ اس پر میں سجدہ سے سر اٹھاؤں گا۔ اور کہوں گا۔ کہ اے رب میری

اُمّت کو بخش دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے محمد اپنی امت کے ان سب لوگوں کو جن کا حساب نہیں ہوگا۔ جنت کے دائیں دروازے سے داخل کر دو۔ اس کے بعد پھر میری شفاعت سے اور ایماندار لوگ بھی دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جس کے دل میں ایک جَو کے برابر بھی ایمان ہوگا۔ اس کو بھی خدا کے حکم سے نکال لاؤں گا۔ اور برابر دعا کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کے دل میں ایک رائی یا ذرّہ کے برابر بھی ایمان ہوگا۔ ان کو بھی نکال لوں گا۔ آخر میں پھر میں سجدہ کروں گا۔ اور خدا کی تعریف کروں گا۔ تو پھر خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ تم شفاعت کرو۔ میں عرض کروں گا۔ اے رب میری اُمّت میری اُمّت۔ اس پر حکم ہوگا۔ کہ جن کے دل میں رائی کے دانہ سے بھی بہت کم ایمان ہو۔ ان کو بھی نکال لو۔ چنانچہ میں جا کر ایسے لوگوں کو بھی نکال لوں گا۔ پھر آخر میں بھی اسی طرح حمد و ثنا کروں گا۔ اور عرض کروں گا۔ کہ اے پروردگار تو ان لوگوں کی نجات کا بھی حکم دے۔ جنہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہ مجھ کو اپنی عزت اور جلال اور بڑائی اور بزرگی کی قسم میں ان لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات دوں گا۔ جنہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہے۔

سب سے پہلی وحی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبوت سے کچھ مدت پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمدہ خواب آنے شروع ہوئے۔ جو خواب آپ دیکھتے وہ صاف طور سے پورا ہو جاتا تھا۔ اس وقت آپؐ کو تنہائی میں رہنا پسند ہو گیا۔ اور آپؐ غارِ حرا میں خلوت فرمانے لگے۔ اور کئی کئی رات برابر وہاں خدا کی عبادت کیا کرتے۔ پھر گھر آتے اور کئی روز کی خوراک لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس وحی آگئی۔ جب آپؐ پہ پہلی وحی نازل ہوئی تو اس وقت آپ غارِ حرا میں تھے۔ یہ رمضان کا مہینہ۔ شبِ قدر کی رات اور پیر کا دن تھا کہ ایک فرشتہ آپؐ کے پاس آیا۔ اور آپؐ کے سامنے ظاہر ہو کر اُس نے آپؐ سے کہا کہ پڑھو۔

آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر اس فرشتے نے آپ کو پکڑ لیا اور زور سے دبایا یہاں تک کہ آپ کو تکلیف ہوئی۔ پھر چھوڑ کر آپ سے کہا پڑھیئے۔ آپ نے پھر فرمایا۔ کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر فرشتے نے دوبارہ آپ کو زور سے دبایا۔ یہاں تک کہ آپ کو تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھیئے۔ آپ نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر تیسری دفعہ اس فرشتے نے آپ کو زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (سورہ علق: ۲ - ۶)

یعنی "اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ انسان کو گوشت کی بوٹی سے پیدا کیا۔ پڑھو! اور تمہارا پروردگار بڑا اکرم کرنے والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ جانتا نہ تھا"

یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس واقعہ کی ہیبت سے دھڑکنے لگا۔ آپ غار حرا سے سیدھے حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آئے۔ اور کہا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کمبل ڈال دیا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد جب آپ کا دل ذرا ٹھہرا تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سب حال بیان کیا۔ اور کہا کہ میرا تو دم نکلنے لگا تھا۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا۔ کہ ایسا نہ فرمائیے۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ بٹاتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ جو اچھی باتیں اور لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ آپ میں موجود ہیں۔ آپ مہمان نواز ہیں۔ اور تکالیف میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر اپنے چچا کے بیٹے ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں۔ یہ ورقہ عیسائی ہو چکے تھے۔ اور انجیل سے خوب واقف تھے۔ اور اتنے عمر رسیدہ آدمی تھے کہ ان کی آنکھیں بھی جاتی رہی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا۔ کہ اے

بھائی۔ ذرا اپنے بھتیجے کا حال تو سنو۔ اور پھر اپنی رائے دو۔ ورقہ نے حال پوچھا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب واردات بیان فرمائی۔ ورقہ نے سن کر کہا۔ کہ اے محمدؐ یہ تو وہ فرشتہ ہے جسے اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں آپؐ کے نبوت کے زمانہ میں جوان ہوتا۔ اے کاش کہ میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا۔ جب آپ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا سچ مچ یہ لوگ مجھے یہاں سے نکال دیں گے۔ ورقہ نے کہا۔ ہاں۔ جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے۔ ہمیشہ لوگ آپ جیسے نبیوں سے دشمنی کرتے ہیں۔ اور اگر میں زندہ رہا تو انشا اللہ پوری طاقت کے ساتھ آپ کی مدد کروں گا۔ مگر افسوس کہ چند روز کے بعد ہی ورقہ کی وفات ہوگئی۔ اور وحی کا آنا بھی کچھ مدت کے لئے رُک گیا۔

دوسری دفعہ پھر

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دفعہ وحی آنے کے بعد اس کے رُک جانے کا حال بیان فرمانے لگے۔ تو فرمایا۔ کہ ایک دن میں چلا جا رہا تھا۔ کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سُنی۔ اُوپر نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں ڈر گیا۔ گھر کو واپس آیا اور کہنے لگا کہ کمبل اوڑھاؤ کمبل اوڑھاؤ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی۔

يَاۤ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ (سورہ مدثر ۲-۶)

یعنی اے کپڑا اوڑھنے والے کھڑا ہو۔ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کر اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ اور ہر ناپاکی کو چھوڑ دے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ کہ وحی کی آمد خوب گرم ہوگئی اور لگاتار آنے لگی۔

وحی کے وقت تکلیف

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے نازل ہونے کے وقت سخت تکلیف ہوتی تھی۔ پہلے پہل آپؐ اپنے ہونٹوں کو جلدی جلدی ہلاتے تھے تاکہ وحی یاد ہو جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اے نبی آپ اپنی زبان کو زیادہ حرکت نہ دیا کریں کہ وحی یاد ہو جائے۔ آپ صرف سُن لیا کریں۔ پھر یہ ہمارا ذمہ ہے کہ آپ کے ذہن میں ہم اس کو محفوظ کر دیں۔ جب آپ وحی کو سن چکیں اس کے بعد اسے دہرایا کریں۔ چنانچہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کیا کرتے تھے۔

وحی کس طرح آتی تھی

ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ آپؐ پر وحی کس طرح آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے۔ اور یہ مجھ پر سب قسموں میں سخت ہوتی ہے۔ پھر جب میں اس کا مضمون یاد کر لیتا ہوں۔ تو یہ کیفیت دُور ہو جاتی ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ فرشتہ آدمی کی صورت بن کر میرے سامنے آجاتا ہے۔ اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اسے حفظ کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں بھی آپؐ پر وحی اُترتے دیکھی ہے۔ اس وقت آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا۔ چہرہ مُبارک سُرخ ہو جاتا تھا اور سانس تیز چلنے لگتا تھا۔

قرآن کا دور جبرئیل کے ساتھ

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو خود ہی سب

لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ مگر رمضان کے مہینے میں آپ کی سخاوت بے حد بڑھ جاتی تھی جب اس مہینہ میں حضرت جبرائیل ہر رات کو آپ کے پاس آتے اور قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔

آپؐ قرض لے کر اس سے زیادہ دیتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے ایک اونٹ قرض لیا۔ کچھ مدت کے بعد وہ شخص آپؐ سے اس اونٹ کے بدلہ کا اُونٹ لینے آیا اور تقاضا کیا۔ یہاں تک کہ اس نے بہت سخت کلامی کی اور گستاخی سے پیش آیا۔ بعض صحابہؓ کو یہ بات بہت بڑی معلوم ہوئی اور اُسے مارنے کو اُٹھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا۔ اور فرمایا کہ قرض خواہ کی بات سخت ہی ہوتی ہے۔ تم کہیں سے اس کے اونٹ کے بدلے ایک اونٹ کا بندوبست کرو۔ لوگوں نے بہت تلاش کیا اور عرض کی یا رسولؐ اللہ اس کے اونٹ سے بہت اچھے اچھے اونٹ تو ملتے ہیں۔ مگر اس وقت ویسا نہیں ملتا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھی قسم کا اونٹ ہی لاکر اسے دے دو۔ کیونکہ اچھا آدمی وہی ہے جو قرض خواہ کو اس کے قرض سے بڑھ کر ادا کرے۔

جانوروں سے نیکی کرنا بھی ثواب ہے

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زمانہ کی ایک عورت کا قصہ اپنے صحابہؓ کو سنایا۔ فرمایا۔ کہ ایک بہت بڑی اور گنہگار عورت تھی۔ وہ کہیں جارہی تھی۔ راستہ میں اسے پیاس لگی۔ تو اس نے ایک کنویں میں اتر کر پانی پیا۔ جب وہاں سے چلی تو دیکھا کہ پاس ہی ایک کتا پیاس کے مارے بیقرار ہے اور گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے دل میں کہا کہ یہ میری طرح پیاسا ہے۔ اسے پانی پلانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ پھر کنوئیں میں اتری اپنی جوتی

میں پانی بھرا۔ اس جوتی کو دانتوں سے پکڑ کر کنویں سے باہر آئی۔ اور اس کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ کام ایسا پسند آیا۔ کہ اس کے پچھلے سب گناہ اس نے بخش دیئے۔ اور اس کے دل میں نیکی کی محبت اور گناہ کی نفرت ڈال دی۔ یہاں تک کہ اس نے توبہ کرلی۔ اور آخر جب مری تو جنت میں داخل ہوئی۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ کیا جانوروں کی خدمت سے بھی ہمیں ثواب ملے گا ؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں ہر جاندار کی خدمت میں ثواب ہے۔

بھوکوں کو خدا رزق دیتا ہے

— حضرت ابوسعیدؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو کسی کام کے لئے سفر پر بھیجا۔ یہ لوگ ایک دن ایک عرب کے قبیلہ کے نزدیک اُترے اور ان لوگوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں۔ ہمارے کھانے کا بندوبست کرو۔ ان لوگوں نے صحابہؓ کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ لوگوں نے بہتیرے علاج کئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور وہ مرنے کے قریب ہوگیا۔ کسی نے کہا وہ جو مسافر اُترے ہوئے ہیں۔ شاید اُن میں سے کوئی سانپ کے کاٹے کا علاج یا منتر جانتا ہو۔ چنانچہ وہ لوگ صحابہؓ کے پاس آئے اور حال بیان کیا کہ ہمارے سردار کو سانپ ڈس گیا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اس کا علاج جانتا ہو تو ہمارے ساتھ چلے۔ ایک صحابیؓ نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اس کا منتر آتا ہے۔ مگر چونکہ تم نے ہماری دعوت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لئے اب میں اُجرت لے کر علاج کروں گا۔ مفت نہیں کروں گا۔ اس پر ان لوگوں نے کچھ بکریاں دینے کا اقرار کیا۔ جب معاملہ طے ہوگیا تو وہ صحابی گئے۔ اور انہوں نے الحمد کی سورت پڑھ کر اس بیمار پر پھونکنی شروع کی۔ جوں جوں وہ دم کرتے جاتے تھے۔ اس شخص کو ہوش آتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں وہ اُٹھ بیٹھا اور اچھا ہوگیا۔ اس پر ان لوگوں نے وعدہ کی بکریاں صحابہؓ کو دیدیں۔ بکریاں لے کر صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب آپؐ نے ان کا سارا قصہ سُنا تو بہت ہنسے اور فرمایا کہ تمہیں کس نے بتایا کہ الحمد میں یہ تاثیر ہے۔ اچھا یہ بکریاں تم لوگ بانٹ لو۔ اور مجھے بھی اپنی اجرت میں سے حصہ دو۔

شراب کی خرابی (ابتدائے مدینہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ بدر کی لڑائی میں ایک اونٹنی میرے حصہ میں آئی۔ اور ایک اور اونٹنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمائی۔ میں نے ایک دن ان دونوں اونٹنیوں کو ایک جگہ بٹھا کر ارادہ کیا کہ ان پر اذخر گھاس جنگل سے کاٹ کر لاؤں گا اور اسے سناروں کے ہاتھ بیچ کر جب کچھ رقم ہو جائے تو اپنی شادی کی دعوتِ ولیمہ کروں گا۔ اذخر بیچنے کے لئے میں نے ایک سنار سے بات چیت بھی کر لی تھی۔ اس سنار نے کہا تھا۔ کہ تم لاؤ میں ضرور خرید لوں گا۔ میں جنگل کو جانے کے لئے تیار تھا کہ اتنے میں پاس کے گھر میں سے میرے چچا حضرت حمزہ شراب کے نشہ میں نکلے۔ وہاں کچھ غزل خوانی بھی ہو رہی تھی۔ گانے والوں نے کہا۔ کہ اے حمزہ یہ موٹی موٹی اونٹنیاں بیٹھی ہیں ان کو پکڑ لو۔ اور ذبح کر لو۔ اس پر حمزہ تلوار لے کر میری اونٹنیوں کے پاس آئے۔ اور ان کے کوہان کاٹ ڈالے۔ اور پیٹ چاک کر کے کلیجیاں نکال لیں۔ میں یہ خوفناک نظارہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر سیدھے اس جگہ پہنچے اور حمزہ پر ناراض ہوئے۔ کہ تم نے یہ کیا ظلم کیا۔ حمزہ شراب کے نشے میں کہنے لگے کہ تم کون ہو؟ میرے باپ کے غلام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ ان کے تو ہوش و حواس ہی ٹھکانے نہیں تو واپس چلے آئے۔ یہ واقعہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے کا ہے (خدا تعالیٰ کی اپنے خاص بندوں کے ساتھ یہ بھی عادت ہے کہ دنیا سے جانے سے پہلے ان کے سب قصور اور کمزوریاں یہیں دھو ڈالتا ہے۔ حضرت حمزہؓ کی اس غلطی کے بدلے احد کے دن بعینہٖ اُن سے یہی معاملہ ہوا۔ اور ہندہ

نے ان کا پیٹ چاک کر کے ان کی کلیجی کی بوٹیاں چبائیں۔ یہ کفارہ خدا نے ان کا یہیں کر دیا۔ پھر اپنے نیک اعمال اور اسلام کی ابتدائی مدد کی وجہ سے وہ سید الشہدا کہلائے۔ واللہ اعلم)

منہ پر ہرگز نہ مارو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی کو مارے بھی تو منہ پر ہرگز نہ مارے۔ (بعض استاد یا ماں باپ جان کر منہ پر تھپڑ مارتے ہیں یہ گناہ کی بات ہے۔ اور منہ پہ مار کھانے والے بچوں کی آنکھ کان یا دماغ کو بھی بعض دفعہ اس سے ایسا صدمہ پہنچ جاتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے عیب دار ہو جاتے ہیں)۔ (الفضل ۴ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

حضرت ابوذرؓ کا اسلام لانا

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں قبیلہ غفار کا ایک شخص ہوں۔ جب ہمیں اپنے علاقہ میں یہ خبر پہنچی۔ کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ تو میں نے ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ملے۔ اور پھر گھر میں واپس آئے۔ جب میں نے اُن سے حال پوچھا تو کہنے لگے کہ میں نے اُس شخص کو دیکھا ہے۔ وہ ہر نیکی کا حکم کرتے ہیں اور ہر بُری بات سے منع کرتے ہیں۔ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ان کی اتنی مختصر بات سے میری تسلی نہ ہوئی۔ اور میں نے خود اپنا سامان تیار کیا اور مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں میں بہت حیران ہوا۔ کہ میں کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ملوں گا۔ کیونکہ میں اُن کو پہچانتا نہ تھا۔ اور یہ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ لوگوں سے آپؐ کی بابت دریافت کروں میں کعبہ میں اُتر پڑا۔ بھوک پیاس لگتی تو زمزم کا پانی پی لیا کرتا۔ ایک دن حضرت علیؓ میرے پاس سے گذرے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا کہ تم یہاں مسافر معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا ہمارے گھر چلو۔ میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ نہ وہ مجھ سے بولے نہ میں کچھ

بولا۔ وہیں ان کے پاس کھانا کھایا اور سو رہا۔ صبح ہوئی تو میں پھر کعبہ میں گیا۔ اور ارادہ کیا کہ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بابت کسی سے پوچھوں گا۔ مگر کوئی شخص مجھے ایسا نہ ملا جس سے یہ سوال کرتا۔ رات ہوگئی اور میں کعبہ میں ہی پڑ رہا۔ اتفاقاً پھر حضرت علیؓ میرے پاس سے گذرے اور کہنے لگے کہ تمہیں آج بھی کوئی جگہ ٹھہرنے کو نہیں ملی۔ میں نے کہا نہیں۔ حضرت علیؓ نے کہا چلو میرے ساتھ۔ راستہ میں انہوں نے پوچھا۔ کہ تم باہر کے آدمی ہو۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ جو آئے ہو ؟ میں نے کہا۔ کہ اگر آپ میرا راز فاش نہ کریں تو بیان کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا ہاں میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ تم بیشک بیان کرو۔ میں نے کہا کہ ہمیں اپنے علاقہ میں یہ خبر ملی تھی۔ کہ یہاں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس پر میں نے اپنے بھائی کو یہاں بھیجا۔ مگر جو کچھ انہوں نے بیان کیا۔ اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اس لئے میں خود اس شخص سے ملنے آیا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ اچھے ملے! میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ جن سے تم ملنا چاہتے ہو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اور جہاں میں جاؤں تم بھی داخل ہو جانا۔ اور اگر کوئی فسادی آدمی جس سے تم کو خطرہ کا اندیشہ ہوگا مجھے نظر آئے گا تو میں دیوار کے پاس ٹھہر جاؤں گا اور اپنی جوتی درست کرنے لگوں گا تو تم یہ اشارہ سمجھ لینا اور مجھ سے الگ ہوکر سیدھے چلے جانا۔ میں نے کہا اچھا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس لے گئے۔ میں آپؐ سے ملا اور سوال کیا۔ کہ مجھے اسلام کے احکام سنائیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سنائے میں اسی وقت مسلمان ہوگیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ کہ اے ابوذر ابھی اپنے اسلام کو کھلم کھلا ظاہر نہ کرنا۔ بلکہ بہتر ہے کہ تم اپنے علاقہ کی طرف واپس چلے جاؤ اور جب تمہیں ہمارے غلبہ کی خبر پہنچے تو ہمارے پاس آجانا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں اب اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا میں تو ابھی پکار پکار کر لوگوں میں اس کو ظاہر کروں گا۔ چنانچہ میں وہاں سے نکلا اور پکارتا ہوا کعبہ کی طرف آیا اور کہا اے قریش میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اور محمد اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ سُن کر قریش کے لوگ کہنے لگے کہ ذرا اس بے ایمان کی خبر لینا۔ یہ کہہ کر وہ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے اتنا مارا کہ میری جان نکلنے کے قریب ہوگئی۔ اتنے میں حضرت عباس رضؓ نے مجھے دیکھا اور مجھ پر جھک گئے۔ اور لوگوں سے کہا۔ کمبختو یہ تو قبیلہ غفار کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ مارا گیا تو یاد رکھنا کہ وہ لوگ تمہاری وہ خبر لیں گے کہ تم بھی یاد کرو گے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے قافلوں اور تجارت کا راستہ انہی کے علاقہ میں سے ہے۔ یہ سُن کر وہ مارنے والے رک گئے اور ادھر اُدھر چلے گئے۔ خیر میں نے وہ رات گزاری۔ اور جب صبح ہوئی تو میں پھر کعبہ میں گیا اور کل کی طرح پھر کلمہ پڑھا اور اپنا اسلام ظاہر کیا۔ اس پر پھر وہ لوگ مجھے مارنے لگے۔ حضرت عباسؓ پھر دوڑے ہوئے آئے اور مجھے اُن سے بچایا۔ اور وہی بات کہی جو کل کہی تھی۔ غرض یہ حال میرے مسلمان ہونے والے دن کا ہے۔

حقیقی پاکیزہ زندگی

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ آپؐ کی بی بیوں کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال دریافت کریں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید آپؐ گھر میں ہر وقت نماز میں ہی مصروف رہتے ہوں گے۔ جب بی بیوں نے آپؐ کے حالات سنائے اور انہیں آپؐ کی عبادت معمولی معلوم ہوئی تو وہ کہنے لگے۔ کہ بھلا ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت۔ آپؐ کے تو اگلے پچھلے قصور سب خدا نے معاف کر دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو اب ساری رات نماز ہی پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ ہی رکھا کروں گا۔ کوئی دن ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ باتیں سُنیں تو انہیں بلوا کر پوچھا۔ کہ کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے؟ وہ بولے ہاں۔ یا رسولؐ اللہ۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ مگر پھر بھی میرا یہ حال ہے کہ روزہ رکھتا بھی ہوں۔ اور چھوڑ بھی دیتا

ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں۔ اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ اور ان سے تعلق بھی رکھتا ہوں۔ سن لو! کہ جو شخص میرے اس طریقہ پر نہیں چلے گا اس کا پھر میرے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔

لونڈیاں آپ سے مدد لیا کرتی تھیں

مدینہ میں کئی دفعہ غریب لونڈیاں آپ کو پکڑ لیتیں اور کہتیں کہ یا رسولؐ اللہ یہ ہمارا کام ہے اسے کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہو لیتے اور ان کا کام کر دیتے۔

الفقر فخری

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں کئی دفعہ دو دو ماہ تک آگ نہ جلتی تھی۔ ایک شخص بولا۔ کہ پھر گذارہ کس طرح ہوتا تھا۔ بولیں کہ پانی اور کھجور کھا لیتے تھے۔ یا کبھی کہیں سے کچھ دودھ آجاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کبھی چپاتی کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ کبھی میدہ آپؐ کے ہاں آیا۔ گھر میں کوئی چھلنی نہ تھی۔ چکی سے موٹا موٹا آٹا پیس کر منہ کی پھونکوں سے بھوسی اڑا دیتے اور باقی کو گوندھ کر پکا لیتے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو آپؐ کی زرہ تھوڑے سے جَو کے بدلے ایک یہودی کے پاس گرو تھی۔ اور جن کپڑوں میں آپ فوت ہوئے۔ ان میں دونوں طرف پیوند لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ ایسا وقت تھا۔ کہ سارا جزیرہ نمائے عرب آپؐ کا مطیع اور فرمانبردار ہو چکا تھا۔

مساوات

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی جنگ کے لئے مدینہ سے نکلے تو فوج میں سواریاں بہت کم تھیں۔ تین تین آدمیوں کے پیچھے ایک اونٹ تھا اور لوگ باری باری سوار

ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو دو آدمی ایک اونٹ میں شریک تھے۔ جب وہ عرض کرتے کہ یارسول اللہ آپ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔ تو آپؐ فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ پیدل نہیں چل سکتے۔ اور میں بھی تمہاری طرح ثواب کا محتاج ہوں۔ چنانچہ آپؐ ان کو اپنی اپنی باری پر سوار کرا دیتے اور خود پیدل چلتے۔

آپؐ لین دین کے کھرے تھے

خالد بن عمیر ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مکہ گیا۔ ان دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ اور ابھی ہجرت نہیں ہوئی تھی۔ وہاں میں نے ایک پاجامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ فروخت کیا۔ حضورؐ نے اس کی قیمت میں مجھے چاندی دی۔ اور جب آپؐ نے وہ چاندی تولی۔ تو خوب جھکتی ہوئی تولی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے زیادہ سختی کا دن (طائف)

ایک دن حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ کیا اُحد سے بھی زیادہ سختی کا کوئی دن آپ پر آیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ میں نے تمہاری قوم قریش سے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ اُحد سے بہت بڑھ کر ہیں۔ اور سب سے زیادہ تکلیف مجھے اس دن پہنچی۔ جس دن میں طائف میں عبدیالیل کے پاس گیا اور اس نے میری دعوت رد کر دی۔ میں نہایت رنج و ملال کے ساتھ وہاں سے چل نکلا۔ ان لوگوں نے وہاں کے شہدے اور اوباش میرے پیچھے لگا دیئے۔ اور انہوں نے کئی میل تک مجھے ہوش نہ آنے دیا۔ اتنا مارا اور پتھر برسائے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ میں نے اپنا منہ بچانے کے لئے اپنا سر نیچے کر رکھا تھا۔ اور میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ یہاں تک کہ پتھروں کی بارش قرن الثعالب میں جا کر بند ہوئی تو میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور دیکھا کہ ایک اَبر کے

ٹکڑے نے مجھ پر سایہ کر لیا۔ اور اس میں جبرائیل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تبلیغ اور ان لوگوں کا سلوک دیکھ لیا۔ اور اللہ نے آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے۔ اور آپؐ کو اجازت دی ہے کہ جو چاہیں آپ اسے حکم کریں۔ پھر مجھے پہاڑوں کے فرشتے نے آواز دی اور سلام کیا۔ اور کہا۔ کہ اے محمدؐ اس وقت جو آپ چاہیں میں کر دوں۔ اگر اجازت ہو تو یہ دونوں سامنے والے پہاڑ ان لوگوں پر رکھ دوں۔ میں نے کہا نہیں میں یہ نہیں چاہتا مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ

خیر آپؐ نے ان اوباشوں کے ظلم سے ایک باغ میں پناہ لی۔ وہ باغ آپؐ کے مکہ کے پرانے دشمنوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اس وقت وہ دونوں وہیں باغ میں موجود تھے۔ آپؐ کی مصیبت دیکھ کر ان دشمنوں کو بھی اس وقت ترس آگیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام عداس نامی کو بلا کر کہا۔ کہ ایک خوشہ انگوروں کا لے کر اس شخص کو دے آ جو فلاں جگہ بیٹھا ہے۔ عداس انگور لے کر حاضر ہوا۔ اور پیش کر کے کہا کہ اسے کھائیے۔ آپؐ جب کھانے لگے تو پہلے بسم اللہ پڑھی۔ عداس نے آپؐ کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام تو اس شہر کے لوگ نہیں پڑھا کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اور تمہارا کیا دین ہے؟ عداس نے کہا میں عیسائی ہوں اور نینوہ کا رہنے والا ہوں آپؐ نے فرمایا کہ پھر تو تم یونسؑ کے شہر والے ہو۔ عداس نے کہا آپ کیا جانیں کہ یونسؑ کون تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ وہ میرے بھائی تھے۔ میں بھی نبی ہوں اور وہ بھی نبی تھے۔ یہ سُن کر عداس جھکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے سر اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ یہ نظارہ عتبہ اور شیبہ نے بھی دُور سے دیکھا اور کہنے لگے لو اس شخص نے ہمارے غلام کو بھی گمراہ کر دیا۔ جب غلام ان کے پاس واپس آیا۔ تو انہوں نے کہا۔ کم بخت تو نے اس شخص کے سر اور ہاتھوں کو کیوں بوسہ دیا۔ عداس بولے حضور اس وقت اس شخص سے بہتر اور کوئی شخص پردہ

دنیا پر نہیں ہے۔ عتبہ شیبہ کہنے لگے۔ عداس افسوس کی بات ہے۔ تمہارا دین تو اس کے دین سے اچھا ہے۔ تم ہرگز اپنے دین کو نہ چھوڑو۔

بچوں کو پیار کرنا

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دیہاتی آدمی بیٹھا تھا۔ آپؐ نے اس کے سامنے اپنے نواسے کو پیار کیا اور چوما وہ کہنے لگا یا رسولؐ اللہ کیا آپ بھی بچوں کو چومتے ہیں؟ ہم تو اپنے بچوں کو اس طرح پیار نہیں کرتے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ بھائی جب اللہ نے تمھارے دل سے رحم چھین لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

چچا کی گواہی بھتیجے کی بزرگی پر

جناب ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا مرتے دم تک مسلمان نہیں ہوئے مگر پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی کے اتنے قائل تھے کہ انہوں نے آپؐ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے،

وَاَبْيَضُ يُسْتَسقَى الغَمَامُ بِوَجْهِهٖ
ثِمَالُ الْيَتَامیٰ عِصْمَةٌ لِلاَرَاجِلِ

یعنی محمدؐ وہ گورے رنگ کا انسان ہے۔ کہ ہم لوگ ان کے طفیل سے بارش مانگا کرتے ہیں۔ اور سب جانتے ہیں کہ وہ یتیموں کا خبر گیر اور بیوہ عورتوں کا سہارا ہے۔

کعبہ کی نشست گاہیں

جاہلیت کے زمانہ میں قریش کے ہر خاندان کے لئے کعبہ میں بیٹھنے کی جگہیں مقرر تھیں جہاں وہ لوگ آکر بیٹھا کرتے اور اپنی مجالس لگایا کرتے تھے۔

زیدؓ بن حارثہ کا قصّہ

جاہلیت کے زمانہ میں آپ کے ایک غلام تھے۔ ان کا نام زید تھا۔ آپؐ کے پاس وہ اس طرح آئے تھے کہ ایک دفعہ کئی لٹیروں نے اُن کے قبیلہ پر ڈاکہ مارا۔ اور ان کو قید کر کے لے گئے اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ ان کو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم نے اپنی پھوپھی کے لئے لیا۔ اور مکہ میں لاکر ان کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت زید کی عمر ۸ سال کی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نذر کر دیا۔ اب وہ آپؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ اتفاقاً کچھ مدت کے بعد زید کے رشتہ داروں کو ان کا پتہ چل گیا۔ اُن کے والد جن کا نام حارثہ تھا۔ ان کی تلاش میں اپنے بھائی سمیت مکہ آ پہنچے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے عبد المطلب کے صاحبزادے ہم اپنے لڑکے کے لئے حاضر ہوئے ہیں جو آپ کی خدمت میں ہے۔ آپ ہم پر احسان کریں۔ اور اس کا فدیہ لے کر اُسے ہمارے حوالے کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ وہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا زید۔ آپؐ نے زید کو بلایا اور پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو۔ وہ بولے ہاں یہ میرے والد ہیں۔ اور یہ میرے چچا ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کہ زید یہ لوگ تم کو لینے آئے ہیں۔ اور تم نے میرے حال کو بھی دیکھ لیا ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ خواہ یہاں رہو۔ خواہ ان کے ساتھ واپس وطن کو چلے جاؤ۔ زیدؓ نے جواب دیا۔ حضورؐ میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں تو آپؐ کے پاس ہی رہوں گا۔ آپؐ ہی میرے باپ ہیں اور آپؐ ہی میرے چچا ہیں۔ ان کا باپ بولا۔ کم بخت تیرا بُرا ہو۔ تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ زید نے جواب دیا۔ ہاں میں نے ان صاحب میں ایسی بات دیکھی ہے۔ کہ اب میں انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کو پسند نہیں کر سکتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے زیدؓ کی یہ وفاداری اور شکر کا جذبہ دیکھا تو آپؐ اس کا ہاتھ پکڑ کر کعبہ کے صحن میں لے گئے

اوراعلان فرمایا کہ اے حاضرین گواہ رہو۔ آج سے میں زید کو آزاد کرتا ہوں۔ اور اب یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کا وارث ہوں ۔ اور یہ میرا وارث ہے۔ جب زید کے والد اور چچا نے یہ حال دیکھا تو ان کو تسلی ہوگئی اور خوشی خوشی اپنے گھر کو واپس چلے گئے۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو مسلمان بنانا شروع کیا۔ تو زید بھی فوراً مسلمان ہو گئے۔ سب سے پہلے مسلمان آپ کے گھر کے لوگ ہی تھے۔ یعنی حضرت خدیجہؓ آپؐ کی بیوی۔ حضرت علیؓ جو آپؐ کے چچیرے بھائی تھے اور آپؐ کے پاس ہی رہتے تھے۔ اور حضرت زید جو آپؐ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ جب زید بڑے ہو گئے تو آپؐ نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ حالانکہ قریش اتنی ناک والی قوم تھی۔

کہ غلاموں کو وہ جانوروں سے زیادہ ذلیل سمجھتے تھے۔ زید کے آزاد ہو جانے کے بعد لوگ ان کو زید بن محمدؐ (یعنی محمدؐ کا بیٹا زید) کہا کرتے تھے۔ پھر مدینہ میں جب یہ خدا کا حکم قرآن میں نازل ہوا کہ کسی کا بیٹا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ اور جس کا بیٹا ہو اسی کے نام سے پکارا جائے تو اس وقت سے پھر وہ زید بن حارثہ کہلانے لگے۔

خدا کا خوف

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آسمان پر بادل یا آندھی دیکھتے تو گھبرا جاتے۔ کبھی اندر آتے کبھی باہر جاتے اور آپؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ پھر جب بارش شروع ہو جاتی۔ تو آپ کی وہ حالت دُور ہو جاتی۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ یہ کیا بات ہے آپؐ نے فرمایا۔ کہ مجھے خوف آتا ہے کہ یہ ویسا عذابِ الٰہی نہ ہو جیسا کہ عاد کی قوم پر آیا تھا۔

مشرک شاعروں کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسانؓ بن ثابت شاعر سے کہا کرتے تھے۔ کہ تم مشرکوں کی ہجو کرو۔ جبرئیل تمہاری مدد پر ہیں ۔ (الفضل ۲۵ دسمبر ۱۹۲۸ء)

عبداللہ بن سلام یہودی کا مسلمان ہونا

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ایک نیک یہودی جن کا نام عبداللہ بن سلام تھا۔ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ میں آپ سے تین باتیں پوچھوں گا۔ آپ ان کا جواب ٹھیک دیں گے تو میں آپؐ پر ایمان لے آؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا پوچھو۔ انہوں نے تین سوال کئے۔ آپؐ نے جواب دیئے۔ عبداللہ بن سلام نے آپ کے جواب سن کر کہا۔ کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ یہود لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔ اگر وہ میرے مسلمان ہونے کی خبر پائیں گے تو کہیں گے کہ اس کا کیا اعتبار وہ تو آدمی ہی بڑا تھا اگر مسلمان ہو گیا تو کیا ہوا۔ اس لئے آپؐ ان کو بلا کر میری بابت تحقیقات کر لیں۔ چنانچہ یہودی لوگ بلائے گئے۔ اور عبداللہ بن سلام اندر گھر میں چھپ گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تم میں سے کیسے شخص ہیں؟ یہودی لوگ کہنے لگے۔ کہ ان کا باپ بھی بڑا عالم تھا اور وہ بھی بڑے عالم ہیں اور ہم سب میں بزرگ اور نیک شخص ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا بتاؤ اگر عبداللہ مسلمان ہو جائیں۔ تو پھر تو تم بھی اسلام لے آؤ گے ۔ یہودیوں نے کہا۔ خدا انہیں بچائے ۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ سن کر عبداللہ بن سلام مکان کے اندر سے کلمہ پڑھتے ہوئے نکل آئے اور کہنے لگے کہ لوگو میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور محمدؐ اس کے سچے رسول ہیں۔ یہودیوں نے یہ جو حالت دیکھی تو لگے ان کو گالیاں دینے۔ اور یہ بھی کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں۔ یہ شخص آپ بھی بُرا ہے اور اس کا باپ بھی بُرا ہے ۔

ابوجہل کا قتل

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ میں بدر کے دن صفِ جنگ میں کھڑا تھا۔ میں نے اپنے دائیں بائیں نظر کی مجھے انصار کے دو کم عمر لڑکے دکھائی دیئے۔ مجھے اس وقت افسوس ہوا۔ اور میں نے دل میں کہا۔ کاش میرے دونوں طرف کوئی مضبوط آدمی ہوتے میں اسی خیال میں تھا۔ کہ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ کہ چچا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں ؟ میں نے کہا۔ ہاں مگر تمہیں اس سے کیا کام۔ لڑکے نے کہا۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ کم بخت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت گالیاں دیا کرتا تھا۔ اور مجھے اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میں اس کو دیکھ لوں تو میں اس کو نہ چھوڑوں۔ پھر خواہ وہ مر جائے خواہ میں۔ عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں۔ کہ میں نے اس لڑکے کی بات سن کر بہت تعجب کیا۔ اتنے میں دوسری طرف کے لڑکے نے بھی ایسی ہی گفتگو مجھ سے کی۔ مجھے اور حیرانی ہوئی۔ تھوڑی دیر میں مجھے ابوجہل بھی نظر آگیا۔ کہ اپنے لشکر میں ادھر اُدھر انتظام کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر ان لڑکوں سے کہا۔ کہ دیکھو وہ سامنے ابوجہل ہے۔ جسے تم پوچھتے تھے۔ میرے منہ سے یہ بات نکلنی تھی۔ کہ وہ تیر کی طرح اُڑے اور تلواریں کھینچ کر ابوجہل پر ٹوٹ پڑے اور اتنی تلواریں اُسے ماریں کہ وہ مردہ سا ہو کر گر پڑا۔ پھر وہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے ابوجہل کو قتل کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم دونوں میں سے کس نے۔ ہر ایک نے عرض کیا کہ حضور میں نے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تم نے اپنی تلواریں پونچھ ڈالی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ لاؤ اپنی تلواریں دکھاؤ۔ چنانچہ آپ نے ان کا ملاحظہ فرما کر فیصلہ دیا۔ کہ تم دونوں نے مل کر اسے مارا ہے۔ ان دونوں لڑکوں کے نام معاذ اور معوذ تھے۔

حُسنِ سلوک اور برداشت

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں جا رہے تھے۔ اور آپ پر ایک موٹے حاشیہ کی چادر تھی۔ اتنے میں ایک گنوار آدمی نے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کو اس زور سے کھینچا۔ کہ آپؐ کی گردن پر اس چادر کے حاشیہ کا نشان پڑ گیا۔ وہ گنوار کہنے لگا کہ مجھے بھی اللہ کے مال میں سے کچھ دلوائیے۔ آپ اس کی اس حرکت پر مسکرائے۔ اور خادموں سے فرمایا۔ کہ اسے کچھ دے دو۔

زہر والی بکری دعوت میں (خیبر)

حضرت ابوبکرؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ جب خیبر فتح ہوا تو یہودیوں کی طرف سے آپ کے لئے ایک بھنی ہوئی بکری کھانے کے لئے آئی۔ اس میں ان ظالموں نے زہر ملا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ یہاں جتنے یہودی ہیں سب کو جمع کر کے میرے سامنے بلا لاؤ۔ جب وہ سب آ گئے۔ تو آپؐ نے فرمایا میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا تم سچ سچ بتا دو گے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ بتاؤ تو تمہارا باپ کون ہے ان لوگوں نے کہا فلاں شخص۔ آپؐ نے فرمایا جھوٹ تمہارا باپ تو فلاں شخص ہے۔ انہوں نے کہا۔ آپؐ سچ کہتے ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کہ اگر اب کچھ پوچھوں۔ تو مجھے سچ بتا دو گے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اگر ہم جھوٹ بولیں گے۔ تو آپ اسی طرح معلوم کر لیں گے جس طرح آپ نے اب معلوم کر لیا۔ اس پر آپؐ نے ان سے پوچھا کہ دوزخ میں کون لوگ جائیں گے۔ انہوں نے کہا ہم لوگ تو تھوڑے ہی دن دوزخ میں رہیں گے مگر ہمارے بعد آپ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بخدا تمہارے بعد ہم کبھی اس میں نہیں رہیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کہ اگر اب میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو سچ کہہ دو گے۔ انہوں نے کہا بے شک۔ آپؐ

نے فرمایا۔ کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیوں۔ انہوں نے کہا ہم نے آپ کا امتحان لیا تھا۔ اگر آپ جھوٹے نبی ہیں۔ تو آپ کے مرنے سے ہمیں نجات مل جائے گی۔ اور اگر آپؐ سچے نبی ہیں۔ تو پھر آپ سلامت رہیں گے۔

ابتدائے ہجرت میں انصار کی مہمان نوازی

شروع ہجرت کے دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ تمام مہاجرین کے انصار کے مہمان تھے۔ دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت انصاریوں کے ایک ایک گھر میں اتاری گئی تھی۔ مقدادؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ میں اس جماعت میں تھا۔ جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے۔ ہمارے والے گھر میں چند بکریاں تھیں۔ انہی کے دودھ پر گذارہ تھا۔ دودھ دوہ کر سب لوگ اپنا اپنا حصہ پی لیتے اور آپ کے لئے ایک پیالہ میں رکھ چھوڑتے۔ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس تشریف لانے میں بہت دیر ہوئی۔ تو سب لوگ دودھ پی پلا کر سو رہے۔ آپ کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔ (شائد خیال کیا۔ کہ باہر کھانا کھالیں گے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو دیکھا کہ پیالہ بالکل خالی ہے۔ کچھ نہ کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا۔ کہ یا اللہ جو آج ہمیں کھلائے۔ تو بھی اسے کھلائیو۔ مقدادؓ ذکر کرتے ہیں کہ میں سن کر اُٹھا اور چاہا کہ ایک بکری ذبح کر کے گوشت تیار کروں مگر آپؐ نے روک دیا۔ اور بکری کو پکڑ کر اس کا دودھ دوبارہ دوہا اور جو نکلا پی کر سو رہے۔ اور دودھ کا حصّہ نہ رکھنے والوں کو کسی قسم کی ملامت نہ کی۔

رضاعی ماں باپ کی تعظیم

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف رکھتے تھے کہ آپ کے رضاعی والد آئے۔ آپ نے ان کے لئے اپنی چادر کا ایک پلہ بچھا دیا۔ پھر رضاعی ماں آئیں۔ تو دوسرا پلہ ان کے لئے بچھا دیا۔ آخر میں جب رضاعی بھائی آئے۔ تو آپ اٹھ کر پیچھے سرک گئے اور ان

کو اپنے سامنے بیٹھا لیا۔

انصاف کا تقاضا (فتح طائف)

فتح مکہ کے بعد طائف کے لوگوں کو قلعہ بند چھوڑ کر آپ مدینہ تشریف لے آئے تھے۔ تمام عرب میں اب طائف ہی ایک ایسا مقام تھا۔ جہاں کے لوگوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس علاقہ میں صخر نامی ایک مسلمان رئیس تھے۔ انہوں نے آپؐ کے بعد طائف والوں کو ایسا تنگ کیا اور دبایا کہ آخرکار وہ مطیع ہونے پر راضی ہو گئے۔ اور اسلام بھی لے آئے۔ صخرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع دی۔ چند دنوں میں خود طائف والوں کا وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ کہ ہماری ایک عورت صخر کے قبضہ میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صخر کو بلا بھیجا۔ اور جب وہ آئے تو حکم دیا۔ کہ ان کی عورت کو اس کے گھر پہنچا دو۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے عرض کیا۔ کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے۔ صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ہم اسلام لے آئے ہیں۔ ہمارا چشمہ ہمیں ملنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر صخر کو بلا بھیجا۔ اور فرمایا۔ کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے۔ تو ان کی جان اور ان کے مال محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے تم ان کا چشمہ ان کو واپس کر دو۔ صخر نے تعمیل حکم کی۔ راوی بیان کرتے ہیں۔ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں حکم صخر نے منظور کر لئے تو میں نے دیکھا۔ کہ حضور کا چہرہ مبارک شرم سے سرخ ہو گیا۔ کہ صخر کو فتح طائف کے بدلے ان دو معاملوں میں الٹی شکست اٹھانی پڑی۔ مگر کیا کرتے۔ انصاف اور اسلام کا تقاضا یہی تھا۔

غزوہ اوطاس

حنین کی جنگ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامرؓ صحابی کو ایک لشکر کا سردار بنا کر اوطاس کی طرف بھیجا۔ وہاں دُرید بن صمہ فوج لئے مقابلہ کو پڑا تھا حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں۔ کہ میں بھی لشکرِ اسلام کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں کافروں کا سپہ سالار دُرید مارا گیا۔ مگر لشکرِ اسلام کے سردار ابو عامر کو بھی ایک تیر ایسا لگا کہ اس کے گھٹنے کے اندر گھس گیا۔ میں نے ابو عامر سے پوچھا۔ کہ چچا تمہیں کس نے تیر مارا۔ انہوں نے مجھے اشارہ سے بتایا کہ وہ شخص میرا قاتل ہے۔ میں جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگتا جاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ او بے حیا بزدل تجھے شرم نہیں آتی۔ ٹھہرتا کیوں نہیں۔ اس پر وہ ٹھہر گیا۔ اور میری اور اس کی لڑائی ہوئی، میں نے اسے ہلاک کر دیا۔ واپس آکر ابو عامرؓ سے کہا کہ اللہ نے تمہارے قاتل کو ہلاک کر دیا۔ پھر وہ بولے کہ اب یہ تیر تو نکالو۔ میں نے تیر نکالا۔ تو گھٹنے میں سے پانی بہنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ کہ اے ابوموسیٰ اس زخم سے میں نہیں بچوں گا۔ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میری طرف سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ ابو عامر کے لئے بخشش کی دعا کریں۔ پھر ابو عامر نے مجھے لشکر کا سردار بنایا اور تھوڑی دیر میں فوت ہو گئے۔ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس ہوا تو اس وقت آپؐ ایک چارپائی پر لیٹے تھے۔ اور اس کی رسیوں کے نشان آپ کی پیٹھ اور پہلو پہ پڑ گئے تھے۔ میں نے سب حال عرض کیا اور دُعا کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا کر وضو کیا اور پھر ہاتھ اٹھا کر ابو عامرؓ کے لئے دُعا فرمائی۔ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ میرے لئے بھی۔ اس پر آپؐ نے میرے لئے بھی دُعا فرمائی۔

فتح مکہ کے بعد اشاعتِ اسلام

حضرت عمرؓ و بن سلمہ صحابی بیان کرتے تھے۔ کہ ہمارا قبیلہ ایک چشمہ پر رہا کرتا تھا۔ اور مسافر لوگ اکثر وہاں سے گذرا کرتے تھے۔ جو کوئی مسافر گذرتا اس سے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بابت پوچھا کرتے تھے۔ کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ اور کیا بیان کرتا ہے مسلمان لوگ ہم کو بتاتے کہ یہ شخص کہتا ہے۔ کہ میں خدا کا رسول ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔ اور خدا نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے۔ پھر وہ ہم کو قرآن سناتے تو میں وہ یاد کر لیتا تھا۔ اور عرب کے لوگ مسلمان ہونے کے لئے صرف فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ محمد اور اس کی قوم آپس میں نمٹ لیں۔ اگر محمد ان پر غالب آگیا تو وہ سچا نبی ہے۔ پھر جب مکہ فتح ہوگیا۔ تو ہر قوم اسلام لانے میں جلدی کرنے لگی۔ اور میرے والد نے بھی اس کام میں بہت جلدی کی۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس جا کر مسلمان ہوگئے۔ جب وہ مدینہ سے واپس آئے تو کہنے لگے کہ اے میرے قبیلہ والو میں سچے نبی کے پاس ہو آیا ہوں۔ اور اس نے فرمایا ہے۔ کہ تم لوگ پانچ پانچ نمازیں ان وقتوں میں پڑھا کرو۔ اور نماز سے پہلے اذان دیا کرو اور جو تم میں سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو وہ نماز پڑھائے۔ غرض سب لوگ مسلمان ہوگئے۔ اور جب تحقیقات کی گئی۔ تو مجھ سے زیادہ کوئی قرآن کا حافظ نہ نکلا۔ کیونکہ میں نے مسلمان مسافروں سے سُن سُن کر بہت سی سورتیں یاد کر رکھی تھیں۔ چنانچہ سب نے مجھے اپنا امام بنایا۔ میری عمر اس وقت چھ سات سال کی ہوگی۔ اور میرے پاس صرف ایک چھوٹی سی چادر تھی۔ جب میں سجدہ کرتا تو ننگا ہو جاتا تھا۔ ایک دن ایک عورت کہنے لگی۔ کہ لوگو تم اپنے امام کے چوتڑ تو ڈھانکو۔ یہ ہمارے سامنے ننگا ہوتا ہے۔ اس پر لوگوں نے کپڑا خرید کر ایک لمبا سا کرتہ مجھے بنا دیا جب میں نے وہ کرتہ پہنا تو اتنا خوش ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔

فتح مکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لئے ماہ رمضان میں دس ہزار صحابیوں کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ یہ آپؐ کی ہجرت کے ۸½ سال کے بعد کا واقعہ ہے۔ جب آپؐ مکہ کے قریب پہنچ گئے تو قریش کو معلوم ہوا کہ اس وقت ابوسفیان حکیم بن حزام اور بدیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جاسوسی کے لئے نکلے۔ جب یہ لوگ موضع مرّالظہران پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں بے حد آگیں روشن ہیں۔ بدیل نے کہا کہ یہ بنی عمر قبیلہ نے جلائی ہوں گی ابوسفیان کہنے لگے کہ بنی عمر کے آدمی اس سے بہت کم ہیں۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چوکیداروں نے اُن کو پکڑ لیا اور آپؐ کے پاس لے آئے۔ ابوسفیان مسلمان ہو گئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے روانہ ہوئے۔ تو آپؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا۔ کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے جاکر کھڑے ہو۔ جہاں سے ہمارا لشکر اچھی طرح نظر آئے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ ان کو ایک مناسب موقعہ پر لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے سامنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج کے دستے گزرنے شروع ہوئے۔ جب پہلا قبیلہ گزرا تو ابوسفیان نے پوچھا۔ عباس یہ لوگ کون ہیں۔ انہوں نے کہا یہ قبیلۂ غفار ہے۔ ابوسفیان نے کہا مجھے ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر قبیلہ جہینہ گذرا۔ تو ابوسفیان نے وہی بات کہی۔ پھر قبیلہ سعد اور اس کے بعد قبیلہ سلیم گذرے۔ اس پر بھی ابوسفیان نے وہی بات کہی۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ایک ایسا قبیلہ گزرا جسے ابوسفیان نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے عباسؓ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا یہ انصاری ہیں۔ اور ان کا جھنڈا سعد بن عبادہ کے پاس ہے۔ اتنے میں سعد بن عبادہؓ بولے کہ لے ابوسفیان آج کا دن کفار کے قتل کا دن ہے۔ آج کعبہ میں لڑائی حلال ہو جائے گی۔ ابوسفیان نے کہا۔ اچھا مصیبت کا دن آیا۔ پھر ایک سب سے چھوٹی جماعت ان کے سامنے سے گذری جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مہاجرین اصحابؓ تھے۔ اور آنحضرتؐ

کا جھنڈا حضرت زبیرؓ کے ہاتھ میں تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو ابوسفیان نے کہا۔ کہ یا حضرت آپ کو معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ انصاری نے کیا کہا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا کہا؟ وہ کہنے لگے کہ سعد نے کہا کہ آج قریش کے قتل کا دن ہے۔ اور آج کعبہ میں لڑائی جائز کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سعد نے غلط کہا۔ آج کا دن تو ایسا دن ہے۔ کہ اللہ کعبہ کو بزرگی دے گا اور اسے غلاف پہنایا جائے گا۔ غرض اس تزک و احتشام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں کداء کی طرف سے داخل ہوئے۔ خالد بن ولیدؓ کو حکم تھا کہ تم دوسری طرف سے داخل ہو۔ وہاں کچھ مشرکوں نے ان کا مقابلہ کیا جس میں دو صحابیؓ مارے گئے اور بارہ تیرہ مشرک۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں تشریف لے گئے۔ اس وقت کعبہ کے گرد چاروں طرف باہر ۳۶۰ بت لگے ہوئے تھے۔ آپؐ اپنی چھڑی سے ان کو مارتے جاتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے کہ حق آگیا اور جھوٹ بھاگ گیا۔ اور جھوٹا دین نہ اب کسی کے کام آیا۔ نہ آئندہ کام آسکتا ہے۔

وہ رات مسجد میں بسر کی (مدینہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ فدک سے چار اُونٹ اناج کے آئے۔ آپؐ نے بلال کو حکم دیا کہ اس غلّہ سے جو کچھ قرضہ وغیرہ ہے۔ وہ ادا کر دو۔ چنانچہ ایک یہودی کا قرضہ ادا کیا گیا۔ اور جو حاجت مند تھے ان کو دیا گیا۔ اس کے بعد بلالؓ نے عرض کیا۔ کہ یارسولؐ اللہ سب کام ہوگیا۔ آپؐ نے پوچھا۔ کہ کچھ بچ رہا یا نہیں؟ بلالؓ بولے۔ ہاں کچھ باقی ہے۔ فرمایا کہ جب تک کچھ بھی باقی رہے گا میں گھر میں نہیں جا سکتا۔ بلالؓ بولے یا حضرت اب کوئی سائل اور حاجت مند ہی نہیں تو میں کیا کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ رات مسجد میں بسر کی۔ دوسرے دن جب بلالؓ نے عرض کیا۔ کہ یارسولؐ اللہ خدا کے فضل سے وہ سب تقسیم ہوگیا۔ تو آپؐ نے اللہ کا شکر کیا اور اٹھ کر گھر میں تشریف لے گئے۔

تقویٰ (مرض الموت)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض الموت کے دنوں میں ایک دن مسجد میں تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرضہ آتا ہو یا کسی نے مجھ سے کسی قسم کا بدلہ لینا ہو۔ تو وہ اب لے لے۔ میں حاضر ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان سن کر مجلس میں سناٹا ہوگیا اور صحابہ کے کلیجے پھٹ گئے۔ صرف ایک شخص نے کہا کہ حضورؐ نے مجھ سے تین درہم قرض لئے تھے۔ چنانچہ وہ اسی وقت ادا کر دیئے گئے

اپنے یہودی خادم کی بیمار پُرسی

مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی لڑکا نوکر تھا اور آپ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن وہ بیمار ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بیمار پُرسی کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پہلے تو اس کی طبیعت کا حال پوچھا۔ پھر فرمایا کہ میاں اب تو تم مسلمان ہو جاؤ۔ اس لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا وہ بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ باپ نے کہا کہ بیٹا ابوالقاسم کا کہنا مان لو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ وہ لڑکا کہنے لگا کہ یا رسول اللہؐ مجھے منظور ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مسلمان ہونے سے بہت ہی خوش ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! خدا نے اس لڑکے کو دوزخ سے بچا لیا۔

عورت کی بے صبری (مدینہ)

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ قبر کے

سرہانے ایک عورت بیٹھی آہ وزاری اور بین کر رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ اے عورت اللہ سے ڈر اور صبر کر۔ اس عورت نے کہا۔ کہ اے شخص تو اپنی راہ لگ تجھ پر میرے جیسی مصیبت پڑتی تو پھر تجھے پتہ لگتا۔ لگا ہے مجھے نصیحت کرنے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے خاموش ہو کر چلے آئے۔ پیچھے لوگوں نے بتایا کہ۔ بیوقوف۔ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ سُن کر وہ آپؐ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ کہ اس وقت مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے آپؐ کو پہچانا نہ تھا۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اب یہ کہنے کا کیا فائدہ۔ ثواب تو اسی صبر کا ہے۔ جو صدمہ کے پہلے دھکے کے وقت کیا جائے۔

معراج

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے معراج کا ذکر صحابہؓ کو خود سنایا۔ فرمایا کہ جب میں مکہ میں تھا۔ تو ایک رات میں نے دیکھا کہ میرے گھر کی چھت پھٹ گئی۔ اور جبرائیل علیہ السلام اس میں سے اُترے۔ پہلے انہوں نے میرا سینہ چاک کیا۔ اور آب زمزم سے اُسے دھو کر صاف کیا۔ پھر ایک طشت سونے کا حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا لائے۔ اور اسے سینہ کے اندر ڈال کر اس کو بند کر دیا۔ اس کے بعد جبرائیل میرا ہاتھ پکڑ کر پہلے آسمان پر لے گئے۔ اور اس آسمان کے داروغہ فرشتے سے کہا۔ کہ دروازہ کھول دے۔ اُس نے کہا تم کون ہو؟ وہ بولے میں جبرائیل ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ جبرائیلؑ نے کہا ہاں میرے ساتھ محمدؐ ہیں۔ پھر اُس نے کہا۔ کیا وہ بلائے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر اس داروغہ نے دروازہ کھول دیا اور ہم اس آسمان پر چڑھے اور وہاں ایک اور شخص کو بیٹھے دیکھا جس کے دائیں طرف بھی ایک جماعت تھی۔ اور بائیں طرف بھی جب وہ شخص اپنی دائیں طرف دیکھتے تھے تو ہنس دیتے تھے اور بائیں طرف دیکھتے تھے تو رو دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔ "خوش آمدید" "اے میرے نیک بیٹے اور نیک پیغمبر"۔ میں نے جبرائیلؑ سے پوچھا۔ کہ یہ کون

ہیں۔ انہوں نے کہا۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور ان کے دائیں بائیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ ان میں دائیں طرف جنت والے اور بائیں طرف دوزخ والے ہیں۔ اس لیئے وہ دائیں طرف دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بائیں طرف دیکھ کر رو دیتے ہیں۔ پھر جبرائیل مجھے دوسرے آسمان پہ لے گئے۔ اور اس کے داروغہ سے کہا کہ دروازہ کھول دے۔ وہاں بھی سب وہی گفتگو ہوئی۔ جو پہلے آسمان پر ہوئی تھی۔ پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس آسمان پر میں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کو دیکھا۔ انہوں نے بھی مجھے کہا کہ خوش آمدید اے نیک بھائی اور نیک پیغمبر۔ پھر تیسرے آسمان پر سب وہی باتیں ہوئیں اور وہاں میں نے یوسف علیہ السلام کو پایا۔ انہوں نے بھی مجھے خوش آمدید کہا۔ اسی طرح چوتھے آسمان پر گیا جہاں ادریس علیہ السلام کو دیکھا۔ انہوں نے بھی مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر ہم پانچویں آسمان پر چڑھے وہاں حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ ان سے بھی وہی بات ہوئی۔ آگے چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے۔ انہوں نے بھی سلام اور خوش آمدید مجھے کہا۔ پھر ہم ساتویں آسمان پر گئے۔ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ خوش آمدید اے نیک پیغمبر اور اے نیک بیٹے۔ پھر جبرائیلؑ مجھے ایسے اونچے مقام پہ لے گئے جہاں مجھے قلموں کے لکھنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوا۔ وہاں سے میری امت پر ۵۰ نمازیں مقرر ہوئیں۔ اس کے بعد میں واپس ہوا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا تو انہوں نے پوچھا کہ اللہ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے۔ میں نے کہا پچاس نمازیں۔ موسیٰؑ نے کہا۔ آپ خدا کے حضور واپس جائیے اور ان کو کم کرائیے۔ آپ کی امت میں اس قدر عبادت کی طاقت نہیں ہوگی۔ اُن کے کہنے سے میں واپس ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا اس نے کچھ نمازیں کم کردیں۔ اور میں واپس ہوا۔ پھر جب میں موسیٰؑ کے پاس سے گذرا۔ تو میں نے کہا۔ کہ خدا تعالیٰ نے کچھ نمازیں معاف کردی ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا کہ آپ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جائیے آپ کی اُمت میں اتنی بھی طاقت نہیں ہوگی۔ میں پھر خدا کے حضور واپس گیا اور عرض کیا۔ وہاں سے پھر کچھ نمازیں معاف ہوگئیں۔ جب میں موسیٰ کے پاس پھر آیا

اور ذکر کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر جاؤ تمہاری امت میں اتنی بھی طاقت نہیں ہے۔ میں پھر اللہ تعالیٰ کے حضور گیا۔ اور عرض کیا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اچھا جاؤ کُل پانچ نمازیں تم پر فرض کی جاتی ہیں۔ اور یہ پانچ پچاس کے ہی برابر ہیں۔ میرے ہاں بات نہیں بدلی جاتی۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا۔ تو انہوں نے پھر مجھے واپس جانے کی صلاح دی۔ مگر میں نے کہا۔ بس اب نہیں۔ مجھے اپنے خدا سے زیادہ کہتے شرم آتی ہے۔ اس کے بعد جبرائیلؑ مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے۔ وہ ایک بیری کا درخت تھا جس پر طرح طرح کے رنگ چھائے ہوئے تھے اور میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ کیا تھے۔ پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا۔ وہاں میں نے موتیوں کی لڑیاں دیکھیں اور وہاں کی مٹی دیکھی جو مُشک کی طرح تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے نماز فرض کی تھی تو نماز کی دو دو رکعتیں تھیں۔ سفر میں بھی اور حضر میں بھی۔ پھر سفر کی نماز تو وہی رہی۔ مگر حضر کی نمازیں ظہر، عصر اور عشاء میں زیادتی کا حکم ہو گیا۔ اور دو دو کی جگہ چار چار رکعتیں مقرر ہو گئیں۔

دن کو معراج کا ایک حصّہ

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ فرمانے لگے کہ جب قریش نے معراج کی بابت مجھے جھوٹا کہا۔ تو میں کعبہ کے صحن میں کھڑا ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ وہ لوگ مجھ سے سوال کرتے جاتے تھے اور میں ان کو وہاں کی سب نشانیاں بتاتا جاتا تھا۔

دوزخی مجاہد

خیبر کی لڑائی میں مسلمانوں اور یہودیوں کے خوب خوب مقابلے ہوئے۔ ایک دن جب شام ہوئی۔ اور دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ آرام کے لئے واپس ہوئے تو اس دن ایک مسلمان کو دیکھا گیا کہ بڑی بہادری سے لڑا۔ اور اس نے بڑے دشمن قتل کئے۔ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ صبح جب آپؐ کے سامنے یہ ذکر ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ کہ وہ شخص تو دوزخی ہے۔ یہ سُن کر ایک مسلمان اس شخص کے پیچھے ہو لیا۔ اس دن بھی اس نے خوب جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ اور خود بھی سخت زخمی ہوا۔ جب وہ زخموں کے درد سے بیتاب ہوا تو اس نے اپنی تلوار کا قبضہ زمین میں رکھ کر اس کی نوک اپنے سینے میں رکھی اور زور سے جو اپنے تئیں دبایا تو تلوار اس کے کلیجہ میں گھس گئی اور وہ مر گیا۔ اس کی یہ خودکشی دیکھ کر وہ شخص جو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا بات ہے۔ اس نے کہا کہ وہ شخص جس کو آپؐ نے آج ہی فرمایا تھا۔ کہ وہ دوزخی ہے۔ اور لوگ اس بات سے حیران ہوئے تھے۔ وہ واقعی دوزخی ہی نکلا۔ میں آج اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا تھا۔ جب وہ سخت زخمی ہو گیا۔ تو اس نے اپنے تئیں خود ہلاک کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص بظاہر جنتیوں کے سے کام کرتا ہے مگر خدا کے نزدیک وہ دوزخی ہوتا ہے۔ پھر آپؐ نے بلالؓ سے فرمایا کہ اے بلال اُٹھ اور لوگوں کو پکار کر سُنا دے کہ جنت میں سوائے ایمان والے شخص کے کوئی داخل نہیں ہو گا۔ اور بعض وقت بے ایمان آدمی سے بھی اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرا دیا کرتا ہے۔

حضرت جعفرؓ

حضرت عبداللہؓ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ جنگِ موتہ میں ہم نے حضرت جعفرؓ کی لاش کو دیکھا۔ تو اس پر ۹۰ سے زیادہ نیزے اور تلوار کے زخم تھے۔ یہ جعفرؓ ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی تھے۔ (الفضل یکم جنوری ۱۹۲۹ء)

واللہ میں تو اپنی مُراد کو پہنچ گیا

جبارؓ نامی ایک صحابی اپنے مسلمان ہونے کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے کفر کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک مسلمان کو نیزہ مارا۔ وہ نیزہ اس کے جسم کے پار ہوگیا اور وہ مسلمان وہیں مرگیا۔ مگر نیزہ کھاتے ہی مرتے ہوئے اس کے مُنہ سے یہ کلمے نکلے۔ کہ "کعبہ کے رب کی قسم میں تو اپنی مُراد کو پہنچ گیا۔" یہ سُن کر حیران ہوا۔ کہ یہ اِس نے کیا کہا۔ پھر میں نے اور لوگوں سے اس کا مطلب پوچھا۔ اور سوال کیا۔ کہ ایک دن جب میں نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا اور اس میں کامیاب ہوگیا تو مرنے والا اُلٹا کہنے لگا کہ کامیاب مَیں ہوا۔ یہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے مجھے بتایا۔ کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں شہید ہوگیا اور خدا کے راستہ میں جان دینے کی سعادت مجھے مل گئی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہے۔ یہ سُن کر میرے دل پر اس بات کا نہایت ہی گہرا اثر ہوا۔ اور یہی بات میرے اسلام قبول کرنے کا باعث ہوگئی۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے خزیمہؓ نام۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت سے پہلے تجارت کے لئے نکلے۔ اور اسی قافلہ کے ساتھ مل گئے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کے لئے جارہے تھے۔ اس سفر میں خزیمہؓ کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور عادات دیکھنے کا خوب موقعہ ملا۔ آخر ایک دن انہوں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے محمدؐ! میں آپؐ میں ایسی خصلتیں دیکھتا ہوں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ ہی وہ نبی ہیں۔ جو عرب کی سرزمین سے پیدا ہوں گے۔ میں آپؐ کی تصدیق کروں گا اور جب آپؐ دعوے کریں گے تو آپؐ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ خزیمہؓ پھر سال ہا سال آپؐ سے نہیں ملے۔ فتح مکہ کے بعد وہ مسلمان ہو کر حاضر ہوئے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو دیکھ کر فرمایا "خوش آمدید اے سب سے پہلے مہاجر" خزیمہؓ نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ میں حاضر ہونے سے اس واسطے نہیں رُکا کہ مجھے کوئی شُبہ تھا۔ یا وہ بات جو میں نے آپ سے کہی تھی۔ اس سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ بلکہ میں تو آپ کو برابر مانتا تھا۔ اور قرآن پر یقین رکھتا تھا اور بتوں کا مُنکر ہو گیا تھا۔ مگر بات یہ ہوئی کہ ہمارے ملک میں پے در پے ایسے قحط پڑے کہ میں نکل نہ سکا۔

اسلام کے لئے فقیری اختیار کی (مکہ)

مصعبؓ بن زبیر صحابی کا خاندان بہت امیر تھا۔ وہ مکہ کے رہنے والے تھے۔ خود وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہنا کرتے تھے اور امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی طرح جب گھر سے باہر نکلتے تو بڑے ٹھاٹھ اور بانکپن کے ساتھ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی منادی کی۔ تو خدا نے اُن پر بھی فضل کیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ ان کی ساری برادری اور قوم پھر تو ان کی دشمن ہو گئی۔ اور وہ سب امیری ٹھاٹھ خاک میں مل گئے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو اس حال میں دیکھا۔ کہ صرف ایک پُرانی چادر اُن کے بدن پر تھی۔ اور اس میں بھی کئی پیوند چمڑے کے لگے ہوئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ کو ان کا وہ زمانہ بھی یاد آگیا جب وہ امیرانہ حالت میں رہا کرتے تھے اور آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

خُدا کا عاشق

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پچھلی رات کے وقت دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے غائب ہیں۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ وہ باہر نکلیں اور دیکھتے دیکھتے قبرستان تک پہنچ گئیں۔ وہاں کیا دیکھتی ہیں کہ آپؐ زمین پر چادر کی طرح پڑے ہیں اور اللہ تعالےٰ کو مخاطب کر کے یہ فرما رہے ہیں کہ سَجَدَتْ لَکَ رُوْحِیْ وَجَنَانِیْ (یعنی میری جان و دل تیرے آگے سجدے میں گرے ہوئے ہیں) حضرت عائشہ رضؓ یہ حالت دیکھ کر دبے پاؤں وہاں سے چلی آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عشق کی حالت دیکھ کر مکہ کے کافر بھی کہا کرتے تھے کہ عَشِقَ مُحَمَّدٌ رَبَّہٗ۔ یعنی محمدؐ تو اپنے خدا کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ

(یہ واقعہ حضرت مسیح موعود کی زبان سے سُننے میں آیا ہے)

آپؐ کی سخاوت اور احسان

صفوان نامی ایک شخص مکہ کے شرفاء میں سے تھے۔ وہ فتح مکہ تک آپؐ کے سخت دشمن تھے۔ جب مکہ فتح ہو گیا۔ تو اس کے کچھ دن بعد وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال دینا شروع کیا۔ اور اتنا دیا کہ میرے دل سے آپؐ کی سب دشمنی نکل گئی۔ پھر آپؐ مجھے برابر دیتے رہے یہاں تک کہ آخر میرے دل میں سب سے زیادہ آپؐ کی محبت ہو گئی۔ (اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھی ہے۔ کہ اے مسلمانو آپس میں تحفے دیتے رہا کرو۔ تاکہ محبت بڑھے)

توتم بھی مجھے مار لو

عبداللہؓ ایک صحابی بیان کرتے ہیں۔ کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے دن اونٹ پر سوار دیکھا۔ میں بڑھتا بڑھتا آپؐ کے پاس پہنچا۔ اور محبت کے مارے آپؐ کے پیروں سے لپٹ گیا۔ آپؐ کے ہاتھ میں اس وقت ایک کوڑا تھا۔ اتفاقاً وہ مجھے لگ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ۔ مجھے اس چوٹ کا قصاص (بدلہ) ملنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً وہ کوڑا دے دیا تھا اور فرمایا۔ کہ توتم بھی مجھے مار لو۔ میں نے آپ کی پنڈلی اور قدموں کو بوسہ دیا۔ اور آنکھوں سے لگایا اور اس طرح سے اپنا بدلہ لے لیا۔

حیوانوں پر آپ کا رحم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ جانور کے بدن میں سے گوشت کاٹ لینے کو حرام فرمایا ہے۔ اسی طرح باندھ کر کسی جانور پر نشانہ بازی کرنے کو منع کیا ہے۔ اسی طرح جانوروں کو آپس میں لڑانے کو منع فرمایا ہے۔ نیز فرمایا ہے کہ گھوڑوں کی دُم اور ایال نہ کاٹو۔ ایال تو ان کا لحاف ہیں۔ اور دم ان کا مورچھل جس سے مچھر مکھی وغیرہ اُڑاتے ہیں۔

خُدا تو بہت سارے تھے۔ مگر دُعا پھر بھی قبول نہ ہوتی تھی

حضرت عروہؓ صحابی نے ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں کئی خداؤں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ان سے دُعائیں بھی مانگا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ہماری دُعائیں قبول نہ ہوتی تھیں۔ پھر خدا نے اپنے فضل سے حضورؐ کو ہماری طرف بھیجا۔ اور ہم کو ان سب بے برکت خداؤں سے نجات دی۔

بادشاہ دوجہاں کا ترکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت نہ کوئی روپیہ چھوڑا۔ نہ پیسہ۔ نہ کوئی لونڈی نہ غلام۔ آپؐ کی ملکیت میں سے اس وقت صرف ایک سفید خچر تھا۔ جو باقی رہا۔ یا کچھ ہتھیار۔ ان میں سے بھی ایک زرّہ ایک یہودی کے ہاں گروی پڑی تھی۔

نہ بخیل نہ جھوٹا نہ بُزدل

حُنین کی جنگ سے واپسی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف چلے آ رہے تھے کہ یکایک بہت سے گنوار بدوؤں نے آپؐ کو گھیر لیا۔ اور آپؐ سے مانگنے لگے۔ یہاں تک کہ آپؐ کو ایک درخت کے نیچے لے گئے۔ اور آپؐ کی چادر کھینچنے لگے۔ آپ اس وقت سوار تھے۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا۔ کہ میری چادر چھوڑ دو۔ کیا تم مجھے بخیل سمجھتے ہو۔ خدا کی قسم اگر اس جنگل کے کانٹوں کے برابر میرے پاس بکریاں ہوں۔ تو میں سب کی سب تم لوگوں کو دے دوں۔ اور تم مجھے بخیل نہ پاؤ گے۔ نہ جھوٹ بولنے والا۔ نہ بُزدل۔

بیٹیوں والے کو تسلّی

اَوسؓ نام ایک انصاری آپؐ کے پاس ایک دفعہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرہ پر رنج و غم کے آثار دیکھے۔ فرمایا کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ میری کئی لڑکیاں ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا دل غمگین رہتا ہے۔ اور میں تو ان کی موت کی دعا مانگتا رہتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَوس! تم ایسی بددُعا نہ کیا کرو۔ دیکھو لڑکیوں میں بھی برکت ہوتی ہے۔ یہی لڑکیاں نعمت کے وقت شُکر کرنے والی مصیبت کے وقت تمہاری ہمدردی میں رونے والی اور تمہاری بیماری کے وقت تیمارداری اور خدمت کرنے

والی ہوتی ہیں۔ ان کا بوجھ زمین پر ہے۔ اور ان کی روزی اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے۔ پھر تم کیوں ناحق رنج کرتے ہو۔

حضرت خبابؓ پر ظلم

حضرت خبابؓ مکہ میں شروع اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ ایک عورت کے غلام تھے۔ اور لوہاری کا کام کیا کرتے تھے۔ ان کو بھی خدا کے راستہ میں سخت سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ سب سے پہلے گھر سے باہر کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ وہ یہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، خبابؓ، صہیبؓ، بلالؓ، عمارؓ عمار کی والدہ اور والد۔ حضرت ابوبکرؓ کے سوا باقی یہ لوگ یا تو غلام تھے یا پیشہ ور تھے اور تھے بھی ادنیٰ درجے کے۔ اس لئے ان پر بڑے بڑے ظلم توڑے جاتے تھے۔ ان کو لوہے کی زرہیں پہنائی جاتی تھیں۔ اور چلچلاتی دھوپ میں لٹایا جاتا تھا اور ان پر پتھر رکھے جاتے۔ گلے میں رسیاں باندھ کر زمین پر گھسیٹا جاتا۔ لوہا گرم کر کے بدن کو داغ دیئے جاتے۔ مگر یہ لوگ استقلال سے اسلام پر قائم تھے۔ حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تکلیفوں کی شکایت کی۔ آپؐ کعبہ کے سایہ میں اپنی چادر پر لیٹے تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ۔ آپؐ ہمارے لئے خدا سے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ آپؐ یہ سن کر اُٹھ بیٹھے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا اور فرمانے لگے۔ تم سے پہلی اُمتوں میں جو ایمان والے گذر چکے ہیں۔ ان کی تو یہ حالت تھی۔ کہ ایک کو پکڑ کر زمین کھود کر آدھا گاڑ دیتے تھے۔ اور پھر آرہ سے اُسے لکڑی کی طرح چیر ڈالتے تھے۔ مگر وہ اپنے دین پر قائم رہتے تھے۔ اور کسی کا گوشت لوہے کی کنگھیوں سے ادھیڑا جاتا تھا۔ اور وہ کنگھیاں اس کی ہڈیوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ مگر وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ اس دین کو بھی یقیناً غلبہ دیگا۔ یہاں تک کہ ایک سوار عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

چلا جائے گا۔ اور ایسا امن ہو گا۔ کہ اسے خدا کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہو گا۔ اور یہ جو بھیڑیئے (انسان) تم کو نظر آتے ہیں۔ یہ بکریوں کی حفاظت کریں گے۔ مگر تم لوگ جلدی کرتے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان خبابؓ کی دکان پر کبھی کبھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور ان سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ جب خباب کی مالکہ کو یہ خبر ملی۔ تو وہ لوہا گرم کر کے ان کے سر پر رکھا کرتی۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حال سنایا۔ حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ خباب کی مدد کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ خبابؓ کی مالکہ کے سر میں ایسی مرض پیدا ہو گئی۔ کہ وہ کتوں کی طرح بھونکتی رہتی تھی۔ حکیموں نے یہ نسخہ تجویز کیا۔ کہ اس کے سر پر داغ دیئے جائیں۔ چنانچہ خباب بھی لوہا گرم کر کے اس کے سر کو داغ دیتے رہتے تھے۔ (یہ خدائی انتقام تھا)

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک دن ان سے پوچھا۔ کہ اے خبابؓ سناؤ تمہیں مکہ کے کافروں سے کیا کیا تکالیف پہنچا کرتی تھیں۔ خبابؓ بولے۔ اے امیر المومنینؓ میری پیٹھ دیکھ لو۔ حضرت عمرؓ نے دیکھ کر کہا کہ میں نے آج تک ایسی پیٹھ کسی کی نہیں دیکھی۔ خباب کہنے لگے۔ کہ آگ روشن کی جاتی تھی۔ اور اس دھکتی آگ پر وہ لوگ مجھے لٹا دیتے تھے۔ اور پکڑ کر دبائے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ میری چربی پگھل کر آگ کو بجھا دیتی تھی۔ (اب اے پڑھنے والے یہ حال سن کر سچ سچ بتا کہ لوگ جو اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام زبردستی اور تلوار کے زور سے پھیلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جبریہ مسلمان بناتے تھے کیا یہ اعتراض ٹھیک ہے؟ تم فوراً بول اٹھو گے کہ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہی ہے۔ کہ جو شخص بھی مسلمان ہوتا تھا وہ اپنے دل کی محبت اور خدا پر ایمان لا کر مسلمان ہوتا تھا۔ کیا خبابؓ جیسے لوگ زبردستی مسلمان کئے جا سکتے تھے؟)

گھر کے کام کاج سے عار نہ تھی

ایک دفعہ بعض لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں کیا کیا کرتے تھے۔ ان کا شائد خیال ہوگا۔ کہ گھر میں نفل ہی پڑھتے رہتے ہوں گے حضرت عائشہؓ بولیں۔ کہ گھر کا کام کاج کیا کرتے تھے۔ اور کیا کرتے تھے (کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے تھے۔ دودھ دوہ لیا کرتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خرید کر لاتے تھے۔ جوتی پھٹ جاتی تو خود ہی گانٹھ لیا کرتے تھے۔ ڈول کو سی لیا کرتے تھے۔ اُونٹ کو باندھنا چارہ دینا۔ آٹا تک گوندھ لینا۔ غرض سب کام گھر کے کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں عورتوں کو وعظ ونصیحت بیویوں کی دلداری۔ سوال کرنے والیوں کو مسئلے بتانا اور صدقہ خیرات وغیرہ کرنا۔ یہ سب کچھ ہوا کرتا تھا۔)

اپنی ذات کے لئے کبھی بدلہ نہیں لیا

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کبھی عمر بھر اپنے نفس کی خاطر کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ ہاں کوئی سزا کسی شریعت کے جرم کی ہوتی تھی تو وہ دیا کرتے تھے

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن

حضرت عائشہؓ سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا حال بتائیے۔ حضرت عائشہؓ بولیں کہ بس اتنا یاد رکھو کہ آپؐ کا خلق قرآن تھا (یعنی جو باتیں قرآن میں منع ہیں۔ وہ آپؐ میں نہ تھیں اور جن کا حکم ہے وہ سب آپؐ کیا کرتے تھے)۔

آپؐ کی وعدہ وفائی

ایک صحابی (عبداللہ بن ابی الحماء) بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے دعویٰ نبوت سے پہلے ایک معاملہ خرید و فروخت کا کیا۔ اس دوران میں مَیں نے کہا کہ اے محمدؐ آپؐ یہیں ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا مگر میں وہاں سے جاکر اس وعدہ کو بھُول گیا۔ پھر تین دن کے بعد وہاں آیا۔ تو آپؐ کو اس جگہ موجود پایا۔ آپؐ نے مجھ پر کچھ اظہار غصہ یا ناراضگی کا نہ فرمایا۔ صرف اتنا کہا۔ کہ اے جوان تم نے مجھے تکلیف دی میں اس جگہ تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

ستر پوشی

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں جنگل میں فضلائے حاجت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور وہاں مِل جُل کر پاس پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے ننگا ہوتا کوئی عیب نہ تھا۔ اور سارے جہان کی باتیں وہاں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو بھی بند کیا۔ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ اس بات سے ناراض ہوتا ہے۔

سخت مصیبت کے وقت عہد کی پابندی

ہجرت کے ایک سال کے بعد ابوحذیفہ اور ابوحسل دو مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف آنے لگے۔ قریش نے ان کو روکا۔ مگر انہوں نے جانے پر اصرار کیا۔ آخر ان کو اس اقرار پر جانے دیا۔ کہ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دیں۔ جب یہ لوگ روانہ ہو کر بدر کے مقام پر پہنچے۔ تو وہاں دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے تھے اور لڑائی تیار تھی۔ انہوں نے اپنا حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم عہد کر کے آئے ہو۔ تو

بہر حال اپنا عہد پورا کرو۔ ہم لوگ عہد شکن نہیں ہیں۔ باقی رہا مدد کا سوال۔ سو ہم کو خدا کی مدد کافی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں صحابی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔ حالانکہ موقعہ ایسا نازک تھا۔ کہ دنیا کے لوگ سارے عہد وپیمان ایسے اوقات میں بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

بہادری کا باپ (بدر)

حضرت زبیرؓ صحابی کہتے ہیں۔ کہ بدر کے دن کافروں میں ایک بہادر سردار تھا۔ اس کا نام عُبیدہ تھا۔ وہ سر سے پیر تک لوہے میں غرق تھا۔ صرف آنکھوں کے سوراخ کُھلے تھے۔ وہ میدان میں آکر للکارا۔ اور کہا ہے کوئی جو میرے مقابلہ کو نکلے۔ میں بہادری کا باپ ہوں۔ (ابو ذات الکرش) حضرت زبیرؓ کہتے ہیں۔ میں اس کے مقابلہ کو نکلا۔ اور اس پر نیزہ کا وار کیا۔ اور ایسا تاک کر اس کی آنکھ میں نیزہ مارا۔ کہ دماغ میں گُھس گیا اور وہ کم بخت اُسی وقت گر کر مر گیا۔ مگر میرا نیزہ اس کے سر میں ایسا پھنسا کہ میں نے بڑی مشکل سے ہلا ہلا کر اسے نکالا اور نیزہ دونوں طرف سے ٹیڑھا ہو گیا پھر یہ نیزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیرؓ سے مانگ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بطور یادگار سب خلفاء کے پاس رہا۔

مطعم بن عدی کی شکر گذاری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق ایک دن فرمایا۔ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا۔ اور ان کم بختوں کی سفارش کرتا۔ تو میں اس کے کہنے سے سب کو چھوڑ دیتا۔

(یہ مطعم وہ شخص تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف سے واپسی کے وقت اپنی پناہ میں مکّہ کے اندر لایا تھا)

(الفضل ۸ جنوری ۱۹۲۹ء)

بنو قریظہ کی ناشکری

جب بنو نضیر اور بنو قریظہ یہودیوں نے آپ کے برخلاف سازش اور جنگ کی تو بنو نضیر تو شکست کھا کر جلاوطن ہو گئے مگر بنو قریظہ وہیں رہے۔ اور آپؐ نے اُن پر یہ احسان کیا کہ بنو نضیر کی زمینیں بھی ان کو دے دیں۔ مگر خندق کی لڑائی کے وقت ان بدبختوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے برخلاف شرارتیں کیں۔ اور جنگ کی تیاری کی۔ اس پر آپؐ نے مجبوراً ان سے لڑائی کی۔ اور ان کو شکست دی۔ پھر ان کے اپنے فیصلہ کے مطابق۔ ان کے سپاہی مارے گئے۔ اور مال اسباب عورتیں بچے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ ان لوگوں میں جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو آپ نے امن دے دیا۔ پھر مدینہ کے باقی سب یہود کو بھی آپؐ نے ان کی باربار کی شرارتوں کی وجہ سے وہاں سے جلاوطن کر دیا۔ اور وہ خیبر کی طرف چلے گئے۔

نجران کے عیسائیوں کا قصہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عاقبؔ اور سیّد نجران کے عیسائیوں کے سردار حاضر ہوئے۔ پہلے ان کا ارادہ ہوا۔ کہ آپ اور وہ لوگ ایک دوسرے کے لئے بددعا کریں۔ کہ جو جھوٹا ہو وہ ہلاک ہو جائے۔ مگر ایک ان میں سے کہنے لگا کہ بھائی اگر یہ شخص سچا نبی ہے اور ہم نے اس سے مباہلہ کیا۔ تو ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ پھر ان دونوں نے صلاح کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ ہم لوگ آپؐ کے فرمانے کے مطابق جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔ ہم مباہلہ نہیں کرتے۔ آپ ہمارے ساتھ کسی امانت دار شخص کو بھیج دیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں میں تمہارے ساتھ نہایت امانت دار آدمی کو کر دوں گا۔ یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا۔ کہ اے ابوعبیدہ بن جراح اٹھو اور ان کے ساتھ جاؤ۔

حجۃ الوداع کا خطبہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں یہ خطبہ پڑھا کہ زمانہ پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا ہے (یعنی مشرک جو مہینے آگے پیچھے کر لیتے تھے اور سال کا حساب غلط کر دیتے تھے۔ وہ بات اب موقوف کی جاتی ہے) سال کے بارہ مہینے ہیں۔ اور ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ جن میں جنگ وغیرہ کرنی حرام ہے۔ ان چار مہینوں میں تین تو لگاتار ہیں۔ یعنی ذلقعدہ، ذالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ یہ کونسا مہینہ ہے۔ ہم نے عرض کیا۔ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی خوب جانتے ہیں۔ آپ کچھ دیر خاموش ہو گئے۔ جس سے ہم نے خیال کیا۔ کہ اب اس کا نام بدل کر کوئی اور نام رکھیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کیا اس شہر کا نام مکہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا۔ کہ بیشک یہی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کہ یہ کون سا دن ہے۔ ہم نے عرض کیا۔ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی خوب جانتے ہیں۔ آپؐ خاموش ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا۔ کہ آپؐ اس کا کوئی اور نام تجویز کریں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ کیا یہ قربانی والا دن نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہؐ تو آپؐ نے فرمایا۔ کہ سن لو تمہارے خون اور مال اور عزت ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے کہ اس دن کی حرمت اس شہر اور اس مہینے میں اور دیکھو تم سب اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ اور وہ تم سے تمہارے عملوں کی بازپرس کرے گا۔ کہیں ایسا نہ کرنا کہ ایک دوسرے کی گردن مار کر گمراہ ہو جاؤ۔ سن لو جو لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ سننے والے کی نسبت وہ شخص بات کو زیادہ سمجھتا ہے جسے بعد میں خبر پہنچے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں ایک شخص عدنان[۱] گذرے ہیں۔ ان سے معدؔ[۲] پیدا ہوئے۔ اور معد سے نزار[۳] اور نزار سے الیاس[۴] اور الیاس سے مدرکہ[۵] اور مدرکہ سے خزیمہ[۶] اور خزیمہ سے کنانہ[۷] اور کنانہ سے نضر[۸] اور نضر سے مالک[۹] اور مالک سے فہر[۱۰] اور فہر سے غالب[۱۱] اور غالب سے لوئی[۱۲] اور لوئی سے کعب[۱۳] اور کعب سے مرہ[۱۴] اور مرہ سے کلاب[۱۵] اور کلاب سے قصی[۱۶] اور قصی سے عبد مناف[۱۷] اور مناف سے ہاشم[۱۸]۔ ان ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب[۱۹] تھے۔ اور عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ[۲۰] تھے۔ اور عبداللہ کے بیٹے محمد[۲۱] تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں پہلے پہل وحی نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ ۱۳ برس تک مکہ میں رہے پھر آپؐ نے ہجرت کی۔ ہجرت کے بعد آپؐ مدینہ میں دس برس زندہ رہے اور وفات کے وقت آپؐ کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹنا (مکہ)

لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں سب سے بڑی تکلیف کیا پہنچی تھی۔ انہوں نے بیان کیا۔ کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ نے آکر اپنی چادر آپؐ کے گلے میں ڈال دی پھر اُسے مروڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ چادر آپ کے گلے میں پھانسی کی طرح ہوگئی۔ وہ ظالم

اُسے اور چکر دیتا رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ کا دم بند ہوگیا۔ اور قریب تھا کہ آپؐ مرجائیں۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اس وقت وہاں تھے۔ انہوں نے اس کم بخت کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اور بمشکل آپ کو چھڑایا۔ اور قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ "کیا تم اس شخص کو صرف اس قصور پر قتل کرتے ہو کہ وہ صرف اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے۔" (أتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ)

جناب ابوطالب کو امداد کا ثواب

ایک دفعہ حضرت عباسؓ آپؐ کے چچا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا آپؐ کی وجہ سے آپ کے چچا ابوطالب کو بھی کوئی ثواب ہوگا۔ کیونکہ وہ آپؐ کی حمایت کیا کرتے تھے۔ اور آپؐ کی خاطر لوگوں سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں ان پر اتنی تھوڑی تکلیف ہے کہ جہنم کا عذاب صرف ان کے ٹخنوں تک ہے۔ اگر وہ میری امداد نہ کرتے تو دوزخ کے سب سے نچلے درجہ میں ہوتے۔ مگر جہنم کی آگ ٹخنے تک کی بھی ایسی سخت ہوگی۔ کہ اس کی گرمی سے ان کا دماغ کھولنے لگے گا۔

ابوجہل کا تکبر

بدر کے دن فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی جاکر ابوجہل کا حال تو دیکھو۔ اس پر ابن مسعودؓ اس کی تلاش میں نکلے دیکھا کہ اسے معاذ اور معوذ نے قتل کردیا تھا۔ مگر ابھی ذرا سا دم باقی تھا۔ ابن مسعودؓ نے اس سے کہا کہ کیوں جناب آپ ہی ابوجہل ہیں نا۔ اس نے کہا ہاں۔ اس پر ابن مسعودؓ نے اس کی داڑھی پکڑلی وہ بولا کیا آج مجھ سے بھی بڑا کوئی آدمی مارا گیا ہے؟ ابن مسعودؓ اس کی گردن کاٹنے لگے۔ تو کم بخت بولا کہ لمبی گردن رکھ کر سر کاٹنا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو۔ کہ میں سب کا سردار ہوں۔ ابن مسعودؓ نے کہا کہ تیری یہ حسرت بھی

پوری نہ ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے سر کو اس طرح کاٹا کہ گردن بالکل اس کے ساتھ نہ تھی اور اسے
لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ
اس امت کا فرعون تھا۔ (بلکہ فرعون سے بدرجہا زیادہ شقی۔ کیونکہ فرعون تو جب ڈوبنے لگا
تو اس کا تکبر سب ہوا ہوگیا۔ اور دم کہنے لگا۔ کہ میں موسیٰ کے رب پر ایمان لایا۔ مگر یہ ابوجہل
مرتے مرتے بھی تکبر کے مارے کہتا تھا۔ کہ ذرا لمبی گردن رکھ کے کاٹنا۔ فرعون تو دریا میں غرق
ہوا۔ مگر ابوجہل بدر کے کنویں میں غرق کیا گیا)۔

بدر کے بعد کفار کے مُردوں کو خطاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں فتح کے بعد تین دن تک ٹھہرے۔ تین دن کے بعد
آپؐ سوار ہوئے اور اس کنویں کے کنارے پر تشریف لائے۔ جہاں کفار کی لاشوں کو ڈلوا دیا تھا۔
وہاں کھڑے ہوکر آپؐ نے نام بنام ایک ایک سردار کو پکارا۔ اور کہا کہ کیا تمہیں یہ آسان نہ تھا۔
کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مان لیتے ہم سے تو جو وعدہ ہمارے رب نے کیا تھا۔ وہ سچا
ہوگیا۔ کیا تم نے بھی آگے جاکر اپنے رب کا وعدہ سچا پایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہؐ!
کیا یہ مُردے سنتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا گواہ ہے یہ مُردے اس وقت زندوں سے زیادہ
میری بات سُن رہے ہیں۔

جنگِ بدر میں جو صحابہؓ شریک ہوئے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے
زیادہ فضیلت والا فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارہ میں فرمایا ہے
کہ اے اہلِ بدر اب جو چاہو کرو۔ میں نے تمہیں بخش دیا۔

جو مسلمان بدر میں شریک ہوئے تھے ان کو بدری کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک عبرتناک خواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی عادت تھی کہ صبح کی نماز پڑھ کر جانماز پر ہی سورج نکلنے تک بیٹھے رہتے۔ کبھی تو حاضرین اپنے حالات اور جاہلیت کے زمانہ کی باتیں سناتے۔ اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم خود لوگوں سے پوچھا کرتے کہ اگر تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ تو بیان کرے۔ اس پر اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا۔ تو وہ آپؐ کو سناتا۔ اور آپؐ اس کی تعبیر فرماتے۔ ایک دن آپؐ نے اسی طرح پوچھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ کہ آج ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ وہ یہ کہ میرے پاس دو آدمی آئے اور مجھے ایک جگہ لے گئے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہے اور دوسرا کھڑا ہے۔ جو کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک سیخ ہے۔ وہ اس سیخ کو بیٹھے ہوئے آدمی کے جبڑے میں اس زور سے گھسیٹتا ہے کہ اس کی گدی تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر نکال کر دوسرے جبڑے کی طرف یہی عمل کرتا ہے۔ اور برابر اسی طرح عذاب دیئے جاتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے۔ تو ان دونوں نے بیان کیا۔ کہ یہ ایسا آدمی ہے جو جھوٹی باتیں مشہور کیا کرتا تھا۔ اور ہوتے ہوتے اس کی باتیں دنیا بھر میں مشہور ہو جاتی تھیں اور یہ اس کی سزا ہے۔

پھر ہم آگے چلے تو دیکھا کہ ایک شخص چت لیٹا ہے اور ایک دوسرا آدمی اس کے سرہانے پتھر لئے کھڑا ہے۔ اور زور سے اس کے سر پہ پتھر مارتا ہے۔ جب پتھر لڑھک کر پرے جا پڑتا ہے۔ تو وہ مارنے والا پھر اسے اٹھا کر لاتا ہے۔ اور جب تک وہ آئے اس شخص کے سر کا زخم اچھا ہو جاتا ہے۔ واپس آکر پھر وہ اسی طرح سر پہ پتھر مارتا ہے۔ غرض اسی طرح ہوتا رہتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کہ یہ کیا ہے۔ تو میرے ساتھیوں نے کہا۔ کہ یہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا تھا۔ مگر یہ نہ رات کو قرآن پڑھتا۔ نہ دن کو اس پہ عمل کرتا تھا۔ اب اس کو برابر یہی سزا ہوتی رہے گی۔

پھر ہم آگے چلے۔ تو ایک غار دیکھا۔ جس کا منہ تنگ تھا۔ مگر اندر اس کے بہت جگہ تھی۔ اس میں آگ جل رہی تھی اور اس آگ میں ننگے مرد اور ننگی عورتیں جل رہی تھیں جب آگ زور سے بھڑکتی۔ تو وہ لوگ اس کے شعلوں کے ساتھ اُچھلتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ یہ بدکار لوگ ہیں۔ پھر ہم آگے چلے۔ تو دیکھا کہ ایک خون کی نہر ہے۔ جس کے بیچ میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ اور ایک آدمی اس کے کنارے پر کھڑا ہے۔ کنارے والے آدمی کے پاس بہت سے پتھر رکھے تھے۔ جب اندر والا آدمی باہر نکلنا چاہتا تو باہر والا پتھر کھینچ کر اس کے منہ پر مارتا۔ جس سے وہ پھر بیچ میں جا پڑتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے۔ جواب ملا کہ یہ سود کھانے والا شخص ہے۔ پھر ہم آگے گئے۔ تو ایک نہایت سرسبز باغ میں پہنچے۔ اس میں ایک بڑا بھاری درخت تھا۔ اور اس درخت کی جڑ میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کے گرد بہت سے بچے بھی تھے۔ اور درخت کے پاس ہی بیٹھا ہوا ایک اور شخص آگ دہکا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ کہ یہ کون ہیں۔ جواب ملا۔ کہ یہ بزرگ حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ اور بچے جو ان کے گرد ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جو چھوٹی عمر میں معصوم مر گئے ہیں۔ اور یہ شخص جو آگ دہکا رہا ہے۔ یہ دوزخ کا داروغہ مالک نام ہے۔

پھر میرے دونوں رفیق مجھے ایک درخت پر چڑھا لے گئے۔ اُوپر جا کر میں نے ایک گھر دیکھا۔ وہ مجھے اندر لے گئے وہاں بہت سے جوان مرد اور عورتیں اور بچے تھے۔ پھر اس گھر سے نکل کر مجھے درخت کی دوسری شاخ پر لے گئے۔ وہاں بھی ایک گھر تھا۔ اور بہت شاندار اور خوبصورت تھا۔ اور اس میں بہت سے بڈھے اور جوان تھے۔ میں نے پوچھا یہ گھر کیسے ہیں۔ میرے ساتھیوں نے کہا۔ کہ پہلا گھر تو عام جنتیوں کا ہے۔ اور دوسرا شہیدوں کا۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم دونوں شخص کون ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم جبرائیل اور میکائیل ہیں۔ اور انہوں نے مجھے کہا۔ کہ ذرا اپنا سر اٹھا کر دیکھئے تو میں نے دیکھا کہ بادل کی طرح اوپر کوئی چیز ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ میں نے کہا ذرا مجھے اس

میں لے چلو۔ انہوں نے کہا ابھی آپ کی زندگی کچھ باقی ہے۔ اگر باقی نہ ہوتی تو آپ اسے دیکھ لیتے۔

ایک پہیلی (مدینہ)

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ درختوں میں ایک ایسا درخت ہے۔ جس کے پتّے نہیں گرتے۔ اور وہ مومن سے مشابہ ہے۔ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔ تو حاضرین مختلف جنگلی درختوں کے نام لینے لگے۔ آخر نہ بتا سکے تو عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ آپ ہی بتا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ کھجور کا درخت ہے۔ حضرت عمرؓ کے لڑکے عبداللہ بھی اسی مجلس میں تھے۔ انہوں نے گھر میں آکر اپنے والد سے کہا۔ کہ میرے دل میں بھی کھجور کا درخت ہی تھا۔ مگر بڑے بڑے آدمیوں کی شرم کی وجہ سے میں بول نہ ہو سکا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بیٹا اگر تم اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی پہیلی بوجھ دیتے تو مجھے بہت ہی خوشی ہوتی۔

بچوں سے مذاق

ایک صحابی کہتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ جب میری عمر ۵ برس کی تھی تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے گیا۔ آپ اس وقت ایک ڈول میں سے پانی پی رہے تھے۔ پانی پی کر آپؐ نے ایک کلّی بھر کر ہنسی سے میرے منہ پر ماری۔

بچوں کے کام کی باتیں

ایک دفعہ ابن مسعودؓ صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ اچھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے۔ انہوں نے عرض کیا۔ اس کے دوسرے درجہ پر فرمایا کہ ماں باپ کی فرمانبرداری۔

صفائی پسندی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرمایا کرتے تھے ۔کہ ہر شخص جمعہ کے دن نہائے مسواک کرے ۔صاف کپڑے پہنے ۔خوشبو لگائے ۔پھر مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے جائے ۔

کیا میں اپنے خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں

مغیرہؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں اتنی اتنی دیر تک عبادت کرتے رہتے تھے کہ آپؐ کے پیر کھڑے کھڑے سوج جایا کرتے تھے ۔جب لوگ عرض کرتے کہ حضور اتنی تکلیف نہ اٹھائیں ۔ اللہ تعالےٰ نے تو آپ کو بخش دیا ہے یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ۔تو کیا میں اپنے خدا کا شکر گزار بندہ بھی نہ بنوں ؟

شرم وحیا ایمان کی نشانی ہے

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا ایک انصاری اپنے چھوٹے بھائی پر خفا ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ۔کہ بھلے مانس تو اتنی شرم کیوں کرتا ہے ۔آپ نے فرمایا ۔یہ کیوں کہتے ہو ۔شرم وحیا تو بہت اچھی چیز ہے ۔بلکہ ایمان کی نشانی ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو شہادت کا شوق

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہؓ کے سامنے بیان کیا ۔کہ میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ خدا کے رستے میں مارا جاؤں ۔پھر زندہ کیا جاؤں ۔پھر مارا جاؤں ۔غرض اسی طرح ہمیشہ قربان ہوتا رہوں ۔

(روزنامہ الفضل ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء)

صحابہؓ کی رائے آپ کے جمال کی بابت

براءؓ :۔ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی حسین وجمیل نہیں دیکھا۔

ابوہریرہؓ :۔ کہتے ہیں۔ مَیں نے ساری عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خولصورت کوئی شخص نہیں دیکھا۔ آپ کا چہرہ سورج کی طرح نورانی تھا۔ اور جب آپؐ ہنستے تو دیواروں پر چمک معلوم ہوتی تھی۔

جابرؓ :۔ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مُبارک چاند کی طرح نورانی تھا۔ آپ جس گلی کوچہ سے نکل جاتے تھے۔ وہ معطر ہو جاتا تھا۔

اُمّ معبدؓ :۔ صحابیہ کہتی ہیں۔ کہ آپؐ غور سے دیکھنے میں سب سے زیادہ خوش اندام معلوم ہوتے اور پاس سے دیکھنے میں سب سے زیادہ حسین۔

حضرت علیؓ :۔ فرماتے ہیں۔ جو آپ کو پہلے پہل دیکھتا۔ تو مرعوب ہو جاتا۔ اور جو ملتا جلتا رہتا۔ وہ آپ سے محبت کرنے لگتا۔ میں نے نہ آپؐ کی زندگی میں اور نہ آپؐ کے بعد کسی کو ایسا حسین وجمیل دیکھا۔

انسؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کی خوشبو سے زیادہ نہ کسی مشک میں خوشبو پائی نہ عنبر میں۔ نہ کسی اور چیز میں۔ اگر آپ کسی سے مصافحہ کرتے تو تمام دن اس شخص کو آپ کے مصافحہ کی خوشبو آتی رہتی اور اگر کسی بچہ کے سر پر ہاتھ پھیر دیتے تو خوشبو کے سبب وہ اور لڑکوں میں پہچانا جاتا۔

غرض حُسن وجمال کا یہ عالم تھا کہ خود بھی جب کبھی آئینہ دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے۔ اللھم کما احسنت خلقی فاحسن خلقی۔ یعنی اے اللہ جس طرح تو نے مجھے جسمانی طور پر حسین بنایا۔ اسی طرح تو میرے اخلاق بھی نہایت پسندیدہ بنا دے۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

باب ششم

حضرت مسیح موعود
(آپ پر سلامتی ہو)

وخاندان

ترے انوار سے روشن جہاں ہے

ترے انوار سے روشن جہاں ہے ترا فیضان بحرِ بیکراں ہے
تِری تعلیم کی حکمت عیاں ہے تِری تبلیغ مشہورِ زماں ہے
ترا روضہ ہے یا باغِ جناں ہے ترا مرکز ہے یا دارالاماں ہے
تِری اولاد رحمت کا نشاں ہے کوئی ساقی کوئی پیرِ مغاں ہے
ترا مداح خلاقِ جہاں ہے کہ تو اسلام کی رُح رواں ہے
ہر اک جانب یہی شور و فغاں ہے خبر لے اے مسیحا تو کہاں ہے

تجھے حق نے عطا کی کامرانی
بنی جاتی ہے دُنیا قادیانی

اُٹھا ۔ لے کر محمّد کے عَلَم کو کلامُ اللہ کی شانِ اَتم کو
دلائل سے ۔ دُعا سے معجزوں سے ہلا ڈالا عرب کو اور عجم کو
قلم کر دیں حریفوں کی زبانیں چلایا تو نے جب سیفِ قلم کو
اثر کیسا تھا تیرے مُبتھل میں گئے دشمن سبھی ملکِ عدم کو
ہزاروں رحمتیں تجھ پر خدا کی نشاں کیا کیا دکھائے تو نے ہم کو

ترے صدقے امامِ آسمانی
غلام احمد نبی قادیانی (بخارِ دل صـ۱۳۳)

شمائل حضرت مسیح موعود

احمدی تو خدا کے فضل سے ہندوستان کے ہر گوشہ میں موجود ہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی مگر احمد کے دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے احمدیوں میں بھی ایک فرق ہے۔ دیکھنے والوں کے دل میں ایک سرور اور لذت اس کے دیدار اور صحبت کی اب تک باقی ہے۔ نہ دیکھنے والے بارہا تاسف کرتے پائے گئے کہ ہم نے جلدی کیوں نہ کی اور کیوں نہ اس محبوب کا اصلی چہرہ اس کی زندگی میں دیکھ لیا۔ تصویر اور اصل میں بہت فرق ہے۔ اور وہ فرق بھی وہی جانتے ہیں جنہوں نے اصل کو دیکھا۔ میرا دل چاہتا ہے احمد (آپ پر سلامتی ہو) کے حلیہ اور عادات پر کچھ تحریر کردوں۔ شائد ہمارے وہ دوست جنہوں نے اس ذات بابرکات کو نہیں دیکھا حظ اُٹھاویں۔

حلیہ مُبارک

بجائے اس کے کہ میں آپ کا حلیہ بیان کردوں اور ہر چیز پر خود کوئی نوٹ دوں یہ بہتر ہے کہ میں سرسری طور پر اس کا ذکر کرتا جاؤں اور نتیجہ پڑھنے والے کی اپنی رائے پر چھوڑ دوں آپ کے تمام حلیہ کا خلاصہ ایک فقرہ میں یہ ہو سکتا ہے کہ

"آپ مردانہ حُسن کے اعلیٰ نمونہ تھے۔"

مگر یہ فقرہ بالکل نامکمل رہے گا اگر اس کے ساتھ دوسرا یہ نہ ہو کہ

"یہ حُسنِ انسانی ایک روحانی چمک دمک اور انوار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا"

اور جس طرح آپ جمالی رنگ میں اس امت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اسی طرح آپ کا جمال بھی خدا کی قدرت کا نمونہ تھا اور دیکھنے والے کے دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ آپ کے چہرہ پر نورانیت کے ساتھ رعونت ہیبت اور استکبار نہ تھے۔ بلکہ فروتنی، خاکساری اور محبت کی آمیزش موجود تھی چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ میں بیان کرتا ہوں کہ حضرت اقدس چولہ صاحب کو دیکھنے ڈیرہ بابا نانک تشریف لے گئے تو وہاں پہنچ کر ایک درخت کے نیچے سایہ میں کپڑا بچھا دیا گیا اور سب لوگ بیٹھ گئے۔ اس پاس کے دیہات اور خاص قصبہ کے لوگوں نے حضرت صاحب کی آمد سُن کر ملاقات اور مصافحہ کے لئے آنا شروع کیا۔ اور جو شخص آتا مولوی سید محمد احسن صاحب کی طرف آتا اور اُن کو حضرت اقدس سمجھ کر مصافحہ کر کے بیٹھ جاتا۔ غرض کچھ دیر تک لوگوں پر یہ امر نہ کھلا۔ جب تک خود مولوی صاحب موصوف نے اشارہ سے اور یہ کہہ کر لوگوں کو ادھر متوجہ نہ کیا۔ "حضرت صاحب یہ ہیں۔" بعینہ ایسا واقعہ ہجرت کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں پیش آیا تھا۔ وہاں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو رسولِ خدا سمجھ کر مصافحہ کرتے رہے جب تک کہ اُنہوں نے آپؐ پر چادر سے سایہ کر کے لوگوں کو ان کی غلطی سے آگاہ نہ کر دیا۔

جسم اور قد

آپ کا جسم دُبلا نہ تھا۔ نہ آپ بہت موٹے تھے۔ البتہ آپ دوہرے جسم کے تھے۔ قد متوسط تھا۔ اگرچہ ناپا نہیں گیا مگر اندازاً پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب ہوگا۔ کندھے اور چھاتی کشادہ اور آخر عمر تک سیدھے رہے نہ کمر جھکی نہ کندھے تمام جسم کے اعضاء میں تناسب تھا۔ یہ نہیں کہ ہاتھ بے حد لمبے ہوں یا ٹانگیں یا پیٹ اندازہ سے زیادہ نکلا ہوا غرض کسی قسم کی بدصورتی آپ کے جسم میں نہ تھی۔ جلد آپ کی متوسط درجہ کی تھی نہ سخت نہ کھُردری اور نہ ایسی ملائم جیسی عورتوں کی ہوتی ہے۔ آپ کا جسم پلپلا اور نرم نہ تھا بلکہ مضبوط اور

جوانی کی سی سختی لئے ہوئے۔ آخر عمر میں آپ کی کھال کہیں سے بھی نہیں لٹکی نہ آپ کے جسم پر جھریاں پڑیں۔

آپ کا رنگ

؎ رنگم چو گندم است و بمو فرق بین ست
زاں ساں کہ آمدست در اخبار سرورم

آپ کا رنگ گندمی اور نہایت اعلیٰ درجہ کا گندمی تھا۔ یعنی اس میں ایک نورانیت اور سرخی جھلک مارتی تھی۔ اور یہ چمک جو آپ کے چہرہ کے ساتھ وابستہ تھی عارضی نہ تھی بلکہ دائمی۔ کبھی کسی صدمہ رنج ابتلا مقدمات اور مصائب کے وقت آپ کا رنگ زرد ہوتے نہیں دیکھا گیا اور ہمیشہ چہرہ مبارک کندن کی طرح دمکتا رہتا تھا۔ کسی مصیبت اور تکلیف نے اس چمک کو دور نہیں کیا۔ علاوہ اس چمک اور نور کے آپ کے چہرہ پر ایک بشاشت اور تبسم ہمیشہ رہتا تھا اور دیکھنے والے کہتے تھے کہ اگر یہ شخص مفتری ہے اور دل میں اپنے تئیں جھوٹا جانتا ہے تو اس کے چہرہ پر یہ بشاشت اور خوشی اور فتح اور طمانیت قلب کے آثار کیونکر ہو سکتے ہیں۔ یہ نیک ظاہر کسی بد باطن کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا۔ اور ایمان کا نور بدکار کے چہرہ پر درخشندہ نہیں ہو سکتا۔ آتھم کی پیشگوئی کا آخری دن آگیا اور جماعت میں لوگوں کے چہرے پژمردہ ہیں اور دل سخت منقبض ہیں۔ بعض لوگ ناواقفی کے باعث مخالفین سے اس کی شرطیں لگا چکے ہیں۔ ہر طرف سے اداسی کے آثار ظاہر ہیں۔ لوگ نمازوں میں چیخ چیخ کر رو رہے ہیں کہ اے خداوند ہمیں رسوا مت کریو۔ غرض ایسا کہرام مچ رہا ہے کہ غیروں کے رنگ بھی فق ہو رہے ہیں۔ مگر یہ خدا کا شیر گھر سے نکلتا ہے ہنستا ہوا اور جماعت کے سربرآوردوں کو مسجد میں بلاتا ہے مسکراتا ہوا۔ ادھر حاضرین کے دل بیٹھے جاتے ہیں۔ ادھر وہ کہہ رہا ہے کہ لو پیشگوئی پوری ہو گئی۔ اطلع اللہ علی ھمہ وغمہ۔

مجھے الہام ہوا۔ اس نے حق کی طرف رجوع کیا حق نے اس کی طرف رجوع کیا۔ کسی نے اس کی بات مانی نہ مانی اُس نے اپنی بات سُنا دی اور سُننے والوں نے اس کے چہرہ کو دیکھ کر یقین کیا کہ یہ سچا ہے۔ ہم کو غم کھا رہا ہے اور یہ بے فکر اور بے غم مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا ہے۔ اس طرح کہ گویا حق تعالیٰ نے آتھم کے معاملہ کا فیصلہ اسی کے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ اور پھر اس نے آتھم کا رجوع اور بیقراری دیکھ کر خود اپنی طرف سے مہلت دے دی اور اب اس طرح خوش ہے جس طرح ایک دشمن کو مغلوب کر کے ایک پہلوان پھر محض اپنی دریا دلی سے خود ہی اسے چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ ہم تم پر رحم کرتے ہیں۔ ہم مرے کو مارنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔

لیکھرام کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ مخبروں نے فوراً اتہام لگانے شروع کئے۔ پولیس میں تلاشی کی درخواست کی گئی۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس یکایک تلاشی کے لئے آ موجود ہوئے۔ لوگ الگ کر دیئے گئے اندر کے باہر باہر کے اندر نہیں جا سکتے۔ مخالفین کا یہ زور کہ ایک حرف بھی تحریر کا مشتبہ نکلے تو پکڑ لیں مگر آپ کا یہ عالم کہ وہی خوشی اور مسرت چہرہ پر ہے اور خود پولیس افسروں کو لے جا لے جا کر اپنے بستے اور کتابیں تحریریں اور خطوط اور کوٹھریاں اور مکان دکھا رہے ہیں۔ کچھ خطوط انہوں نے مشکوک سمجھ کر اپنے قبضہ میں بھی کر لئے ہیں۔ مگر یہاں وہی چہرہ ہے اور وہی مُسکراہٹ۔ گویا نہ صرف بیگناہی بلکہ ایک فتح مبین اور اتمام حجت کا موقعہ نزدیک آتا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے باہر جو لوگ بیٹھے ہیں ان کے چہروں کو دیکھو وہ ہر ایک کنسٹبل کو باہر نکلتے اور اندر جاتے دیکھ دیکھ کر سہمے جاتے ہیں۔ ان کا رنگ فق ہے ان کو یہ معلوم نہیں کہ اندر تو وہ جس کی آبرو کا انہیں فکر ہے خود افسروں کو بلا بلا کر اپنے بستے اور اپنی تحریریں دکھلا رہا ہے اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ایسی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب حقیقت پیش گوئی کی پورے طور پر کھلے گی اور میرا دامن ہر طرح کی آلائش اور سازش سے پاک ثابت ہوگا۔

غرض یہی حالت تمام مقدمات، ابتلاؤں مصائب اور مباحثات میں رہی اور یہ وہ اطمینان

قلب کا اعلیٰ اور اکمل نمونہ تھا جسے دیکھ کر بہت سی سعید روحیں ایمان لے آئی تھیں۔

آپ کے بال

آپ کے سر کے بال نہایت باریک، سیدھے چکنے چمکدار اور نرم تھے۔ اور مہندی کے رنگ سے رنگین رہتے تھے۔ گھنے اور کثرت سے نہ تھے۔ بلکہ کم کم۔ اور نہایت ملائم تھے۔ گردن تک لمبے تھے۔ آپ نہ سر منڈواتے تھے نہ خشخاش یا اس کے قریب کترواتے تھے بلکہ اتنے لمبے رکھتے تھے جیسے عام طور پر پٹے رکھے جاتے ہیں۔ سر میں تیل بھی ڈالتے تھے۔ چنبیلی یا حنا وغیرہ کا۔ یہ عادت تھی کہ بال سوکھے نہ رکھتے تھے۔

ریشِ مبارک

آپ کی داڑھی اچھی گھندار تھی، بال مضبوط موٹے اور چمکدار، سیدھے اور نرم حنا سے سُرخ اور رنگے ہوتے تھے۔ داڑھی کو لمبا چھوڑ چھوڑ کر حجامت کے وقت فاضل بال آپ کترواد یتے تھے۔ یعنی بے ترتیب اور ناہموار نہ رکھتے تھے بلکہ سیدھی نیچے کو اور برابر رکھتے تھے۔ داڑھی میں بھی ہمیشہ تیل لگایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک پھنسی گال پر ہونے کی وجہ سے وہاں سے کچھ بال پورے بھی کتروائے تھے۔ اور وہ تبرک کے طور پر لوگوں کے پاس اب تک موجود ہیں۔ ریشِ مبارک تینوں طرف چہرہ کے تھی۔ اور بہت خوبصورت۔ نہ اتنی کم کہ چھدری اور نہ صرف ٹھوڑھی پر ہو نہ اتنی کہ آنکھوں تک بال پہنچیں۔

وسمہ مہندی

ابتداء ایّام میں آپ وسمہ اور مہندی لگایا کرتے تھے۔ پھر دماغی دورے بکثرت ہونے کی وجہ سے سر اور ریشِ مبارک پر آخر عمر تک مہندی ہی لگاتے رہے وسمہ ترک کر

دیا تھا۔ البتہ کچھ روز انگریزی وسمہ بھی استعمال فرمایا۔ مگر پھر ترک کر دیا۔ آخری دنوں میں میر حامد شاہ صاحب سیالکوٹی نے ایک وسمہ تیار کر کے پیش کیا تھا وہ لگاتے تھے۔ اس سے ریشِ مبارک میں سیاہی آگئی تھی۔ مگر اس کے علاوہ ہمیشہ برسوں مہندی پر ہی اکتفا کی جو اکثر جمعہ کے جمعہ یا بعض اوقات اور دنوں میں بھی آپ نائی سے لگوایا کرتے تھے۔

ریشِ مبارک کی طرح مونچھوں کے بال بھی مضبوط اور اچھے موٹے اور چمکدار تھے۔ آپ لبیں کترواتے تھے۔ مگر نہ اتنی کہ جو وہابیوں کی طرح مونڈی ہوئی معلوم ہوں۔ نہ اتنی لمبی کہ ہونٹ کے کنارے سے نیچی ہوں۔

جسم پر آپ کے بال صرف سامنے کی طرف تھے۔ پُشت پر نہ تھے اور بعض اوقات سینہ اور پیٹ کے بال آپ مونڈ دیا کرتے تھے۔ یا کتروا دیتے تھے۔ پنڈلیوں پر بہت کم بال تھے۔ اور جو تھے وہ نرم اور چھوٹے۔ اسی طرح ہاتھوں کے بھی۔

چہرۂ مبارک

آپ کا چہرہ کتابی یعنی معتدل لمبا تھا۔ اور حالانکہ عمر شریف ۷۰۔ اور ۸۰ کے درمیان تھی پھر بھی جھریوں کا نام و نشان نہ تھا اور نہ متفکر اور غصّہ ور طبیعت والوں کی طرح پیشانی پر شکن کے نشانات نمایاں تھے۔ رنج۔ فکر۔ تردد یا غم کے آثار چہرہ پر دیکھنے کی بجائے زیارت کنندہ اکثر تبسم اور خوشی کے آثار ہی دیکھتا تھا۔

آپ کی آنکھوں کی سیاہی، سیاہی مائل شربتی رنگ کی تھی۔ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر پپوٹے اس وضع کے تھے کہ سوائے اس وقت کے جب آپ ان کو خاص طور پر کھولیں ہمیشہ قدرتی غضِ بصر کے رنگ میں رہتی تھیں۔ بلکہ جب مخاطب ہو کر بھی کلام فرماتے تھے تو آنکھیں نیچی ہی رہتی تھیں اسی طرح جب مردانہ مجالس میں بھی تشریف لے جاتے تو بھی اکثر ہر وقت نظر نیچے ہی رہتی تھی۔ گھر میں بھی بیٹھتے تو اکثر آپ کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ

اس مکان میں اور کون کون بیٹھا ہے۔ اس جگہ یہ بات بھی بیان کے قابل ہے کہ آپ نے کبھی عینک نہیں لگائی اور آپ کی آنکھیں کام کرنے سے کبھی نہ تھکتی تھیں۔ خدا تعالیٰ کا آپ کے ساتھ حفاظت عین کا ایک وعدہ تھا جس کے ماتحت آپ کی چشمانِ مبارک آخر وقت تک بیماری اور تکان سے محفوظ رہیں۔ البتہ پہلی رات کا ہلال آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ ناک حضرت اقدس کی نہایت خوبصورت اور بلند بالا تھی۔ پتلی، سیدھی، اونچی اور موزوں نہ پھیلی ہوئی تھی نہ موٹی۔ کان آنحضور کے متوسط یا متوسط سے ذرا بڑے۔ نہ باہر کو بہت بڑھے ہوئے نہ بالکل سر کے ساتھ لگے ہوئے۔ قلمی آم کی قاش کی طرح اُوپر سے بڑے نیچے سے چھوٹے۔ قوتِ شنوائی آپ کی آخر وقت تک عمدہ اور خدا کے فضل سے برقرار رہی۔

رخسار مبارک آپ کے نہ پچکے ہوئے اندر کو تھے نہ اتنے موٹے کہ بہت باہر کو نکل آویں۔ نہ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ بھنویں آپ کی الگ الگ تھیں۔ پیوستہ ابرو نہ تھے۔

پیشانی اور سرِ مبارک

پیشانی مبارک آپ کی سیدھی اور بلند اور چوڑی تھی اور نہایت درجہ کی فراست اور ذہانت آپ کے جبین سے ٹپکتی تھی۔ علمِ قیافہ کے مطابق ایسی پیشانی بہترین نمونہ اعلیٰ صفات اور اخلاق کا ہے۔ یعنی جو سیدھی ہو نہ آگے کو نکلی ہوئی نہ پیچھے کو دھسی ہوئی۔ اور بلند ہو یعنی اُونچی اور کشادہ ہو اور چوڑی ہو۔ بعض پیشانیاں گو اُونچی ہوں مگر چوڑان ماتھے کی تنگ ہوتی ہے۔ آپ میں یہ تینوں خوبیاں جمع تھیں۔ اور پھر یہ خوبی کہ جبین جبیں بہت کم پڑتی تھی۔ سر آپ کا بڑا تھا۔ خوبصورت بڑا تھا۔ اور علم قیافہ کی رو سے ہر سمت سے پورا تھا۔ یعنی لمبا بھی تھا اور چوڑا بھی تھا۔ اور اونچا بھی اور سطح اوپر کی۔ اکثر حصہ ہموار اور پیچھے سے بھی

گولائی درست تھی۔ آپ کی کن پٹی کشادہ تھی اور آپ کی کمال عقل پر دلالت کرتی تھی۔

لب مبارک

آپ کے لب مبارک پتلے نہ تھے۔ مگر تاہم ایسے موٹے بھی نہ تھے کہ بُرے لگیں۔ دہانہ آپ کا متوسط تھا۔ اور جب بات نہ کرتے ہوں تو مُنہ کُھلا نہ رہتا تھا۔ بعض اوقات مجلس میں جب خاموش بیٹھے ہوں تو آپ عمامہ کے شملہ سے دہان مبارک ڈھک لیا کرتے تھے۔ دندانِ مُبارک آپ کے آخر عمر میں کچھ خراب ہو گئے تھے یعنی کیڑا بعض ڈاڑھوں کو لگ گیا تھا جس سے کبھی کبھی تکلیف ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ڈاڑھ کا سرا ایسا نوکدار ہو گیا تھا کہ اس سے زبان میں زخم پڑ گیا تو ریتی کیسا تھ اُس کو گھسوا کر برابر بھی کرایا تھا۔ مگر کبھی کوئی دانت نکلوایا نہیں۔ مسواک آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

پیر کی ایڑیاں آپ کی بعض دفعہ گرمیوں کے موسم میں پھٹ جایا کرتی تھیں۔

اگرچہ گرم کپڑے سردی گرمی برابر پہنتے تھے۔ تاہم گرمیوں میں پسینہ بھی خوب آجاتا تھا۔ مگر آپ کے پسینہ میں بُو کبھی نہیں آتی تھی خواہ کتنے ہی دن بعد کُرتا بدلیں اور کیسا ہی موسم ہو۔

گردن مُبارک

آپ کی گردن متوسط لمبائی اور موٹائی میں تھی۔ آپ اپنے مطاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان کے اتباع میں ایک حد تک جسمانی زینت کا خیال ضرور رکھتے تھے۔ غسل جُمعہ حجامت حنا۔ مسواک روغن اور خوشبو۔ کنگھی اور آئینہ کا استعمال برابر مسنون طریق پر آپ فرمایا کرتے تھے۔ مگران باتوں میں انہماک آپ کی شان سے بہت دُور تھا۔

لباس

سب سے اول یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ آپ کو کسی قسم کے خاص لباس کا

شوق نہ تھا۔ آخری ایام کے کچھ سالوں میں آپ کے پاس کپڑے سادے اور سلے سلائے بطور تحفہ کے بہت آتے تھے۔ خاص کر کوٹ صدری اور پائجامہ قمیض وغیرہ جو اکثر شیخ رحمت اللہ صاحب لاہوری ہر عید بقر عید کے موقعہ پر اپنے ہمراہ نذر لاتے تھے وہی آپ استعمال فرمایا کرتے تھے۔ مگر علاوہ ان کے کبھی کبھی آپ خود بھی بنوا لیا کرتے تھے۔ عمامہ تو اکثر خود ہی خرید کر باندھتے تھے۔ جس طرح کپڑے بنتے تھے اور استعمال ہوتے تھے۔ اسی طرح ساتھ ساتھ خرچ بھی ہوتے جاتے تھے۔ یعنی ہر وقت تبرک مانگنے والے طلب کرتے رہتے تھے۔ بعض دفعہ تو یہ نوبت پہنچ جاتی کہ آپ ایک کپڑا بطورِ تبرک کے عطا فرماتے تو دوسرا بنوا کر اُس وقت پہننا پڑتا۔ اور بعض سمجھدار اس طرح بھی کرتے تھے کہ مثلاً ایک کپڑا اپنا بھیج دیا اور ساتھ عرض کر دیا کہ حضور ایک اُترا ہوا تبرک مرحمت فرما دیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب آپ کے لباس کی ساخت سنئے۔ عموماً یہ کپڑے آپ زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ کرتہ یا قمیض، پائجامہ، صدری۔ کوٹ، عمامہ۔ اس کے علاوہ رومال بھی ضرور رکھتے تھے اور جاڑوں میں جرابیں۔ آپ کے سب کپڑوں میں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت کھُلے ہوتے تھے۔ اور اگرچہ شیخ صاحب مذکور کے آوردہ کوٹ انگریزی طرز کے ہوتے مگر وہ بھی بہت کشادہ اور لمبے یعنی گھٹنوں سے نیچے ہوتے تھے۔ اور جبّے اور چوغہ بھی جو آپ پہنتے تھے تو وہ بھی ایسے لمبے کہ بعض تو ان میں سے ٹخنے تک پہنچتے تھے۔ اسی طرح کرُتے اور صدریاں بھی کشادہ ہوتی تھی۔

بنیان آپ کبھی نہ پہنتے تھے بلکہ اس کی تنگی سے گھبراتے تھے۔ گرم قمیض جو پہنتے تھے۔ ان کا اکثر اُوپر کا بٹن کھُلا رکھتے تھے۔ اسی طرح صدری اور کوٹ کا اور قمیض کے کفوں میں اگر بٹن ہوں تو وہ بھی ہمیشہ کھُلے رہتے تھے آپ کا طرزِ عمل "ما انا من المتکلفین" کے ماتحت کسی مصنوعی جکڑ بندی میں جو شرعاً غیر ضروری ہے پابند رہنا آپ کے مزاج کے خلاف تھا اور نہ آپ کو کبھی پرواہ تھی کہ لباس عمدہ ہے یا بُرا ٹس کیا ہوا ہے یا بٹن سب

درست لگے ہوئے ہیں یا نہیں صرف لباس کی اصلی غرض مطلوب تھی۔ بارہا دیکھا گیا کہ بٹن اپنا کاج چھوڑ کر دوسرے ہی میں لگے ہوئے ہوتے تھے بلکہ صدری کے بٹن کوٹ کے کاجوں میں لگائے ہوئے دیکھے گئے۔ آپ کی توجہ ہمہ تن اپنے مشن کی طرف تھی اور اصلاح اُمّت میں اتنے محو تھے کہ اصلاح لباس کی طرف توجہ نہ تھی۔ آپ کا لباس آخر عمر میں چند سال سے بالکل گرم وضع کا ہی رہتا تھا۔ یعنی کوٹ اور صدری اور پاجامہ گرمیوں میں بھی گرم رکھتے تھے۔ اور یہ علالتِ طبع کے باعث تھا سردی آپ کو موافق نہ تھی اس لئے اکثر گرم کپڑے رکھا کرتے تھے البتہ گرمیوں میں نیچے کرتہ ململ کا رہتا تھا بجائے گرم کرنے کے پاجامہ آپ کا معروف شرعی وضع کا ہوتا تھا (پہلے غرارہ یعنی ڈھیلا مردانہ پاجامہ بھی پہنا کرتے تھے مگر آخر عمر میں ترک کر دیا تھا) مگر گھر میں گرمیوں میں کبھی کبھی دن کو اور عادتاً رات کے وقت تہ بند باندھ کر خواب فرمایا کرتے تھے۔

صدری گھر میں اکثر پہنے رہتے مگر کوٹ عموماً باہر جاتے وقت ہی پہنتے۔ اور سردی کی زیادتی کے دنوں میں اوپر تلے دو دو کوٹ بھی پہنا کرتے۔ بلکہ بعض اوقات پوستین بھی۔

صدری کی جیب میں یا بعض اوقات کوٹ کی جیب میں آپ کا رومال ہوتا تھا۔ آپ ہمیشہ بڑا رومال رکھتے تھے۔ نہ کہ چھوٹا جنٹلمینی رومال جو آج کل کا بہت مروج ہے اسی کے کونوں میں آپ مُشک اور ایسی ہی ضروری ادویہ جو آپ کے استعمال میں رہتی تھیں اور ضروری خطوط وغیرہ باندھ رکھتے تھے۔ اور اسی رومال میں نقد وغیرہ جو نذر لوگ مسجد میں پیش کرتے تھے باندھ لیا کرتے۔

گھڑی بھی آپ ضرور اپنے پاس رکھا کرتے تھے مگر اس کی کُنجی دینے میں اکثر ناغہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے اکثر وقت غلط ہی ہوتا تھا۔ اور چونکہ گھڑی جیب میں سے اکثر نکل پڑتی اس لئے آپ اُسے بھی رومال میں باندھ لیا کرتے۔ گھڑی کو ضرورت کے لئے رکھتے نہ زیبائش کے لئے۔

آپ کو دیکھ کر کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس شخص کی زندگی میں یا لباس میں کسی قسم کا بھی تصنع ہے یا یہ زیب و زینت دنیوی کا دلدادہ ہے۔ ہاں البتہ والرجز فاھجر کے ماتحت آپ صاف اور ستھری چیز ہمیشہ پسند فرماتے اور گندی اور میلی چیز سے سخت نفرت رکھتے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ بعض اوقات آدمی موجود نہ ہو تو بیت الخلاء میں خود فینائل ڈالتے تھے۔

عمامہ شریف آپ ململ کا باندھا کرتے تھے۔ اور اکثر دس گز یا کچھ اوپر لمبا ہوتا تھا۔ شملہ آپ لمبا چھوڑتے تھے۔ کبھی کبھی شملہ کو آگے ڈال لیا کرتے۔ اور کبھی اس کا پلّہ دہن مبارک پر بھی رکھ لیتے۔ جبکہ مجلس میں خاموشی ہوتی۔ عمامہ کے باندھنے کی آپ کی خاص وضع تھی۔ نوک تو ضرور سامنے ہوتی مگر سر پر ڈھیلا ڈھالا لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ عمامہ کے نیچے اکثر رومی ٹوپی رکھتے تھے۔ اور گھر میں عمامہ اُتار کر صرف یہ ٹوپی ہی پہنے رہا کرتے۔ مگر نرم قسم کی دوہری جو سخت قسم کی نہ ہوتی۔

جرابیں آپ سردیوں میں استعمال فرماتے اور ان پر مسح فرماتے۔ بعض اوقات زیادہ سردی میں دو دو جرابیں اُوپر تلے چڑھا لیتے۔ مگر بارہا جراب اس طرح پہن لیتے کہ وہ پیر پر ٹھیک نہ چڑھتی۔ کبھی تو سر آگے لٹکتا رہتا اور کبھی جراب کی ایڑی کی جگہ پیر کی پشت پر آ جاتی۔ کبھی ایک جراب سیدھی دوسری اُلٹی۔ اگر جراب کہیں سے کچھ پھٹ جاتی تو بھی مسح جائز رکھتے بلکہ فرماتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب ایسے موزوں پر بھی مسح کر لیا کرتے تھے جس میں سے ان کی انگلیوں کے پوٹے باہر نکلے رہا کرتے۔

جوتی آپ کی دیسی ہوتی۔ خواہ کسی وضع کی ہو۔ پشواری، لاہوری، لدھیانوی، سلیم شاہی ہر وضع کی پہن لیتے مگر ایسی جو کھلی کھلی ہو۔ انگریزی بوٹ کبھی نہیں پہنا۔ گرگابی حضرت صاحب کو پہنے میں نے نہیں دیکھا۔

جوتی اگر تنگ ہوتی تو اُس کی ایڑی بٹھا لیتے۔ مگر ایسی جوتی کے ساتھ باہر تشریف

نہیں لے جاتے تھے۔ لباس کے ساتھ ایک چیز کا اور بھی ذکر کر دیتا ہوں وہ یہ کہ آپ عصا ضرور رکھتے تھے۔ گھر میں یا جب مسجد مبارک میں روزانہ نماز کو جانا ہوتا۔ تب تو نہیں مگر مسجدِ اقصیٰ کو جانے کے وقت یا جب باہر سیر وغیرہ کے لئے تشریف لاتے تو ضرور ہاتھ میں ہوا کرتا تھا اور موٹی اور مضبوط لکڑی کو پسند فرماتے مگر کبھی اس پر سہارا یا بوجھ دے کر نہ چلتے تھے جیسے اکثر ضعیف العمر آدمیوں کی عادت ہوتی ہے۔

موسمِ سرما میں ایک دھسّہ لے کر آپ مسجد میں نماز کے لئے تشریف لایا کرتے تھے جو اکثر آپ کے کندھے پر پڑا ہوا ہوتا تھا۔ اور اسے اپنے آگے ڈال لیا کرتے تھے۔ جب تشریف رکھتے تو پھر پیروں پر ڈال لیتے۔

کپڑوں کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کوٹ، صدری۔ ٹوپی۔ عمامہ رات کو اتار کر تکیہ کے نیچے ہی رکھ لیتے۔ اور رات بھر تمام کپڑے جنہیں محتاط لوگ شکن اور میل سے بچانے کو الگ جگہ کھونٹی پر ٹانگ دیتے ہیں وہ بستر پر سر اور جسم کے نیچے ملے جاتے اور صبح کو ان کی ایسی حالت ہو جاتی کہ اگر کوئی فیشن کا دلدادہ اور سلوٹ کا دشمن ان کو دیکھ لے تو سر پیٹ لے۔

موسمِ گرما میں دن کو بھی اور رات کو تو اکثر آپ کپڑے اُتار دیتے اور صرف چادر یا لنگی باندھ لیتے۔ گرمی دانے بعض دفعہ بہت نکل آتے تو اس کی خاطر بھی کرتہ اُتار دیا کرتے۔ تہ بند اکثر نصف ساق تک ہوتا تھا۔ اور گھٹنوں سے اوپر ایسی حالتوں میں مجھے یاد نہیں کہ آپ برہنہ ہوئے ہوں۔

آپ کے پاس کچھ کنجیاں بھی رہتی تھیں۔ یہ یا تو رومال میں یا اکثر ازار بند میں باندھ کر رکھتے۔ روئی دار کوٹ پہننا آپ کی عادت میں داخل نہ تھا۔ نہ ایسی رضائی اوڑھ کر باہر تشریف لاتے بلکہ چادر پشمینہ کی یا دھسّہ رکھا کرتے تھے اور وہ بھی سر پر کبھی نہیں اوڑھتے تھے بلکہ کندھوں اور گردن تک رہتی تھی۔ گلوبند اور دستانوں کی آپ کو عادت نہ تھی بستر آپ کا ایسا ہوتا تھا کہ ایک لحاف جس میں ۵۔۶ سیر روئی کم از کم ہوتی تھی۔ اور اچھا لمبا

چوڑا ہوتا تھا۔ چادر بستر کے اوپر اور تکیہ۔ اور توشک آپ گرمی جاڑے دونوں موسموں میں بسبب
سردی کی ناموافقت کے بچھواتے تھے۔

تحریر وغیرہ کا سب کام پلنگ پر ہی اکثر فرمایا کرتے اور دوات قلم بستہ اور کتابیں
یہ سب چیزیں پلنگ پر موجود رہا کرتی تھیں۔ کیونکہ یہی جگہ میز کرسی اور لائبریری سب کا کام
دیتی تھی۔ اور **ما انا من المتکلفین** کا عملی نظارہ خوب واضح طور پر نظر آتا تھا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ وہ یہ کہ آپ امیروں کی طرح ہر روز کپڑے
نہ بدلا کرتے تھے۔ بلکہ جب ان کی صفائی میں فرق آنے لگتا۔ تب بدلتے تھے۔

خوراک کی مقدار

قرآن شریف میں کفار کے لئے وارد ہے **یاکلون کما تاکل الانعام**
اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ کافر سات انتڑی میں کھاتا اور مومن ایک میں۔ مراد ان باتوں
سے یہ ہے کہ مومن طیب چیز کھانے والا اور دنیادار یا کافر کی نسبت بہت کم خور ہوتا
ہے۔ جب مومن کا یہ حال ہوا تو پھر انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کا تو کیا کہنا۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے دسترخوان پر بھی اکثر ایک سالن ہی ہوتا تھا۔ بلکہ ستو یا صرف کھجور یا دودھ
کا ایک پیالہ ہی ایک غذا ہوا کرتی تھی۔ اسی سنت پر ہمارے حضرت اقدس (آپ پر سلامتی ہو)
بھی بہت ہی کم خور تھے۔ اور بمقابلہ اس کام اور محنت کے جس میں حضور دن رات لگے رہتے
تھے۔ اکثر حضور کی غذا دیکھی جاتی تو بعض اوقات حیرانی سے بے اختیار لوگ یہ کہہ اٹھتے تھے
کہ اتنی خوراک پر یہ شخص زندہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ خواہ کھانا کیسا ہی عمدہ اور لذیذ ہو اور کیسی
ہی بھوک ہو آپ کبھی حلق تک ٹھونس کر نہیں کھاتے تھے۔ عام طور پر دن میں دو وقت مگر
بعض اوقات جب طبیعت خراب ہوتی تو دن بھر میں ایک ہی دفعہ کھانا نوش فرمایا کرتے
تھے۔ علاوہ اس کے چائے وغیرہ ایک پیالی صبح کو بطور ناشتہ بھی پی لیا کرتے تھے مگر جہاں

تک میں نے غور کیا آپ کو لذیذ مزیدار کھانے کا شوق ہرگز نہ تھا۔

اوقات

معمولاً آپ صبح کا کھانا ۱۰ بجے سے ظہر کی اذان تک اور شام کا نمازِ مغرب کے بعد سے سونے کے وقت تک کھا لیا کرتے تھے کبھی شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دن کا کھانا آپ نے بعد ظہر کھایا ہو۔ شام کا کھانا مغرب سے پہلے کھانے کی عادت نہ تھی۔ مگر کبھی کبھی کھا لیا کرتے تھے مگر معمول دو طرح کا تھا۔ جن دنوں میں آپ بعد مغرب عشا تک باہر تشریف رکھا کرتے تھے اور کھانا گھر میں کھاتے تھے ان دنوں میں یہ وقت عشا کے بعد ہوا کرتا تھا ورنہ مغرب اور عشا کے درمیان۔

مدتوں آپ باہر مہمانوں کے ہمراہ کھانا کھایا کرتے تھے اور یہ دسترخوان گول کمرہ یا مسجد مبارک میں بچھا کرتا تھا اور خاص مہمان آپ کے ہمراہ دسترخوان پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ عام طور پر وہ لوگ ہوا کرتے تھے جن کو حضرت صاحب نامزد کر دیا کرتے تھے۔ ایسے دسترخوان پر تعداد کھانے والوں کی دس سے پچیس تک ہو جایا کرتی تھی۔

گھر میں جب کھانا نوش جان فرماتے تھے تو آپ کبھی تنہا مگر اکثر ام المومنین اور کسی ایک یا سب بچوں کو ساتھ لے کر تناول فرمایا کرتے تھے۔ یہ عاجز کبھی قادیان میں ہوتا تھا تو اس کو بھی شرف اس خانگی دسترخوان پر بیٹھنے کا مل جایا کرتا تھا۔

سحری آپ ہمیشہ گھر میں ہی تناول فرماتے تھے۔ اور ایک دو موجودہ آدمیوں کے ساتھ یا تنہا سوائے گھر کے باہر جب کبھی آپ کھانا کھاتے تو آپ کسی کے ساتھ نہ کھاتے تھے۔ یہ آپ کا حکم نہ تھا مگر خدام آپ کو عزت کی وجہ سے ہمیشہ الگ ہی برتن میں کھانا پیش کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اور مہمان بھی سوائے کسی خاص وقت کے الگ الگ ہی برتنوں میں کھایا کرتے تھے۔

کس طرح کھانا تناول فرماتے تھے

جب کھانا آگے رکھا جاتا یا دستر خوان بچھتا تو آپ اگر مجلس میں ہوتے تو یہ پوچھ لیا کرتے ۔کیوں جی شروع کریں ؟ مطلب یہ کہ کوئی مہمان رہ تو نہیں گیا۔ یا سب کے آگے کھانا آ گیا ۔پھر آپ جواب ملنے پر کھانا شروع کرتے۔ اور تمام دوران میں نہایت آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھاتے ۔ کھانے میں کوئی جلدی آپ سے صادر نہ ہوتی۔ آپ کھانے کے دوران میں ہر قسم کی گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ سالن آپ بہت کم کھاتے تھے اور اگر کسی خاص دعوت کے موقعہ پر دو تین قسم کی چیزیں سامنے ہوں تو اکثر صرف ایک ہی پر ہاتھ ڈالا کرتے تھے ۔اور سالن کی جو رکابی آپ کے آگے سے اُٹھتی تھی وہ اکثر ایسی معلوم ہوتی تھی کہ گویا اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بہت بوٹیاں یا ترکاری آپ کو کھانے کی عادت نہ تھی۔ بلکہ لعاب سے اکثر چھوا کر ٹکڑا کھا لیا کرتے تھے۔ لقمہ چھوٹا ہوتا تھا اور روٹی کے ٹکڑے آپ بہت سے کر لیا کرتے تھے اور یہ آپ کی عادت تھی۔ دستر خوان سے اُٹھنے کے بعد سب سے زیادہ ٹکڑے روٹی کے آپ کے آگے سے ملتے تھے اور لوگ بطور تبرک کے اُن کو اٹھا کر کھا لیا کرتے تھے۔ آپ اس قدر کم خور تھے کہ باوجودیکہ سب مہمانوں کے برابر آپ کے آگے کھانا رکھا جاتا تھا مگر پھر بھی سب سے زیادہ آپ کے آگے سے بچتا تھا ۔

بعض دفعہ تو دیکھا گیا کہ آپ صرف روٹی کا نوالہ مُنہ میں ڈال لیا کرتے تھے۔ اور پھر انگلی کا سرا شوربے میں تر کرکے زبان سے چھوا دیا کرتے تاکہ لقمہ نمکین ہو جاوے۔ پچھلے دنوں میں جب آپ گھر میں کھانا کھاتے تھے تو آپ اکثر صبح کے وقت مکی کی روٹی اکثر کھایا کرتے تھے اور اس کے ساتھ کوئی ساگ یا صرف لسی کا گلاس یا کچھ مکھن ہوا کرتا تھا۔ یا کبھی اچار سے بھی لگا کر کھا لیا کرتے تھے۔ آپ کا کھانا صرف اپنے کام کے لئے قوت حاصل کرنے کے لئے ہوا کرتا تھا نہ کہ لذت نفس کے لئے۔ بارہا آپ نے فرمایا کہ ہمیں تو کھانا کھا کر یہ بھی معلوم

نہیں ہوا کہ کیا پکا تھا اور ہم نے کیا کھایا۔ ہڈیاں چوسنے اور بڑا آوالہ اُٹھانے۔ زور زور سے چپڑ چپڑ کرنے۔ ڈکاریں مارنے یا رکابیاں چاٹنے یا کھانے کے مدح و ذم اور لذائذ کا تذکرہ کرنے کی آپ کی عادت نہ تھی بلکہ جو پکتا تھا وہ کھالیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آپ پانی کا گلاس یا چائے کی پیالی بائیں ہاتھ سے پکڑ کر پیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ابتدائی عمر میں دائیں ہاتھ میں ایسی چوٹ لگی تھی کہ اب تک بوجھل چیز اس ہاتھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اکڑوں بیٹھ کر آپ کو کھانے کی عادت نہ تھی بلکہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے یا بائیں ٹانگ بچھا دیتے اور دایاں گھٹنا کھڑا رکھتے۔

کیا کھاتے تھے؟

میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ مقصد آپ کے کھانے کا صرف قوت قائم رکھنا تھا نہ کہ لذت اور ذائقہ اُٹھانا۔ اس لئے آپ صرف وہی چیزیں ہی کھاتے تھے جو آپ کی طبیعت کے موافق ہوتی تھیں۔ اور جن سے دماغی قوت قائم رہتی تھی تاکہ آپ کے کام میں حرج نہ ہو۔ علاوہ بریں آپ کو چند بیماریاں بھی تھیں جن کی وجہ سے آپ کو کچھ پرہیز بھی رکھنا پڑتا تھا۔ مگر عام طور پر آپ سب طیبات ہی استعمال فرما لیتے تھے۔ اور اگرچہ آپ سے اکثر یہ پوچھ لیا جاتا کہ آج آپ کیا کھائیں گے۔ مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے خواہ کچھ پکا ہو آپ اپنی ضرورت کے مطابق کھا ہی لیا کرتے تھے۔ اور کبھی کھانے کے بدمزہ ہونے پر اپنی ذاتی وجہ سے خفگی نہیں فرمائی۔ بلکہ اگر خراب پکے ہوئے کھانے اور سالن پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا تو صرف اس لئے اور یہ کہہ کر کہ مہمانوں کو یہ کھانا پسند نہ آیا ہوگا۔

روٹی آپ تنوری اور چولھے کی دونوں قسم کی کھاتے تھے۔ ڈبل روٹی چائے کے ساتھ یا بسکٹ اور بکرم بھی استعمال فرما لیا کرتے تھے۔ بلکہ ولایتی بسکٹوں کو بھی جائز فرماتے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں کیا معلوم کہ اس میں چربی ہے۔ کیونکہ بنانے والوں کا ادعا تو

ممکن ہے۔ پھر ہم ناحق بدگمانی اور شکوک میں کیوں پڑیں۔ مکی کی روٹی بہت مدت آپ نے آخری عمر میں استعمال فرمائی۔ کیونکہ آخری سات آٹھ سال سے آپ کو دستوں کی بیماری ہو گئی تھی اور ہضم کی طاقت کم ہو گئی تھی۔ علاوہ ان روٹیوں کے آپ شیرمال کو بھی پسند فرماتے تھے اور باقرخانی قلچہ وغیرہ غرض جو جو اقسام روٹی کے سامنے آجایا کرتے تھے آپ کسی کو ردّ نہ فرماتے تھے۔

سالن آپ بہت کم کھاتے تھے۔ گوشت آپ کے ہاں دو وقت پکتا تھا مگر دال آپ کو گوشت سے زیادہ پسند تھی۔ یہ دال ماش کی یا اوڑدھکی ہوتی تھی جس کے لئے گورداسپور کا ضلع مشہور ہے۔ سالن ہر قسم کا اور ترکاری عام طور پر ہر طرح کی آپ کے دسترخوان پر دیکھی گئی ہے اور گوشت بھی ہر حلال اور طیّب جانور کا آپ کھاتے تھے۔ پرندوں کا گوشت آپ کو مرغوب تھا اس لئے بعض اوقات جب طبیعت کمزور ہوتی تو تیتر فاختہ وغیرہ کے لئے شیخ عبدالرحیم صاحب نومسلم کو ایسا گوشت مہیا کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔ مرغ اور بٹیروں کا گوشت بھی آپ کو پسند تھا۔ مگر بٹیرے جب سے کہ پنجاب میں طاعون کا زور ہوا کھانے چھوڑ دیئے تھے۔ بلکہ منع کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس کے گوشت میں طاعون پیدا کرنے کی خاصیت ہے۔ اور بنی اسرائیل میں ان کے کھانے سے سخت طاعون پڑی تھی۔ حضور کے سامنے دو ایک دفعہ گوہ کا گوشت پیش کیا گیا مگر آپ نے فرمایا کہ جائز ہے جس کا جی چاہے کھالے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے چونکہ اس سے کراہت فرمائی اس لئے ہم کو بھی اس سے کراہت ہے۔ اور جیسا کہ وہاں ہوا تھا یہاں بھی لوگوں نے آپ کے مہمان خانہ بلکہ گھر میں بھی کچھ بچوں اور لوگوں نے گوہ کا گوشت کھایا مگر آپ نے اُسے قریب نہ آنے دیا۔ مرغ کا گوشت ہر طرح کا آپ کھا لیتے تھے۔ سالن ہو یا بھنا ہوا کباب ہو یا پلاؤ مگر اکثر ایک ران پر ہی گذارہ کر لیتے تھے اور وہی آپ کو کافی ہو جاتی تھی بلکہ کبھی کچھ بچ بھی رہا کرتا تھا۔ پلاؤ بھی آپ کھاتے تھے مگر ہمیشہ نرم اور گداز اور گلے گلے ہوئے چاولوں کا اور

میٹھے چاول تو کبھی خود کہہ کر پکوا لیا کرتے تھے مگر گُڑ کے اور وہی آپ کو پسند تھے۔ عمدہ کھانے یعنی کباب مرغ۔ پلاؤ یا انڈے اور اسی طرح فرنی میٹھے چاول وغیرہ تب ہی آپ کہہ کر پکوایا کرتے تھے۔ جب ضعف معلوم ہوتا۔ جن دنوں میں تصنیف کا کام کم ہوتا یا صحت اچھی ہوتی تو ان دنوں میں معمولی کھانا ہی کھاتے۔ اور وہ بھی کبھی ایک وقت ہی صرف اور دوسرے وقت دودھ وغیرہ سے گزارہ کر لیتے۔ دودھ یا لائی۔ مکھن یہ اشیاء بلکہ بادام روغن تک صرف قوت۔ کہ قیام اور ضعف کو دُور کرنے کو استعمال فرماتے تھے اور ہمیشہ معمولی مقدار میں بعض لوگوں نے آپ کے کھانے پر اعتراض کئے ہیں۔ مگر ان بیوقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ ایک شخص جو عمر میں بوڑھا ہے اور اُسے کئی امراض لگے ہوئے ہیں اور باوجود ان کے وہ تمام جہان سے مصروف پیکار ہے۔ ایک جماعت بنا رہا ہے جس کے فرد فرد پر اس کی نظر ہے۔ اصلاح اُمت کے کام میں مشغول ہے۔ ہر مذہب سے الگ الگ قسم کی جنگ ٹھنی ہوئی ہے۔ دن رات تصانیف میں مصروف ہے جو نہ صرف اُردو بلکہ فارسی اور عربی میں اور پھر وہی ان کو لکھتا اور وہی کاپی دیکھتا۔ وہی پروف درست کرتا اور وہی ان کی اشاعت کا انتظام کرتا ہے پھر سینکڑوں مہمانوں کے ٹھہرنے اُترنے اور علیٰ حسب مراتب کھلانے کا انتظام۔ مباحثات اور وفود کا اہتمام۔ نمازوں کی حاضری۔ مسجد میں روزانہ مجلسیں اور تقریریں۔ ہر روز بیسیوں آدمیوں سے ملاقات۔ اور پھر ان سے طرح طرح کی گفتگو۔ مقدمات کی پیروی۔ روزانہ سینکڑوں خطوط پڑھنے اور پھر ان میں سے بہتوں کے جواب لکھنے۔ پھر گھر میں اپنے بچوں اور اہلِ بیت کو بھی وقت دینا اور باہر گھر میں بیعت کا سلسلہ اور نصیحتیں اور دعائیں۔ غرض اس قدر کام اور دماغی محنتیں اور تفکرات کے ہوتے ہوئے اور پھر تقاضائے عمر اور امراض کی وجہ سے اگر صرف اس عظیم الشان جہاد کے لئے قوت پیدا کرنے کو وہ شخص بادام روغن استعمال کرے تو کون بیوقوف اور ناحق شناس ظالم طبع انسان ہے جو اس کے اِس فعل پر اعتراض کرے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ بادام روغن کوئی مزیدار چیز نہیں اور لوگ لذت

کے لئے اس کا استعمال نہیں کرتے۔ پھر اگر مزے کی چیز بھی استعمال کی تو ایسی نیت اور کام کرنے والے کے لئے تو فرض ہے۔ حالانکہ ہمارے جیسے کاہل الوجود انسانوں کے لئے وہی کھانے تعیش میں داخل ہیں۔

اور پھر جس وقت دیکھا جائے کہ وہ شخص ان مقوی غذاؤں کو صرف بطور قوت لایموت اور رسد رمق کے طور پر استعمال کرتا ہے تو کون عقل کا اندھا ایسا ہوگا کہ اس خوراک کو لذائذ حیوانی اور حظوظ نفسانی سے تعبیر کرے۔ خدا تعالیٰ ہر مومن کو بدظنی سے بچائے۔

دودھ کا استعمال آپ اکثر رکھتے تھے اور سوتے وقت تو ایک گلاس ضرور پیتے تھے اور دن کو بھی پچھلے دنوں میں زیادہ استعمال فرماتے تھے۔ کیونکہ یہ معمول ہوگیا تھا کہ ادھر دودھ پیا اور ادھر دست آگیا۔ اس لئے بہت ضعف ہوتا جاتا تھا۔ اس کے دُور کرنے کو دن میں تین چار مرتبہ تھوڑا تھوڑا دودھ طاقت قائم کرنے کو پی لیا کرتے تھے۔

دن کے کھانے کے وقت پانی کی جگہ گرمی میں آپ لسّی بھی پی لیا کرتے تھے اور برف موجود ہو تو اس کو بھی استعمال فرما لیتے تھے۔

ان چیزوں کے علاوہ شیرۂ بادام بھی گرمی کے موسم میں جس میں چند دانہ مغز بادام اور چند چھوٹی الائچی اور کچھ مصری پیس کر چھن کر پڑتے تھے۔ پیا کرتے تھے۔ اور اگرچہ معمولاً نہیں مگر کبھی کبھی رفع ضعف کے لئے آپ کچھ دن متواتر یخنی گوشت یا پاؤں کی پیا کرتے تھے۔ اور یہ یخنی بھی بہت بدمزہ چیز ہوتی تھی یعنی صرف گوشت کا اُبلا ہوا رس ہوا کرتا تھا۔

میوہ جات آپ کو پسند تھے اور اکثر خدام بطور تحفہ کے لایا بھی کرتے تھے۔ گاہے بگاہے خود بھی منگواتے تھے۔ پسندیدہ میووں میں سے آپ کو انگور، بمبئی کا کیلا۔ ناگپوری سنگترے، سیب، سردے اور سرولی آم زیادہ پسند تھے۔ باقی میوے بھی گاہے ماہے جو آتے رہتے تھے کھا لیا کرتے تھے۔ گنا بھی آپ کو پسند تھا۔

شہتوت بیدانہ کے موسم میں آپ بیدانہ اکثر باغ کی جنس سے منگوا کر کھاتے تھے اور کبھی کبھی ان دنوں سیر کے وقت باغ کی جانب تشریف لے جاتے اور مع سب رفیقوں کے اسی جگہ بیدانہ تڑوا کر سب کے ہمراہ ایک ٹوکرے میں نوشِ جان فرماتے۔ اور خشک میووں میں سے صرف بادام کو ترجیح دیتے تھے۔

چائے کا میں پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ آپ جاڑوں میں صبح کو اکثر مہمانوں کے لئے روزانہ بنواتے تھے اور خود بھی پی لیا کرتے تھے۔ مگر عادت نہ تھی۔ سبز چائے استعمال کرتے۔ اور سیاہ کو ناپسند فرماتے تھے۔ اکثر دودھ والی میٹھی پیتے تھے۔

زمانہ موجودہ کے ایجادات مثلاً برف اور سوڈا لیمونیڈ، جنجر وغیرہ بھی گرمی کے دنوں میں پی لیا کرتے تھے بلکہ شدت گرمی میں برف بھی امرتسر۔ لاہور سے منگوا لیا کرتے تھے۔

بازاری مٹھائیوں سے بھی آپ کو کسی قسم کا پرہیز نہ تھا نہ اس بات کی پرچول تھی کہ ہندو کی ساخت ہے یا مسلمانوں کی۔ لوگوں کی نذرانہ کے طور پر آوردہ مٹھائیوں میں سے بھی کھا لیتے تھے اور خود بھی روپیہ دو روپیہ کی مٹھائی منگوا کر رکھا کرتے تھے۔ یہ مٹھائی بچوں کے لئے ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ اکثر حضور ہی کے پاس چیزیں یا پیسہ مانگنے دوڑے آتے تھے۔ میٹھے بھرے ہوئے سموسے یا بیدانہ عام طور پر یہ دو ہی چیزیں آپ ان بچوں کے لئے منگوا رکھتے۔ کیونکہ یہی قادیان میں ان دنوں میں اچھی بنتی تھیں۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آپ کو اپنے کھانے کی نسبت اپنے مہمانوں کے کھانے کا زیادہ فکر رہتا تھا۔ اور آپ دریافت فرما لیا کرتے کہ فلاں مہمان کو کیا کیا پسند ہے۔ اور کس کس چیز کی اس کو عادت ہے۔ چوہدری محمد علی صاحب ایم اے کا جب تک نکاح نہیں ہوا۔ تب تک آپ کو اِن کی خاطر داری کا اس قدر اہتمام تھا کہ روزانہ خود اپنی نگرانی میں ان کے لئے دودھ، چائے، بسکٹ مٹھائی، انڈے وغیرہ برابر صبح کے وقت بھیجا کرتے اور پھر لے جانے والے سے دریافت بھی کر لیتے تھے کہ انہوں نے اچھی طرح سے کھا

بھی لیا۔ تب آپ کو تسلی ہوتی۔ اسی طرح خواجہ صاحب کا بڑا خیال رکھتے اور بار بار دریافت فرمایا کرتے کہ کوئی مہمان بھوکا تو نہیں رہ گیا یا کسی کی طرف سے ملازمانِ لنگر خانہ نے تغافل تو نہیں کیا۔ لبعض موقعہ پر ایسا ہوا کہ کسی مہمان کے لئے سالن نہیں بچا یا وقت پر ان کا کھانا رکھنا بھول گیا تو اپنا سالن یا سب کھانا اس کے لئے اٹھوا کر بھجوا دیا۔

بارہا ایسا بھی ہوا کہ آپ کے پاس تحفہ میں کوئی چیز کھانے کی آئی یا خود کوئی چیز آپ نے ایک وقت منگوائی پھر اس کا خیال نہ رہا اور وہ صندوق میں پڑی پڑی سڑ گئی یا خراب ہو گئی۔ اور اسے سب کا سب پھینکنا پڑا۔ یہ دُنیا دار کا کام نہیں۔

ان اشیاء میں سے اکثر چیزیں تحفہ کے طور پر خدا کے وعدوں کے ماتحت آتی تھیں۔ اور بارہا ایسا ہوا کہ حضرت صاحب نے ایک چیز کی خواہش فرمائی اور وہ اسی وقت کسی نووارد یا مرید با اخلاص نے لاکر حاضر کر دی۔

آپ کو کوئی عادت کسی چیز کی نہ تھی۔ پان البتہ کبھی کبھی دل کی تقویت یا کھانے کے بعد منہ کی صفائی کے لئے یا کبھی گھر میں سے پیش کر دیا گیا تو کھا لیا کرتے تھے۔ یا کبھی کھانسی نزلہ یا گلے کی خراش ہوئی تو بھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ حقہ تمباکو کو آپ ناپسند فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ ایک موقعہ پر کچھ حقہ نوشوں کو نکال بھی دیا تھا۔ ہاں جن ضعیف العمر لوگوں کو مدت العمر سے عادت لگی ہوئی تھی ان کو آپ نے بسبب مجبوری کے اجازت دے دی تھی۔ کئی احمدیوں نے تو اس طرح پر حقہ چھوڑا کہ ان کو قادیان میں وارد ہونے کے وقت حقہ کی تلاش میں تکیوں میں یا مرزا نظام الدین وغیرہ کی ٹولی میں جانا پڑتا تھا۔ اور حضرت صاحب کی مجلس سے اُٹھ کر وہاں جانا چونکہ بہشت سے نکل کر دوزخ میں جانے کا حکم رکھتا تھا اس لئے باغیرت لوگوں نے ہمیشہ کے لئے حقہ کو الوداع کہی۔

ہاتھ دھونا وغیرہ

کھانا سے پہلے عموماً اور بعد میں ضرور ہاتھ دھویا کرتے تھے۔ اور سردیوں میں اکثر

گرم پانی استعمال فرماتے۔ صابون بہت ہی کم برتتے تھے۔ کپڑے یا تولیہ سے ہاتھ پونچھا کرتے تھے۔ بعض مُلّانوں کی طرح داڑھی سے چکنے ہاتھ پونچھنے کی عادت ہرگز نہ تھی۔ کُلّی بھی کھانے کے بعد فرماتے تھے اور خلال بھی ضرور رکھتے تھے۔ جو اکثر کھانے کے بعد کیا کرتے تھے۔

رمضان میں سحری کے لئے آپ کے لئے سالن یا مرغی کی ایک ران اور فرنی عام طور پر ہوا کرتے تھے اور سادہ روٹی کے بجائے ایک پراٹھا ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ آپ اس میں سے تھوڑا سا ہی کھاتے تھے۔

کھانے میں مجاہدہ

اس جگہ یہ بھی ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اوائل عمر میں گوشہ تنہائی میں بہت بہت مجاہدات کئے ہیں اور ایک موقعہ پر متواتر چھ ماہ کے روزے منشائے الٰہی سے رکھے اور خوراک آپ کی صرف نصف روٹی یا کم روزہ افطار کرنے کے بعد ہوتی تھی۔ اور سحری میں بھی نہ کھاتے تھے۔ اور گھر سے جو کھانا آتا وہ چُھپا کر کسی مسکین کو دے دیا کرتے تھے۔ تاکہ گھر والوں کو معلوم نہ ہو۔ مگر اپنی جماعت کے لئے عام طور پر آپ نے ایسے مجاہدے پسند نہیں فرمائے۔ بلکہ اس کی جگہ تبلیغ اور قلمی خدمات کو مخالفانِ اسلام کے برخلاف اس زمانہ کا جہاد قرار دیا۔ پس ایسے شخص کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ دنیاوی لذتوں کا خواہشمند ہے سراسر ظلم نہیں تو کیا ہے ؟

لنگر خانہ میں آپ کے زمانہ میں زیادہ تر دال اور خاص مہمانوں کے لئے گوشت پکا کرتا تھا مگر جلسوں یا عیدین کے موقعہ پر یا جب کبھی آپ کے بچوں کا عقیقہ یا کوئی اور خوشی کا موقعہ ہو تو آپ عام طور پر اُس دن گوشت یا پلاؤ یا زردہ کا حکم دے دیا کرتے تھے کہ غربا کو بھی اس میں شریک ہونے کا موقع ملے۔

الہام

کھانا کھلانے کی بابت آپ کو ایک الہامی حکم ہے یاایھا النبی اطعموا الجائع والمعتر یعنی اے نبی بھوکے اور سوال کرنے والوں کو کھلاؤ۔

ادویات

آپ خاندانی طبیب تھے۔ آپ کے والد ماجد اس علاقہ میں نامی گرامی طبیب گزر چکے ہیں۔ اور آپ نے بھی طب سبقاً سبقاً پڑھی ہے مگر باقاعدہ مطب نہیں کیا۔ کچھ تو خود بیمار رہنے کی وجہ سے اور کچھ چونکہ لوگ علاج پوچھنے آجاتے تھے۔ آپ اکثر مفید اور مشہور ادویہ اپنے گھر میں موجود رکھتے تھے نہ صرف یونانی بلکہ انگریزی بھی۔ اور آخر میں تو آپ کی ادویات کی الماری میں زیادہ تر انگریزی ادویہ ہی رہتی تھیں۔ آپ کئی قسم کی مقوی دماغ ادویات کا استعمال فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کوکا۔ کولا۔ مچھلی کے تیل کا مرکب۔ ایسٹن سیرپ، کونین فولاد وغیرہ اور خواہ کیسی ہی تلخ یا بدمزہ دوا ہو آپ اس کو بے تکلف پی لیا کرتے۔

سر کے دورے اور سردی کی تکلیف کے لئے سب سے زیادہ آپ مشک یا عنبر استعمال فرمایا کرتے تھے اور ہمیشہ نہایت اعلیٰ قسم کا منگوایا کرتے تھے۔ یہ مشک خریدنے کی ڈیوٹی آخری ایام میں حکیم محمد حسین صاحب لاہوری موجد مفرح عنبری کے سپرد تھی۔ عنبر اور مشک دونوں مدت تک سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسی کی معرفت بھی آتے رہے۔ مشک کی تو آپ کو اس قدر ضرورت رہتی کہ بعض اوقات سامنے رومال میں باندھ رکھتے تھے کہ جس وقت ضرورت ہوئی فوراً نکال لیا۔ (سیرۃ المہدی حصہ دوم ص۱۱۹ تا ص۱۲۷)

تذکرہ

حضور کے الہام وکشوف ورؤیا

میں نے ۱۳ر مئی کے الفضل میں تذکرہ میں سے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے کچھ رویا و الہامات لکھے تھے۔ جو حضور کی وفات کے بعد پورے ہو کر حضور کی صداقت پر دلیل ٹھہرے۔ اور مزید وعدہ کیا تھا۔ آج کی صحبت میں کچھ اور باتیں حضور کے الہامات وکشوف ورویا میں پیش کرتا ہوں تاکہ احباب کے لئے ازدیادِ ایمان کا باعث ہوں اور مخالفین کے لئے حجت۔

(۱)

حضور کی ایک مشہور دعا ہے کہ ؎

"خود میرے کام کرنا یارب نہ آزمانا"

اس دُعا کی قبولیت حضور کی زندگی میں تو ظاہر ہی تھی۔ لیکن ۹ مئی ۱۹۰۸ء کو وفات سے قریباً دو ہفتہ پہلے خداتعالیٰ نے آئندہ کے لئے بھی یہ وعدہ فرما دیا کہ۔

"الرّحیل ثم الرّحیل۔ ان اللہ یحمل کل حمل"

کوچ کا وقت آگیا۔ اللہ تعالیٰ تمھارے سارے بوجھ اٹھا لے گا۔)

یعنی سارے کام خود کرے گا۔ پس یہ الہام جواب ہے حضور کی اس دُعا کا کہ ؎

خود میرے کام کرنا یارب نہ آزمانا۔

(۲)

۵ر اپریل ۱۹۰۵ء کو ایک الہام حضور نے شائع فرمایا کہ

اَلَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ (البقرہ : ۶۶)
ترجمہ :۔ اور تم اِن لوگوں (کے انجام) کو جنہوں نے تم میں سے (ہوتے ہوئے) سبت کے معاملہ میں زیادتی کی تھی۔

اور کہا کہ قوم مخالف کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا ترجمہ ہے (کہ وہ قوم مخالف ایسی ہوگی)۔ جو تم میں سے ہی ہوگی۔ اور وہ لوگ سبت کے دن یعنی ہفتہ کے دن ظلم اور سرکشی کریں گے۔ اب ہم تاریخ سلسلہ کو دیکھتے ہیں۔ کہ ہم میں سے ہی ایک گروہ نے ہفتہ کے روز جو خلافتِ ثانیہ کی بیعت کا پہلا دن تھا۔ بغاوت اور سرکشی اختیار کی تھی۔ پس یہ الہام ہفتہ والے دن کے باغیوں اور سرکشوں کا صرف غیر مبایعین پر ہی پورا ہوتا ہے اور لفظاً لفظاً پورا ہوتا ہے۔ یعنی (۱) کچھ سرکش لوگ ہوں گے (۲) وہ اسی جماعت میں سے ہوں گے (۳) وہ ہفتہ کے دن سرکشی کریں گے۔ اب اس سے زیادہ واضح اور صاف پیشگوئی اور کیا ہو سکتی ہے۔" (تذکرہ صفحہ ۶۶)

(۳)

"ریاست کابل میں قریباً پچاسی ہزار کے آدمی مریں گے" (تذکرہ ۶۵۲)
یہ وحی مارچ ۱۹۰۷ء کی ہے اور بیس اکیس سال بعد بچہ سقہ کی جنگوں میں بقول اخبارات کے قریباً نوے ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد تو لوگوں کے اندازے تھے۔ اصل اور صحیح تعداد تو وہی ہے جو خدا تعالیٰ نے بتائی۔ اور کسی عدد کا ایک پیشگوئی میں بتایا جانا پھر اس پیشگوئی کا اسی عدد کے مطابق پورا ہوتا ایسا غیب کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ایک عالم الغیب ہستی کا کام ہے۔ جیسے آج کل کے بعض بڑے بڑے حساب دانوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے۔ کہ دورِ شمسی ۴۸ ہزار سال تک چلتا ہے۔ پھر اس میں ایک فنا یا عظیم الشان تغیر آجاتا ہے۔ لیکن ان کی اس گنتی میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ اور سچی گنتی وہی ہے۔ جو عرب کے ایک اُمّی نے جسے خود ہزار سے اوپر

گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک عالم الغیب ہستی سے خبر پاکر یہ بتایا تھا کہ :-

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (معارج ۵،۶)

ترجمہ :- عام فرشتے اور کلامِ الٰہی لانے والے فرشتے اُس (خدا) کی طرف اتنے وقت میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔ پس تو اچھی طرح صبر کر

یعنی ایسا دن پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔

(۴)

برہمن اوتار سے مقابلہ کرنا اچھا نہیں (تذکرہ صفحہ ۵۶)

مدت ہوئی ایک دفعہ ایک ہندو سے میری گفتگو ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ کہ ہندوؤں میں کچھوا اور مگرمچھ تک اوتار ہوئے ہیں۔ اور کھتری ویش اور شودر بھی اپنے اپنے وقت میں اوتار ہوئے ہیں۔ لیکن دنیا میں آج تک کوئی برہمن اوتار نہیں ہوا۔ اور وہی آخری اوتار ہوگا۔ جس کا انتظار ہے۔ یہاں برہمن کا لفظ کسی خاص ذات یا گوت پر نہیں بولا گیا۔ بلکہ اس مقصد کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اوتار جنگ و جہاد سے تعلق نہیں رکھے گا۔ بلکہ علم کے زور سے قلوب کو تسخیر کرے گا۔ کیونکہ برہمن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ علم پڑھے اور پڑھائے۔ پس اہلِ ہنود کی تاریخ کے مطابق بھی حضور کا یہ الہام صحیح ٹھہرتا ہے کیونکہ حضور نے ہی دلائل و براہین اور نشانات کے زور سے دیگر تمام مذاہب پر غلبہ پایا ہے۔

(۵)

رویا۔ دیکھا کہ مرزا نظام الدین کے مکان پر مرزا سلطان احمد کھڑا ہے۔ اور سب لباس سرتاپا سیاہ ہے۔ ایسی گاڑھی سیاہی کہ دیکھی نہیں جاتی۔ اسی وقت معلوم ہوا

کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو سلطان احمد کا لباس پہن کر کھڑا ہے۔ اس وقت میں نے گھر میں مخاطب ہو کر کہا۔ کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تب دو فرشتے اور ظاہر ہو گئے اور تین کرسیاں معلوم ہوئیں۔ اور تینوں پر وہ تین فرشتے بیٹھ گئے۔ اور بہت تیز قلم سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ جس کی تیز آواز سنائی دیتی تھی۔ اُن کے اِس طرز کے لکھنے میں ایک رُعب تھا۔ میں پاس کھڑا ہوں۔ کہ بیداری ہو گئی۔ (تذکرہ ۴۸۸)

حضور نے اس خواب کی ایک تعبیر قبل از وقت بھی کی تھی۔ مگر یہ پیشگوئی عجیب واقعات اور غیب اپنے اندر رکھتی ہے جس کا اس وقت ۱۹۰۵ء میں کسی کو بھی علم نہ تھا۔ اس رویا میں درحقیقت مرزا سلطان احمد صاحب ہی کا ذکرِ خیر اور ان کی بابت ہی پیشگوئی تھی یعنی گو مخالفت اور دیگر وجوہ سے وہ سر تا پا سیاہ حالت میں ہیں۔ لیکن نظامِ سلسلہ یعنی اس خلیفہ کی بیعت میں داخل ہو کر جو اس سلسلہ کے نظام کا بانی ہو گا۔ وہ فرشتہ بن جائیں گے۔ اور خدا کے نزدیک کرسی نشین اور معزز ہو جائیں گے اس وقت میری روح بھی بول اُٹھے گی۔ کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ نیز اس رویا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم سمیت حضور کے تین بیٹے اہلِ قلم ہوں گے۔ اور ان کی قلموں کی آواز یعنی تحریر کا شہرہ دنیا بھی سُن لے گی۔ سو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور مرزا بشیر احمد اور مرزا سلطان احمد صاحب واقعی ایسے ہی مشہور اہلِ قلم ہیں۔ پس اس رویا کا ہر حصّہ ہم نے اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھ لیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

(۶)

"جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا۔ اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہو گا اور تیرا مخالف رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہے۔" (تذکرہ ۳۴۷)

یہ الہام نہایت واضح طور پر مسئلہ جنازہ کو صاف کر دیتا ہے۔ یعنی جو بھی تیری بیعت میں داخل نہیں ہو گا اور تیرا مخالف رہے گا ...... وہ جہنمی ہے اور جب جہنمی ثابت ہو گیا

تو اس کا جنازہ پڑھنا بموجب آیت
مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (التوبہ: ۱۱۳)
ترجمہ، بعد اس کے کہ اُن پر ظاہر ہو گیا کہ وہ دوزخی ہیں ۔
کے منع ہے ۔

(۷)

مولوی محمد علی صاحب کو رویا میں کہا " آپ بھی صالح تھے اور نیک ارادہ رکھتے تھے ۔ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ ۔ " اس رویا کی تعبیر تو یہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب مولوی محمد علی صاحب کا صالح اور نیک ہونا ایک امرِ ماضی ہو جائے گا ۔ لیکن ایک دوسری تعبیر اس رویا کی یہ بھی ہے ۔ کہ مولوی محمد علی سے مراد ان کی جماعت ہے ۔ کیونکہ امیر سے بعض دفعہ اس کا سارا گروہ مراد ہوتا ہے ۔ اور تعبیر یہ ہوا کہ ان کی جماعت میں صالح اور نیک ارادہ رکھنے والے اجزاء بھی ہیں ۔ وہ سب انشاءاللہ واپس آکر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ساتھ شامل ہو جائیں گے ۔ یعنی جو عضو بھی اہلِ پیغام کا اپنے اندر نیکی اور صلاحیت رکھتا ہو گا وہ آخر حضور کے قدموں میں آگرے گا ۔ خواہ مولوی محمد علی صاحب خود منحرف ہی رہیں ۔ کیونکہ صالح اور نیک حصہ کا آکر ساتھ بیٹھ جانے کی خبر ہے وہاں جو غیر صالح اور غیر حصہ ہے (خواہ وہ خود امیر ہی ہو) وہ نہیں آئے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ جس جس غیر مبائع میں نیکی اور صلاحیت ہوتی ہے ۔ وہ ضرور اس پیشگوئی کے مطابق حضور کے قرب میں آجاتا ہے ۔ اور یہی سلسلہ جاری رہے گا جب تک طیب غیر صالح سے الگ نہ ہو جائے ۔ ؎

جس کی فطرت نیک ہے وہ آئے گا انجام کار

چنانچہ ماسٹر فقیر اللہ صاحب ، خان بہادر صاحب ، محمد صادق صاحب ، سید امجد علی شاہ صاحب اور ان کا صاحبزادہ ۔ خان بہادر ڈاکٹر محمد شریف صاحب وغیرہ وغیرہ احباب جو مولوی محمد علی صاحب کے صالح اور نیک اعضا تھے ان سے الگ رہ گئے ۔ (الفضل ۲۷ جولائی

از زوجان

۳۰ مئی ۱۹۰۰ء

مکرمہ مخدومہ جناب ہمشیرہ صاحبہ سلامت باشد

..... حضرت اقدس ..... کے وصال کی خبر وحشت اثر معلوم ہو کر جو صدمہ ہوا اس کے بیان کی ضرورت نہیں پر ساتھ ہی میرا تو یہ حال ہے کہ میں لکھتا جاتا ہوں اور اعتبار نہیں آتا کہ یہ واقعہ سچ ہے۔ دل کو یقین نہیں آتا یا یہ کہو کہ دل یقین کرنا نہیں چاہتا مگر جو امر ہونا تھا اور خدا تعالیٰ کے ہاں سے مقدر تھا وہ ہوا۔ اس میں کسی انسان اور فرشتے کا دخل نہیں۔ آج تک کوئی انسان موت سے بچا ہے نہ بچے گا۔ تمام پیمبر، انبیاء اولیاء، بزرگ، پیر، صاحب کرامات خدا کے پیارے۔ غرض بڑے بڑے رتبے والے حتیٰ کہ سب کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی چند روزہ زندگی بسر کر کے اس جہان سے رحلت کی۔ ہزاروں روئے۔ لاکھوں نے اپنی جان اُن پر تصدق کرنی چاہی، نہایت تضرع اور سچے دل سے ہر شخص نے دعا کی یہ پیالہ ٹل جائے مگر نہ ٹل سکا۔ اور آخر سب کو پینا ہی پڑا۔ نبی رسول خدا کے پیارے دوست ہوتے ہیں۔ وہ ان کو کچھ مدت کے لئے دنیا میں ہدایت کے لئے بھیجتا ہے جب وہ اپنا کام کر چکتے ہیں تو پھر دنیا میں اُنکی ضرورت نہیں رہتی جب تک وہ یہاں رہتے ہیں لوگ اِن کے مخالف اور درپئے آزار رہتے ہیں۔ ہر طرح کے دُکھ دیتے ہیں اور سب وشتم کرتے ہیں۔ غرض ہر انداز اور ہر طور سے اُن کو تکلیف اور ایذا دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پس خدا بھی جب ان کا کام ہو چکتا ہے تو فوراً ہی اُن کو اپنے پاس دائمی آرام اور ہمیشہ کی راحت میں بُلا لیتا ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ ضرورت سے زیادہ وہ دنیا میں رہ کر تکلیف اٹھاویں۔ غرض انبیاء اور اولیاء کی موت

ایسی نہیں ہوتی کہ مرتے وقت اُن کو کوئی کاوش یا ہم و حزن ہو بلکہ وہ ان کو دُنیا سے بشارت اور دائمی برکت اور رحمت کے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور وہ لوگ جس طرح ایک بھوکا بچہ دیر کے بعد اپنی ماں کی گود میں ہمک کر جاتا ہے اسی طرح اپنے رب سے وصال پاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے اُس کے طرح طرح کے افضال اور الطاف کے مورد بنتے ہیں پس موت کا وارد ہونا اُس شخص کے لئے تو موجب فکر و تشویش ہو سکتا ہے جسے اگلے جہان میں اپنے اعمال کا فکر ہو مگر جو شخص معصوم خدا کی درگاہ میں واپس جاتا ہے نہیں بلکہ اس کا عزیز مہمان اور پیارا دوست بن کر جاتا ہے۔ تو اُس کے انتقال پر ہم کو رشک کرنا چاہیئے کہ جس طرح یہ مرنے والا تیرا مقرب اور پسندیدۂ درگاہ تھا۔ اسی طرح تو ہم کو بھی توفیق دے کہ تیرے فضل سے ہم بھی مریں تو تیرے نیک اور پیارے بندے ہو کر مریں اور آخرت میں ہم اس کے ساتھ ایسے ہی وابستہ رہیں جس طرح دنیا میں تھے۔

دوسری بات جو ہم کو اس واقعہ سے پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا صبر اور ہماری استقامت اس ابتلا کے موقع پر آزمانی چاہتا ہے۔ ایک ہمارا سب سے پیارا اس جہان سے رحلت فرما ہوا۔ اگر ایسی حالت اور ناگہانی صدمہ کے وقت انسان شدتِ غم میں خدا تعالیٰ کی حدود سے باہر نہ جاوے اور جو کچھ سر پر گذرا اُس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر اُسی سے صبر بھی مانگے اور ہر حال میں جیسا کہ ہم نے بیعت کے وقت سے اقرار کیا تھا اپنے عملوں سے بھی کر دکھادے کہ خدا کی رضا پر ہر طرح راضی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے دل کو صبر و قرار اور تسکین سے بھر دیتا ہے اور اس کے ایمان میں ترقی دیتا ہے۔ دل پر جو رنج گزرتا ہے وہ فطرتی ہے مگر کثرتِ ہموم کے وقت کسی ایسی بات کا ہو جانا ممکن ہے جو خدا کی نظر میں ناپسندیدہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۱۸ سال کی تھیں جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ انہوں

نے اور آپ کی ازواج نے جو نمونہ آپ کی وفات کے وقت دکھایا وہ قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ تم بھی اس فرقہ کی عورتوں کے لئے نمونہ ہو احتیاط رکھنی چاہیئے کہ ایسے موقع پر جبکہ مردوں کے چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جس کی تقلید کر کے آئندہ امت کی عورتیں کوئی بُری رسم اختیار کر لیں۔ تمہارے افعال، تمہارے اقوال تمہاری باتیں آئندہ کے لوگ سند پکڑیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ کی رضا میں تمہاری ہر بات ہو اور کوئی نمونہ ایسا نہ چھوڑ جاؤ جس پر قیامت تک کسی کی حرف گیری ہو سکے۔

عورت کے لئے خاوند کا مرنا سب سے بڑھ کر صدمہ اور غم ہے مگر ہمیشہ کے لئے نہیں اگر کوئی مر جاتا اور کوئی ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جاتا تو واقعی یہ صدمہ سخت صدمہ تھا مگر جب سب ایک راہ چل رہے ہیں اور آگے پیچھے سب کو مرنا ہے تو اگر یہی سمجھ لیا جائے۔ کہ مرنے والا سفر پر گیا ہے یا چند دن کے لئے غائب ہے اور پھر ہم اس کو ضرور ملیں گے۔ اور یہ ملاقات ایسی ہوگی کہ پھر اس میں جُدائی نہ ہوگی تو کیا یہ خوش آئند خیال نہیں ہے؟ ہاں اور لوگوں کو تو ڈر ہو سکتا ہے کہ بیوی شاید وہاں اپنے میاں سے یا میاں اپنی بیوی سے وہاں نہ مل سکے۔ کیونکہ ہر ایک کو اپنے اعمال کے سبب اجر دیا جاوے گا اور انجام کی کس کو خبر ہے مگر یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ ایمان لانے والی بی بی جو خدا تعالیٰ کی بشارت اور خوشخبری سے دُنیا میں اُس کے ساتھ رہی ہو۔ وہ اگلے جہان میں بھی اپنے میاں کے ساتھ ہوگی اور ضرور ہوگی۔

جماعتِ احمدیہ کے لئے یہ ایک سخت ابتلا ہے۔ پہلے وہ ایک بے فکر کی طرح تھے اور نام کے مددگار تھے۔ اب ان کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا کام وہ شخص اکیلا کرتا رہا۔

میرا ایمان ہے کہ اگر یہ فرقہ سچ ہے اور یقیناً سچ پر ہے تو خدا اس کو ہر طرح کی ہلاکت سے بچالے گا اور ہر دشمن کی دُشمنی سے محفوظ رکھے گا اور اسے دنیا کے اطراف میں پھیلادے گا وہ شخص تو اپنا کام پورا کر گیا۔ بلکہ وصیت بھی ایک چھوڑ دو دفعہ چھپوا دی تھی۔

اور لوگوں پر تبلیغ پوری ہو چکی تھی اور یہ ایک دن آنے والا باقی تھا سو آگیا۔ مگر وہ دن بھی خدا کا نشان ہو کر آیا اور دو پیش گوئیوں کو پورا کر گیا یعنی ایک تو الہام انتقال کے متعلق الرحیل ثم الرحیل والا اور "مباش ایمن از بازی روزگار" اور دوسرے وہ پرانا اور بار بار ہونے والا الہام یعنی داغ ہجرت اور وطن کی جدائی میں رحلت ہوگی۔ غرض خدا کے بندے مرتے مرتے بھی اپنا خدا کی طرف سے ہونے کا ثبوت دے جاتے ہیں۔ اوران کی ذات تو ایسی تھی کہ ان کا مرنا جینا سب خدا کی مرضی اور اس کی فرمانبرداری میں تھا۔ مگر ہم کو بھی جو پسماندگان میں رہ گئے ہیں۔ ایسا ہی نمونہ دکھانا چاہیئے جس میں خدا تعالیٰ کی مرضی پر سر رکھ دینے اور راضی بقضا ہونے کی خود ہمارے دل گواہی دے دیں۔

آپ مجھ سے بڑی ہیں اور سب باتوں میں مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور مجھے ایسا لکھنے کی ضرورت کچھ نہیں مگر میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس ناگہانی حادثہ کا آپ کے دل پر کیا صدمہ ہوا ہوگا۔ دنیا کی زندگی ایک تو خود چند روزہ ہے۔ مگر ان چند روزہ میں بھی اس سرائے کے مسافر اس طرح تعلق پذیر ہو جاتے ہیں کہ جدائی کا دن ایک بڑا سخت دن ہوتا ہے اور جو اس سختی کو اللہ کی مرضی کے مطابق سہہ لیتا ہے وہ آئندہ اس سے بڑھ کر خوشی دیکھے گا مجھے خود بے حد رنج ہے کہ میں ایسی دور ایسے ایسے وقت پر پڑا ہوا ہوں۔ علاوہ ازیں یہ کہ دریا کی طغیانی کے سبب راستے بہت مشکل اور قریباً مسدود ہیں۔ آپ کی بھاوج بھی آنے کو تیار بیٹھی ہیں۔ عرضی رخصت کی گئی ہوئی ہے اگر منظور ہوئی تو حاضر خدمت ہوں گا۔ ایک ہی ذات سب کا آسرا ہے۔ اسی سے ہر وقت دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہر مصیبت پر ثابت قدم رکھے اور اعلیٰ درجہ کا نیک نمونہ آئندہ نسلوں کے لئے بنائے اور ہماری زندگی اور موت اسی ایمان پر ہو۔ اور جس کی جدائی سے آج دل کو تپش سی لگی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ اور اس کے قدموں میں ہمارا حشر

ہو۔ اور ہمیشہ اس کے اصحاب اور متعلقین میں داخل رہیں خدا کے ہزار ہزار درود اور سلام تجھ پر ہوں اے غلام احمد کی روح!

اور بڑی بڑی برکتیں اور مراتب اور درجات اللہ تعالیٰ تجھے دیوے بدلے اس رحمت اور شفقت کے جو تو نے اُمتِ محمدی سے کی اور جو تعلیم تو نے ہم کو دی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی محمدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بارِك وسلّم

محمد اسمٰعیل

(از کتاب حضرت اماں جان)

سیرت حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگم کا اجمالی نقشہ

حضرت میر ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کی تحریر کا ایک کمال دریا کو کوزے میں بند کر دینا بھی ہے حضرت سیدہ نصرت جہاں حرم حضرت مسیح موعود کی سیرت کا اجمالی نقشہ پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

۱۔ بہت صدقہ خیرات کرنے والی۔
۲۔ ہر چندہ میں شریک ہونے والی۔
۳۔ اول وقت اور پوری توجہ اور انہماک سے پنج وقتہ نماز ادا کرنے والی۔
۴۔ صحت اور قوت کے زمانہ میں تہجد کا التزام رکھتی تھیں۔
۵۔ خدا کے خوف سے معمور
۶۔ صفائی پسند
۷۔ شاعر بامذاق
۸۔ مخصوص زنانہ جہالت کی باتوں سے دُور
۹۔ گھر کی عمدہ منتظم
۱۰۔ اولاد پر از حد شفیق
۱۱۔ خاوند کی فرمانبردار
۱۲۔ کینہ نہ رکھنے والی
۱۳۔ عورتوں کا مشہور وصف ان کی تریاہٹ ہے مگر میں نے حضرت ممدوحہ کو اس عیب سے ہمیشہ پاک اور بری دیکھا۔

"مَیں نے اپنی ہوش میں نہ کبھی حضور کو حضرت (اماں جان) سے ناراض دیکھا نہ سُنا بلکہ ہمیشہ وہ حالت دیکھی جو ایک آئیڈیل Ideal جوڑے کی ہونی چاہیئے بہت کم خاوند اپنی بیویوں کی وہ دلداری کرتے ہیں جو حضور حضرت (اماں جان) کی فرمایا کرتے تھے اور ہندوستانی میں ہی اکثر کلام کرتے تھے مگر شاذ و نادر پنجابی میں بھی۔ حالانکہ بچوں سے اکثر پنجابی بولا کرتے تھے۔"

(سیرۃ حضرت سیّدہ (نصرت جہاں بیگم) ص۳۸ حصہ دوم

حضرت سیدہ نصرت جہان بیگم کے لیلۃ القدر ہونے کے متعلق ایک روایت بزبان حضرت میر محمد اسمٰعیل

رمضان ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ قادیان میں لوگ حسب معمول لیلۃ القدر کی تلاش میں تھے کہ ایک روز مکرمی اخویم بابو فضل احمد صاحب بٹالوی مہاجر نے مجھے اپنی رؤیا سنائی کہ مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ حضرت (سیدہ نصرت جہاں) لیلۃ القدر ہیں۔ میں پہلے تو اس فقرہ کو سُن کر کچھ حیران حیران سا ہوا۔ پھر مجھ پر بھی واضح ہو گیا کہ حقیقتاً انسان ہی لیلۃ القدر ہوتے ہیں نہ کہ زمانہ ——— زمانہ بعض مبارک وجودوں سے منور اور مبارک ہو کر لیلۃ القدر کہلانے لگتا ہے۔ مگر یہ خاصیت اس زمانہ کی نہیں ہے بلکہ اس مبارک وجود کے فیضان کی ہے۔ جو اُسے بابرکت کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت مسیح موعود اور اسی طرح دیگر سب انبیا علیہم السلام کے زمانے ان کی برکات کی وجہ سے لیلۃ القدر کہلاتے ہیں۔ اور جب تک ایسے وجود دنیا میں رہتے ہیں۔ برکات کی ایک فضا عالم پر چھائی رہتی ہے۔ پس اگرچہ لیلۃ القدر کہنے کو ایک زمانہ یا ایک رات ہوتی ہے مگر اُس کی پشت پر کسی زندہ وجود کے برکات ہوتے ہیں۔ جو اُسے بابرکت بنائے رکھتے ہیں۔ ان معنوں میں کیا شک ہے کہ حضرت علیا کا وجود بھی ایک بہت بڑی لیلۃ القدر ہے .....

محمد اسمٰعیل

الصفہ قادیان

پیاری بیٹی محترمہ مریم صدیقہ صاحبہ کے نام مکتوب

حضرت میر محمد اسمٰعیل نے اپنی بیٹی کو شادی کے بعد گھر سے رخصت کرتے ہوئے بعض ہدایات اپنے قلم سے نوٹ بک میں تحریر کر کے دیں حضرت مصلح موعود (اللہ آپ سے راضی ہو) کے متعلق الٰہی بشارتیں تحریر کرنے کے بعد تحریر فرمایا:۔

مریم صدیقہ !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

..... تم اپنی خوش قسمتی پہ جتنا بھی ناز کرو کم ہے ......

" مریم صدیقہ جب تم پیدا ہوئیں تو میں نے تمہارا نام مریم اسی نیت سے رکھا تھا کہ تم کو خدا تعالیٰ اور اس کے سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف کر دوں۔ اس وجہ سے تمہارا دوسرا نام نذر الٰہی بھی تھا۔ اب اس نکاح سے مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بندہ نواز خدا نے میری درخواست اور نذر کو قبول کر لیا تھا اور تم کو ایسے خاوند کی زوجیت کا شرف بخشا جس کی زندگی اور اس کا ہر شعبہ اور ہر لحظہ خدا تعالیٰ کی خدمت اور عبادت کے لئے وقف ہے۔ پس اس بات پر بھی شکر کرو کہ تم کو خدا تعالیٰ نے قبول فرما لیا اور میری نذر کو پورا کر دیا۔ فالحمد للہ۔" ....

اس کے بعد محترم میر صاحب نے خاوند کی اطاعت کے بارہ میں ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درج کیا اور فرمایا:۔

" سمجھنے کے لئے بڑی موٹی بات یہ ہے کہ جس گھر میں خاوند بیوی کا مطیع ہو جائے یا بیوی خاوند کی مطیع ہو جائے وہی گھر بہشت بن جاتا ہے اگر دونوں اپنے تئیں بادشاہ خیال کریں تو ایسا گھر جہنم سے بدتر ہو

جاتا ہے۔ جب ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے تو ایک گھر میں کس طرح سما سکتے ہیں۔ پس عورت کو خاوند کے گھر جانے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیئے کہ میں نے کامل اطاعت سے اپنے گھر اور آخرت کو جنت بنانا ہے۔"

"میری پیاری مریم صدیقہ! تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری تین سوکنیں پہلے موجود ہیں۔ وہ تمہاری شادی سے پہلے بھی تمہاری بھابی جان تھیں اور تم ہم اور سب ان کی عزت اس لئے کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو حضرت خلیفۃ المسیح کی بیویاں بنایا تھا۔ اب تم بھی اس جماعت میں داخل ہوگئی ہو۔ پس ہمیشہ ان کو اپنا بزرگ اور عزیز اور بہنوں کی طرح خیال کرو۔ بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی عزت کرو جس طرح چھوٹی بہن اپنی بڑی بہن کی عزت کرتی ہے۔ اور ان کے بچوں کو ایسی ہی نظر سے دیکھو جس طرح ایک بہن دوسری بہن کے بچوں کو دیکھتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ وہ حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو کی نسل اور ذریت ہیں۔ خدا تعالیٰ تم کو توفیق دے۔

مریم صدیقہ! تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ حضرت خلیفۃ المسیح پر خدمتِ دین کا کتنا بوجھ ہے اور اس کے ساتھ کس قدر ذمہ داریاں اور تفکرات اور ہموم وغم وابستہ ہیں اور کس طرح وہ اکیلے تمام دُنیا کے بر سر کار زار ہیں۔ اور اسلام کی ترقی اور سلسلہ احمدیہ کی بہبودی کا خیال ان کی زندگی کا مرکزی نکتہ ہے۔ پس ایسے مبارک وجود کو اگر تم کبھی بھی خوشی دے سکو اور کچھ بھی ان کی تکان اور تفکرات کو اپنی بات چیت، خدمت گذاری اور اطاعت سے ہلکا کرسکو تو سمجھو کہ تمہاری شادی اور تمہاری زندگی بڑی

کامیاب ہے اور تمہارے نامہ اعمال میں وہ ثواب لکھا جائے گا جو بڑے سے بڑے مجاہدین کو ملتا ہے۔

بیوی کا پہلا فرض ہے کہ جب وہ خاوند کے گھر جائے تو اس کی مرضی پہچاننے کی کوشش کرے۔ اور اس کی طبیعت اور مزاج کا علم حاصل کرے۔ پھر اگلا مرحلہ یعنی خاوند کو راضی رکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مگر بعض باتیں ایسی ہیں جو عموماً خاوند کی تکلیف کا باعث ہوتی ہیں۔ اُن سے خاص کر احتراز چاہیئے اور میں اُن کا ذکر کر دیتا ہوں۔ اُن میں سے ایک بات یہ ہے کہ بیوی اکثر اوقات خرچ کے لئے تقاضا کرتی ہے۔ خرچ حکمت سے لینا چاہیئے۔ نہ کہ تقاضا اور تنگ کر کے اور جب خاوند کے پاس روپیہ موجود نہ ہو اس وقت مطالبہ کرنا اس کو تکلیف دینا ہے۔

ایک بات یہ ہے کہ بیوی اکثر اوقات بدمزاج یا خاموش رہے اور جب خاوند گھر میں آئے تو اُسے سچے دل سے خوش آمدید نہ کرے یا اس کی بات کاٹے یا ایسے الفاظ لوگوں کے سامنے کہے جس میں خاوند کی کسی قسم کی تحقیر ہو یا بہت نخرے کرے اور ناز برداری کی خواہش رکھے۔ اس کی خیر خواہی کی بات کو نہ مانے۔ مثلاً وہ کہے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ تو جواب کہ مجھے بھوک نہیں۔ وہ کوئی دوا تجویز کرے تو کہے یہ مجھے مفید نہیں ہوگی میں اسے استعمال نہیں کروں گی۔ وہ کوئی کپڑا یا تحفہ لا کر دے تو اُسے حقارت سے دیکھے۔ غرض ایسی بیسیوں چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن میں بیبیاں فیل ہو جاتی ہیں اور اپنی زندگی کو تلخ کر لیتی ہیں۔

بحث کرنا اور مخالف جواب دینا یہ خاوند کے دل سے بیوی کی محبت کو اس طرح اڑا دیتا ہے جس طرح ربڑ پنسل کے لکھے کو۔ اور یہ

عادت آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بہت ہے۔

مریم صدیقہ! تمہاری زندگی اب خلیفہ کی رضا جوئی اور خدا تعالیٰ کی محبت کے لئے ہے۔ اس لئے دُنیا کی چیزوں اور زینتوں سے ابھی سے اپنے دل کو ہٹا لو بجائے رنگین کپڑوں، عمدہ جوتوں، نفیس زیورات کے قرآن مجید، نمازیں، روزے نیک کام، عمدہ اخلاق، دینی کتابوں کا مطالعہ پاک خواتین اسلام کے نقشِ قدم پر چلنا۔ سلسلہ کی خدمات میں حصّہ لینا۔ یہ باتیں تمہارا مقصود ہو جائیں۔ اور دُنیا کی زیب و زینت اصل مقصد نہ رہے۔

مریم صدیقہ! صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تلاوت اگر ہمیشہ کرتی رہو گی تو تمہارے دل میں ایک نُور پیدا ہو گا۔"

اس کے بعد محترم میر صاحب نے اپنی بچی کو صفائی کے بارہ میں ہدایات دیں۔ جن میں یہ درج ہے کہ صبح، دوپہر، شام، تین وقت مسواک کرو اور فرمایا خوشبو اور عطر کو شارع نے بہت پسند کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"مصنوعی پوڈر اور لپ سٹک وغیرہ چیزیں جلد کو آخر کار خراب کر دیتی ہیں اور بعض ان میں سے زہریلی بھی ہوتی ہیں اور جو لوگ ایسی چیزوں کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ آخر ادنیٰ خیالات میں ہی محصور ہو جاتے ہیں اور حُسنِ اخلاق کی جگہ حُسنِ اعضاء ہی ان کا منتہائے نظر ہو جاتا ہے۔ پس سوائے گاہے بگاہے استعمال کے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں چاہیئے۔

مریم صدیقہ! جس نیک بی بی کو گھر کی صفائی۔ پکانا، سینا اور خانہ داری آتی ہے وہ خاوند کو زیادہ خوش کر سکتی ہے بہ نسبت اس کے جو نکمّی ناولیں یا قصّے ہی پڑھتی رہتی ہے یا اپنے ہی بناؤ سنگار میں مصروف رہتی ہے۔"

بیماری میں زیادہ گھبراہٹ اور بے صبری نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"بے قراری کا اظہار ایک معیوب بات ہے، صبر ایک اعلیٰ خلق ہے خصوصاً عورتوں کے لئے اور بھوک، بیماری، درد اور اذیت پر صبر کرنا، صدق، تقویٰ اور ایمان کی علامت ہے۔

مریم صدیقہ! ہر معاملہ میں اور ہر تکلیف اور مشکل اور آرام اور راحت میں خدا تعالیٰ تمہاری زندگی کو اپنے فضل سے نہایت کامیاب زندگی بنا دے گا۔ میں بھی تمہارے لئے خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں اور کرتا رہا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُعِیْذُہَا بِکَ وَذُرِّیَّتَہَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
یَا مَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ

پھر اُن کو قادیان کی سکونت مل جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کرو کم ہے۔ جو لڑکیاں قادیان میں پیدا ہوئیں اور یہاں جوان ہوئیں اور بیاہ کر باہر چلی گئیں اُن کے دل سے پوچھنا چاہیئے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔"

تندرستی اور صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور فرمایا۔

"صحت کے گرنے سے انسان کے خیالات، اخلاق اور اس کے نیک اعمال سب میں ناگوار تغیّر آجاتا ہے۔"

اختتام آپ نے ان الفاظ پہ کیا:۔

اوصیک بتقوی اللّٰہ والمواظمۃ علی ذکر اللّٰہ

خدا حافظ۔ والسلام۔ محمد اسمٰعیل

(روحانی صفحات ۴۹ تا ۵۶)

حضرت میر محمد اسحٰق صاحب کی وفات کس طرح ہوئی؟

میر صاحب (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کو کئی سال سے ایک بیماری تھی جو عود کر کر کے آتی تھی۔ یعنی اُن کے دماغ کا مصفّا پانی ناک کے راستے ٹپکنا شروع ہو جاتا۔ اور پھر خود ہی بند ہو جایا کرتا تھا۔ یہ ایک بہت شاذ بیماری ہے جس کا کوئی علاج اب تک معلوم نہیں ہوا۔ ہر حملہ کے بعد مرحوم بہت کمزور ہو جاتے تھے اور اہلِ خانہ سے اُسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ وہ گھبرا نہ جائیں۔ لاہور کے جلسہ مصلح موعود سے واپس تشریف لائے تو نزلہ ہو گیا۔ بخار آنے لگا اور ناک میں سے پانی گرنا پھر شروع ہو گیا۔ ۱۴ مارچ کو مجھے بلایا۔ میں نے نسخہ تجویز کیا۔ اشارہ سے کہا کہ والدہ داؤد کو اس پانی کے گرنے کی خبر نہ ہو۔ ۱۶ مارچ کی شام کو ۵ بجے شیخ احسان علی صاحب کی دکان کے آگے ملے۔ فرمایا کہ سر میں شدید درد ہے۔ کئی ٹکیاں اسپرین کی کھا چکا ہوں اب گھر جا رہا ہوں (گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے) میں یہ سن کر بیت مبارک میں عصر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہوا تھا کہ کسی نے کہا کہ میر صاحب دارالشیوخ میں بڑ کے درخت کے نیچے پڑے ہیں اور گر کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ جب میں وہاں پہنچا۔ تو دیکھا کہ لڑکے انہیں دبا رہے تھے اور پیر چھس رہے تھے۔ میاں عبدالمنان صاحب بھی پاس تھے۔ فرمایا کہ ناقابلِ برداشت درد میرے سر میں ہے۔ اور بغیر مارفیا کے کسی چیز سے فائدہ نہ ہوگا۔ میں نے شیخ احسان علی صاحب کے ہاں سے مارفیا انجکشن تیار کرا کے منگوائی اور لگا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد قدرے سکون ہو گیا۔ اتنے میں حضرت (مصلح موعود) نے گیسٹ ہاؤس تک جانے کے لئے اپنی موٹر بھیج

دی۔ تھوڑی دیر میں لیٹے لیٹے چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت جوش سے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں (یا تم گواہ رہو) کہ اللہ تعالیٰ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ ہے۔ اس کے بعد ہم نے کہا کہ موٹر احاطہ سے باہر کھڑی ہے اس پر سوار ہو جائیں۔ فرمانے لگے میرے لئے اب یہ بھی ناممکن ہے۔ اس پر کئی لڑکوں نے ان کی چارپائی اُٹھائی۔ اور باہر موٹر کے پاس لے گئے۔ فرمانے لگے یونہی گھر لے چلو۔ مجھے اور مولوی عبدالمنان صاحب کو فرمایا کہ گھر تک ہمراہ رہیں۔ گھر میں جا کر لٹایا گیا۔ بیوی سامنے آئیں۔ تو ہاتھ اُٹھا کر فرمانے لگے۔ بالکل فکر نہ کرو۔ میں اچھا ہوں مجھے کچھ تکلیف نہیں ہے۔ اور اس طرح ان کی تسلی کی۔ اتنے میں انیما تیار کیا گیا۔ اور کئی دفعہ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بعدہ دن کے کھانے کے قے آئی پھر جلد جلد غنودگی بڑھنے لگی۔

مگر قے جاری رہی۔ سخت دردِ سر قے اور غفلت کی وجہ سے نصف شب کے قریب خیال ہوا کہ یہ یوریمیا Uremia ہے پیشاب ربڑ کی نلکی سے نکالا گیا تو اس میں کافی ایلبیومن Albumen تھا مگر بعض اور علامات سے رات کے دو بجے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دماغ کا پانی یعنی Cerebro-Spinal Fluid کمر میں سوراخ کر کے نکالا جائے۔ وہ نکالا گیا۔ تو بہت زور سے دھار باندھ کر اور دودھ کی طرح سفید یعنی پیپ سے ملا ہوا نکلا۔ جس میں خوردبینی امتحان کرنے پر ہر قسم کے پیپ کے جراثیم پائے گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ پانی جو ہمیشہ ناک میں سے نکلا کرتا تھا اور دماغ کے اندر اور پردوں میں اس کا منبع تھا۔ وہ سیپٹک Septic ہو گیا ہے۔ اور سرسامی کیفیت۔ غفلت۔ تشنج۔ قے اور آنکھوں کا ایک طرف کو پھر جانا اور پتلیوں کا سکڑ جانا سب اسی وجہ سے ہے اور صورت ورم دماغ Meningitis کی قائم ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ بے ہوش ہو کر پھر ہوش نہیں آیا۔ تیز بخار اس دوران میں بڑھتا رہا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں انسان دعا اور دوا سے کوشش اور جدوجہد کرتے رہے۔ مگر تقدیرِ الٰہی انکار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ مغرب کے وقت روح مبارک قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ آفتابِ علم و حکمت اور مجموعہ محاسنِ اخلاقِ نبویہ ہمیشہ

کے لئے اس دنیا سے غروب ہوگیا۔ قادیان امرتسر اور لاہور کے معالجوں نے اپنے سب آلاتِ حرب استعمال کر لئے اور بیماری کے خلاف اپنی فولادی سوئیوں، شیشہ کی نلکیوں اور ربڑ کی پچکاریوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ مگر اجلِ مقدر نے سب پر فتح پائی اور اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (یونس: ۵۰) کہتے ہوئے اس مطمئنہ اور رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر: ۲۹) نفس کو لے جاکر بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

(الفضل یکم اکتوبر ۴۴ء)

سیرت المہدی (حصّہ اول، دوم وسوم) سے
حضرت میر محمد اسمٰعیل کی بیان کردہ چند روایات

روایت ۲۶ :۔ ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب نے بیان کیا کہ:۔
جب حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے لدھیانہ میں دعوٰی مسیحیت شائع کیا۔ تو میں ان دنوں چھوٹا بچہ تھا۔ اور شاید تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھے اس دعوے سے کچھ اطلاع نہیں تھی۔ ایک دن میں مدرسہ گیا تو بعض لڑکوں نے مجھے کہا کہ وہ جو قادیان کے مرزا صاحب تمہارے گھر میں ہیں۔ انہوں نے دعوے کیا ہے کہ حضرت عیسٰی فوت ہوگئے ہیں اور یہ کہ آنے والے مسیح وہ خود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے۔ کہ میں نے ان کی تردید کی کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ حضرت عیسٰی تو زندہ ہیں اور آسمان سے نازل ہوں گے خیر جب میں گھر آیا۔ تو حضرت صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آپ سے مخاطب ہوکر کہا۔ کہ میں نے سنا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ مسیح ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ میرا یہ سوال سُن کر حضرت صاحب خاموشی سے اُٹھے اور کمرے کے اندر الماری سے ایک نسخہ کتاب "فتح اسلام" (جو آپ کی جدید تصنیف تھی) لاکر مجھے دے دیا۔ اور فرمایا۔ اسے پڑھو۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے۔ کہ یہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی صداقت کی دلیل ہے۔ کہ آپ نے ایک چھوٹے بچے کے معمولی سوال پر اس قدر سنجیدگی سے توجہ فرمائی۔ ورنہ یونہی کوئی بات کہہ کر ٹال دیتے۔

روایت ۱۷۹ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا امرتسر میں آتھم کے ساتھ مباحثہ ہوا تو دورانِ مباحثہ میں ایک دن عیسائیوں نے خفیہ طور پہ ایک اندھا اور ایک بہرا اور ایک لنگڑا مباحثہ کی جگہ میں لاکر ایک طرف بٹھا دیئے اور پھر اپنی تقریر میں حضرت صاحب

کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ مسیح ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیجئے۔ یہ اندھے اور بہرے اور لنگڑے آدمی موجود ہیں۔ مسیح کی طرح ان کو ہاتھ لگا کر اچھا کر دیجئے۔ میر صاحب بیان کرتے ہیں کہ ہم سب حیران تھے۔ کہ دیکھئے اب حضرت صاحب اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ پھر جب حضرت صاحب نے اپنا جواب لکھوانا شروع کیا تو فرمایا کہ میں تو اس بات کو نہیں مانتا کہ مسیح اس طرح ہاتھ لگا کر اندھوں اور بہروں اور لنگڑوں کو اچھا کر دیتا تھا۔ اس لئے مجھ پر یہ مطالبہ کوئی حجت نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ آپ لوگ مسیح کے معجزے اس رنگ میں تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کا یہ بھی ایمان ہے کہ جس شخص میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو وہ وہی کچھ دکھا سکتا ہے جو مسیح دکھاتا تھا۔ پس میں آپ کا بڑا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اندھوں اور بہروں اور لنگڑوں کی تلاش سے بچا لیا اب آپ ہی کا تحفہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ اندھے بہرے اور لنگڑے حاضر ہیں۔ اگر آپ میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہے تو مسیح کی سنت پر آپ ان کو اچھا کر دیں۔ میر صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت صاحب نے جب یہ فرمایا تو پادریوں کی ہوائیاں اُڑ گئیں اور انہوں نے جھٹ اشارہ کر کے ان لوگوں ......کو وہاں سے رخصت کروا دیا۔ میر صاحب بیان کرتے ہیں۔ کہ وہ نظارہ بھی نہایت عجیب تھا کہ پہلے تو عیسائیوں نے لتنے شوق سے ان لوگوں کو پیش کیا اور پھر ان کو خود ہی اِدھر اُدھر چھپانے لگ گئے۔

روایت ۳۲۹ میں نے کبھی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی زبان سے غصہ کی حالت میں بھی گالی یا گالی کا ہم رنگ لفظ نہیں سُنا۔ زیادہ سے زیادہ بیوقوف یا جاہل یا احمق کا لفظ فرما دیا کرتے تھے اور وہ بھی کسی ادنیٰ طبقہ کے ملازم کی کسی سخت غلطی پر شاذ و نادر کے طور پر۔ خاکسار عرض کرتا ہے کہ مجھے جہاں تک یاد ہے حضرت صاحب کسی ملازم کی سخت غلطی یا بے وقوفی پر جانور کا لفظ استعمال فرماتے تھے جس سے منشاء یہ ہوتا تھا کہ تم نے جو فعل کیا ہے۔ یہ انسان کے شایانِ شان نہیں۔ بلکہ جانوروں کا سا کام ہے۔

روایت ۳۳ ۔ مجھے پچیس سال تک حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے عادات واطوار اور شمائل کو بغور دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ میں نے اپنی ساری عمر میں آج تک کامل طور پر تصنع سے خالی سوائے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے کسی کو نہیں دیکھا۔ حضور کے کسی قول یا فعل یا حرکت و سکون میں بناوٹ کا شائبہ تک بھی میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔

روایت ۳۴ ابتدائی ایّام کا ذکر ہے کہ والد بزرگوار (یعنی خاکسار کے نانا جان حضرت میر ناصر نواب صاحب) نے اپنا ایک بانات کا کوٹ جو مستعمل تھا ہمارے خالہ زاد بھائی سیّد محمد سعید کو جوان دنوں قادیان میں تھا کسی خادمہ عورت کے ہاتھ بطور ہدیہ بھیجا۔ محمد سعید نے نہایت حقارت سے کوٹ واپس کر دیا اور کہا کہ میں مستعمل کپڑا نہیں پہنتا۔ جب وہ خادمہ یہ کوٹ واپس لارہی تھی راستہ میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میر صاحب نے یہ کوٹ محمد سعید کو بھیجا تھا مگر اس نے واپس کر دیا کہ میں اُترا ہوا کپڑا نہیں پہنتا۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ اس سے میر صاحب کی دل شکنی ہو گی۔ تم یہ کوٹ ہمیں دے جاؤ۔ ہم پہنیں گے اور اُن سے کہہ دینا کہ میں نے رکھ لیا ہے۔

روایت ۳۵ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی زندگی کے آخری زمانہ میں اکثر دفعہ احباب آپ کے لئے نیا کُرتہ سِلوا لاتے تھے اور اسے بطور نذر پیش کر کے تبرک کے طور پر حضور کا اُترا ہوا کُرتہ مانگ لیتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ کسی نے میرے ہاتھ ایک نیا کُرتہ بھجوا کر پُرانے اترے ہوئے کُرتے کی درخواست کی۔ گھر میں تلاش سے معلوم ہوا کہ اس وقت کوئی اُترا ہوا بے دُھلا کُرتہ موجود نہیں۔ جس پر آپ نے اپنا مستعمل کُرتہ دھوبی کے ہاں کا دُھلا ہوا دیئے جانے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو دھوبی کے ہاں کا دُھلا ہوا کُرتہ ہے اور وہ شخص تبرک کے طور پر میلا کُرتہ لے جانا چاہتا ہے۔ حضور ہنس کر فرمانے لگے کہ وہ بھی کیا برکت ہے جو دھوبی کے ہاں دُھلنے سے جاتی رہے۔ چنانچہ وہ کُرتہ اس شخص کو

دے دیا گیا۔

روایت ۳۷۵۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اپنی جسمانی عادات میں ایسے سادہ تھے کہ بعض دفعہ جب حضور جراب پہنتے تھے تو بے توجہی کے عالم میں اس کی ایڑی پاؤں کے تلے کی طرف نہیں بلکہ اوپر کی طرف ہو جاتی تھی اور بار بار ایک کاج کا بٹن دوسرے کاج میں لگا ہوا ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات کوئی دوست حضور کے لئے گرگابی ہدیۃً لاتا تو آپ بسا اوقات دایاں پاؤں بائیں میں ڈال لیتے تھے اور بایاں دائیں میں چنانچہ اسی تکلیف کی وجہ سے آپ دیسی جوتی پہنتے تھے۔ اسی طرح کھانا کھانے کا یہ حال تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں تو اس وقت پتہ لگتا ہے کہ کیا کھا رہے ہیں کہ جب کھاتے کھاتے کوئی کنکر وغیرہ کا ریزہ دانت کے نیچے آجاتا ہے۔

روایت ۳۸۰ میں انٹرنس کا امتحان دے کر ۱۸۹۷ء میں قادیان آیا تو نتیجہ نکلنے سے پہلے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اکثر مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ کوئی خواب دیکھا ہے؟ آخر ایک دن میں نے بیان کیا کہ میں نے خواب میں گلاب کے پھول دیکھے ہیں۔ فرمانے لگے اس کی تعبیر تو غم ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ میں اس سال امتحان میں فیل ہو گیا۔ نیز ویسے بھی جن دنوں میں کوئی اہم اَمر حضور کے زیر نظر ہوتا تھا تو آپ گھر کی مستورات اور بچوں اور خادمہ عورتوں تک سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ اگر کسی نے دیکھا ہوتا تو بڑے غور اور توجہ سے سنتے تھے۔

روایت ۴۲۰ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سر کے بال منڈوانے کو بہت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ خارجیوں کی علامت ہے۔ نیز حضرت صاحب فرماتے تھے کہ ہمارے سر کے بال عقیقہ کے بعد نہیں مونڈے گئے۔ چنانچہ آپ کے سر کے بال نہایت باریک اور ریشم کی طرح ملائم تھے اور نصف گردن تک لمبے تھے لیکن آپ کی ریش مبارک کے بال سر کے بالوں کی نسبت موٹے تھے۔

روایت ۵۲۷ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو پرندوں کا گوشت پسند تھا۔ اور بعض دفعہ بیماری وغیرہ کے دنوں میں بھائی عبدالرحیم صاحب کو حکم ہوتا تھا کہ کوئی پرندہ شکار کر لائیں۔ جب تازہ شہد مع چھتہ کے آتا تھا تو آپ اسے پسند فرما کر نوش کرتے تھے۔ شہد کا چھتہ تلاش کرنے اور توڑنے میں بھائی عبدالعزیز ماہر تھے۔

روایت ۵۲۸ مقبرہ بہشتی میں دو قبروں کے کتبے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے خود لکھے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کا نمونہ ہیں کہ اس مقبرہ کے کتبے کس طرح کے ہونے چاہئیں۔ اب جو کتبے عموماً لکھے جاتے ہیں ان سے بعض دفعہ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شخص کہاں دفن ہے یا اس کے اندر کیا کیا خوبیاں تھیں یا سلسلہ کی کس کس قسم کی خدمت اس نے کی ہے دو کتبے جو حضور نے خود لکھے وہ مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور صاحبزادہ مبارک احمد کے ہیں۔

روایت ۵۲۹ سفر ملتان کے دوران میں حضرت صاحب ایک رات لاہور میں شیخ رحمت اللہ صاحب مرحوم کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے تھے۔ ان دنوں لاہور میں ایک کمپنی آئی ہوئی تھی۔ اس میں قدِ آدم موم کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔ جن میں بعض پرانے زمانہ کے تاریخی بُت تھے اور بعض میں انسانی جسم کے اندرونی اعضاء طبی رنگ میں دکھائے گئے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم حضرت صاحب کو اور چند احباب کو وہاں لے گئے اور حضور نے وہاں پھر کر تمام نمائش دیکھی۔

روایت ۵۳۰ جب حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اپنی کسی تقریر یا مجلس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتے۔ تو لبسا اوقات ان محبت بھرے الفاظ میں ذکر فرماتے کہ "ہمارے آنحضرت" نے یوں فرمایا ہے۔ اسی طرح تحریر میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے بعد ؐ یا صلعم نہیں لکھتے تھے بلکہ پورا درود یعنی صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کرتے تھے۔

روایت ۵۵۷۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) صدقہ میں جانور کی قربانی بہت کیا کرتے تھے گھر میں کوئی بیمار ہوا یا کوئی مشکل درپیش ہوئی یا خود یا کسی اور نے کوئی منذر خواب دیکھا تو فوراً بکرے یا مینڈھے کی قربانی کرا دیتے تھے۔ زلزلہ کے بعد ایک دفعہ غالباً مفتی محمد صادق کے لڑکے نے خواب میں دیکھا کہ قربانی کرائی جائے۔ جس پر آپ نے چودہ بکرے قربانی کرا دیئے۔ غرضیکہ ہمیشہ آپ کی سنّت یہی رہی ہے۔ اور فرماتے تھے کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت بھی تھی۔

روایت ۶۸۹۔ قریباً ۹۳ء تک گول کمرہ ہی مہمان خانہ ہوتا تھا۔ پھر اس میں پریس آگیا۔ جب یہاں مہمان خانہ تھا تو یہیں کھانا وغیرہ کھلایا جاتا تھا۔ اور کاتب بھی اسی جگہ مسودات کی کاپیاں لکھا کرتا تھا۔ اور حضرت صاحب کا ملاقات کا کمرہ بھی یہی تھا۔ ان دنوں میں مہمان بھی کم ہوا کرتے تھے۔ ۹۵ء میں حضرت والد صاحب یعنی میر ناصر نواب صاحب پنشن لے کر قادیان آگئے۔ اور چونکہ اس وقت پریس اور مہمانوں کے لئے فصیل قصبہ کے مقام پر مکانات بن چکے تھے۔ اس لئے میر صاحب گول کمرہ میں رہنے لگے اور انہوں نے اس کے آگے دیوار روک کر ایک چھوٹا سا صحن بھی بنا لیا۔

روایت ۷۶۴۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) عموماً رات کو سونے سے پہلے دبوایا کرتے تھے۔ کبھی خود باہر سے خدام میں سے کسی کو بُلا لیتے تھے۔ مگر اکثر حافظ معین الدین عرف مانا آیا کرتے تھے۔ مَیں بھی سوتے وقت کئی دفعہ دبانے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میاں تم نے مدّت سے نہیں دبایا۔ آؤ آج ثواب حاصل کرلو۔

روایت ۷۶۵۔ بعض اوقات گرمی میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی پشت پر گرمی دانے نکل آتے تھے تو سہلانے سے اُن کو آرام آتا تھا۔ بعض اوقات فرمایا کرتے۔ کہ میاں "جلُون" کرو۔ جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ انگلیوں کے پوٹے بالکل آہستہ آہستہ اور نرمی سے پشت پر پھیرو۔ یہ آپ کی اصطلاح تھی۔

روایت ۷۹۶۔ میں نے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی دو دفعہ بیعت کی۔ ایک دفعہ غالباً ۱۸۹۶ء میں مسجد اقصیٰ میں کی تھی۔ اس وقت میرے ساتھ ڈاکٹر لودے خان صاحب مرحوم نے بیعت کی تھی۔ دوسری دفعہ گھر میں جس دن حضرت ام المومنین نے ظاہری بیعت کی اسی دن میں نے بھی کی تھی۔ حضرت ام المومنین کی بیعت آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر لی تھی۔ باقی تمام مستورات کی صرف زبانی بیعت لیا کرتے تھے۔

روایت ۷۹۷۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے اس سفر دہلی میں جو آپ نے اوائل دعویٰ میں ۱۸۹۱ء میں کیا تھا میں اور والدہ صاحبہ حضرت صاحب کے ساتھ تھے۔ میر صاحب یعنی والد صاحب کی تبدیلی پٹیالہ ہوئی تھی۔ وہ وہاں نئے کام کا چارج لینے گئے تھے۔ اس لئے ہم کو حضرت صاحب کے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ حضرت صاحب نواب لوہارو کی کوٹھی کے اُوپر جو مکان تھا اس میں اُترے تھے۔ یہیں ایک طرف مردانہ اور دوسری طرف زنانہ تھا۔ اکثر اوقات زنانہ سیڑھی کے دروازوں کو بند رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ لوگ گالیاں دیتے ہوئے اُوپر چڑھ آتے تھے اور نیچے ہر وقت شور و غوغا رہتا تھا۔ اور گالیاں پڑتی رہتی تھیں۔ بدمعاش لوگ اینٹیں اور پتھر پھینکتے تھے۔ میری والدہ صاحبہ نے ایک روز مجھے سُنایا کہ جو بڑھیا روٹی پکانے پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن کہنے لگی کہ "بیوی یہاں آج کل دہلی میں کوئی آدمی پنجاب سے آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مَیں حضرت عیسیٰ ہوں اور امام مہدی ہوں۔ اس نے شہر میں بڑا فساد مچا رکھا ہے اور کفر کی باتیں کر رہا ہے۔ کل میرا بیٹا بھی چھری لے کر اس کو مارنے گیا تھا۔ کئی ہتے کئے۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھل نہ سکا۔ مولویوں نے کہہ رکھا ہے کہ اس کو قتل کر دو۔ مگر میرے لڑکے کو موقعہ نہ ملا۔" اس بیچاری کو اتنی خبر نہ تھی کہ جن کے گھر میں بیٹھی وہ یہ باتیں کر رہی ہے یہ انہی کا ذکر ہے اور اسی گھر پر حملہ کر کے اس کا بیٹا آیا تھا۔ اور بیٹے صاحب کو بھی پتہ نہیں لگا۔ کہ میری ماں اسی گھر میں کام کرتی ہے۔

باب ہفتم

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی

(اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی

آپ وہ ہیں جنہیں سب راہ نما کہتے ہیں — اہلِ دل کہتے ہیں اور اہلِ دُعا کہتے ہیں

آپ کو حق نے کہا "سخت ذکی" اور "فہیم" — "مظہرِ حق و عُلیٰ" "ظلِّ خدا" کہتے ہیں

رستگاری کا سبب آپ ہیں قوموں کے لیے — ہر مصیبت میں تمہیں لوگ دوا کہتے ہیں

استجابت کے کرشمے ہوئے مشہورِ جہاں — آپ کے دَر کو درِ فیض و عطا کہتے ہیں

کوئی آتا ہے یہاں سائلِ دنیا بن کر — مطلب اپنا وہ زر و مال غنا کہتے ہیں

رزق اور عزّت و اولاد کے گاہک ہیں کئی — بخشوانے کو کوئی اپنی خطا کہتے ہیں

کوئی دربار میں آتا ہے کہ مِل جائیں علوم — کوئی لینے کو طلب گارِ شفا کہتے ہیں

نیک بننے کے لیے سینکڑوں در پر ہیں پڑے — خود کو مُشتاقِ رہِ زُہد و تقیٰ کہتے ہیں

طالبِ جنّتِ فردوس ہیں اکثر عاقل — دارِ فانی کو فقط "ایک سَرا" کہتے ہیں

میں بھی سائل ہوں طلبگار ہوں اِک مطلب کا — کوئے احمد کا مجھے لوگ گدا کہتے ہیں

میری اک عرض ہے اور عرض بھی مشکل ہے بہت — دیکھئے آپ بھی سُن کر اُسے کیا کہتے ہیں

جس کی فرقت میں تڑپتا ہوں وہ کچھ رحم کرے۔ — یعنی مِل جائے مجھے جس کو خدا کہتے ہیں

ہیچ کس نیست کہ در کوئے تو اش کارے نیست
ہر کس ایں جا بامیدِ ہوسے می آید

(بخارِ دل صد ۴۹، ۵۰)

مُصلح موعود کا نام فضلِ عمر کیوں رکھا گیا؟

حضرت مُصلح موعود کی ایک پہچان حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے یہ فرمائی ہے کہ الہاماً مجھ پر اس کا ایک نام فضل عمر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کی شناخت اُن فضیلتوں کی موجودگی سے ہوسکے گی جو حضرت عمرؓ میں پائی جاتی ہیں اور ان میں ایک فضیلت تو ایسی ہے کہ وہ سوائے حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ کے دُنیا کے کسی اور فردِ بشر میں پائی ہی نہیں جاسکتی۔ یعنی۔

(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ ثانیہ کے زمانہ میں۔ حضور کا دوسرا خلیفہ ہونا جیساکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعثتِ اولیٰ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ تھے۔ یہ فضل یا فضیلت ایسی محکم اور ایسی غیر منفک ہے کہ حضرت فضل عمر سے ...... نہ تو پہلے کوئی ایسا شخص ہوا ہے جسے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا دوسرا خلیفہ ہونے کا فخر حاصل ہو۔ نہ آئندہ کوئی ایسا شخص پیدا ہوسکتا ہے۔ جو اس عہدہ پر سرفراز ہوسکے۔ تیسرا چوتھا پانچواں بیسواں غرض ہر نمبر کا خلیفہ اس سلسلہ میں آسکتا ہے۔ مگر نہیں آسکتا تو دوسرا۔ رہے غیر مبائعین سو وہ تو سرے سے خلافت ہی کے قائل نہیں۔ اور جو کچھ اور لوگ مصلح موعود ہونے کے مدعی ہیں ان سب میں سے کسی ایک کو بھی جماعت احمدیہ کی خلافت بحیثیت دوسرے خلیفہ مسیح موعود ہوتے حاصل نہیں۔ اور نہ انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا۔ پس یہ ایک ایسا محکم تعین کا نشان مصلح

موعود کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ جس میں اشتباہ کا دخل ہی نہیں رہا۔ اور سوائے ایک انسان کے کوئی اس عہدے کا مدعی ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اس صفاتی نام سے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ مصلح موعود کون ہے۔ اور اگر غور کیا جاوے تو ایسی محکم علامات چار ہیں۔

۱۔ آپ کا حضرت مسیح موعود کے تخم ذریت اور نسل سے ہونا۔

۲۔ آپ کا نو سالہ میعاد کے اندر پیدا ہونا۔

۳۔ آپ کا بشیر اوّل کے معاً بعد تولد ہونا

۴۔ اور آپ کا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی جماعت کا دوسرا خلیفہ ہونا۔

(۲)

اس مخصوص فضل کے سوا بعض اور فضیلتیں بھی حضرت عمر رض کی ہیں جو حضرت فضلِ عمر میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس طرح حضرت عمر رض کے زمانہ میں فتوحات بہت وسیع ہو گئی تھیں اور اسلام نے بہت ترقی کی تھی۔ اور اکثر متمدن ممالک میں افواج اسلامیہ اور مبلغین اسلام جا پہنچے تھے۔ اسی طرح حضرت فضلِ عمر کے زمانہ میں بھی احمدیت اور دین حق کے مبلّغ دُنیا کے اکثر ممالک اور زمین کے اکثر گوشوں اور کناروں تک پہنچ گئے ہیں۔ پہنچ چکے ہیں۔ اور سلسلہ کی کتابیں۔ حالات اور اخبارات اکثر بیرونی اور اجنبی ممالک میں نفوذ کر چکے ہیں اور احمدیت کی فتوحات رعب۔ وسعت اور غنائم محتاج بیان نہیں ہے۔ نیز حضور کے علوم نے لوگوں کو نہایت درجہ سیراب کر دیا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رض کی بابت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک خواب ہے کہ میں نے دیکھا کہ ایک کنواں ہے جس پہ ڈول رکھا ہے۔ ابوبکر رض نے ایک دو ڈول ناتوانی کے ساتھ کنوئیں میں سے نکالے۔ پھر وہ ڈول ایک چرب بن گیا۔ اور عمرؓ نے اس سے اتنا پانی نکالا۔ کہ آدمی اور اونٹ سب سیراب ہو گئے۔ سو یہ دوسری مماثلت ہے حضرت فضلِ عمر کی حضرت عمر رض کے ساتھ۔

۳

اسی طرح ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے رویاء میں دکھایا گیا کہ میں نے دودھ پیا۔ یہاں تک کہ میرے ناخنوں تک اس کی تری پہنچ گئی۔ پھر میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر بن خطابؓ کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا اس کی تعبیر کیا ہے؟ فرمایا اس سے مراد علم ہے۔ پس جس طرح حضرت عمرؓ کو نبوت کے علم میں سے حصہ ملا تھا۔ اسی طرح حضرت فضلِ عمر کو بھی وہی حصہ ملا ہے۔ اور دوست دشمن اس کرامت کے معترف ہیں۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں صرف یہ یاد رکھنا کافی ہوگا کہ حضرت عمرؓ کی کام کرنے کی طاقت اور آنجناب کا علم جن کا ہم نے نمبر ۲ اور نمبر ۳ میں ذکر کیا ہے۔ ایسا ہی حال حضرت فضلِ عمر کا بھی ہے کہ جسمانی کام کی قوت اور علمی قوت دونوں کا مظاہرہ قریباً قادیان میں رہنے والے احمدی کے سامنے ہوتا رہتا ہے اور اسی کی طرف حضرت مسیح موعود کے اس الہام میں اشارہ ہے کہ ایک فرزند تمہیں عطا کیا جائے گا۔ جو قوی الطاقتین ہوگا۔ اور یہ کہ وہ علومِ ظاہری اور باطنی سے پُر کیا جائے گا۔

۴

حضرت عمرؓ اپنی اس بات پر بھی فخر کیا کرتے تھے کہ میں نے بعض دفعہ جو باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیں تو میری عرضداشت کے اور میری مرضی کے مطابق قرآنی آیتیں بھی نازل ہوگئیں۔ منجملہ ان کے ایک آیت حجاب بھی ہے

حضرت فضلِ عمر کی عمر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے زمانہ میں اتنی تو نہ تھی کہ وہ حضور کو کوئی مشورہ دیا کرتے۔ لیکن ایک رنگ توارد الہامی کا یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال وہ رویا حضرت فضلِ عمر کی ہے۔ جس میں آپ نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو انی مع الافواج اتیک بغتۃ والا الہام ہوا ہے۔ چنانچہ جب حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

ہاں آج رات واقعی مجھے یہ الہام ہوا ہے۔ پس جس طرح حضرت عمرؓ کا القا رویائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح حضرت فضلِ عمر کا رویا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی وحی کی صورت میں نمودار ہوا یہ چوتھی مماثلت ہے۔

۵

پانچویں مماثلت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی تھی۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی حضرت فضلِ عمر کو اپنی اولاد میں ہونے کی وجہ سے جنت کی بشارت اسی دنیا میں دے دی۔ جب آپ نے یہ فرمایا کہ مقبرہ بہشتی میں داخل ہونے کے لئے میری نسبت اور میرے اہل و عیال کی نسبت خدا نے استثناء رکھا ہے .... اور شکایت کرنے والا منافق ہوگا۔ یعنی میری اولاد اور میری بیوی کو خدا تعالیٰ نے جنتی بنایا ہے۔ اور مجھے ان کے بہشتی ہونے کی اطلاع اس کی طرف سے مل چکی ہے۔ علاوہ ازیں مخصوص طور پر بھی حضور کے جنتی ہونے کی بشارت حضور کے تولد ہونے سے پہلے ہی الہاماً بتا دی گئی تھی۔ جیسے کہ فرمایا "تب اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اٹھایا جائے گا۔ یعنی برخلاف قول مولوی مصری کے پسرِ موعود کا انجام اچھا ہوگا۔ اور اس کی روح کا رفع آسمان کی طرف ہوگا۔

(اس موقع پر ایک ضمنی بات بیان کرنی ضروری ہے کہ پیغامی کہا کرتے ہیں کہ اوروں کے لئے تو یہ مقبرہ بہشتی تھا۔ مگر مسیح موعود کے اہل و عیال کے لئے یہ خاندانی مقبرہ ہے کیونکہ ان کی طرف سے کوئی وصیت کی رقم داخل نہیں کی گئی۔ اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ حضور نے مقبرہ کی بنیاد رکھنے کے وقت اپنی جائیداد میں سے اس وقت کے حساب سے ایک ہزار روپیہ کی زمین چندہ میں یعنی وصیت میں دی تھی۔ حضور کو تو وصیت کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ آپ کو تو فریقین بالاتفاق رائے جنتی مانتے ہیں پس یہ ہزار روپے کی زمین حضور نے خود اپنے اہل و عیال ہی کی طرف سے دی تھی۔

۶

چھٹی مشابہت حضرت عمرؓ اور حضرت فضلِ عمر کے مزاجوں کی مماثلت ہے حضرت عمرؓ کی غیرت دینی اور جلال کون ہے جو نہیں جانتا۔ اور یہاں حضرت فضلِ عمر کے بارے میں یہ الہام ہے۔

"جس کا نزول بہت مبارک اور جلالِ الٰہی کا موجب ہوگا۔" نیز "خدا کی رحمت اور غیوری نے اسے کلمۂ تمجید سے بھیجا ہے۔"

سب جماعت کے لوگ جانتے ہیں کہ دینی معاملہ میں غیرت اور جلال حضرت فضلِ عمر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جس طرح کہ وہ حضرت عمرؓ کی تھی۔

(۷)

ساتویں مشابہت حضرت عمرؓ کے ساتھ حضرت فضلِ عمر کی یہ ہے کہ آپ بھی مُحَدَّث ہیں یعنی مُلہم۔ اور حضور کے حق میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم اس میں اپنی روح ڈالیں گے (یعنی کلام)

اسی طرح حضرت عمرؓ کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امم سابقہ کے مُحَدَّثوں کی طرح عمرؓ بھی ایک محدث اور ملہم ہے۔ چنانچہ کئی آیتوں کے مضامین پہلے حضرت عمرؓ کے دل پر نازل ہوئے پھر قرآن میں وحی متلو کی صورت میں آگئے اور بعض آپ کے رویاء اور کشف بھی مشہور ہیں۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد فوراً ہی کسی نبی نے آنا ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔ یا یہ کہ میں نہ مبعوث ہوتا تو عمر مبعوث ہوتا۔ یہ سب باتیں نورِ نبوت اور الہامی فطرت اور وحی کی برداشت کی طاقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان ہی باتوں کو احمدیہ جماعت کے لوگ حضرت فضلِ عمر میں بھی ہمیشہ سے دیکھ

رہے ہیں۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص اپنی گائے لئے جاتا
تھا کہ تھکان کے مارے خود اس گائے پر سوار ہو گیا۔ گائے نے اس سے کہا کہ ہم تو کاشتکاری
کے لئے پیدا کی گئی ہیں نہ کہ سواری کے لئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا سبحان اللہ کیا گائے بیل بھی
بولا کرتے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تو اس بات کو مانتا ہوں۔ بلکہ ابوبکرؓ
اور عمرؓ بھی مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں اس مجلس میں موجود نہ تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں صاحب کشف
تھے۔ کیونکہ سب معاملہ اس گائے کی تقریر کا کشفی ہے۔ رہا اس کا ثبوت سو یہ ہے کہ ایک
دفعہ اپنی خلافت کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے جمعہ کا خطبہ پڑھتے پڑھتے "یا ساریۃ الجبل
یا ساریۃ الجبل" پکار کر فرمایا۔ حاضرین خطبہ حیران ہوئے۔ اور بعد نماز جمعہ اس کی بابت
آپ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اسلامی لشکر کو میدانِ جنگ میں سخت مصیبت
میں دیکھا اور ساتھ ہی یہ نظارہ دیکھا کہ اگر وہ پہاڑ کی طرف پناہ لے لیں تو بچ سکتے ہیں۔ اس
لئے میں نے سردارِ لشکر ساریہ کو آواز دی کہ پہاڑ کی پناہ لو۔ پہاڑ کی پناہ لو۔ کچھ مدت کے بعد
جب اس لشکر کے لوگ مدینہ میں آئے۔ تو انہوں نے بیان کیا کہ ہم دشمن کے نرغے میں آ گئے
تھے۔ لیکن ایک آواز آئی کہ اے ساریہ پہاڑ کی پناہ لو۔ پس ہم ادھر چلے گئے۔ اور تباہی سے
محفوظ ہو گئے۔ سو یہ مشہور کشف ہے جو حضرت عمرؓ کو صاحب کشف ہونا ثابت کرتا ہے۔
اسی طرح اذان کے کلمات بھی آپ کی معرفت ہی ہم مسلمانوں کو ملے ہیں۔ پس چونکہ وہ خود محدثؓ
ملہم اور صاحب کشف تھے۔ اس لئے ان کے لئے یہ ماننا کیا مشکل تھا کہ بیل کلام کرتا ہے
یا بھیڑیا بولتا ہے۔ ہاں عام لوگوں کے لئے یہ بات واقعی ناقابل فہم تھی۔

اسی طرح ہمارے فضلِ عمر بچپن سے صاحبِ کشف و رؤیا والہام ہیں اور ان کا صرف ایک
یمزقنھم والا الہام ہی ۱۹۱۴ء سے آج تک ہتھوڑے کی طرح اہلِ پیغام کو توڑ توڑ کر پراگندہ
کر کے دائمی حجت ان لوگوں پر پوری کر رہا ہے۔ اور جب سے یہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی

ہے تب سے تو یہ سلسلہ بہت نمایاں اور کثرت سے ہوگیا ہے۔ یہ ساتویں مشابہت ہوئی۔

(۸)

آٹھویں مشابہت حضرت فضلِ عمر کی حضرت عمرؓ سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان اللّٰہ وضع الحق علی لسان عمر یعنی اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر رکھا ہے اور ایک جگہ روایت ہے کہ خدا نے حق کو عمرؓ کی زبان اور دل دونوں پر جاری کیا ہے۔ سو ایسے ہی الفاظ حضرت فضلِ عمر کے حق میں الہامِ الٰہی نے فرمائے ہیں۔ جہاں آپ کو مظہر الحق والعلا کہا گیا ہے۔ اور آپ کا نام روح الحق رکھا گیا ہے۔ اور آپ کے آنے کو

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل: ۸۲)

ترجمہ: حق آگیا ہے اور باطل بھاگ گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج (یونس: ۳۳)

ترجمہ: اور حق کو چھوڑ کر گمراہی کے سوا کیا (حاصل ہو سکتا) ہے۔

پس یہ آٹھویں مماثلت ہوئی۔

(۹)

نویں مماثلت دین کے متعلق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رویا دیکھی کہ لوگ میرے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں اور وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ کسی کی قمیص چھاتی تک ہے۔ کسی کی اس سے بھی کم۔ اتنے میں عمرؓ آپؐ کے روبرو لائے گئے۔ اس حال میں کہ ان کی قمیص اتنی لمبی تھی کہ زمین پر گھسٹتی جاتی تھی۔ اور وہ اسے کھینچتے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا حضور اس خواب کی کیا تعبیر ہے آپؐ نے فرمایا "دین"۔ سو یہاں بھی یہی حال ہے کہ اس قدر دین اور قرآن کے حقائق و معارف حضرت فضلِ عمر کو دیئے گئے ہیں کہ ہر جلسہ پر آنے والا۔ ہر مجلس میں حاضر ہونے والا۔ ہر خطبے کا سننے والا۔ اور ہر وہ شخص جو آپ کی کتابوں اور تفسیر کا مطالعہ کرتا ہے اس یقین سے بھر جاتا ہے کہ واقعی سر سے پیر تک یہ شخص دین اور کلام اللہ کے

معارف سے اس طرح بھرا ہوا ہے جس طرح بلاٹنگ پیپر اگر پانی میں ڈالا جائے تو پانی سے بھر جاتا ہے۔ اور اس کے ہر بُن مُو سے دین ہی دین پھُوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ اور ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ نبوت جیسے عظیم الشان دینی مسئلہ کی حقیقت حضور کی وجہ سے ہی جماعت میں ممکن ہوئی۔

(۱۰)

دسویں مشابہت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دُعا فرمایا کرتے تھے کہ یا الٰہی اسلام کو معزز اور غالب کر دے یا تو ابو جہل کو مسلمان کر کے یا عمرؓ ابن خطاب کو مسلمان کر دے سو حضرت عمرؓ کو خدا نے مسلمان کر دیا اور ان کی وجہ سے اسلام کی نصرت، عزت اور غلبہ کچھ تو فوراً ظاہر ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر آپ کی خلافت کے زمانہ میں تو اس قدر غلبہ اور نصرت اسلام کو حاصل ہوئی کہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ بالکل اسی طرح حضرت فضلِ عمر بھی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی چالیس شبانہ روز کی دعاؤں کے نتیجہ میں پیدا ہوئے اور جیسا کہ حضرت مسیح موعود نے فرمایا تھا کہ میری اولاد کے ذریعے خدا نے ترقی و نصرتِ اسلام کی بنیاد ڈالنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ وعدہ بھی ہم نے اس مصلح موعود کے زمانہ میں بشدت پورا ہوتا دیکھ لیا۔ فالحمد للّٰہ علٰی ذالک۔

(۱۱)

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ نظامِ سلسلہ کا قیام اور ہر قومی محکمہ کا الگ الگ تعین۔ مجلسِ شوریٰ کا قائم کرنا سنہ ہجری شمسی کی ترویج۔ مختلف قسم کی جماعتی مردم شماریوں کی ابتداء شعر کا ذوق۔ قوتِ تقریر۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کرنا۔ سیاست و تدبیر۔ عورتوں کے حقوق اور تعلیم کا انتظام۔ دین کے لئے واقفین کا سلسلہ چلانا۔ غرض یہ اور ایسی بہت سی اور باتیں ہیں جو حضرت عمرؓ کی طرح اس زمانہ میں آپ کی امتیازی خصوصیات میں داخل ہیں۔

سیّدنا حضرت محمود کی شان

سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز جنہیں خدا تعالیٰ نے حسن و احسان میں حضرت مسیح موعود کا نظیر قرار دیا ہے جنہیں آسمانی نوروں سے معمور فرمایا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے حقائق و معارفِ قرآن سے امتیازی طور پر بہرہ ور فرمایا ہے صفحۂ زمین پر اہل علم و ادب موجود ہیں صوفیاء اور گدی نشین بھی موجود ہیں۔ مگر کوئی انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معارفِ قرآن مجید کے بیان کرنے میں دُنیا کا کوئی عالم یا صوفی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت تجربہ شدہ ہے۔ اگر کسی کو اس میں شُبہ ہو تو آج بھی میدانِ مقابلہ میں نکل کر آزمالے۔

(روزنامہ الفضل ۲۲ فروری ۱۹۴۴ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خاندانی ترقی

پیش گوئیاں

۱۔ تیرا گھر برکت سے بھرے گا۔ اور میں اپنی نعمتیں تجھ پر پوری کردوں گا۔ اور خواتینِ مُبارکہ سے جن میں سے تو بعض کو اس کے بعد پائے گا۔ تیری نسل بہت ہوگی۔ اور میں تیری ذرّیت کو بہت بڑھاؤں گا۔ اور برکت دوں گا۔ اور تیری نسل کثرت سے ملکوں میں پھیل جائے گی۔ تیری ذرّیت منقطع نہیں ہوگی۔ اور آخری دنوں تک سرسبز رہے گی۔

۲۔ الہامی دُعا۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ (یہ اس وقت کا الہام ہے کہ آپ کی پہلی بیوی اور پہلے لڑکے مخالف تھے۔ اور آپ واقعی دنیا میں اکیلے اور بے وارث نظر آتے تھے)۔

۳۔ ینقطع اباءك ویبدء منك یعنی تیرے باپ دادوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور تجھ سے ایک خاندان کا نیا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس الہام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلسلہ نیک لوگوں کا ہوگا۔ اگر وہ بھی بُرے ہوں گے۔ تو یہ پیشگوئی اور خوشخبری بالکل لغو اور فضول ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری شاخوں کو بُرا اور بے کار سمجھ کر مٹا دیا۔ لیکن یہ غضب کیا کہ ان سے زیادہ بدتر لوگ ان کی جگہ قائم کر دیئے ،

اپنی نسل کی ترقی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساری پُرانی شاخیں کاٹ دیں۔ سوائے حضور کی اپنی نسل کے اور سوائے حضور کے خاندان کے۔ ان لوگوں کے جو حضور کے دامن کے نیچے آ گئے اور پھر اس شاخ کو ترقی دینی شروع کی۔ اور ہمارے دیکھتے دیکھتے آج حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی صلب سے ستر (۷۰) متنفس زندہ موجود ہیں۔ جن میں سینتیس (۳۷) مرد اور تینتیس عورتیں ہیں۔ اسی طرح آج جو پچیس سالہ جوبلی کا دن ہے۔ حضرت خلیفہ ثانی کی صلبی اولاد پچیس نفوس ہیں۔ یعنی تیرہ لڑکے۔ نو لڑکیاں۔ ایک پوتا۔ ایک نواسہ ایک نواسی۔

دوسری ترقی بذریعہ پرانے خاندان کے افراد کے

یعنی علاوہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور اپنی صلبی نسل کے حضور نے اپنے خاندان کو مزید ترقی اس طرح دی۔ کہ جو لوگ حضور کے خاندان میں تو تھے۔ مگر مخالف اور احمدیت سے الگ تھے۔ ان کو اپنی قوتِ قدسی سے احمدیت کے اندر کھینچ لیا۔ مثلاً مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم۔ عمالقہ کی اولاد۔ تائی صاحبہ۔ عزیزہ بیگم صاحبہ زوجہ مرزا فضل احمد مرحوم۔ مرزا احمد بیگ ہوشیارپوری کے خاندان کے کئی افراد۔ یہ سب لوگ خلافتِ ثانیہ میں جماعت میں داخل ہوئے۔ اور یہ وہ بڑے بڑے جن تھے۔ جو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے زمانہ میں مخالف بلکہ اشد مخالف تھے اور قابو میں نہ آتے تھے۔ غرض یہ جن اسی طرح مطیع کر لئے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے چُھٹے ہوئے جن حضرت سلیمان علیہ السلام نے مطیع کئے تھے۔

تیسری ترقی قادیانی خاندان کی ترقی

پھر حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے ایک تیسری خاندانی ترقی کی۔ وہ ہے قادیان میں جماعت احمدیہ کے ایک حصہ کو جمع اور آباد کیا۔ قادیانی مہاجرین کا رشتہ حضور سے صرف روحانی نہیں ہے جیسے باہر کے احمدیوں کا بلکہ نیم جسمانی اور نیم روحانی رشتہ ہے اور ان کے تعلقات حضور سے مثل اپنے خاندانی بزرگ کے ہیں۔ سو جس قدر نئے محلے اور نئی آبادی یہاں موجود ہے۔ وہ بھی حضور کا ایک خاص خاندان ہے جس کا نام اصحاب الصفہ ہے۔ اور جس کی بنیاد حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے رکھی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے قادیان کی آبادی ڈیڑھ ہزار افراد سے تقریباً دس ہزار افراد تک پہنچ گئی۔ اور سات آٹھ وسیع محلے بالکل نئے آباد ہو گئے۔

چوتھی ترقی روحانی خاندان کی ترقی

جماعت احمدیہ روحانی ذریت ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور ان کے خلفاء کی۔ اس روحانی خاندان کی ترقی حضور کے عہد میں دو طرح ہوئی۔ ایک تو تعداد کے لحاظ سے جماعت کی ترقی جس کا اندازہ مبایعین کی فہرستوں سے ہو سکتا ہے۔ جو ہمیشہ "الفضل" میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

دوسری ترقی بموجب پیش گوئی "تیری نسل کثرت سے ملکوں میں پھیل جائے گی" وہ ترقی ہے۔ جو علاوہ جماعت احمدیہ کی عام ترقی کے مختلف غیر ممالک میں اس سلسلہ کے قائم ہونے کے متعلق ہے اور اس کے ماتحت حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے زمانہ میں انگلستان امریکہ، مصر، فلسطین، جاوا، سماٹرا، ماریشس، افریقہ، غربی و شرقی وغیرہ میں نئی جماعتیں پیدا ہوئیں۔

حضور کے اپنے خاندان کی علمی ترقی

ایک بیٹا مولوی فاضل۔ اور آکسفورڈ کا بی۔ اے آنرز۔ دوسرا بیٹا مولوی فاضل بی۔اے تیسرا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں تعلیم پاتا ہے۔ باقی چھوٹے سب مدرسہ احمدیہ میں دینی تعلیم میں مصروف ہیں۔ ایک داماد بی۔ اے آئی سی۔ ایس۔ ایک بھتیجا گریجویٹ اور بیرسٹر۔

علاوہ ازیں آپ کے خاندان کی لڑکیاں بعض میٹرک پاس ہیں اور دینیات کالج میں پڑھتی ہیں۔ بعض مولوی ہیں۔ بعض ادیب۔ بعض ایف۔ اے اور بعض امسال بی۔ اے میں جا رہی ہیں،

حضور کے رُوحانی خاندان کی ترقی علم عزّت اور وجاہت میں

حضور کی توجہ سے سَو سے اوپر تو مولوی فاضل ہوں گے۔ اور بہت سے فارغ التحصیل جامعہ احمدیہ کے علماء ایک لشکر گریجوایٹوں کا۔ حتٰی کہ کئی عورتیں گریجوایٹ اور بی۔ ٹی اور لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ ڈپٹی کمشنر، انجنیئر۔ وکیل، بیرسٹر، معزز سرکاری ملازم۔ معزز تجار۔ اور معزز زمیندار حضور کی جماعت میں داخل ہیں۔

پھر سر ظفر اللہ خان صاحب ہیں جنہیں سب لوگ جانتے ہی ہیں۔ اور ان کے متعلق تو حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کا ایک رؤیا مشہور ہے کہ حضور نے انہیں اپنے بیٹے کی طرح دیکھا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح وہ بھی حضور کے خاندان میں داخل ہیں۔

حضور کی اور حضور کے خاندان کی مالی ترقی

راجپورہ کی زمین اور سندھ کا تیس میل لمبا علاقہ اس پر شاہد ہے۔ مکانات شاہد ہیں۔ مثلاً قصرِ خلافت۔ بیت الحمد اور مسجد اقصیٰ کے قریب کے مکانات۔ مالی ترقی اس طرح بھی ثابت ہے۔ کہ حضور اور حضور کے خاندان کے چندے سب لوگوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

خواہ تحریک جدید کے ہوں خواہ کسی اور دینی تحریک کے۔ اس سے نہ صرف مالی ترقی بلکہ مالی قربانی کی رُوح بھی نہایت نمایاں نظر آتی ہے ۔

حضور کے روحانی خاندان کی مالی ترقی

قادیان کے مکانوں کی حیثیت دیکھ لو۔ اور اس چندہ کو دیکھ لو جو ۱۹۱۴ء میں آیا تھا۔ اور اب ۱۹۳۸ء میں آیا ہے۔ میرے خیال میں قریباً دس گنے کا فرق ہے ۔

علمی ترقی

جس قدر نئے اور اچھوتے مضامین پر حضرت خلیفۃ المسیح کی تقریریں اور تحریریں موجود ہیں اور جس قدر قرآن مجید کے حقائق اور معارف حضور نے بیان فرمائے ہیں۔ وہ میرے نزدیک حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے بعد صرف آپ ہی کا حصّہ تھا ۔ اور اگر غور کیا جائے تو گزشتہ اولیاء اللہ اگر زندہ ہوتے تو حضور کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ۔

مذہبی اور اخلاقی ترقی خاندان کی

جو تغیر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور حضرت خلیفہ ثانی نے اپنے خاندان کی مذہبی اور اخلاقی حالت میں پیدا کیا ہے۔ اگر میں اسے ذرا بھی کھول کر بیان کردوں تو لوگ حیران ہو جائیں ۔ مگر یہ ایک الگ اور لمبا مضمون ہے ۔

یہ خاندان حق پر ہے

اب حضرت خلیفہ ثانی اور حضور کے سب خاندان کے حق پر ہونے کی الہامی دلیل

بھی نوٹ کریں۔

۱۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے ایک نہایت خطرناک بددعا اپنے لئے اور اپنے سب متعلقین اور اولاد کے لئے کی ہے۔ جس میں یہ مصرعہ آتا ہے ؏

آتش افشاں بر در و دیوار من

اس میں خدا سے التجا کی ہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں اور تیرے دین کو برباد کرنے والا ہوں تو مجھے اور میری سب اولاد کو تباہ کر دے۔ اب اگر حضور کی سب اولاد دین اسلام اور احمدیت کو برباد کرنے والی ہوگئی ہے تو خدا تعالیٰ کو لازم تھا کہ اس بددعا کا اثر ان پر دکھاتا۔ نہ یہ کہ الٹا ان کو ترقی دیتا اور ان کی تائید و نصرت کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سب حق پر جمع ہیں۔

۲۔ اسی طرح حضور کا ایک الہام ہے من اعرض عن ذکری نبتلیہ بذریۃ فاسقۃ ملحدۃ یمیلون الی الدنیا ولا یعبدوننی شیاء (تذکرہ ص۴۱۹) یعنی جو میرے ذکر سے روگرداں ہوگا۔ ہم اس کی اولاد کو فاسق اور ملحد کر دیں گے۔ اور ایسی اولاد خدا کی عبادت نہیں کرے گی بلکہ دنیا میں گر پڑیں گے۔ اس کلام الٰہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر (بقول غیر مبایعین) حضرت خلیفہ ثانی اور حضرت مسیح موعود کی تمام اولاد گمراہ اور بدکار اور گمراہ کنندہ ہیں تو خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) بھی کبھی راستباز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بری اور فاسق اور دنیا دار اولاد اس بات کی سزا ہے کہ ان کا باپ خود بے ایمان ہو۔ پس حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو راستباز سمجھتے ہو۔ تو کبھی ان کے لئے وہ ذلت اور سزا تجویز نہ کرو۔ جو خدا نے بے ایمانوں کے لئے فرمائی ہے۔

۳۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو یہ پیغامی سرغنہ کہتے تھے کہ حضور جماعت کا ناجائز روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان سے حساب لیا جائے۔ اسی طرح اب کہتے ہیں کہ جماعت کا روپیہ سیاسیات اور ناجائز امور پر خرچ ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں خدا نے حضرت سلیمانؑ

کو مخاطب کر کے فرمایا ہے

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (ص: ۴۰)

یہ ہماری بخشش ہے خواہ اسے دے خواہ روک لے۔ تجھ پر اس کے حساب کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء سے حساب نہیں لیا جا سکتا۔ اور جو مانگتا ہے۔ وہ تو خدا کی سُنت اور قرآن کے احکام سے ناواقف ہے۔ خواہ دُنیا کے سامنے وہ مفسر اور مترجم قرآن ہی بنتا پھرے۔

دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت خلیفۃ المسیح کو بھی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہامات میں سلیمان کہا گیا ہے۔ اس لئے حضور پر بھی اخراجات کے متعلق کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کا حکم حضور پر بھی حاوی ہے۔

(الفضل ۱۹ مارچ ۱۹۴۹ء)

باب ہشتم

متفرق مضامین

جنازہ کا مسئلہ

منافقین کے جنازہ کے بارہ میں جو دراصل عرب کے مشرکین ہی تھے اور بظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰)

یعنی ان منافقوں کے لئے تو ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا۔ یہی وہ آیت ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اب ان لوگوں کے لئے ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا۔ شائد کہ یہ بخشے جائیں۔ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (توبہ: ۸۴)

یعنی ان منافقوں کا جنازہ نہ پڑھ اور نہ ان کی قبر کے پاس کھڑا ہو۔ کیونکہ یہ آخر دم تک کافر رہے ہیں۔ تیسری آیت ان مشرکین کے جنازہ کے متعلق یہ ہے کہ۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (توبہ: ۱۱۳)

یعنی نہ نبی اور نہ دوسرے مومن مشرکوں کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ اور نہ ان کا جنازہ پڑھیں۔ خواہ وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ جو کفر پر مر جائے اس کے متعلق تو پورے طور پر ظاہر ہو گیا۔ کہ وہ جہنمی ہے۔

ان آیات سے جب جنازہ کی ممانعت ایسی واضح ہے۔ تو پھر کیا سبب ہے کہ غیر احمدی اصحاب کے جنازہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی بعض خاص حالات میں نرمی کی تعلیم دی ہے۔ تو اس کی کیا وجہ تھی۔ اور پھر اب وہ نرمی کیوں دکھائی نہیں جاتی۔ اس کا کیا سبب ہے۔ سنیئے

۱۔ اول یہ کہ الٰہی سلسلے آہستہ آہستہ اور بتدریج شکل اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے احکام بھی بتدریج استحکام پکڑتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے زمانہ میں بعض باتیں اس طرح فیصل شدہ نہیں تھیں۔ جیسے اب ہو گئی ہیں۔ کیونکہ خلفاء کی تمکینِ دین کا حصہ باقی تھا۔ جو ان کی معرفت پورا ہوتا ہے۔ اور جس طریقہ پر وہ چلائیں وہ بھی الٰہی طریقہ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ جو دین ان کا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسی کی تمکین کرتا ہے۔ پس خلفائے راشدین جس امر کو جماعت کے لئے مقرر کر دیں۔ وہی بموجب قرآن مجید درست ہے۔ اور انہی کا دین چلے گا۔ غیر مبائعین کا دین نہیں چلے گا۔ اور اسی کا نام سبیل المومنین بھی ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) بھی پہلے عام مسلمانوں کا جنازہ پڑھا کرتے تھے۔ پھر آپ نے ترک کر دیا۔ لیکن اس پر بھی کسی کسی آدمی کو کبھی کبھی بطور شاذ اجازت ملی۔ حالانکہ مسئلہ نبوت اور مسئلہ کفر و اسلام صاف فرما چکے تھے۔ اسی اثناء میں آپ کی وفات ہو گئی۔ اور آپ کے بعد آپ کے خلیفہ نے اس مسئلہ کے متعلق یہی فیصلہ کیا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا اصلی منشاء جنازہ کے متعلق یہی تھا۔ کہ بالآخر وہ ترک کر دیا جائے۔ اس لئے جماعت اب قطعی ترک کو اختیار کرے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

۲۔ رہی یہ بات کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے خود کیوں نہیں ایسا قطعی فیصلہ

فرمایا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی۔ اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ مغفرت مانگوں گا۔ اور عملاً نجاشی کا جنازہ پڑھا تھا۔ اسی طرح بعض حالات میں حضرت مسیح موعود نے بعض لوگوں کے دوستوں اور عزیزوں کو جنازہ کی اجازت دے دی اور وہ بھی اس شرط پر کہ شخص متوفی بدگو نہ ہو۔ دشمن نہ ہو بلکہ خاموش ہو۔ اور حسنِ ظن رکھتا ہو۔ اور امام جنازہ احمدی ہو۔ اور ساتھ ہی فرما دیا کہ ان کا جنازہ ہم پر فرض نہیں۔ صرف احسان کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ شائد استدلال آیت اور سُنّت سے کیا تھا آیت تو پہلے گزر چکی ہے۔

مَاكَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ (التوبہ ۱۱۳)

یعنی قرآن کی رو سے مشرک کا جنازہ تو قطعاً حرام ہے۔ باقی رہے اہلِ کتاب ان کی بابت خاموشی ہے۔ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وجہ سے نجاشی کا جنازہ جو گو نہ مصدق تھا۔ مگر ظاہر میں مسلمان نہ تھا۔ پڑھا تھا۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کا محسن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مائل تھا۔ اور اہلِ کتاب تھا۔ گو وہ باقاعدہ کلمہ گو اور نماز روزہ ادا کرنے والا نہیں تھا۔ صرف مجمل مصدق تھا۔ مگر اور اہلِ کتاب کا جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ کسی محسن اہلِ کتاب کا بطور شاذ کے اپنے امام کے پیچھے جنازہ جائز رکھا گیا تھا۔ اور اسی طرح پر بطور شاذ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی اجازت تھی۔ پھر جب خلافت اسلامیہ کا زمانہ آیا۔ تو خلفاء نے ساری اونچ نیچ سوچ کر جماعت کا فائدہ اسی میں مدِ نظر رکھا کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ ایسا جنازہ بھی نہ پڑھا جائے۔ ورنہ جماعت کے لئے یہ بات مضر ہوگی۔ اس لئے نجاشی کے بعد پھر آج تک کسی نیم مومن اہلِ کتاب کا جنازہ کسی مسلمان نے کسی زمانہ میں بھی نہیں پڑھا۔ غرض دین کی تکمیل اس مسئلہ پر خلفاء اور مومنین نے یہی کی۔ کہ اسلام میں یہ بات اب ناجائز ہے۔ اس کے بعد حضرت مسیح موعود کا زمانہ آیا۔ آپ نے پہلے سب مسلمان مخالفین کو مسلمان ہی قرار دیا پھر فاسق پھر کافر۔ اور رفتہ رفتہ نمازیں اور لڑکیاں دینے کے تعلقات بالکل الگ ہو گئے۔ جنازے

بھی اسی طرح الگ ہوتے چلے گئے۔اور آخر میں یہ رہ گیا کہ کوئی نجاشی کی طرح خاموش ہو۔اور سلسلہ کی طرف رغبت رکھتا ہو اور دشمنی نہ کرتا ہو۔اور کسی احمدی کا خاص محسن ہو۔تو ان خاص لوگوں کو اجازت دے دی گئی۔کہ اپنے امام کے پیچھے ان کا جنازہ پڑھ لیں۔کیونکہ متوفی مشرکین میں نہیں بلکہ اہلِ کتاب میں داخل ہے۔اس مرحلہ پر حضور کا انتقال ہوگیا۔آپ کے بعد جب خلفاء کی تمکینِ دین کا زمانہ آیا تو انہوں نے تمام باتوں کو اور اسلاف کے عمل اور "سبیل المومنین" کو دیکھ کر اور حضرت مسیح موعود کے تدریجی انقطاع پر غور کر کے ضروری سمجھا کہ آئندہ یہ بھی اسی طرح بند کر دیا جائے۔جیسا کہ تیرہ سو سال تک پہلے مسلمانوں میں بند رہا۔اور اس مسئلہ کا ماننا اب ہم پر ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ دیگر اسلامی مسائل کا ماننا۔ورنہ ہم بدعہد اور غیر سبیل المومنین پر چلنے والے ہوں گے۔بے شک مشرکین کا جنازہ قطعی حرام ہے۔لیکن اہلِ کتاب کا بعض خاص حالات میں صرف جواز کے ماتحت آتا تھا مگر خلفاء نے اس نادر الوقوع جواز کو بھی بالکل ناجائز کر دیا۔

یہ ہے حقیقت میری تحقیق میں جنازہ کے مسئلہ کی۔اس میں حرمت کا حصہ بھی واضح ہوگیا۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود کے جواز والے حصّہ کی بھی توجیہہ ہوگئی۔اور خلفاء کے فتویٰ کی بھی اتباع کی ضرورت معلوم ہوگئی آگے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ میں نے تو یہ مسئلہ اس طرح سمجھا ہوا ہے۔

(نوٹ ۱) اس طرح کا ایک اور نمونہ بھی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دیا تھا۔مگر اہلِ کتاب کو نہیں نکالا۔ بلکہ رہنے دیا تھا۔حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ان کو بھی بالکل نکال دیا۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہی تھا۔کہ آخرکار ان کو بالکل ہی نکال دیا جائے تو امن ہو سکتا ہے)۔

(نوٹ ۲) مذکورہ بالا بیان کا مطلب یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے سابقین نے اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے بعد خلفائے آخرین نے کوئی نیا دین گھڑ لیا۔بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت مسیح موعود زندہ رہتے تو خود بھی یہی فیصلہ فرماتے جو خلفاء نے کیا)۔ (روزنامہ الفضل ۷ ستمبر ۱۹۳۸ء)

سادہ اور باکفایت زندگی کے متعلق کچھ باتیں

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ علاوہ اُن مقررہ باتوں کے جو میں اپنے خطبات میں تحریک جدید کے متعلق بیان کر چکا ہوں۔ احباب کو دیگر ارشادوں اور باتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور تحریک جدید کے جلسوں میں ان کو بیان کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ خاکسار مختصراً بطور تمہید کے اس ہیڈنگ کے ماتحت بعض ایسی باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ تاکہ احباب کو اس بات کی طرف توجہ پیدا ہو۔ کہ ان پر یا ان جیسی اور باتوں پر عمل کرنے سے ہم اپنے اخراجات میں مزید کفایت پیدا کر سکتے ہیں۔ یا ہماری زندگی اس طرح اور زیادہ سادہ ہو سکتی ہے اور پس انداز کیا ہوا روپیہ آئندہ دینی یا دنیاوی مگر ضروری کاموں کے لئے کام آسکتا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ ہم ایک سالن تو کھاتے رہیں۔ مگر ساتھ ہی ایسی بے اعتدالیاں بھی جاری رکھیں جن کی وجہ سے ہماری سادہ زندگی ایک عجیب معجون مرکب بن جائے۔ جس کا ایک حصّہ تو نہایت باکفایت ہو اور دوسرا حصہ قابلِ اعتراض اور مسرفانہ پس ایسی ٹھوکروں سے بچنے کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو ایک تفصیلی نظر اپنے ارد گرد اپنے کھانے۔ کپڑے۔ رہائش سفر اور تعلیمی اخراجات وغیرہ پر ڈالنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک سوراخ کو بند کر کے ہم فائدہ اٹھالیں مگر دوسرے اور بڑے سوراخ کی طرف سے لاپرواہی کر کے نتیجہ یہ ہو۔ کہ اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔

جن امور کو میں ذیل میں بیان کروں گا ان پر عمل کرنا ہر شخص کے لئے لازمی نہیں ہے۔ تاہم ان باتوں کا خیال رکھنے سے ہم میں سے بعض احباب اپنے اخراجات میں سے معقول بچت نکال سکتے ہیں یا یہ ہو سکتا ہے کہ ان باتوں کو دیکھ کر ان کو بعض دیگر ایسے

اخراجات کی اصلاح کا خیال پیدا ہو جائے۔ جو یوں خود بخود نہ پیدا ہو سکتا۔ اس لئے محض بطور اشارہ کے میں ایسے بعض امور کا ذکر کر دیتا ہوں۔ جو سادہ زندگی اور باکفایت زندگی بسر کرنے میں ہمارے کام آسکتی ہیں۔

کھانے کے متعلق بعض امور

۱۔ برف بوتل ۔ شہروں بلکہ قصبات تک میں بہت سے لوگ برف اور بوتل کے بہت شائق نظر آتے ہیں۔ اور بچوں کا تو کچھ حال ہی نہ پوچھو۔ شائد بعض گھروں میں تمام دن کی برف اور بوتلوں کا خرچ اصل کھانے سے زیادہ جا پڑتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ بلا کسی خاص ضرورت کے اپنے ہاں ہمیشہ برف اور بوتلیں ذخیرہ رکھتے ہیں بلکہ دکاندار سے باندھ لگا لیتے ہیں۔ پھر خواہ ٹھنڈک ہو۔ یا بارش برف ان کے ہاں ضرور آجاتی ہے۔ خواہ پگھل پگھل کر ضائع ہوتی رہے۔ حالانکہ ترش بوتل اور ٹھنڈی برف خصوصاً بچوں کے گلے کے لئے اور ان کے دانتوں کے لئے اور ان کے معدہ کے لئے بہت مضر ہے۔ اگر متواتر یا بکثرت استعمال کی جائے۔ شہر کے لوگ تو پانی پی ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ یخ کی طرح ٹھنڈا نہ ہو۔ اور اس طرح وہ اپنے دانتوں اور قوتِ ہاضمہ کو تباہ کرتے ہیں۔ اور مالی بوجھ اتنا پڑتا ہے کہ متوسط الحال لوگوں کے ہاں بعض مہینوں میں صرف یہی ایک خرچ دس سے پندرہ[۱۵] روپیہ تک جا پہنچتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ بعض برف بیچنے والے ایک پیسے کی برف کوٹ کر اور اسے رنگ کر تنکوں کے سروں پر بطور گولے کے بنا لیتے ہیں۔ اور ایسے گولے پیسے پیسے بیچتے پھرتے ہیں۔ بے شک وہ تو ایک پیسے کی برف سے تین آنے کما لیتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے بھی حساب کیا ہے کہ آپ کے بچے بعض اوقات ایک آنہ یا دو آنہ روزانہ اسی کھیل میں ضائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت خود آپ کے گھر میں بھی برف موجود ہوتی ہے۔

پس میری نصیحت یہ ہے کہ سوائے اشد ضرورت کے عمومی طور پر برف بوتل کا رواج اڑا دیا جائے۔ ہاں مہمان کے لئے یا کبھی سخت گرمی ہو یا طبیعت بیمار ہو تو بے شک یہ بھی خدا کی نعمت ہے مگر آج کل تو یہ نعمت زحمت بنی ہوئی ہے۔ یہی حال آئس کریم کا ہے۔ جو آج کل وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

۲۔ **نشے اور بُری عادتیں** ۔ حرام نشوں کے علاوہ بعض مکروہ نشے بھی ہیں۔ جو ہمارے اخراجات بڑھانے کا باعث ہیں۔ اور ان میں سے مشہور یہ ہیں۔ پان، زردہ، حُقّہ سگریٹ، نسوار یعنی ہلاس۔ پوست۔ افیون اور کسی حد تک چائے۔ عادت کی غلامی کے علاوہ یوں بھی عموماً یہ سب کسی نہ کسی طرح کا نقصان انسانی صحت کو پہنچاتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں تو لوگوں نے مفید اشیاء کا ناشتہ ترک کر کے عادتاً چائے کو اختیار کر لیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ خواہ وہ نقصان مالی ہو یا صحت کا یا اخلاقی۔ دوسروں کا کیا کہوں۔ خود میرے ہاں ایک آنہ سے دو آنہ تک روزانہ کے پان آتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں کوئی بھی زردہ یا تمباکو نہیں کھاتا۔ مگر کیا ہے؟ صرف ایک عادت اور وہ بھی نقصان دہ۔ یعنی دانت رنگین ہو جاتے ہیں۔ مُنہ ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ ہونٹ سرخ رنگے جاتے ہیں اور بالآخر اکثر پان کھانے والے تمباکو کے چکر میں آجاتے ہیں اور ایک عادت سے دوسری عادت کی طرف ترقی کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض گھروں میں کئی روپے ماہوار کی صرف چائے خریدی جاتی ہے اور جو زردہ کھاتے ہیں۔ وہ تمباکو سے ترقی کر کے خوشبودار قوام اور مفرح گولیوں تک پہنچتے ہیں۔ جو نہ صرف نقصان دہ ہیں۔ بلکہ بہت قیمتی چیزیں ہیں جن پر لاکھوں روپیہ امراء اور شوقینوں کا سالانہ خرچ ہو جاتا ہے۔

پان زردہ سے بڑھ کر سگریٹ ہیں جو ہر وقت جیب میں رہ سکتے ہیں۔ میں نے بعض شخصوں کو دیکھا۔ جو روزانہ پچاس سگریٹ تک پی جاتے ہیں۔ اور بعض حُقّہ نوش لوگوں کو دیکھا ہے کہ خوشبو کے لئے قیمتی مصالحے تمباکو میں ملاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا مال ضائع کرتے ہیں۔

غرض اس امر میں مناسب یہ ہے کہ عادتاً پان ، زردہ ، حقہ ، سگریٹ اور چائے وغیرہ کو ترک کر دینا چاہیئے ۔ ہاں چائے یا پان بوقتِ ضرورت گاہے گاہے بے شک استعمال ہو سکتے ہیں ۔ لیکن تمباکو ۔ افیون ۔ پوست ۔ قوام ۔ زردہ کی گولیاں یا نسوار تو سوائے ضعیف العمر عادی آدمیوں کے کسی احمدی کو چکھنا بھی قابلِ شرم ہے ۔

۳ ۔ **کھانے کے اوقات میں کمی :** بعض گھروں میں ہر وقت ہانڈی چڑھی رہتی ہے اور دستر خوان بچھا رہتا ہے اور سوائے مسلسل اور متواتر کھانے کے ان کے ہاں اور کوئی ذکر ہی کم ہوتا ہے ۔ اور ع

تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

کا نظارہ ان کے ہاں ہر وقت دکھائی دیتا ہے یہ بات نہایت ہی معیوب ہے ۔ سوائے کمزوروں اور بچوں کے میرے نزدیک کسی شخص کو تین دفعہ سے زیادہ کھانا نہیں کھانا چاہیئے ۔ خواہ صبح کا ناشتہ ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا ۔ یا صبح کا کھانا ۔ تیسرے پہر کا ناشتہ اور رات کا کھانا ۔ بہر حال ہر وقت کھانے کا شغل جیب پر بہت بوجھل ہوتا ہے ۔ اور جیب سے زیادہ معدہ پر اور صحت پر ۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود یا ان کے بچے چٹورے ہوتے ہیں ۔ یعنی ان کا جی ہر مزیدار چیز کے کھانے کو لوٹتا رہتا ہے ۔ اس طرح ہر موسم پر ہر پھل اور ہر ترکاری اور ہر قسم کے کھانے اور ہر طرح کے چٹنی اچار ۔ مربوں اور ہر طرح کے مزیدار کھانوں اور ہر طرح کی پینے کی اشیاء کے لئے ان کی طبیعت بے قرار رہتی ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر چیز ان میں سے پیسہ خرچ کر کے حاصل ہوتی ہے ۔ پس اپنے کھانے کے اوقات مقرر اور محدود کرنے چاہئیں ۔ اور بچوں کے چٹورپنے کا سختی سے مقابلہ کرتے رہنا چاہیئے ۔

یاد رہے کہ صرف وہی بچے چٹورے نہیں ہوتے ۔ جو ہر کھانے والی چیز پر گرتے ہیں ۔ بلکہ وہ بچے بھی چٹورے ہیں جن کو خاص خاص کھانے کی چیزوں سے نفرت ہو ۔ یعنی اگر ایک لڑکا میٹھا ، گھیا یا کدو یا توری نہیں کھاتا ۔ یا دال اور پتلے شوربے سے نفرت کرتا ہے تو دراصل وہ

بھی چٹورا ہے ۔کیونکہ وہ ہمیشہ لذیذ اور پسندیدہ اشیاء کھانا چاہتا ہے ۔عموماً والدین تعریفی رنگ میں اپنے بیٹے کی اس خاصیت کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ ہمارا لڑکا تو بیچارا فلاں فلاں چیز چکھتا ہی نہیں ۔گویا کہ وہ اِک تارک الدنیا صوفی ہے ۔ حالانکہ بیٹے صاحب کبھی عمدہ اعلیٰ اور لذیذ اشیاء سے انکار نہیں کرتے بلکہ انہیں حاصل کرنے کے لئے صوفی بنتے ہیں ۔ اصل صوفی وہ ہیں جو غریبانہ امیرانہ سب قسم کی اشیا کھا لیا کریں ۔پس اس بُری عادت کا بھی مقابلہ اور اصلاح ضروری ہے ۔

۴۔ **کم خرچ اور مفید ناشتہ** : میرا خیال ہے کہ ہم میں سے اکثر احباب نے اپنے کھانوں میں واقعی سادگی اختیار کر لی ہے ۔ مگر یہ بات ناشتوں میں نہیں دیکھی گئی ۔اول تو وہ سادہ کم خرچ نہیں ہوتے ۔ دوسرے وہ مفید نہیں ہوتے ۔مفید نہ ہونے کی مثال تو چائے کا دائمی استعمال ہے ۔جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ۔ مگر سادگی اور کفایت کے متعلق یہ عرض ہے کہ ناشتہ میں بھی بہت سی چیزیں نہیں ہونی چاہئیں ۔ اور بعض چیزوں سے تو خصوصاً پرہیز کرنا چاہیئے کہ وہ گراں ہیں اور نہایت مُضر اور ثقیل مثلاً پیسٹری جو معدہ اور انتڑیوں میں لیس اور لئی کی طرح چپک جاتی ہے ۔ اور جگر کے لئے تو پتھر کی طرح ہے بسکٹوں کا بھی قریباً یہی حال ہے جو اعلیٰ اور زود ہضم ہوتے ہیں ۔ وہ تو اتنے مہنگے ہوتے ہیں کہ ایک بسکٹ بعض اوقات تین پیسہ فی عدد کے حساب سے پڑتا ہے ۔ اور اگر ایک آدمی شوقین ہے تو آٹھ دس آنہ کے صرف بسکٹ ہی ایک ناشتہ میں کھا سکتا ہے اور غور کر کے دیکھو تو بسکٹ کیا ہیں یہ سوکھے ٹکڑے اور بس اس صورت میں آپ سوال کریں گے کہ پھر ہمارا ناشتہ کن اشیاء کا ہونا چاہیئے ۔سو میرے خیال میں نوجوانوں اور بچوں خصوصاً طالب علموں کو صبح کا ناشتہ دودھ اور پراٹھے سے کرنا چاہیئے ۔ ایک پراٹھا اور ایک میٹھی پیالی دودھ کی طالب علموں کے لئے اسکول جانے سے پہلے کھانی بہت اچھی ہے ۔ ہاں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ گھی اچھا ہو ۔اس کے علاوہ بجائے دودھ کے دودھ کی لسی یا دہی کی لسی گرمیوں میں بہت مفید ہوتی ہے یا بجائے پراٹھے کے روٹی کے ساتھ مکھن

یا دہی استعمال کر سکتے ہیں۔ تازہ یا باسی روٹی ایک تلے ہوئے انڈے کے ساتھ (جو گھر کی مرغی کا ہو کیونکہ وہ سستا پڑتا ہے) بھی موزوں ہے۔ غرباء تو باسی روٹی کے ساتھ لسی یا باسی دال سالن کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح بھنے ہوئے چنے کشمش ملا کر۔ اُبلے ہوئے نمکین چنے۔ اُبلے ہوئے آلو۔ یا دودھ سویاں عمدہ ناشتہ کا کام دیتے ہیں۔ یہ تو صبح کے ناشتوں کا حال ہے۔ جو لوگ تیسرے پہر ناشتہ کرتے ہیں۔ ان کے لئے موسمی پھل یا ترکاری مثلاً آم۔ خربوزہ۔ پھوٹ۔ امرود۔ تربوز۔ ککڑی بھٹے۔ یعنی وہ پھل جو موسمی ہونے کی وجہ سے سستے مل جاتے ہیں۔ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ورنہ سادہ دودھ ہی سہی (ضمناً میں یہ بھی بیان کر دیتا ہوں کہ جن لوگوں کو ضعف دماغ کی شکایت رہتی ہے ان کے لئے بہترین ناشتہ یا دام کا شیرہ اور نیم برشت انڈے کی زردی ہے) غرباء تیسرے پہر اگر بھوک لگے تو بھنے ہوئے دانے مکئی یا باجرہ یا چنے یا جوار کے کھایا کرتے ہیں اور حدِ اعتدال کے اندر رہ کر یہ بھی مفید ہیں۔ بہت چھوٹے بچے جو ہر وقت کھانے کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کو ثقیل اشیاء ہر وقت دی جایا کریں تو اُن کے پیٹ خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے پھیکے یا نمکین مُرمرے (یعنی چاول بھنے ہوئے) بہت ہلکے اور زود ہضم مہیا رکھنے چاہیئے۔ اور بجائے اس کے کہ دن بھر وہ لڈو یا پیڑے کھاتے رہیں۔ اور دن رات اسہال میں مبتلا رہیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ علاوہ کھانے اور دودھ کے جب وہ ضد کریں تو ایک مٹھی مُرمرے دے کر ان کو بہلا دیا جائے۔

۵۔ **سالن میں اسراف:۔** نہ صرف یہ مناسب ہے کہ ایک سالن پکا کر پھر سیخوں کے کباب۔ دہی بھلّے کباب۔ بوندی۔ پکوڑی وغیرہ اشیاء دسترخوان پر بلا وجہ زائد کی جائیں۔ بلکہ اکثر ڈھونڈ ڈھونڈ کر قیمتی اور نایاب ترکاریاں اور سبزیاں منگوانا بھی باکفایت اور سادہ زندگی کے اصول کے خلاف ہے۔ مثلاً باوجود اس کے کہ بازار میں کدو، آلو۔ اروی کریلے بینگن، ساگ بھنڈیاں توریاں وغیرہ سستی اور طرح طرح کی ترکاریاں موجود ہیں۔ پھر بھی ان کو چھوڑ کر یہ کوشش کرنا کہ لوبیے کی پھلیاں اور بے موسم مٹر جو آج کل گراں ہیں وہ حاصل کئے جائیں یا جس موسم

میں ٹماٹر نایاب ہوں۔ ان دنوں چار آنہ یا آٹھ آنہ سیر والے ٹماٹروں کو خریدنا اسراف نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ تمام گرمی اور برسات بھر تو کریلے کھاتے نہیں جب کریلے دو پیسے سیر ہوتے ہیں لیکن جاڑے میں جب آٹھ آنے سیر ہو جاتے ہیں تو دوسری جگہ سے کریلے منگواتے ہیں۔ اسی طرح بلا خاص موسم اور ضرورت کے عموماً مچھلی اور مرغی پکواتے رہنا کس قدر صحت اور سادگی کے اصول کے برخلاف ہے۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ترکاری موسم کے شروع میں بہت گراں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ آٹھ آنہ یا روپیہ سیر تک بک جاتی ہے۔ ان چند مہنگے دنوں میں گراں قدر ترکاریوں کا خریدنا اوسط درجہ کے آدمیوں کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۶۔ **بعض کھانے کی اشیاء اکٹھی اور بروقت خریدنا**۔ اس میں بھی کافی بچت ہو جاتی ہے۔ مثلاً غلہ، دالیں۔ پیاز وغیرہ

۷۔ **ولایتی گھی کا مناسب استعمال**۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خالص گھی بہت مفید صحت چیز ہے اور ولایتی گھی محض تیل ہے اور کچھ نہیں مگر نرخ میں نصفا نصف کا فرق ہے۔ گھی ایک روپیہ سیر آتا ہے اور ولایتی گھی قریباً آٹھ آنہ سیر اور مزے میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن خشک اشیاء مثلاً قیمہ، کباب وغیرہ میں تو ولایتی گھی کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہاں شوربے دار سالن ہو تو اس میں ولایتی گھی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

پس بعض اوسط حال کے آدمیوں کے لئے یہ مناسب ہوگا۔ کہ وہ اصلی گھی اپنے لئے استعمال کیا کریں اور ولایتی گھی ملازمین وغیرہ کی ہانڈی میں ڈلوایا کریں۔ اور خود بھی جب قیمہ یا کباب یا خشک بھنی ہوئی اشیاء پکوائیں تو اس میں ولایتی گھی ڈلوا لیا کریں۔ اس طرح اُن کے پیٹ میں اصلی گھی بھی جاتا رہے گا اور باورچی خانہ کا خرچ بھی ہلکا ہو جائے گا اور کھانا بھی بدمزہ یا بُودار نہ ہوگا۔

سٹیشنری کے متعلق

اس میں بڑا اندھیر کا خرچ ہوتا ہے۔ اگر سستے پیڈ اور لفافے لے لئے جائیں تو اس میں کون سی ذلت ہے۔ بعض لوگ اگر توجہ کریں تو اپنی سٹیشنری کا خرچ چوتھائی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو امیروں کی بابت ہے۔ بڑا اندھیر تو سکولوں اور ماسٹروں کی طرف سے ہوتا ہے۔ غریبوں کو روٹی تو میسر نہیں۔ مگر لڑکے لڑکیاں ہر دوسرے تیسرے دن تقاضا کرتے ہیں کہ ماسٹر جی کہتے ہیں۔ کہ تاریخ کی کاپی ڈھائی آنے والی لاؤ اور جغرافیہ کی چار آنے والی۔ اور فلاں مضمون کی اتنے والی۔ وہ آگئیں تو معلوم ہوا۔ کہ کبھی استعمال ہی نہیں کی گئیں۔ پھر مہینہ بعد اور طرح کی کاپیاں وغیرہ لانے کا حکم ہوگیا۔ غرض ایک لوٹ ہے جو تعلیم دینے والوں کی معرفت لڑکوں اور لڑکیوں کے والدین پر پڑتی ہے۔ سکولوں کی کتابوں۔ اور فیسوں کے علاوہ یہ مصیبت جونک کی طرح ان کا خون چوستی ہے۔ حالانکہ ہماری جماعت کے اُستاد اگر تحریک جدید کے ماتحت اس پر غور کریں تو لوگوں کو بہت ساری بچت ہو سکتی ہے۔

حساب کا تمام رف کام سلیٹوں پر ہو سکتا ہے۔ اور ہر کاپی کے ورقوں کے دونوں طرف لکھا جا سکتا ہے۔ ایک کاپی پر دو دو مضمونوں کے نوٹ آسکتے ہیں۔ غرض کاغذ سیاہی قلم پنسلوں وغیرہ کے متعلق جو رقم خرچ ہوتی ہے وہ ایک روپیہ میں سے بارہ آنے بچ سکتی ہے۔ اس اسراف میں طالب علموں کا بھی برابر کا قصور ہے لیکن اُستاد جہاں اس بات کا ذمہ دار ہے۔ کہ لڑکا ترقی کرے۔ وہاں اس بات کا بھی اخلاقی طور پر ذمہ دار ہے کہ اس کے اخراجات نامناسب نہ ہوں۔

بہرحال اگر اس پر چیک رکھا جائے اور استاد اور طلبہ ادھر توجہ دیں۔ تو والدین کی ایک معقول رقم بچ سکتی ہے۔

برتن

برتنوں کے متعلق ایک صورت کفایت کی یہ ہے کہ قلعی کرانے والے برتن کم استعمال کئے جائیں۔ ایک دیگچی جو دو روپے کو آتی ہے۔ اس پر تین سال میں تین روپے صرف قلعی کے خرچ ہو جاتے ہیں۔

فضول تار

مغرب سے ایک رَویہ بھی آگئی ہے کہ فلاں جگہ کھانا ہے۔ فوراً تار دے دو۔ کسی دوست کو کوئی خوشی پہنچے تو فوراً تار دے دینا۔ غرض تار کیا ہے۔ ایک فیشن ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کہ کسی شخص نے جمعہ کو ایک خط اپنے دوست کو لکھا۔ کہ میرا بھائی بیمار ہے۔ وہ خط وہاں ہفتہ کو پہنچ گیا۔ لیکن اس دوست نے اس کا جواب تک نہ لکھا۔ ورنہ اس کا خط وہاں اتوار کو مل جاتا۔ پیر کے دن اُن دوست کو خیال آیا کہ ادھو! پرسوں سے خط آیا ہوا ہے ہم نے اپنے دوست کو اس کا جواب تک نہیں دیا۔ پھر کیا تھا ڈبل تار لکھ مارا:

VERY ANXIOUS HOW IS YOUR BROTHER
WIRE IMMEDIATELY

گویا نہ صرف اپنے پیسے ضائع کئے اور تار دو دن چھوڑ کر بے وقت بھیجا بلکہ بیچارے دوست پر بھی جرمانہ کر دیا۔ کہ تم تار میں جواب دو۔ ہم نہایت متفکر ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر سچ مچ متفکر ہوتے۔ تو کیوں دو دن پڑے سوتے رہتے۔

کوئی لڑکا پاس ہو جائے۔ تو گویا شرعی فریضہ ہے کہ ہر شخص آٹھ دس آنے ضرور ضائع کرے۔ اس طرح لوگوں کا سینکڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ جس میں زیادہ حصہ اسراف میں داخل ہوتا ہے۔ کسی کو بیمار سُن لیں۔ تو بجائے خط کے یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ تار بھیجا جائے

اسی طرح جہاں لفافہ کی جگہ کارڈ جا سکتا ہو وہاں غرباء کے لئے ایک پیسہ بچا لینا بھی عقلمندی بلکہ ثواب ہے۔

غرض فضول تار اور فضول ٹکٹوں کے اسراف کا خیال رکھو۔ اگر صحیح طور پر پابند تحریکِ جدید ہونا چاہتے ہو۔

لباس کے متعلق کفایت

میری یہاں ہرگز یہ مراد نہیں۔ کہ سب لوگ ہر ایک بات پر عمل کریں۔ جو یہاں ذکر ہوتی ہے۔ بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ جو بات کسی شخص کے حالات اور حیثیت کے مطابق مفید ہو وہ اسے اختیار کرے۔

بستر کی چادریں :۔ سفید لٹھا کی چادریں بہت گراں پڑتی ہیں۔ اور جلدی ختم ہو جاتی ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ صرف گھر کے معزز اور بڑے لوگ ایسی چادریں استعمال کریں۔ لڑکوں وغیرہ کے لئے آج کل کھیسوں کی شکل کی بنی ہوئی میل خوری چادریں بہت سستی مل جاتی ہیں جو دیرپا بھی ہوتی ہیں۔

رومال :۔ عورتیں اور نوجوان طالب علم ریشمی رنگین رومالوں کے بڑے شائق ہوتے ہیں۔ اگر یہ رومال دوکانوں سے خریدے جائیں۔ تو بعض اوقات ایک روپیہ یا بارہ آنہ فی عدد ملتے ہیں۔ وہی رومال دہلی یا لاہور میں لڑکے بازاروں میں بیچتے پھرتے ہیں۔ اور تین آنہ فی عدد دستیاب ہو جاتے ہیں۔ روزانہ استعمال کے رومال سفید یا خالی لٹھہ کے گھروں میں بنا لینے چاہئیں۔ جو بہت سستے پڑتے ہیں۔

رنگین کپڑے :۔ عورتیں اور لڑکیاں اگر گرمی کے موسم میں اپنے کپڑے رنگ لیا کریں۔ اور سفید نہ رکھا کریں۔ تو ایک گونہ کفایت ہو جاتی ہے۔ رنگین کپڑے کم میلے ہوتے ہیں۔ اور سفید دوسرے دن ہی بدلنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی دھوبی کا بل

بھی بڑھ جاتا ہے۔

زینت کے اخراجات

آج کل مغرب زدہ عورتیں بہت سا روپیہ کریم۔ پوڈر، سرخی، لپ سٹک، منجن وغیرہ اشیاء پر بے دردی سے صرف کرتی ہیں۔ میں جب ایسی عورت کو دیکھتا ہوں کہ نامناسب طور سے اس نے اپنے تئیں ان اشیاء سے آراستہ کیا ہے تو میری زبان پر اس وقت ایک لفظ گردش کرنے لگتا ہے۔ اور وہ لفظ ہے PAINTED WOMEN وجہ یہ ہے کہ قدرے سفیدی اور بے معلوم سُرخی جو غیر قدرتی نہ معلوم ہو وہ کھپ جاتی ہے۔ اور بُری نہیں لگتی۔ لیکن سانولے رنگ پر اتنا سفیدہ کہ بھوتنا معلوم ہو۔ اور ہونٹوں پہ اتنی سُرخی کہ خون پیا ہوا نظر آئے۔ سخت مکروہ اور ناقابلِ برداشت نظارہ ہے۔ پھر اس پر لطف یہ کہ ہر پانچ منٹ کے بعد سُرخی سفیدہ کی تجدید کی جاتی ہے۔ اور دن رات یہی عمل جاری رہتا ہے۔ خیر یہ تو اپنا اپنا مذاق ہے۔ لیکن شکر ہے کہ میرے گھر میں ابھی تک یہ وباء داخل نہیں ہوئی۔ ہاں ان سب اشیاء میں سے منجن یا ٹوتھ پاؤڈر بہت ضروری اور مفید چیز ہے۔ لیکن اکثر بازاری منجن بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگوں کو بہت زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ دانت صاف کرنا کم از کم تین دفعہ روزانہ ضروری ہے۔ صبح کے وقت۔ دوپہر کو بعد از طعام اور رات کو سوتے وقت اگر بازاری منجن وغیرہ خریدے جائیں تو غریب آدمی کا دیوالیہ نکل جائے۔

(روزنامہ الفضل ۲۹ جولائی ۳۹ء)

نوکر مزدور ہے ۔ غلام نہیں ہے

ایک دوست انبالہ سے اپنے خط میں مجھے تحریر فرماتے ہیں ۔

" السلامُ علیکم ۔ گزارش ہے ۔ کہ آپ کا ایک مضمون " الفضل " کی ایک قریبی اشاعت میں شائع ہوا جس میں سادہ زندگی کے متعلق نہایت قیمتی نصائح ارشاد فرمائی ہیں ۔ مگر میرے نزدیک جہاں بناسپتی گھی کے استعمال کا ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ بناسپتی گھی ملازمین کے لئے استعمال کریں ۔ قابلِ اعتراض ہے ۔ اور اس کا اکثر غیر احمدی اشخاص نے تمسخر اڑایا ہے چونکہ خاکسار خود بھی اس کے خلاف ہے ۔ اس لئے مخالفین کو کوئی جواب نہیں دے سکتا ۔ اس لئے ملتمس ہوں کہ اس کی تشریح فرمائیں کہ آیا یہ از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں ۔ کیا کھانے کے معاملہ میں ملازم اور آقا کے درمیان کوئی امتیاز روا ہے ۔ "

اس خط کے آنے سے پہلے بھی چند دوستوں نے زبانی طور پر یہی اعتراض کیا ۔ میرے نزدیک چونکہ یہ اعتراض ناواقفی پر مبنی ہے ۔ اس لئے اس کا جواب لکھتا ہوں ۔

واضح ہو کہ اوّل تو کوئی ایک شخص کسی گھر میں ملازم ہو تو اس کے لئے علیحدہ ہانڈی پکانا ۔ یا ایسی تجویز بتانا سراسر بے وقوفی ہے ۔ کیونکہ دس بارہ کھانے والوں کے سالن میں سے ایک آدمی کا سالن بآسانی نکل سکتا ہے ۔ اور علیحدہ سالن پکانا اسراف میں داخل ہوگا پس یہ بات تو صرف ایسے گھرانوں یا خاندانوں میں چل سکتی ہے جہاں کئی کئی نوکر ہوں ۔ اور ان کی تعداد اتنی ہو کہ الگ ہانڈی پکانے میں خرچ کی کفایت ہو سکے ۔ اس لئے یہ تجویز صرف ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس کئی ملازم ہوں ۔ مثلاً ایک باورچی ۔ ایک شیخی ۔

یعنی برتن مانجھنے والا۔ ایک ڈیوڑھی کا ملازم۔ ایک دو عورتیں گھر کا اُوپر کا کام کرنے کے لئے جانوروں کا نوکر، ڈرائیور، مہترانی وغیرہ وغیرہ۔ اس حالت میں جب پانچ سات آدمی اپنے گھر کے ہوں اور چار، پانچ یا زیادہ ملازم اُوپر کے ہوں تو اُن کی ہانڈی بآسانی اور بکفایت الگ پک سکتی ہے۔ بلکہ گھی کا سوال جانے دو۔ اگر گھر والوں کے لئے پلاؤ یا مرغی یا مچھلی یا ایسی ہی چیز پکائیں تو کیا ان نصف درجن ملازموں کے لئے بھی ایسا ہی انتظام کرنا پڑے گا۔ اور آقا نے اگر پیٹ بھر کر صرف پلاؤ کھایا ہے۔ تو کیا ہر ملازم بھی اس دن پیٹ بھر کر پلاؤ ہی کھائے گا۔ اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ جس دن گھر والوں کے لئے ایک مرغ یا سیر بھر پلاؤ پکے۔ اس دن ملازمین کے لئے چار مرغ اور پانچ سیر پلاؤ تیار ہوا کرے۔ کیونکہ بعض ملازمین ماشاء اللہ آقا سے چار گُنا کھاتے ہیں اور آٹھ گنا کھا سکتے ہیں اگر کھانا لذیذ ہو۔ اور جو آقا ایسا انصاف کرے گا جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔ اُسے تو چند روز میں ہی ان نوکروں کو برخاست کرنے کی ضرورت پیش آجائے گی یا وہ بیچارہ خود پتلی دال یا قلیہ کھانا شروع کر دے گا۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ غلطی کہاں سے آئی۔ بات یہ ہے کہ اسلام میں غلاموں کے ساتھ سلوک کی نہایت درجہ تاکید وارد ہوئی ہے اور حکم ہے کہ جو خود کھاؤ وہی غلام کو دو۔ اور جو خود پہنو وہی اُسے پہناؤ اور جو کام اس سے کراؤ اس میں خود برابر کے شریک ہو جاؤ۔ وجہ یہ ہے کہ غلام کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے۔ نہ وہ کہیں اپنی مرضی سے جا سکتا ہے۔ نہ وہ اپنی مرضی سے کام چھوڑ سکتا ہے۔ اور جو بھی وہ کماتا ہے وہ مالک کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ غرض غلام کی پوزیشن اپنی غلامی کے دوران میں صفر کے برابر ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کے لئے ایسے سلوک کا حکم فرمایا ہے جس کا اُوپر ذکر ہوا۔ لیکن کسی رواج کسی شریعت کسی عقل نہ کسی گورنمنٹ نے یہ نہیں بتلایا کہ غلام اور ملازم دونوں کی ایک ہی پوزیشن ہے نوکر جس وقت چاہے نوکری چھوڑ سکتا ہے۔ نوکر جو کام نہ کرنا چاہے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ نوکر تنخواہ لیتا ہے اور جہاں چاہے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ اپنی تنخواہ میں سے جس قسم کا

چاہے۔ کھا پہن سکتا ہے۔ یا جہاں چاہے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ پس دونوں میں اتنا ہی بھاری فرق ہے جتنا ایک آزاد اور قیدی میں۔ آپ کس طرح غلاموں کے مسائل کو آزاد لوگوں پر لگا سکتے ہیں؟ شائد آپ نے یہ سُنا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے بھی حقوق کھانے پینے اور مشقت۔ محنت وغیرہ میں رکھے ہیں جتنے آقاؤں کے۔ آپ نے دیکھا کہ غلام تو نظر نہیں آتے چلو ان حقوق کو آزاد ملازمین پر چسپاں کر دو۔ حالانکہ یہ بالکل نامناسب اور غلط فتویٰ ہے کہ ایک جماعت کا فتویٰ دوسری جماعت پر لگا دیا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو نوکروں کے کپڑے بھی آقاؤں جیسے بنانے پڑیں گے اور بیس روٹیاں باورچی پکائے گا تو بیس بابو صاحب پکائیں گے۔ اسی طرح ڈپٹی صاحب کا چپڑاسی ہفتہ میں تین دن ڈاک لے جائے گا اور تین دن وہ خود لے جائیں گے اور صبح کو مہترانی پاخانہ کرائے گی اور شام کو گھر والی خود۔ کیونکہ غلاموں کے لئے نہ صرف کھانے پینے کے حقوق برابر ہیں۔ بلکہ کپڑے اور مشقت و محنت میں بھی ان کے لئے برابری کے حقوق مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

برخلاف اس کے نوکر ایک ایسا آزاد شخص ہے کہ وہ جب چاہے ملازمت اختیار کر سکتا ہے۔ جب چاہے ترک کر سکتا ہے۔ بعض تنخواہ لیتے ہیں۔ بعض کھانا، کپڑا اور ساتھ ہی تنخواہ بھی لیتے ہیں۔ لیکن عقل اور شریعت کے نزدیک وہ مزدور ہیں۔ اور ایک مزدور ایک غلام کی طرح اپنے آقا کا برابر کا شریک نہیں ہے وہ آزاد ہے بلکہ جس دن ناراض ہوتا ہے کبھی کبھی تو وہ آقا اور اس کے گھر والوں کو دس گالیاں دے کر نکل جاتا ہے اور رکھنا کھن اپنا حساب گنوا لیتا ہے۔ بھلا اس کا اور غلام کا کیا مقابلہ؟ اور غلام کے مسائل کو مزدور پر کیوں تھوپا جاتا ہے؟ نوکر یعنی مزدور کو وہی کھانا ملے گا جو عرفِ عام میں اس ملک کے نوکروں کو ملا کرتا ہے۔ ورنہ اس نئے مسئلہ کے مطابق تو گھر کے دسترخوان پر سب ملازمین کو گھر والوں کے برابر بیٹھ کر کھانا کھانا چاہیئے۔ اور گھر میں جو پھل میوہ تحفہ تحائف آئیں۔ وہ سب ملازمین کے ساتھ برابر کے حصہ میں بانٹ لینے چاہئیں۔ پس دو مختلف حالات کو غلط طور سے گڈمڈ کر

دینے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے ۔

جن لوگوں کا ایسا خیال ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا ان کی بیوی ہانڈی روٹی تیار ہوتے ہی بہترین حصہ سالن روٹی کا تازہ تازہ اور گرم گرم چینی کے برتن اور عمدہ دسترخوان میں لگا کر اپنے نوکروں کو بھیجتی ہے۔ جیسا کہ گھر کے مالک کے لئے ؟ یا وہ نوکروں کو بعد میں معمولی برتنوں میں پہلے خود کھا کر یا اپنا حصّہ نکال کر تقسیم کرتی ہے۔ اگر وہ "مساوات" نہیں برتتی۔ تو پھر پہلے اصلاح اپنے گھروں سے شروع ہونی چاہیئے۔ میرا اپنا تو یہی خیال ہے کہ وہ بیوی صحیح عمل کرتی ہے۔ کیونکہ نوکر "روٹی کپڑے" پر یا "روٹی اور تنخواہ" پر رکھے جاتے ہیں۔ یعنی اس قسم کی روٹی کپڑے پر جو اس ملک میں نوکروں کا طبقہ اپنے گھروں میں استعمال کرتا ہے اور جس کا عام رواج پایا جاتا ہے۔ نہ وہ "روٹی کپڑا" جو آقا خود استعمال کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ نوکر پیٹ بھر کر کھائے۔ بھوکا نہ رہے۔ اور خراب گندا مضر صحت بدمزہ کھانا اُسے نہ دیا جائے بلکہ آقا کی حیثیت کے مطابق ملازم کا کھانا بھی ہو اور جس قدر بھی نیک سلوک کیا جائے وہ کارِ ثواب ہے۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ غلام بیٹے کی طرح ہوتا ہے اور ملازم مزدور کی طرح۔ اس وجہ سے دونوں کے لئے الگ الگ احکام ہیں ۔

(الفضل ۵ر اگست ۱۹۳۹ء)

نظامِ نَو کی بنیاد

جنگ کے بعد کا نظام

پہلی جنگ کے دوران میں بھی فریقینِ جنگ ایک نئے نظام کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر ہم نے گزشتہ ۲۵ سال میں دیکھ لیا۔ کہ وہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اب پھر اس کا بہت ذکر ہو رہا ہے۔ لیکن آخر یہی ثابت ہوگا کہ نظامِ نَو کے معنے یہ ہیں کہ شکست خوردہ دشمن کو کس طرح ہمیشہ ہمیش کے لئے بے کار بنا دیا جائے۔ اور اپنے مفاد کی کس طرح بیش از پیش مضبوطی کر لی جائے۔ اور کس طرح جنگ کے اثرات اور صدمات کو زائل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی عیاشی اور عیش و عشرت میں مشغول ہوا جائے۔ بس یہ ہے وہ نظامِ نَو جس کی ہمیں اس جنگ کے بعد انتظار کرنی چاہیئے۔ اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ نظامِ نَو بھی زیادہ دیر تک چل نہیں سکے گا۔ کیونکہ اس کے پیچھے خدائی تائید اور الٰہی نصرت اور مخلوق کا حقیقی فائدہ موجود نہیں ہے۔

اسلام کا بابرکت نظام

برخلاف اس کے ہم جو احمدی جماعت کے لوگ ہیں۔ وہ بھی ایک نظامِ نَو کے منتظر ہیں۔ اور اس تاریخ سے منتظر ہیں۔ جب نومبر ۱۸۹۱ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مسیح پاک کی زبان سے یہ ارشاد فرمایا:۔ کہ ہم ایک نیا نظام اور نیا آسمان اور نئی زمین چاہتے

ہیں۔" پھر اسی کشف میں حضور نے ارادہ الٰہی سے اس نئے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔
پھر منشائے حق کے مطابق اس کی ترتیب اور تفریق کی۔ پھر آسمان دُنیا کو پیدا کیا پھر فرمایا
کہ اب ہم انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کریں گے۔"

(تفصیل کے لئے دیکھو آئینہ کمالات اسلام ص۵۶۴ تا ۵۶۶)

اس سے معلوم ہوا کہ الٰہی منشا بھی ایک نئے نظام کے قیام کا ہے۔ اور وہ نیا نظام مقامی اور ملکی یا قومی نہیں ہوگا۔ بلکہ سارے عالم کے لئے ہوگا۔ اور ضروری ہے کہ پہلے تمام نظام توڑے جائیں۔ تاکہ یہ بابرکت نظام اس آخری زمانہ میں دنیا کی سرسبزی اور شادابی کے لئے قائم کیا جائے۔ اس نئے نظام کا تفصیلی ذکر کرنے کا یہاں موقعہ نہیں نہ ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی تیرہ سو سال سے دنیا میں موجود اور محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اس کی برکتوں کا پہلے بھی یہ دنیا تجربہ کر چکی ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھا چکی ہے۔ وہ کوئی نیا نظام نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ نیا ہے۔ یعنی نظام کا خاکہ اور ڈھانچہ تو پورا موجود ہے لیکن ایک چیز اور صرف ایک چیز کی کسر ہے اور اس چیز کا نام ہے بنیاد نظامِ نو۔ کیا کوئی مسلمان قرآن مجید کی موجودگی اور اسلام کی کامل شریعت کے ہوتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ ان کے بعد کوئی اور نیا نظام بھی آسکتا ہے۔ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے۔ تو نہ آنحضرتؐ خاتم النبیین ٹھہر سکتے ہیں نہ قرآنِ مجید کامل کتاب اور نہ شریعت اسلامیہ مکمل شریعت۔ پس اگر نظامِ نو کوئی نئی چیز ہے۔ تو اسلام اور قرآن کو تو جواب ہے۔ لیکن اگر قرآن۔ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دائمی اور رہتی دُنیا تک کی چیزیں ہیں۔ تو پھر نظامِ نو کے معنوں پہ ہمیں غور کرنا پڑے گا۔ اور میں غور وفکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس نظامِ نو کے لفظ کا صرف اتنا مطلب ہے۔ ہم اسی قرآنی حکومت کو دنیا میں پھر قائم کریں گے جو قرنِ اول میں تھی۔ اور اسی شریعت کو پھر نافذ کریں گے۔ جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں چلتی تھی۔ اور اسی نظام کو پھر زندہ کریں گے جو

اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ ؕ (النحل: ۲)

ترجمہ: (اے منکرو!) اللہ کا حکم آیا ہی چاہتا ہے اس لیے (اب) تم اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔

میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور وہی احیائے دین اور اقامتہ شریعت کا نظارہ اس دنیا کو پھر دکھائیں گے جو حضور علیہ السلام کی معرفت پورا ہونا مقدر ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہاں اب صرف یہ معلوم کرنا باقی رہ گیا ہے۔ کہ پھر اسے نظامِ نَو یا نئے آسمان اور نئی زمین کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ اور کونسی چیز نئی پیدا ہو گی جو پہلے نہیں تھی۔ کیونکہ شریعت کا نظام تو پورا اور مکمل ساڑھے تیرہ سو سال سے موجود ہے۔ یعنی محل اور قصرِ شریعت تو بنا بنایا تیار ہے۔ پھر وہ نئی بات کیا ہے۔ جس کا ہمیں انتظار ہے۔ اور جس کے لئے اس وقت تمام عالم بے تاب اور بے قرار نظر آتا ہے۔ پس جب نظامِ نَو کا مصالحہ سامنے ہے اور اس کا میٹریل موجود ہے۔ یعنی شریعت غرائے اسلامیہ اور قرآنی ہدایات تمام محفوظ و مصئون ہیں۔ تو وہ کیا کمی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ پرانا نظام نیا ہو جائے گا۔ یا نیا کہلانے کا مستحق ہو گا؟ کیونکہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ کہ کوئی مسلمان بھی کسی نئی شریعت نئی حکومت یا نئی ہدایت کے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور تجربتہً اور عقلاً خود ہم پر بھی واضح ہو چکا ہے کہ اسلامی اور قرآنی شریعت اور نظام کے آگے اور اس کے مقابل میں خواہ کوئی نظام بھی ہو۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت حالات میں ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب نظام تمہارے پاس موجود ہے تو اسے قائم کر دو۔ دیر کیا ہے اور انتظار کس بات کا؟ یہ سوال نہایت معقول ہے۔ لیکن ہم بھی اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک کامل نظام ایک بہترین نظام ایک دائمی نظام واقعی موجود

تو ہے لیکن افسوس ہمارے پاس اس کی بنیاد موجود نہیں جس پر وہ کھڑا کیا جا سکے پس اس بنیاد کا تیار کرنا ہی ایسا کام ہے جس کی وجہ سے ہم اسے ایک نظامِ نو کہہ سکتے ہیں۔ پرانی بنیاد پھٹ گئی۔ خراب ہو گئی، نرم ہو گئی، ضائع ہو گئی۔ اب اُوپر کا محل اور قصر گرا ہوا اوندھا اور بے کار پڑا ہے۔ جب تک اسے نئے سرے سے ایک نئی اور مضبوط بنیاد پر نہ رکھا جائے۔ اس کی کوئی حیثیت اور کوئی اہمیت نہیں۔ وہ قابل درآمد نہیں۔ اور اس سے کوئی بھی فائدہ اٹھایا نہیں جا سکتا۔

پس یہ وہ بنیاد ہے۔ یہ وہ پلتے نظام کے لئے نئی بنیاد یا بلفظ دیگر نظامِ نو کی بنیاد ہے۔ جس کی تعمیر کی فکر میں جماعت احمدیہ لگی ہوئی ہے اور جس کے درست ہوتے ہی پھر وہی اگلا نظام ایک نئی شان اور ایک نئی شوکت کے ساتھ ظاہر ہو گا۔ اور پھر جب تک وہ بنیاد قائم رہے گی۔ تب تک وہ بھی اپنا کمال اور رونق دکھاتا رہے گا۔ پہلی دفعہ جب یہ نظام قائم ہوا تو ایک مدت چل کر پھر اس کی بنیادوں میں پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ چوہوں اور دیمکوں نے بل بنا کر اسے کھوکھلا کر دیا۔ اور یہ بنیاد اسی طرح شق اور خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ قصرِ بریں متزلزل ہو کر جھک گیا۔ لیٹ گیا۔ تکما ہو گیا۔ اور قوموں کی جائے پناہ اور آرامگاہ نہ رہ سکا۔ اب جو نئی بنیاد دی جا رہی ہے۔ اس میں یہ خیال بھی رکھا جائے گا کہ پھر ویسی باتیں اور وہ نقائص پیدا نہ ہونے پائیں۔ اور انشاء اللہ اب ایسا ہی ہو گا۔

نظامِ نو کی بنیاد

اس مضمون کا ہیڈنگ "نظامِ نو کی بنیاد" ہے جو اب خراب ہو چکی تھی۔ اور اب پھر اس کی تعمیر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے شروع کی۔ اور ان کی خلافت اور جماعت اس کی تکمیل میں مصروف ہے۔ آپ اس وقت ہمہ تن یہ معلوم کرنے کے مشتاق ہوں گے کہ وہ بنیاد کیا ہے۔ اور اس سے کیا مراد ہے۔ اوّل تو آپ مضمون کی رفتار سے خود ہی

سمجھ گئے ہوں گے۔ اور اگر نہ سمجھے ہوں۔ تو میں ایک فقرہ میں اپنا مطلب عرض کئے دیتا ہوں کہ نظامِ نَو کی بنیاد سے مراد "راستباز متقی انسانوں کی ایک ایسی مقدس جماعت جن کے دلوں دماغوں جانوں اور جسموں پہ مبارک شریعت غرّائے اسلامیہ کو کھڑا کیا جا سکے اور "جسے کوئی زلزلہ کوئی پانی کوئی جانور کوئی بوسیدگی اور کوئی حملہ دشمن کا کمزور نہ کر سکے۔" یہ ہے چند مختصر الفاظ میں اس بنیاد کی حقیقت جسے قرآن مجید نے

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (احزاب: ۷۳)

ترجمہ لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا

کے دو پیارے مگر آمنخاہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ جس کی تعریف

كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (الصف: ۵)

ترجمہ۔ گویا وہ ایک دیوار ہیں جس کی مضبوطی کے لئے اس پر سیسہ پگھلا کر ڈالا گیا ہو۔

کے الفاظ خداوندی میں کی گئی ہے۔ اور جسے عُرفاً ہم بھی ہمیشہ "حاملان شرع متین" کی اصطلاح سے اپنی تحریر اور تقریر میں بولتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ نظامِ نَو کی بنیاد جماعت احمدیہ اور صرف جماعت احمدیہ ہے اور کچھ نہیں۔ اور بغیر اس جماعت کی موجودگی کے نظامِ نو اور کسی بنیاد پر رکھا نہیں جا سکتا اور نہ اس کا کوئی اور قائمقام یہ کام دے سکتا ہے۔

بنیاد کی تعمیر کے لئے تین ضروری چیزیں

لیکن نظامِ نَو جو دُنیا کو مصائب و آلام سے نجات دلانے والا ہو۔ وہ چونکہ تمام جہان کے لئے ہے۔ اس سے اس کی بنیاد بھی اس کے مطابق وسیع اور عظیم الشان ہونی چاہیئے۔ نیز اگر کسی بنیاد میں بجائے پختہ عمدہ کنکریٹ کے کچی پلّی اینٹیں بھر دی جائیں

تب بھی وہ مکان مضبوط اور قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ جلدی متزلزل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی دیگر تعمیروں کی طرح اس بنیاد کے لئے بھی تین چیزیں ضروری ہیں۔ جب تک وہ پوری نہ ہوں گی تب تک نظامِ نَو تمام دُنیا کے لئے کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتا۔ اور وہ تین چیزیں یہ ہیں ۔

۱۔ ایمان ۔یقین اور تقوی اللہ

۲۔ ایسے لوگ جو اِن صفات سے بکمال متصف ہوں ۔

۳۔ نہ صرف کچھ لوگ ایسے ہوں ۔ بلکہ جہاں جہاں اور جس جس ملک یا روئے زمین پر یہ نظام پھیلتا جائے ۔ وہاں ان کی مستقل میجارٹی یعنی اکثریت ہو۔ اور ہوتی چلی جائے ۔

ایمان ۔یقین اور تقوےٰ

یاد رکھیں کہ اگر پہلی چیز نہ ہو گی۔ تو پھر یہ عمارت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی۔ انہی چیزوں کا فقدان تھا جو اللہ تعالیٰ کو ایک نبی بھیجنے کی ضرورت پیش آئی ۔ دنیا میں کوئی الٰہی نظام بغیر ایک عظیم الشان نبی کے قائم نہیں ہو سکتا۔ نہ کبھی ہوا ہے۔ تمام مذاہب باطل ہو گئے ۔ تمام فرقے اُمتِ محمدیہ کے کھوکھلے اور بے برکت ہو گئے۔ ایمان ثریا پر چلا گیا۔ اور تقویٰ زیر زمین ۔کہیں روشنی نہ رہی۔ نظامِ شریعت کی جگہ رسم و رواج اور کتاب الحیل نے لے لی تب خدا تعالیٰ نے نئی زمین اور نئے آسمان بنانے کا ارادہ کیا اور مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے ایمان اور تقوٰی دے کر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو بھیجا تاکہ وہ ان کی تخم ریزی افراد میں کر کے ایک جماعت قائم کریں۔ جو دنیا کے روحانی نظامِ نَو کی حامل بن سکے ۔ سو اے بھائیو! وہ تم ہو ۔ وذالِکَ فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

خلافت کی برکات

مگر ایک نظام کے لئے یہ ضروری اور لابدی ہے۔ بلکہ پہلی ضرورت اس کی یہ ہے کہ اس کا ایک چلانے والا ہر وقت موجود ہو۔ پس نبی کی وفات کے بعد سلسلہ خلافت جاری ہوا اور جب تک یہ خلافت زندہ رہے گی۔ یہ نظام بھی زندہ رہے گا۔ کیونکہ ان مومن متقی لوگوں کا گلہ بان خلیفہ ہی ہوتا ہے۔ ورنہ لوگ پراگندہ بھیڑوں کی طرح منتشر ہو کر بھیڑیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پس ضروری ہے کہ ہم نہ صرف متقی مومن ہوں مطیع خلافت بھی ہوں۔ اور اپنے ایمان اور یقین اور تقویٰ میں ہمیشہ ترقی کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

منتقل میجارٹی کی اہلیت

تیسری بات یعنی اکثریت اس لئے ضروری ہے کہ اگر بالفرض یہ جماعت ایک صوبہ یا ایک ملک تک ہی محدود رہے۔ تب تمام دُنیا کے وسیع علاقے میں اپنا نظام قائم نہیں کر سکتی۔ یا بالفرض ہر ملک میں کچھ احمدی پائے جائیں مگر ان کی اکثریت نہ ہو تب بھی غلبہ کفر کا باقی رہے گا اور نظام شریعت کا نفاذ اور اس پر عمل محال ہو جائے گا۔ پس نیا آسمان اور نئی زمین بنانے کے لئے بہ ضرورت ہے کہ یہ جماعت ہر ملک اور ہر خطۂ زمین میں اس قدر بڑھ جائے کہ دوسرے لوگ بقول حضرت مسیح موعود صرف سانسی اور خانہ بدوش اقوام کی طرح رہ جائیں۔ اگر یہ اکثریت ہم پیدا نہ کر سکے تو گو ایک محدود علاقے میں نئے نظام کو صرف ایک ناتمام حد تک چلانے میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ تب بھی یہ نظام تو آفاق پر چھا نہیں سکے گا۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ کلام یہ کہ خود کو ایمان ویقین وتقویٰ اور خشیتہ اللہ سے بھر لو پھر اپنی تعداد میں اضافہ کرتے جاؤ۔ اور جس قدر بھی نظام چل سکتا ہے۔ اُسے خلافت کے ماتحت چلاتے جاؤ اور بڑھاتے جاؤ۔ اور ساتھ ساتھ ہر ملک، ہر براعظم اور دنیا کے ہر حصہ پر چھا جانے کی کوشش کرتے رہو۔ یہاں تک کہ وہ مبارک نظام وہ امر اللہ جس کا خدا نے تم سے وعدہ کیا ہے قائم ہو جائے اور دُنیا کے دُکھ درد مٹ کر انصاف عدل، خدا ترسی کا دَور دورہ تا قیامت چلتا رہے۔ اگر تمام دُنیا بھی کہنے کو ظاہری طور پر احمدی ہو جائے اور ان میں خدا ترسی۔ خداشناسی اور ایمان نہ ہو۔ تو ایسے لوگ ہرگز کوئی نظامِ الٰہی نہیں چلا سکیں گے۔ اگر وہ خود منارہؔ یا اقلیت میں ہوں گے تب بھی یہی نتیجہ ہوگا۔

پس ساری شرائط کو پورا کرو تاکہ وہ نظام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اور پورے طور پر وہ قرآن مجید احادیث اور کتب حضرت مسیح موعود میں موجود ہے اور کچھ حصہ اس کا اس وقت تمہاری اپنی جماعت میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ مکمل ہو کر خدا کی بادشاہت اسی طرح اس زمین پر بھی جلوہ گر ہو جس طرح وہ آسمانوں پر ہے۔ آمین۔

(الفضل ۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء)

حضرت عمرؓ کا اسلام

حضرت عمرؓ قریش کے معزز خاندان میں سے تھے۔ اور جب کبھی قریش کی آپس میں یا کسی غیر سے لڑائی ہوتی تو عمرؓ ہی اُن کے سفیر بن کر جایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ چالیسویں مسلمان مرد تھے۔ آپؓ سے پہلے ۳۹ مرد اور گیارہ عورتیں مسلمان ہو چکی تھیں۔ ان دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقم کے گھر میں تبلیغ کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ اصحابِ فیل کے حملہ سے ۱۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ بڑے لمبے قد اور اونچی آواز والے آدمی تھے۔ ان کا رعب اور اثر بھی بہت تھا۔ ان کی عادت تھی۔ کہ زمانہ کفر میں مسلمانوں کو بہت ستایا کرتے تھے۔ آپ کے مسلمان ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُعا فرمایا کرتے تھے۔ یا اللہ یا تو عمرؓ بن خطاب مسلمان ہو جائے۔ یا عمرو بن ہشام (یعنی ابو جہل) تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔

اس دعا کے بعد ایک دن کعبہ میں قریش نے کمیٹی کی۔ اور یہ پاس کیا۔ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہت فساد پھیلا رکھا ہے جو شخص اسے قتل کر دے گا۔ اسے سَو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ وہاں سے جوش میں اُٹھے کہ میں جا کر محمد کو قتل کرتا ہوں۔ رستہ میں ان کو ایک شخص ملا اس نے پوچھا۔ عمر کہاں جاتے ہو۔ عمرؓ نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے چلا ہوں۔ اُس نے ہمیں بہت ستایا ہے۔ وہ شخص بولا۔ عمر یہ تمہاری سخت غلطی ہے۔ عمر کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے

تو پہلے تیری ہی گردن اڑا دوں گا۔ وہ شخص سچ مچ مسلمان تھا۔ کہنے لگا۔ غیر لوگوں کو قتل کرتے پھرتے ہو۔ پہلے اپنوں کی تو خبر لو۔ ان کو مارلو۔ تو پھر اور طرف رُخ کرنا۔ عمرؓ پوچھنے لگے وہ کون؟ مسلمان بولا۔ پہلے تو اپنی سگی بہن اور اس کے میاں سعید کی خبر لو۔ عمر نے یہ سُن کر سیدھا بہن کے گھر کا رخ کیا۔ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ جو مسلمان غریب مفلس ہوتا۔ اسے کسی کھاتے پیتے مسلمان کے سپرد کر دیتے تاکہ غریب کا گذارہ ہو سکے۔ چنانچہ عمر کے بہنوئی سعید کو بھی دو غریب مسلمان سپرد کر رکھے تھے۔ عمر نے وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی کون؟ عمر نے کہا۔ میں ہوں خطاب کا بیٹا۔ اس وقت انہوں نے سُنا کہ اندر کئی آدمی بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمر خود بیان کرتے ہیں کہ میری آواز سُن کر یہ لوگ اِدھر اُدھر چھپ گئے اور گھبراہٹ میں وہ کتاب بھی وہیں بھول گئے۔ پھر میری بہن نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ سُنا ہے تم بھی مسلمان ہو گئی ہو۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ اس پر میں نے جو کچھ میرے ہاتھ میں آیا۔ اٹھا کر مارنا شروع یہاں تک کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اور خون کی ندی بہنے لگی۔ وہ رونے لگیں اور کہتی جاتی تھیں۔ بھائی چاہے مار ڈالو۔ میں تو اب مسلمان ہو چکی۔ میں نے جو خون دیکھا۔ تو ہٹ کر پرے ایک تخت پر جا بیٹھا۔ وہاں ایک کتاب پڑی دیکھی۔ میں نے کہا یہ کیا کتاب ہے۔ مجھے دو۔ میری بہن نے کہا کہ خبردار اسے ہاتھ نہ لگانا۔ اس کتاب کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔ تم لوگ خدا کے حکم کے مطابق غسل نہیں کرتے۔ اس لئے ناپاک ہو۔ ناچار میں نے غسل کیا اور اس کتاب کو پڑھنے لگا۔ جب میں نے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھی تو بے خود ہو گیا اور کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔ پھر جب ذرا دل ٹھکانے ہوا تو یہ آیت پڑھی۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الحشر: ۲)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کر رہا ہے اور وہ

(اللہ) غالب اور حکمت والا ہے۔

جب قرآن میں کہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی نام آتا تو میں بے خود ہو جاتا۔ پھر ذرا آپے میں آتا تو پڑھنے لگتا۔ آخر جب میں اس آیت پر پہنچا۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (الحدید : ۸)

ترجمہ :۔ اے لوگو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور جن (جائیدادوں) کا (پہلی قوموں کے بعد) تم کو مالک بنایا ہے اُن میں سے خرچ کرو۔

تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ دیا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میرا کلمہ سن کر جو مسلمان اندر اِدھر اُدھر چھپے ہوئے تھے وہ باہر نکل آئے اور خوشی کے مارے اَللّٰهُ اَكْبَرُ کے نعرے لگانے لگے اور مجھے کہا اے عمر تمہیں خوشخبری ہو۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پیر کے دن یہ دُعا کی تھی کہ خدایا۔ یا تو عمر کو مسلمان کر دے یا ابوجہل کو۔ سو خدا نے تم کو یہ فخر نصیب کیا۔ اس کے بعد میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کہاں ہیں۔ لوگوں نے مجھے پتہ بتایا۔ میں وہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور کہا۔ میں عمر ہوں۔ دروازہ کھولو۔ مسلمان میرے ظلموں اور سختیوں سے واقف تھے۔ اور میرے مسلمان ہو جانے کی ابھی کسی کو خبر نہ تھی۔ اس لئے دروازہ کھولنے میں پس و پیش کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بے شک دروازہ کھول دو۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو عمر ہدایت پا جائے گا۔ ان لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ لئے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپؐ نے میرا کرتا پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور فرمایا۔ اے خطاب کے بیٹے۔ اب تو مسلمان ہو جاؤ۔ اے اللہ اسے ہدایت

دے۔ میں نے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہ سُن کر مسلمانوں نے تکبیر کے نعرے اس زور سے بلند کئے کہ تمام مکہ گونج اٹھا۔ اس کے بعد مجھے یہ جوش اٹھا کہ یا تو مسلمانوں کو یہ کافر لوگ مارا نہ کریں ورنہ پھر مجھے بھی ان کی طرح مار پیٹا کرے۔ اور جو مصیبت عام مسلمانوں کو پہنچتی ہے مجھے بھی پہنچے۔ یہ ارادہ کر کے میں اپنے ماموں کے پاس گیا۔ اور ان سے کہا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت کہا۔ کہ اس دین کو چھوڑ دو۔ مگر میں نے یہی جواب دیا۔ کہ نہیں۔ آخر انہوں نے مجھے گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا میں نے کہا۔ کچھ لطف نہ آیا۔ مار نہیں پڑی۔ اس کے بعد میں قریش کے سب رئیسوں کے دروازہ پر گیا اور اسی طرح اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ مگر کسی نے مجھے نہ مارا۔ صرف گھر سے باہر نکال دیا میں نے پھر یہی کہا۔ کہ کچھ مزا نہ آیا۔ آخر ایک شخص نے مجھ سے کہا۔ کہ عمر کیا تم اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ جب سب رئیس کعبہ میں جمع ہوں۔ اس وقت جمیل کو کہہ دینا وہ ڈھنڈورہ دے دے گا۔ میں نے کہا۔ اچھا۔ جب لوگ کعبہ میں جمع ہو گئے۔ تو میں نے جمیل کے کان میں چپکے سے کہہ دیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے اسی وقت غل مچا دیا۔ یہ سُن کر سب لوگ مجھ پر پل پڑے۔ اور مارنے لگے۔ میں بھی انہیں مارنے لگا۔ اتنے میں میرے ماموں نے مجھے پہچان لیا۔ اور بآواز بلند کہا۔ لوگو! میں اپنے بھانجے کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ سُن کر لوگ پرے ہٹ گئے۔ اس کے بعد پھر میں نے یہی دیکھا۔ کہ لوگ مجھے تو کچھ نہیں کہتے مگر اور غریب مسلمان روزانہ مار کھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پھر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور ایک دن جب لوگ کعبہ میں جمع ہوئے۔ تو میں نے اپنے ماموں سے کہا۔ کہ سنیئے میں آج سے آپ کی پناہ واپس کرتا ہوں۔ انہوں نے ہر چند مجھے منع کیا۔ مگر میں نے نہ مانا۔ اور ان کی پناہ لوگوں کے سامنے واپس کر دی۔ اس کے بعد میں برابر مشرکوں کی مار کھاتا رہا۔ اور مارتا بھی رہا۔ یہاں تک کہ خدا تعالےٰ نے اسلام کو غالب کر دیا۔

ایک دن حضرت عمرؓ پر لوگوں نے حملہ کیا۔ اور ان کو کعبہ میں خوب مارا۔ انہوں نے

مقابلہ کیا۔ اور صبح سے دوپہر ہوگئی۔ آخر حضرت عمرؓ تھک کر گر پڑے۔ مگر ان لوگوں نے ان کو مارنا نہ چھوڑا۔ حضرت عمرؓ مار کھاتے جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ اے ظالمو! تم سے جو ہو سکے کرو۔ خدا کی قسم اگر ہم مسلمان تین سو ہو جاتے۔ تو پھر تم دیکھتے۔ ہم تم کو کعبہ سے کان پکڑ کر باہر نکال دیتے۔ (خدا کی قدرت ایسا ہی ہوا۔ یعنی بدر میں ۳۰۰ کے قریب مسلمانوں نے کفار قریش کے پورے ساز و سامان سے آراستہ لشکر کو اس طرح تباہ کر دیا کہ آج تک عقلمند اس واقعہ پر حیران ہیں) اور اس طرح انہوں نے ثابت کر دیا۔ کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ وہ یونہی نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ پورا عزم اور ارادہ شامل تھا۔

(روزنامہ الفضل ۲۱ مئی ۱۹۲۸ء)

سیّئ الاسقام۔ یعنی بُری بیماریاں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعاؤں میں سے ایک دُعا یہ بھی ہے کہ
اللھم انی اعوذ بك من البرص والجذام والجنون
وسیّئ الاسقام
یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ جلد کے سفید داغوں سے اور کوڑھ سے اور جنون سے اور سب بُری بیماریوں سے۔ یہ دُعا پڑھ کر مجھے کئی دفعہ خیال آیا کرتا تھا۔ کہ ایسی بُری اور خبیث بیماریاں کیا کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر میں نے اپنی سمجھ اور تجربہ کے مطابق ایک فہرست تیار کی کہ میرے نزدیک اس قسم کے امراض انسان کے لئے بہت بُرے ہیں۔ اور وہ اس فہرست میں داخل ہیں جن سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ سو میں ان امراض کو اس مضمون میں لکھ دیتا ہوں۔ آگے جس قدر جس کا تجربہ وسیع ہو۔ وہ مزید ایزادی بھی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے۔ کہ ایک بیماری امیر کے لئے بُری نہ ہو۔ مگر وہی ایک غریب کے لئے تباہی کا باعث بن جائے۔ یا ایک زمیندار کے لئے خبیث نہ ہو۔ مگر ایک ملازم پیشہ کے لئے سیّئ الاسقام بن جائے۔ یا ایک فقیر تو اس پر صبر کر سکے مگر ایسا شخص جس کی عمر ناز و نعمت میں گزری ہو اس کی برداشت نہ کر سکے۔ بلکہ خودکشی کا مرتکب ہو جائے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قریبًا ہر بیماری ایسے مقام اور ایسے حالات کو پہنچ سکتی ہے کہ وہ سیّئ الاسقام میں داخل ہو جائے۔ پس خدا ہی ہے جو

اپنے فضل سے اس کا سیئہ والا حصہ دُور کر سکتا ہے۔ وھو الشافی۔

اب میں وہ فہرست لکھتا ہوں۔

۱۔ وہ بیماریاں جو انسان کی شکل کو مسخ کر دیں اور اُسے بدصورت بنا دیں۔ مثلاً بے حد موٹاپن، نکٹاپن۔ یا ناک بیٹھ جانا۔ برص وغیرہ نیز بعض وہ بیماریاں جن کو ڈاکٹر لوگ Deformities کہتے ہیں۔

۲۔ وہ بیماریاں جن سے دوسروں کو گھن آئے یا تیماردار تنگ آجائیں۔ مثلاً پرانے دست یا گندے مزمن زخموں میں پیپ لہو بہتے رہنا یا جن کے ساتھ غلاظت بدبو اور گندگی وابستہ ہو۔ مثلاً ناک میں کیڑے پڑ جانا۔

۳۔ وہ بیماریاں جن سے خدا کی طرف سے توجہ جاتی رہے۔ یا عبادت اور دُعا کا لطف مفقود ہو جائے جیسے بعض قسم کے مراق۔

۴۔ وہ بیماریاں جن سے اخلاق خراب ہو جائیں۔ میری مراد اس سے صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بیمار بدمزاج ہو جائے۔ بلکہ بعض بیماریاں ایسا رنگ بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ کہ مریض چور، جھوٹا اور بدچلن ہو جاتا ہے۔ یا بہت لغو بکواس کرتا رہتا ہے۔

۵۔ ایسی بیماریاں جن کی وجہ سے اس مریض پر لوگ ہنسی مذاق کریں۔ مثلاً بعض قسم کے وہم اور جنون اور بعض قسم کے رعشے۔ یا زیادہ ہکلاپن۔

۶۔ وہ بیماریاں جن میں بیمار کو سخت گھبراہٹ ہو۔

۷۔ وہ جن میں موت فجاۃً واقع ہو جاتی ہو۔ اور گنہگار کو توبہ نصیب نہ ہو۔ ہاں مغفور لوگوں کے لئے کوئی ہرج نہیں۔

۸۔ وہ بیماریاں جو عذابِ الٰہی کے رنگ میں نازل ہوں۔ مثلاً طاعون۔

۹۔ وہ امراض جن میں قدرتی راستے بند ہو جائیں۔ مثلاً پیشاب، پاخانہ۔ ریح، سانس وغیرہ کے راستے۔

۱۰۔ وہ بیماریاں جن میں آدمی سسک سسک کر اور بڑے لمبے عرصہ تک مبتلا ہو کر مرے۔

۱۱۔ وہ امراض جن کا بظاہر کوئی علاج نہ ہو اور ان کی وجہ سے ایسے بیمار میں بجائے صبر کے ناامیدی پیدا ہو

۱۲۔ وہ درد اور تکالیف جو ناقابلِ برداشت ہو جائیں یا بار بار دورہ کر کے آتے ہوں۔

۱۳۔ وہ امراضِ خبیثہ جو اکثر حالات میں معاصی کا نتیجہ ہوتے ہیں مثلاً آتشک، سوزاک یا استمنا بالید کے نتیجہ میں جریان اور نامردی نیز وہ بیماریاں جو شراب اور دیگر نشوں کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

۱۴۔ حواسِ خمسہ میں سے کسی حس کا مستقل طور پر مارا جانا۔ خصوصاً اندھا بہرا یا گونگا ہو جانا۔

۱۵۔ ارذل العمر جس میں انسان کا حافظہ اور عقل مفقود ہو کر آدمی حیوان کی طرح ہو جاتا ہے

۱۶۔ نیز ایسی دماغی اور اعصابی بیماریاں جن سے آدمی آدمی نہیں رہتا مثلاً بعض مرگی کے اقسام اور بعض خاموش قسم کے جنون اور بعض قسم کے فالج

۱۷۔ وہ امراض جن سے انسان مستقل طور پہ دوسروں کا محتاج اور ان پہ ناگوار بوجھ ہو جائے۔

۱۸۔ وہ امراض جن کی وجہ سے اوپر والوں کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جائے۔ یا جن کی وجہ سے سب لوگ اس پر ترس کرتے ہوں۔

۱۹۔ ایسے لمبے اور متعدی امراض جن کی وجہ سے مریض کے اپنے عزیز و اقارب بھی اس سے پرہیز کریں۔ مثلاً سل۔ جذام۔ آتشک وغیرہ نیز بدبودار امراض جن کی وجہ سے ہر شخص ایسے آدمی سے بھاگے مثلاً سخت قسم کا بغل گند یا منہ کے سانس اور ناک میں سے سخت بدبو کا نکلتے رہنا۔

۲۰۔ ایسے امراض جن کی وجہ سے لوگوں کو اس مریض سے ضرر کا خوف پیدا ہو۔ مثلاً

دیوانگی ۔

۲۱۔ وہ امراض جن کی وجہ سے خودکشی کے خیالات پیدا ہوتے ہوں۔ یا وہ بیماری خودکشی پر منتج ہو ۔

۲۲۔ ایسی مستقل اور موذی بیماری جس سے زندگی تلخ ہو جائے۔ مثلاً ٹیک Ticks

۲۳۔ وہ بیماری جس کی وجہ سے انسان مسجدوں اور بزرگوں کی مجلسوں سے محروم ہو جائے مثلاً ہر وقت بلغم کا آتے رہنا۔ یا گندے قسم کے ناسور یا متعفن امراض ۔

۲۴۔ ایسے امراض جن کی وجہ سے مکروہ نشے یا محرّمات بکثرت استعمال کرنے پڑیں ۔

۲۵۔ ہر قسم کا جنون

۲۶۔ جن میں عمر مناسب سے پہلے ہی کسی جوان عورت کے خاوند کی رجولیت جاتی رہے ۔

۲۷۔ وہ امراض جن کی وجہ سے عقل و شعور میں مستقل طور پہ بہت کمی آجائے ۔

۲۸۔ وہ بیماریاں جن کی وجہ سے شرم و حیا زائل ہو جائے ۔ اور جن کی وجہ سے لوگوں کے سامنے بار بار بے پردہ اور ننگا ہونا پڑے۔ مثلاً دوسروں سے پیشاب نکلوانا یا ایسی معذوری کہ استنجا اور آبدست ہمیشہ نامحرموں سے کرانا پڑے ۔

۲۹۔ وہ امراض جو آئندہ نسلوں میں منتقل ہوں اور نسل کو زیادہ خراب کرتے چلے جائیں ۔

۳۰۔ وہ امراض اور لاچاریاں جو انسان کو باوجود مساعد حالات موجود ہونے کے دینی اور دنیوی ترقی سے مانع ہوں ۔

۳۱۔ وہ بیماریاں جن کے نتیجہ میں ایک پھٹکار اور نحوست چہرہ پہ برسنے لگے ۔

۳۲۔ وہ بیماریاں جو دنیا میں ہی خدائی انتقام کے طور پہ لوگوں کے لئے عبرت ہو جائیں ۔ مثلاً کسی غریب کو مارنے کے بعد مارنے والا کا ہاتھ مفلوج ہو جائے ۔ یا کسی مریض انسان پر تمسخر کرتے کرتے وہی بیماری تمسخر کرنے والے میں پیدا ہو جائے ۔

۳۳۔ وہ بیماریاں جو والدین یا بزرگوں کی بددُعا کا نتیجہ ہوں ۔

واضح ہو کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ مخصوص طور پر بُرے اور خبیث امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور کسی مدعی نبوت کا ان میں مبتلا ہونا اس کے دعوئے نبوت کے لئے کافی تردید ہے۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ فلاں صاحب نے جو رسول ہونے کا دعوے کیا ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ سے بہت نیک اور پارسا آدمی ہے تو کیا ہم ان کو رسول مان لیں۔ میں نے کہا مومن اور نیک ہونا اور بات ہے۔ اور رسالت اور نبوت الگ چیز ہے مثلاً میں اس شخص کو رسول اس لیے نہیں مانتا کہ اس کے چہرہ سے ناک جھڑ گئی ہے۔ اب یہ نقص ولایت میں تو حارج نہیں ہے۔ مگر رسالت میں قطعی طور سے حارج ہے۔ نیز انہی صاحب کو بارہا میں نے چارپائیوں سے اس لئے بندھے ہوئے اور رسیوں سے جکڑے ہوئے دیکھا ہے۔ کہ ان پر سخت قسم کے دورے جنون کے پڑتے تھے۔ اور وہ لوگوں کو مارتے اور گالیاں دیتے تھے۔ پس یہ بھی رسالت کے منافی ہے۔

ہاں البتہ حضرت داؤد کے لئے تورات میں بعض حالات ایسے بیان ہوئے ہیں۔ جن سے ان کا آخری عمر میں سالہا سال بے کار ہو جانا ثابت ہوتا ہے لیکن یہ اسلامی عقیدہ نہیں ہے۔ اور تورات کی ہر بات ماننے کے قابل بھی نہیں ہے۔ نیز یہودیوں میں بہت سے لوگ ان کے دشمن بھی تھے۔ غالباً یہ اُن کی اڑائی ہوئی مبالغہ آمیز باتیں ہوں گی۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح حضرت ایوبؑ کے جسم کے سڑ جانے اور کیڑے پڑ جانے کا بھی ہمارے مفسرین کے ہاں بہت ذکر آتا ہے۔ سو جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بیان بھی بالکل غلط اور منافی حیثیتِ انبیاء ہے اور ہم نے تو اپنی آنکھوں سے ایک ایسا نبی اس زمانہ میں دیکھا ہے جس کی صداقت کے نشانات میں سے ایک نشان اس کی بیماریاں بھی تھیں مگر باوجود ان بیماریوں کے اس کا جسمانی اور روحانی حُسن روز افزوں ترقی پر تھا۔ اور اس کا مرنا بھی اس طرح ہوا جس طرح انگریزی میں ایک مشہور مثل ہے کہ

Dying in harness

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نابینا ہونا تو عارضی ہی تھا۔ مستقل نہ تھا۔ اور بقول بعض بزرگوں کے ابیضت عینا کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ لیکن تورات میں حضرت اسحٰقؑ کا نہ صرف آخری عمر میں اندھا ہو جانا لکھا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ ان کے نابینا ہو جانے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو دھوکہ دے کر ایک غیر مستحق بیٹے کو نبی بنوا لیا !!! حالانکہ موٹی بات ہے۔ کہ اگر نبی ہی اندھا ہو جائے تو وہ لوگوں کو ہدایت کیا دے گا۔ بلکہ اُلٹا لوگ اُسے دھوکا دے لیا کریں گے۔ جیسا کہ تورات نے حضرت اسحٰق کے بارے میں لکھا ہے۔ ہمارے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو تو خدا تعالیٰ نے فرما دیا تھا کہ تیرے تین اعضا پر ہماری خاص رحمت ہے۔ اور ان میں سے ایک عضو آنکھ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خاص تیری آنکھیں سلامت رہیں گی۔ اور دوسرے نبی اندھے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ حضور کو یہ تسلی اس واسطے دی گئی تھی کہ آپ کو ذیابطیس وغیرہ کی تکلیف کی وجہ سے اور ہمیشہ قلمی محنت کرنے کے سبب سے آنکھوں کا خطرہ دیگر انبیاء سے زیادہ لاحق تھا۔ پس ایسی تسلی خدا کی طرف سے ملنی ضروری تھی۔ تاکہ بے فکر ہو کر تحریر کا کام کر سکیں۔ جو حضور کا خاص نشان اور معجزہ تھا۔

بالآخر یہ عرض ہے کہ دراصل میرا مقصد احباب کو اس مسنون دُعا کی طرف توجہ دلانے کا تھا۔ کہ وہ اسے بھی اپنے معمولات میں شامل کریں۔ اور بڑی بیماریوں اور امراض کے گندے حصوں سے نجات حاصل کریں۔ آمین۔

(الفضل ۶ر دسمبر ۱۹۴۳ء)

شاعر

بعض لوگوں کا یہ حال ہے۔ کہ جہاں شعراور شاعری کا نام آیا۔ فوراً یہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ کہ یہ بدعت ہے کفر ہے۔ اور ناجائز امر ہے۔ اور یہ اکثر مذہبی لوگ ہی ہوتے ہیں حالانکہ ان کے لئے فیصلہ کا راستہ بہت آسان تھا۔ یعنی یہ کہ وہ دیکھ لیتے۔ کہ خود کلام الٰہی شعر وشاعری کے متعلق کیا فتوٰے دیتا ہے۔ آیا اسے بکلی ایک ناجائز امر ٹھہراتا ہے۔ یا اچھی شاعری اور بُری شاعری دو الگ قسمیں شعر کی ٹھہرا کر ایک کو جائز اور دوسری کو ناجائز فرماتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے آپس کے جھگڑوں میں سب سے اعلیٰ اور سب سے صحیح تر حکم اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہی ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک سورۃ کا نام سورۂ شعرا ہے۔ اس میں شاعروں اور ان کی شاعری کا بھی ذکر ہے۔ اور شاعروں کے حق میں یہ فرمان صادر ہوا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ
يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا
وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (الشعراء ۲۲۵ تا ۲۲۸)

(اور وہ شاعر بھی شیطانی لوگ ہیں۔ کہ گمراہ لوگ جن کی پیروی کرتے ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہر جنگل میں سرگرداں پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے تو ہیں پر کرتے نہیں۔ بجز ان

شاعروں کے جو ایمان[۱] لائے اور کام کئے اچھے اور یاد کیا[۲] اللہ کو بہت اور مظلوم[۳] ہونے کے بعد بدلہ لیا۔ اور عنقریب ظالم بھی جان لیں گے۔ کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا)

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں شاعروں کی بیان فرمائی ہیں۔ جن میں سے ایک کو بُرا کہا ہے اور دوسروں کی تعریف کی ہے اور جو بُرے ہیں ان کے متعلق کہا ہے کہ ان میں تین صفات بُری ہیں۔ اس لئے وہ مردود ہیں اور جو نیک ہیں۔ ان کی بھی تین ہی صفات کی تعریف کی ہے۔ جن کی وجہ سے وہ اچھے ہیں۔ اب اس معیار سے ہر عقل مند شخص فوراً بُرے اور اچھے شاعر میں تمیز کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ اچھی صفات بانی سلسلہ احمدیہ میں پائی جائیں۔ اور بُری صفات میں سے ایک بھی نہ پائی جائے۔ تو پھر کس کا حق ہے کہ کوئی بُرائی کا کلمہ ایسے بزرگ کے حق میں استعمال کر سکے۔ ہاں اگر اس کے مخالف بات ثابت ہو۔ تو پھر وہ بیشک اعتراض کر سکتے ہیں۔ مگر یہ ہرگز جائز نہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں تو اچھے شاعر کی تعریف کی گئی ہو۔ مگر کوئی مسلمان کہلانے والا محض شاعر ہونے کی وجہ سے اس کی مذمت کرنے لگے۔ اب سنیئے کہ بُرے شاعروں کی صفات کیا کیا ہیں۔

(۱) ایک تو یہ ان کے متبع اور ان کو پسند کرنے والے اور ان کو اپنا لیڈر سمجھنے والے گمراہ شریر اور فاسق اور فاجر لوگ ہوا کرتے ہیں۔ یعنی وہ شاعر غیر مومن، غیر متقی، بدکار، شرابی بدچلن طبقہ میں ہر دلعزیز ہوتے ہیں جیسے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض شاعروں کی غزلیں ہمیشہ رنڈیاں گاتی ہیں۔ اور آوارہ لوگوں کو ان کے دیوانوں کے سینکڑوں اشعار ازبر ہوتے ہیں۔ اور ناجائز عاشقی معشوقی کے مصالحہ سے ان کے اشعار بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہیں شراب وکباب کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ کہیں امردوں کا حسن بیان ہوتا ہے۔ کہیں خدا تعالےٰ کی نافرمانی اور شیطان کی تعریف ہوتی ہے۔ کہیں نامحرموں کی خوبصورتی کا ذکر ہے۔ تو کہیں شہوانی جذبات کو تحریک دی جاتی ہے۔ کہیں قیامت، دوزخ جنت سے تمسخر ہوتا ہے تو کہیں نیکی نماز روزہ حج وغیرہ نیک اعمال پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ سو جس شاعر کے ہاں اس قسم کے

شعراکثر ہوں اور بے دین، فاسق، فاجر طبقہ اس کا مرید ہو وہ بُرا شاعر ہے۔

۲۔ دوسری علامت بُرے شاعروں کی یہ ہے کہ وہ ہر جنگل میں سرگرداں پھرتے ہیں یعنی کبھی کربلا کا واقعہ لکھ کر لوگوں کو رُلاتے ہیں اور کبھی ہزلیہ اور مزاحیہ کلام سے لوگوں کو ہنساتے ہیں۔ کبھی موحد بن جاتے ہیں۔ اور کبھی مشرک۔ کبھی بے جا تعریف اُمرا کی کرتے ہیں۔ کبھی کسی کی ہجو میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں۔ کبھی سوال کرتے اور مانگتے ہیں۔ کہیں نیچرل کے رنگ میں سر نکالتے ہیں تو کہیں سیاسی رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض کچھ پتہ نہیں لگتا کہ ان کا اصلی اور مرکزی نقطہ کیا ہے۔ بلکہ ہر فن مولا بازیگروں کی طرح جیسا موقعہ ہوا اور دماغ کی آوارگی جدھر بھی لے جائے ویسے ہی اشعار کہنے لگتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی غزل کے ہر شعر میں ایسے ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں آپس میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ ابھی ایک آدمی کی تعریف کر رہے ہیں۔ جب حسبِ خواہش انعام نہ ملا۔ تو اسی کی ہجو اور مذمت میں مصروف ہیں۔ مرکزی اصل اور استقلال کسی ایک مضمون یا حال سے نہیں ہوتا بلکہ تھالی کے بینگن ہوتے ہیں۔

(۳) تیسری صفت ان بُرے شاعروں کی یہ ارشاد فرمائی کہ جو اشعار وہ لکھتے ہیں۔ ان کے مضمون کے برخلاف خود عمل کرتے ہیں۔ یعنی اگر اخلاقی شاعر ہیں۔ تو خود نمایاں طور پر بداخلاق ہیں۔ یا مذہبی لیڈر ہیں تو خود شراب بدکاری و جوئے وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ نہ نماز پڑھتے ہیں۔ نہ روزہ رکھتے ہیں۔ نہ اسلام کے ظاہری احکام پر عمل ہے اور کہنے کو مصلحِ اُمت کہلانے کا دعوےٰ ہے۔

اس سے آگے چل کر قرآن کریم فرماتا ہے۔ یہ تو بُرے شاعروں کی پہچان ہم نے تم کو بتائی ہے۔ اب بطور استثناء ایک فرقہ نیک اور صالح شاعروں کا بھی ہے ان کی پہچان حسبِ ذیل ہے۔

(۱) اول یہ کہ وہ مومن اور نیک عمل ہوتے ہیں۔ بدمعاش منڈلی کے سرکردہ نہیں۔ بلکہ ان کے اثر سے دوسرے لوگ بھی ایمان اور نیکی میں ترقی کرتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ نیک شاعروں کے اشعار کا مرکزی نقطہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات ہوتا ہے۔ ہر پھر کر ان کے شعروں میں اسی کا ذکر اسی کی تعظیم اسی سے دعا اسی کے کلام کے حقائق و معارف اسی کے رسولؐ کی نعت اور اسی کے احکام کی تبلیغ ہوتی ہے۔

(۳) تیسری تعریف اچھے شعراء کی یہ فرمائی۔ کہ جب گمراہ، کافر یا بددین لوگ اسلام قرآن یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا بزرگانِ دین یا خود ان پر یا خدائی تعلیموں پر ظالمانہ حملے اور اعتراضات کریں تو وہ سینہ سپر ہو کر ڈیفنس کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان حملوں کا جواب دیتے ہیں اور دلائل سے زبانی اور قلمی جہاد کرتے ہیں۔ نیز خدا کے لئے، خدائی سلسلوں کے لئے، خدا کے مرسلوں کے لئے اور اپنے لئے غیرت دکھاتے ہیں۔ اور ظالم دشمن سے بذریعہ اشعار کے بہ رعایت اخلاق بدلہ لیتے ہیں۔ سو ایسے شاعر بھی خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔

اب اس تفصیل کے بعد جب ہم حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے اشعار کو جو حضور نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔ بغور دیکھیں تو خدا کے پسندیدہ شاعروں والی تینوں باتیں بھی ان میں بشدت نظر آئیں گی۔ یا تو ایمان اور اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی حمد اس کے رسول کی نعت قرآن کی مدح اور اسلام کی صداقت کا ذکر ہے۔ یا پھر جو حملے ظالم دشمن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ دینِ اسلام اور قرآن پر کئے ہیں۔ اور سلسلہ حقّہ احمدیہ پر الزامات لگائے ہیں۔ ان کا جواب ہے اس سے زیادہ ان تین باتوں سے باہر حضور کا ایک شعر بھی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے پہلی تین باتیں جو بُرے شاعروں کی بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک بات بھی حضور کے کلام اور حضور کی جماعت اور حضور کے اخلاق میں نہیں پائی جاتی۔ اور یہی آپ کے پاک اور محبوب الٰہی شاعر ہونے کی دلیل ہے

شاعر (قسط دوم)

الفضل مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۴۴ئہ میں مَیں یہ قرآن مجید کی رائے شاعروں کی بابت لکھ چکا ہوں ۔کہ دو قسم کے شاعر ہیں۔ ایک خدا تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور ایک غیر پسندیدہ اور یہ نہیں ہے۔ کہ شعر ہمیشہ ہی بُرا ہوتا ہے۔ شعر تو صرف ایک موزوں کلام ہے جو اگر بدی کی تعلیم دیتا ہے تو بُرا ہے ۔ اور اگر نیکی کی تو اچھا ہے۔ آج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اسی شعر و شاعری کی بابت بیان کرتا ہوں۔ صحیح بخاری میں حضورؐ کا ایک قول مروی ہے کہ **ان من الشعر لحکمۃ** ۔ یعنی لعض شعر میں حکمت ہوا کرتی ہے۔ اب حکمت ایک ایسی مفید اور بابرکت چیز ہے۔ جس کی خوبی میں کسی کو بھی کلام نہیں ۔ یہاں تک کہ

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا ۚ (البقرہ: ۲۷۰)

(جسے حکمت ملی سمجھ لو کہ اُسے خیر کثیر مل گئی) اس کی تعریف خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی کبھی کبھی گذشتہ شعراء کا عمدہ کلام سُنا کرتے تھے ۔ اسی طرح کفار عرب اور یہود جب اپنے اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برائیاں اور ہجو بیان کیا کرتے تھے۔ تو ان کا جواب آپ اپنے درباری شاعر حسانؓ بن ثابت سے دلوایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حسان تو بھی ان مشرکوں کی ہجو کر جبرئیل تیری مدد پر کھڑے ہیں ۔ اے حسان تو میری طرف سے ان کا جواب دے ۔ اور ساتھ ہی دُعا فرماتے۔ کہ یا اللہ حسان کی تائید روح القدس سے فرما۔ اور ان سے یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اے حسان جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مخالفوں کا مقابلہ کرتا رہے گا ۔

جبرئیل بھی تیری تائید و نصرت کرتا رہے گا۔ نیز اپنا منبر ان کے لئے بچھوا دیا کرتے تھے۔ پھر خود معہ صحابہ کرام ان کے ایسے اشعار سُنا کرتے تھے۔ سو یہی حال حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے اشعار کا ہے کہ وہ بھی از اول تا بالآخر خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی حمد و نعت یا مخالفین اسلام کے مقابلہ میں کہے گئے ہیں۔

ایک دفعہ کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور کی رائے شعر کی بابت کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مومن کبھی تلوار سے جہاد کرتا ہے۔ اور کبھی زبان سے یعنی دین کی تائید میں شعر کہنا لسانی جہاد میں داخل ہے۔ اور آج کل توسیفی جہاد کے سب راستے بند ہیں۔ صرف دلائل کا زبانی جہاد ہی دنیا میں باقی ہے۔ پس اس جہاد کو جو شخص خدا اور اس کے رسول کے لئے کرے وہ ایسا ہی مجاہد ہے جیسے کہ زمانۂ سابق والا تلوار کا مجاہد۔ اسی طرح کسی اور شخص نے حضور سے شعر کے بارہ میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ شعر بھی تو کلام ہی ہے۔ اس کا مضمون اچھا ہو۔ تو وہ بھی اچھا ہے۔ اور مضمون بُرا ہو تو وہ بھی بُرا ہے۔ غرض مدار صرف مضمون پر ہے نہ کہ شعر ہونے پر۔ علاوہ ازیں نہایت صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے خود بھی بعض شعر کہے ہیں۔ مثلاً ؎

اللھم لا عیش الا عیش الآخرہ

فاغفر الانصار والمھاجرہ

یعنی اے اللہ اصل زندگانی تو آخرت کی زندگانی ہی ہے۔ پس تُو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔ اسی طرح ایک جہاد میں حضورؐ کی انگشت مبارک زخمی ہو گئی۔ تو آپ نے اُسے دیکھ کر فرمایا ؎

ھل انت الا اصبع دمیتِ

وفی سبیل اللّٰہ مالقیت

یعنی تُو تو ایک ذرا سی انگلی ہے جس میں سے خون نکل آیا ہے اور تُو نے اللہ کی

راہ میں یہ تکلیف اٹھائی ہے۔ پھر رنج کاہے کا۔ اسی طرح جب جنگِ احزاب سے پہلے خندق کھودی جاتی تھی۔ اور غالباً اس وقت بھی جب مسجدِ نبوی تعمیر ہو رہی تھی تو حضور جو مزدوروں کی طرح صحابہؓ کے ساتھ مل کر کام کیا کرتے تھے۔ پکار پکار کر بعض اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اور کبھی صحابہؓ اشعار پڑھتے تو حضور ان کا جواب دیا کرتے تھے۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کسی شاعر کا قول نہیں ہے" یا یہ کہ "ہم نے اس رسول کو اشعار کی تعلیم نہیں دی" ایسی آیات جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟ سو واضح ہو۔ کہ ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ شعر ہمیشہ بُری چیز ہی ہوا کرتا ہے۔ بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ قرآنِ مجید اشعار میں نازل نہیں کیا گیا بلکہ نثر میں نازل کیا گیا ہے۔ شائد اس بیان سے بعض لوگ یہ دھوکہ کھائیں۔ کہ چونکہ کوئی الٰہی کلام یا الہام اشعار میں نہیں ہوتا۔ اس لئے شعر ضرور کوئی مکروہ چیز ہے۔ سو یاد رہے کہ یہ خیال بھی غلط ہے۔ دنیا میں خدا کا کلام اور وحی و الہام اشعار کی صورت میں بھی نازل ہوا ہے۔ اور اب تک ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زبور، حضرت سلیمان علیہ السلام کی غزل الغزلات۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے نکات تصوف سب گیتوں یا شعروں میں موجود ہیں۔ ہاں یہ درست ہے۔ کہ چونکہ قرآن موسیٰ کی کتاب کی طرح شریعت کی ایک کتاب ہے۔ اس لئے شرعی کلام سوائے نثر کے اشعار کی صورت میں نازل نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ نثر تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ بچہ۔ عورت اور کم علم سادہ لوح انسان سب اس کا مطلب اخذ کر لیتے ہیں۔ اس لئے شریعت اپنے بیان کے لئے ہمیشہ سادہ اور غیر پیچیدہ نثر کے الفاظ چاہتی ہے۔ تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید شعروں میں نہیں ہے۔ کیونکہ اشعار شرعی نبی کے الہام کے مناسب حال نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شعر کوئی قابلِ مذمت چیز ہے۔ جیسا کہ بعض ناواقف سمجھتے ہیں کفار نے بارہا قرآن پر یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ یہ کاہنوں کے اقوال ہیں۔ یا شاعر کے اشعار اور بعض نے تو کہہ دیا کہ یہ کلام نہیں بلکہ جادو اور سحر ہے۔ ان اعتراضات

کی وجہ یہ ہے قرآن کی آیات کاہنوں کے موزون فقروں کی طرح قدرے قافیہ دار ہیں اور شاعروں کے اشعار کی طرح ان کی فصاحت و بلاغت اور بلند پروازی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس میں ایک تیسری چیز بھی ہے اور وہ ہے اس کا انقلابی اثر اس کی قلوب پر کشش اور اس کی کایا پلٹنے والی خاصیت۔ پس ان وجوہ سے اسے سحر کہا جاتا تھا۔ حالانکہ نہ وہ شعر ہے نہ کہانت نہ سحر۔ بلکہ ان تینوں کا مجموعہ اور ان سب سے بالاتر اور ارفع و اعلیٰ چیز ہے۔ جو علاوہ ان جملہ کمالات کے انسان کے نفس کو پاک صاف کرتا۔ ذہن کو ہدایت اور عقل کو روشن ضمیری بخشتا۔ اور روح کو معرفت بصیرت، حکمت نورانیت، رشد اور حق سے بھرپور کر دیتا ہے۔ دوسری وجہ قرآن کے اشعار میں نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ وہ اکثر عقل سے اپیل کرتا ہے۔ نہ کہ جذبات سے اور ٹھوس دلائل پر اپنی صداقت کا انحصار رکھتا ہے۔ نہ کہ لطائف پر۔ تیسرے یہ کہ شعر بسبب قافیہ اور ان بحروں کی پابندی کے اتنی زیادہ سنجیدہ اور قابل وثوق چیز نہیں ہے جیسے کہ نثر۔ اور اس میں حشو و زائد الفاظ کا بھی امکان ہے جو نثر میں نہیں ہوتا۔ اس لئے شعر کی دحی کے لئے وہ نثر سے کم درجہ پر سمجھا گیا ہے۔

(روزنامہ الفضل ۲۶ جنوری ۱۰ فروری ۱۹۴۴ء)

زلزلہ یعنی جنگِ عظیم کے وقت کا تعیّن

مدت سے میرا خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی وحی و الہامات کے متعلق بعض خاص باتیں جو میرے ذہن میں ہیں۔ ان سے احباب کو بھی گاہے گاہے خوش وقت کروں۔ سو آج میں خلافتِ ثانیہ کے برحق ہونے اور ۱۴ ؁ء کی جنگِ عظیم سے اس کا تعلق ہونے کے متعلق حضور کا ایک رؤیا پیش کرتا ہوں۔

۱۔ رؤیا ۲۶ مئی ۱۹۰۵ء

"دیکھا کہ کسی نے کہا کہ آنے والے زلزلہ کی یہ نشانی ہے۔ جب میں نے نظر اٹھائی۔ تو دیکھا۔ کہ اس ہمارے خیمہ کے سر پر سے جو باغ کے قریب نصب کیا ہوا ہے ایک چیز گری ہے۔ خیمہ کی چوب کا اوپر کا سرا وہ چیز ہے۔ جب میں نے اٹھایا۔ تو وہ ایک لونگ ہے جو عورتوں کے ناک میں ڈالنے کا ایک زیور ہے۔ اور ایک کاغذ کے اندر لپٹا ہوا ہے۔ میرے دل میں خیال گذرا۔ کہ یہ ہمارے ہی گھر کا رات سے کھویا ہوا تھا اور اب ملا ہے اور زمین کی بلندی سے ملا ہے اور یہی نشانی زلزلہ کی ہے۔" (تذکرہ صفحہ ۵۰۰)

ناظرین دیکھیں کہ کیسا روشن اور واضح خواب ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خیمہ (یعنی جماعت احمدیہ) کے سر پر سے ایک چیز گری ہے (جو خیمہ کی چوب کا کلس ہوا کرتا ہے) ہمارے یہاں اس سے خلیفۂ جماعت مراد ہے۔ کیونکہ وہی درجہ کے لحاظ سے سب سے مرکزی اور بلند مقام جماعت میں رکھتا ہے۔ اس کے گرنے سے مراد حضرت خلیفہ اول (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کی وفات ہے پھر جب حضور نے اسے دیکھا۔ تو بدل کر ناک کا زیور لونگ جماعت احمدیہ

کے سولگ کا نشان ہوگیا۔یعنی خلافت ثانیہ یا سلسلہ کی خاص ترقی اور بہار کا وقت۔حضور نے پھر فرمایا کہ یہ ہمارے ہی گھر کا مُدت سے کھویا ہوا تھا۔یعنی چھ سال جماعت کا انتظام خلیفہ اول کے پاس رہا۔اب خلافت اس مدت کے بعد پھر ہمارے گھر میں آئے گی۔اور جس سال یہ واقعہ ہوگا۔وہی سال زلزلہ کا ہوگا۔یعنی جب ۱۹۱۴ء میں خلافت ہمارے خاندان میں آئے گی۔تو اسی سال جنگِ عظیم بھی ہوگی۔اور پہلے اور دوسرے خلیفہ کی عظمت میں یہ فرق ہوگا کہ پہلا تو کلس ہوگا۔مگر دوسرا نہ صرف زینت بلکہ قیمت کے لحاظ سے بھی پہلے سے اعلیٰ درجہ ہوگا۔اور زمین کی بلندی سے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کا بہترین حصّہ اس کا انتخاب کرے گا۔اسی طرح کاغذ میں لپٹا ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے ظہور سے پہلے ایسا مخفی ہوگا۔کہ عام طور پر لوگ اس کی اصلی قدر و قیمت نہ جانتے ہوں گے۔

ناظرین پر واضح ہو کہ کاغذ کی گرانی اور جگہ کی کمی کی وجہ سے مزید اور مفصل تاویلیں اور تعبیریں یہاں مشکل ہیں۔صرف یہ اور بتا دینا ضروری ہے کہ اُسی وقت جب یہ رویاء ہوا حضور کو دو الہام بھی ہوئے تھے۔جن میں سے ایک شر الذین انعمت علیھم غیر مبایعین کے لئے ہے اور ردّ الیھا روحھا و ریحانھا حضرت (اماں جان کے لئے یعنی وہ وقت ایسا ہوگا۔کہ بعض تیرے منعم علیہ مزید شرارت کریں گے۔اور وہی وقت ہوگا کہ حضرت (اماں جان) کی طرف آرام اور اعلیٰ برکات دوبارہ لوٹائے جائیں گے۔فالحمد للہ کہ یہ سب باتیں پوری ہو کر خلافتِ ثانیہ کی صداقت اور سلسلہ احمدیہ کی سچائی کا ثبوت اور نشان ٹھہریں اور پہلی جنگِ عظیم کے زلزلہ کے وقت کا تعیّن بھی اس سے ہوگیا۔

(۲) ایک اور زلزلہ عظیمہ یعنی دوسری جنگ

" رویاء میں دیکھا کہ میں قادیان کے بازار میں ہوں۔اور ایک گاڑی پر سوار ہوں جیسے کہ ریل گاڑی ہوتی ہے۔آگے ایک مکان نظر آیا۔اُس وقت زلزلہ آیا۔

مگر ہم کو کوئی نقصان اس زلزلہ سے نہیں ہوا۔" (تذکرہ ص۴۹۵)

تعبیر اس رویا کی یہ ہے کہ ایک زلزلہ (ان پانچ موعود زلزلوں میں سے) اس وقت آئے گا جب قادیان میں ریل گاڑی جیسی ایک گاڑی چلے گی۔ یعنی ڈیزل کار۔ سو یہ کار ۵ مئی ۱۹۳۹ء کو پہلی دفعہ قادیان آئی۔ اور ۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء تک برابر دن میں کئی کئی دفعہ چلتی رہی۔ اسی ستمبر کے شروع میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اور پھر وہ ڈیزل کار ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اس لائن پر کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ مکان سے مراد اس رویا میں ریلوے سٹیشن ہے۔ پس ڈیزل کار کا متواتر چند ماہ تک قادیان میں چلنا دوسرے زلزلہ کی علامت تھی۔ اور ایک بشارت اس الہام میں یہ بھی ہے کہ اس دوسری جنگ میں اس جماعت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ انشاء اللہ۔ پس یہ رویا بھی پورا ہو کر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی صداقت کا نشان ٹھہرا۔

(۳) تفسیرِ کبیر کی مقبولیت

فرمایا "آج ہی ایک خواب میں دیکھا کہ ایک چوغہ زرّین جس پر بہت سنہری کام کیا ہوا ہے۔ مجھے غیب سے دیا گیا ہے۔ ایک چور اس چوغہ کو لے بھاگا اُس چور کے پیچھے کوئی آدمی بھاگا۔ جس نے چور کو پکڑ لیا۔ اور چوغہ واپس لے لیا۔ بعد اس کے وہ چوغہ ایک کتاب کی شکل میں ہو گیا۔ جس کو تفسیر کبیر کہتے ہیں۔ اور معلوم ہوا۔ کہ چور اس کو اس غرض سے لے کر بھاگا تھا۔ کہ اس تفسیر کو نابود کر دے۔" (تذکرہ ص۵۴۴)

اس رویا میں نہ صرف تفسیر کبیر کے مقبول الٰہی ہونے کا اشارہ ہے بلکہ اس کے لے جانے والے کا نام اتنی دفعہ چور رکھا گیا ہے گویا ملاءاعلیٰ میں اس شخص کا یہی لقب قرار دے دیا گیا ہے۔ صدق اللہ و رسولہ ۔ (روزنامہ الفضل ۱۳ مئی ۱۹۴۴ء)

اطمینانِ قلب

اطمینان کے معنے ہیں بھروسہ کرنا۔ امن میں رہنا ،جھکانا۔ پلیٹھ خمدار کرنا۔ آرام کرنا خاموشی اور تسکین پانا

پس اطمینانِ قلب کے معنی ہیں کسی بات یا حالت پر دل کا آرام وتسکین پالینا اور اس کو انشراح حاصل ہو جانا اور جب یہ حالت کسی کو خدا تعالےٰ کی ذات اور مذہب اور رسول اور حشر اور عاقبت کے متعلق حاصل ہوجاتی ہے اور احساس لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا اُسے مل جاتا ہے۔ تو ایسے شخص کے نفس کو نفس مطمئنہ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اس میں شکوک وشبہات اور اضطراب کی حالت باقی نہیں رہی۔ بلکہ اس نے اپنی عقل، علم اور تجربہ سے وہ درجہ یقین کا حاصل کر لیا ہے۔ جس کے بعد بے اطمینانی رخصت ہو جاتی ہے۔ ایسے انسان پر ہدایت کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں ۔ خدا تعالےٰ سے تعلق کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ نقد جنّت کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور وہ تمام باتیں جن کو اس دنیا میں علامات وصلِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ اپنا ظہور شروع کر دیتی ہیں۔ اور وہ مومن ایک یقینی صراطِ مستقیم پر چلنے لگتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ میں آخرکار دوسرے اور مستقل عالم میں جنت میں چلا جاؤں گا۔ اس خیال سے اس کا قلب مطمئن اور دل خوش رہتا ہے خواہ راہ میں اُسے عارضی تکالیف بھی پیش آئیں۔ لیکن منزلِ مقصود سامنے نظر آتی رہتی ہے۔ اور اس وجہ سے اُس کا شوقِ سفر بھی برابر قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ واقعی طور سے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

واضح ہو۔ کہ انسان کے لئے صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصود ابدی غیر مکدّر نعمتوں کے گھر کا حصول ہے۔ اور دُنیا جو ہے اس میں اس کے لئے امتحانات، ابتلا، فتن مصائب رکھے گئے ہیں۔ جن کو صبر سے برداشت کرنے اور وفاداری سے طے کرنے کے بعد وہ نفسِ مطمئنہ آخر کار اصلی جنّت پا لیتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جو آیت قرآن میں آتی ہے کہ:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۳)

ترجمہ: سُنو! جو (لوگ) اللہ سے سچّی محبت رکھنے والے ہیں اُن پر نہ کوئی خوف (مستولی ہوتا) ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

یہ ثابت کرتی ہے کہ اولیاء اللہ پر کبھی کوئی خوف اور حُزن بالکل آتا ہی نہیں۔ مگر یہ خیال قابلِ اصلاح ہے کیونکہ

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ...... (البقرہ: ۱۵۶)

ترجمہ: اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) ...... ضرور آزمائیں گے۔

والی آیت کے خلاف ہے۔ یہاں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم تم پر خوف اور بھوک اور موتیں اور ناکامیاں وارد کر کے تمہارا امتحان لیتے رہیں گے۔ پس خوف اور غم تو ضرور دنیا کی زندگی میں مومنوں کے لئے مقدر ہے۔ اور پہلی آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ یہ خوف اور مصائب مستقل نہیں ہوں گے۔ اور ایسے نہیں ہوں گے کہ مومن کی کمرِ ہمت توڑ دیں۔ اور ان کے ساتھ کئی بشارات بھی ہوں گی۔ جو مومن کے دل کو مضبوط و مطمئن رکھیں گی۔ یہ معنی کہ مومن کو خوف و غم ہوتا ہی نہیں بالبداہت غلط ہے کیونکہ اگر ان کا احساس ہی مٹ جائے تو پھر صبر کیا اور اس کا اجر کیسا؟

پس یہ چیزیں عارضی طور پر آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مگر اطمینان اور بشارات مستقل طور پر مومن کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ مومن کو اپنے خدا کے قرب میں ایسا ہی اطمینان ہوتا ہے۔

جیسے ایک بچہ کو اپنی ماں کی گود میں۔لیکن بچہ کو تکلیفیں بھی آتی ہیں۔ روتا بھی ہے چیختا ہے۔ بیمار بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کا اطمینان زائل نہیں ہوتا۔ اور اپنی ماں پر وہ ہمیشہ پختہ توکل رکھتا ہے اور اسی سے تسکین پاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا دلی آرام وابستہ ہے۔ خواہ اس کی گود میں اس کا دم بھی نکل جائے۔ مگر وہ غیر سے راحت نہیں پاسکتا۔ یہی حال بعینہٖ اس مومن کا ہوتا ہے۔ جو اپنے رب کی رضا حاصل کر لیتا ہے۔ خواہ اس دنیا میں بطور امتحان و ابتلاء کے اس کو کتنی ہی تکالیف پہنچیں۔ کیونکہ اسے خدا کے سوا اپنا محسن حقیقی کوئی بھی نظر نہیں آتا پس وَلَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ دائمی خوف اور حزن ان کو نہیں پہنچ سکتا۔ صرف عارضی اور وہ بھی بشاراتِ الٰہیہ سے مرکب ہو کر ملتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کو آخرت کے متعلق کوئی خوف اور حزن نہیں ہوتا دل امیدوں سے بھر پور اور شوقِ لقاءِ الٰہی سے معمور ہوتا ہے اور دُنیا کی تکالیف بالکل بے حیثیت اور بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے جن لوگوں کی مصاحبت اور رفاقت کا عادی ہو جاتا ہے۔ ان کی جدائی اسے قدرتی طور پر رنج پہنچاتی ہے مگر خدا کی معیت کا خیال اُس کو طاقت دیتا ہے۔ اور کسی کے مرنے سے اُس پر دیوانوں کی سی حالت طاری نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف انا للّٰہ پڑھ کر صبر کرتا ہے۔ اور کسی مخلوق کو اپنا رب خیال نہیں کرتا۔ وہ عزیزوں کی جدائی کی وجہ سے رو بھی لیتا ہے جیسا کہ چوٹ کی وجہ سے کوئی شخص آبدیدہ ہو جاتا ہے مگر پھر اس جگہ کو سہلا کر اور اپنے رب کو اپنے قریب پا کر ہنس بھی دیتا ہے۔ سو اس قسم کا حزن منع نہیں ہے جو عارضی چوٹ کی طرح ہو۔ مگر بدبخت ہے وہ شخص جو ہر وقت خوف و حزن میں گھرا ہوا ہے۔ اُسے آخرت اور جنت اور قربِ الٰہی کی کچھ خبر نہیں۔ اور جو مصیبت بھی اس پر آتی ہے۔ وہ ایک دائمی شکل اختیار کر لیتی ہے اور نجات و فلاح کی اُمید کا نشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا نہیں۔ مومن تو دُنیا کے لمبے سے لمبے اور بڑے سے بڑے دُکھ اُٹھائے گا۔ کہ حد سے حد یہ دُکھ دس، بیس، پچاس سال تک چلیں گے پھر

آرام ہی آرام ہے۔ لیکن کافر کے لئے کوئی آئندہ امید کی شعاع نہیں ہوتی۔ اور وہ نہیں جانتا کہ میرا حشر کیا ہوگا۔ اور خواہ بظاہر وہ اپنے چہرہ کو خوش و خرم بنانے کی کوشش بھی کرے۔ لیکن اس کا دل اس دُنیا کی ناکامیوں سے سوختہ اور آئندہ کی نا امیدیوں سے غمگین رہتا ہے۔ مومن کے غموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس سفر میں ہزار روپیہ کے نوٹ ہوں اور کچھ پیسے بھی ہوں۔ راستہ میں اگر کوئی جیب کترا اس کے پیسے نکال لے مگر نوٹ محفوظ رہیں۔ تو اگرچہ اُن پیسوں کے ضائع ہونے کا تھوڑا سا افسوس اس کو ہوگا۔ مگر ہزار روپیہ بچ جانے کی بہت بڑی خوشی بھی ہوگی۔ اور اس نقصان کو کوئی عقل مند بڑا نقصان نہیں کہے گا۔ بلکہ بسا اوقات شکر کرے گا اور اسی اظہارِ شکر کو دوسرے الفاظ میں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن کہتے ہیں۔ حقیقی حزن اور خوف تو دُنیا داروں کا ہوتا ہے جن کی اگر بیوی مرجائے تو گویا ان کا خدا مر گیا۔ اور اگر بیٹا مرگیا تو ان کا کوئی رب نہ رہا۔ مگر دیندار چونکہ اپنے مالک پر توکل رکھتا ہے اور اس کی حکمتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ اگرچہ بظاہر یہ تلخ گھونٹ ہے لیکن میرے فائدے کے لئے ہے۔ پس جس طرح لوگ کڑوی دوا کو بھی شوق سے پی جاتے ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ ان تلخ گھونٹوں کو خدا کی حکمت اور خدا کی طرف سے دوا سمجھ کر بصد خوشی پی لیتے ہیں۔ اگرچہ پیتے وقت حلق کڑوا بھی ہو جاتا ہے اور منہ بھی بنتا ہے اور اَخ اَخ بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کو اپنا علاج اور دوا بلکہ شفا یقین کر کے نگلتے بھی جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ واقعی ان کو فائدہ معلوم ہوتا ہے اور شفا پاتے ہیں۔ اور اگر کوئی عزیز ان کا مر بھی جائے۔ تو وہ بھی ان کو چند روز کے بعد اگلے جہان میں مل جاتا ہے۔

اب یہ سوال رہ گیا کہ ہندو اور عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی اپنے مذہب پر اپنا اطمینانِ قلب ظاہر کرتے ہیں اور بظاہر اپنے اپنے مذہب پر مطمئن نظر آتے ہیں۔ تو ایک مسلمان کے اطمینان اور ان کے اطمینان میں کیا فرق ہوا؟ سو اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ان کا اطمینان جہالت کا اطمینان ہے۔ اگر کچھ مدت بھی اُن کے مذہب پر جرح جاری رکھی

جائے۔ تو ان کا سب اطمینان کافور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی پشت پر بصیرت تجربہ اور علم نہیں ہوتے۔ مگر مومن چونکہ قدم قدم پہ ذاتی مشاہدہ اور تجربہ اور بصیرت رکھتا ہے اس لئے نہ وہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتا ہے نہ بشاراتِ الٰہیہ اُسے گھبراہٹ میں پڑنے دیتی ہیں۔ اس پر جب مصائب آتے ہیں تو ساتھ ہی غیبی اطلاع۔ رؤیا۔ الہام اور سکینت بھی آتے ہیں اور طرح طرح کی ایسی نصرتیں اور تائیداتِ الٰہیہ دیکھتا ہے کہ اس کا ایمان اور اطمینان پہلے سے بھی زیادہ اپنے خداوند خدا پر ہو جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام پر بیٹے کی جدائی آئی تو ساتھ ہی بلکہ اس سے پہلے ہی یوسف کی اپنی رؤیا نے اسے مطمئن کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ نے وہ وقتاً فوقتاً وہ تسلی فرمائی کہ ہمیشہ

یٰبنی اذہبو فتحسّسوا من یوسف و اخیہ ولا تائیسوا من روح اللّٰہ

ہی کا وعظ کرتے رہے اور آخر میں بھی یہی فرمایا کہ

الم اقل لکم انی اعلم من اللّٰہ مالا تعلمون

بے شک ان کو یوسفؑ کا غم تھا۔ مگر آخر فصبر جمیل کہنے والے بھی تو وہی تھے۔ ان کے حزن میں اضطراب، کرب اور بے صبری کا رنگ نہ تھا۔ بلکہ ان کا حزن ایمان توکل اور امیدوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے غم کے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کو دامان الوہیت سے پونچھنے والے اور رحمتِ خداوند سے تسلی پانے والے بھی تو وہی حضرت تھے۔ یہ وعدے اور غیب کی اطلاعات اور بشارات اور تسکین اور نصرتیں سوائے اسلام کے ہرگز کسی اور مذہب کے انسان کو نہیں ملتیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہمارا ایمان آخرت پر قائم ہے۔ ورنہ دوسرے اہلِ مذاہب خواہ منہ سے کچھ کہیں آخرت کے بارہ میں بالکل کورے ہیں۔ (روزنامہ الفضل ۱۶ رمئی ۱۹۴۴ء)

کم از کم بارہ دفعہ تسبیح اور درود شریف پڑھنا

چند روز ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا کہ ہر احمدی کو چاہیئے۔ کہ روزانہ ایک دفعہ بارہ بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سبحان العظیم۔ اور بارہ دفعہ درود شریف پڑھا کرے۔ اس خطبہ کے بعد ایک دوست فرمانے لگے کیوں جی؟ بارہ کے عدد کو اس ذکر کے ساتھ کیا خصوصیت ہے پہلے تو ہم ۳۳ بار، سو بار، ستر بار وغیرہ کی تعداد سُنا کرتے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ مذہبی دُنیا میں بھی پہلے بارہ کے عدد کا ذکر موجود ہے چنانچہ بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں کا ذکر قرآن میں ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مدینہ والوں سے ہجرت سے پہلے بیعت لی۔ اس میں بھی بارہ نقبا ہی مقرر فرمائے تھے۔ اسی طرح اور بھی بعض جگہ بارہ کا عدد آیا ہے۔ سو یہ بھی غیر مانوس نہیں ہے۔ بلکہ ایک مذہبی گنتی ہے۔ اسی طرح نظامِ عالم میں بھی یہ عدد ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ سال بارہ مہینوں کا ہی ہوتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ذکر الٰہی میں یہ گنتی آپ نے آج ہی سُنی۔ تو یہ کم از کم تعداد ہے۔ آپ بے شک ۷۰ دفعہ یا سو دفعہ تسبیح اور درود پڑھیں کوئی منع نہیں کرتا۔ یہ تو ادنیٰ درجہ ذکر کا ہے تاکہ جماعت کا کوئی فرد بھی ذکر و صلوٰۃ سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو لوگ سو دفعہ درود یا تسبیح پڑھتے ہوں۔ وہ اس تعداد کو گھٹا کر اب صرف بارہ دفعہ پڑھا کریں۔

ایک مصلحت اس گنتی کی یہ بھی ہے کہ یہ عدد موجودہ زمانہ سے خاص تعلق رکھتا ہے۔عرب میں دس، ستر یا ستو وغیرہ کے اعداد نمایاں تھے۔ مگر آج کل اکثر چیزوں کی گنتی درجن اور گروس کے حساب سے ہوتی ہے۔اب جو یہ درود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں درجن درجن کے حساب سے بکثرت جاتے ہوں گے تو حضور نے ضرور پوچھا ہوگا کہ یہ نئے بارہ بارہ درودوں کے نئے بنڈل بکثرت کہاں سے آرہے ہیں۔فرشتوں نے عرض کیا ہوگا کہ حضور یہ جماعت احمدیہ کا امام بھجوا رہا ہے۔تو جیسا کہ ہر نئی چیز ایک لطف اپنے اندر رکھتی ہے حضور نے بھی یقیناً ایک خوشی محسوس کی ہوگی۔اور حضور کی یہ خوشی بھی ہمارے لئے ایک نعمت ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بارہ دفعہ تسبیح یا درود پڑھنے میں خود پڑھنے والوں کے لئے ایک بڑی آسانی اور سہولت ہے۔آپ اپنے انگوٹھے سے اگر اپنی چار انگلیوں کے پوروں پر گنتی کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بارہ پورے ہیں۔اور بچوں اور عورتوں تک کے لئے یہ گنتی گننی نہایت آسان ہے۔بعض دیہاتی یا سادہ طبع آدمی تو بیس تک کی گنتی بھی نہیں کر سکتے۔ان کے لئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر اپنے انگوٹھے کی مدد سے یہ عدد پورا کرنا نہایت آسان ہوگیا ہے۔پس اس طرح عام لوگوں کے لئے بہت سہولت ہوگئی ہے۔ (روزنامہ الفضل یکم جون ۴۴ء)

عورت نبی نہیں ہوسکتی

یہ سوال آج کل بھی کبھی کبھی اٹھتا رہتا ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے یا نہیں ؟ مگر اس کا جواب ایک مسلمان کے لئے بہت آسان ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

۱۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف ۱۱۰)

یعنی نہیں بھیجے ہم نے رسول بنا کر تجھ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی کی تھی اور وہ بستیوں کے رہنے والے تھے۔

۲۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء : ۸)

اور نہیں رسول بنا کر بھیجے تھے ہم نے تجھ سے پہلے مگر مرد۔ پس علماء سے دریافت کر لو اگر تم کو خبر نہ ہو۔

ان آیات سے یہ واضح ہے کہ آج تک سب رسول یا نبی مردوں میں سے ہی ہوتے رہے ہیں اور دیگر سب اہل مذاہب بھی اس بات کے گواہ ہیں۔ یعنی یہ بات آدم کے وقت سے یونہی چلی آتی ہے کہ کوئی عورت کبھی نبی یا رسول نہیں ہوئی۔ نہ کسی الٰہی کتاب میں کسی ایسی عورت کا ذکر ہے۔ جو خدا کی طرف سے نبی بنائی گئی ہو۔ قرآن مجید نے مومنوں کے چار درجے نبی، صدیق، شہید اور صالح بیان کئے ہیں۔ ان میں سے عورتیں صرف آخری تین درجے حاصل کر سکتی ہیں۔ چنانچہ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ میں مریم کو ان سب میں بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیشک آج تک تو کوئی عورت نبی نہیں ہوئی مگر آئندہ شاید ہو جائے۔ تو اس

غیر معمولی بات کے ثبوت میں یا تو کوئی آیت و حدیث ہم کو ملنی چاہیئے تھی یا کسی عورت کا خاص ذکر پیشگوئیوں میں پایا جانا چاہیئے تھا کہ وہ قیامت سے پہلے مبعوث ہونے والی ہے غرض ہر طرح سے یہ عقیدہ غلط ہے ۔

عقلاً بھی اگر دیکھا جائے ۔ تو معلوم ہوگا کہ عورت مامور نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ اس کی فطرتی کمزوریاں اس کے مامور ہونے میں مانع ہیں ۔ مثلاً حیض ، نفاس ، حمل ، رضاعت ۔ اس کا شادی شدہ ہونا ۔ اور اس کا مطیع ہونا ۔ اس کا مردوں کے لئے محل شہوت ہونا ۔ اور اس کا مرد سے کمزور ہونا جسمانی ، ذہنی اور انتظامی قویٰ کے لحاظ سے چونکہ تاریخی طور پر ہم کو کوئی سچی نبیّہ نظر نہیں آتی اور عقلی طور پر کوئی عورت مامور بن نہیں سکتی ۔ اس لئے فیصلہ نہایت صاف ہے کہ عورت کا نبی بننا محال ہے ۔ مردوں کی طاقت ۔ علم ، رُعب اور ہیبت بھی عورت کے نبی بننے میں روک ہیں

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (الزخرف ۱۹)

ترجمہ : اور جھگڑے میں اپنا مافی الضمیر ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکتی (وہ خدا کے حصہ میں آتی ہے اور غالب رہنے والا مرد انسان کے حصہ میں)

ہاں اُسے الہام ہو سکتا ہے ۔ سچے خواب آسکتے ہیں ۔ وہ ولی ہو سکتی ہے مگر مامور کی طرح پبلک کو دعوت الیٰ الحق اپنے تئیں ہادی پیش کر کے نہیں کر سکتی ۔ وہ اور کوئی اس کے ماننے پر مکلّف اور مجبور نہیں ۔

اسلامی شریعت میں تو پردہ ہی سب سے پہلی روک ہے ۔ اگر وہ محمد رسول اللہ کی اُمت میں اور آپ کی شریعت پر عامل ہے ۔ تو اسے پردہ کرنا پڑے گا ۔ اگر نہ کرے گی تو مسلمان اس کی بات کس طرح مانیں گے ۔ اور اگر پردہ کرے گی ۔ تو وہ ایک IN APPROACH ABLE ۔ نبی کی طرح بے فائدہ وجود ہوگی ۔

پھر اس زمانہ میں اگر کوئی عورت اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت مسیح

موعود (آپ پر سلامتی ہو) سے بڑھ کر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تو وہ یقیناً نبیہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور یہ امر محال ثابت ہو چکا ہے اگر وہ کہے مَیں نبیہ نہیں ہوں۔ مگر بڑھ کر ہوں۔ تو یہ ایک قابل مضحکہ دعویٰ ہوگا۔

ہاں عورت غیر مامور ولی ہو سکتی ہے۔ مگر اس صورت میں وہ کسی کو اپنا متبع ہونے کی تبلیغ نہیں کر سکتی۔ اور اپنی طرف دعوت نہیں دے سکتی۔ مگر ایسی تو ہزاروں عورتیں اس اُمت میں اور گذشتہ قوموں میں گذر چکی ہیں اس زمانہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

اگر کوئی عورت سچے خواب یا الہامات حاصل بھی کرے۔ تب بھی وہ زیادہ سے زیادہ صدیقہ بن جائے گی۔ اور ایک صدیق کی نسبت پھر بھی اس کا دائرہ عمل نہایت درجہ محدود رہے گا۔

شاید کوئی معترض کہہ دے۔ کہ جب ایک عورت بادشاہ ہو سکتی ہے۔ تو وہ نبی بن کر ہدایت بھی کر سکتی ہے۔ اس کا جواب ایک تو نقلی ہے جو گذر چکا ہے مگر عقلی جواب یہ ہے کہ بادشاہت تو وہ دوسرے مردوں کے سہارے اور ان کی مدد سے کرتی ہے لیکن نبوت تو ایسی چیز نہیں ہے اور بادشاہ تو نابالغ بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر کیا نابالغ بچے نبی بھی ہو سکتے ہیں؟ پس یہ دلیل محض ایک لفظی دھوکا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بادشاہت اور حکومت تو چلتی ہی ہے بہت سے مددگاروں کے سہارے سے۔ حالانکہ نبوت خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک شخص کے مامور ہو کر تمام مخلوقات کو ہدایت کی طرف بُلانے کا نام ہے۔ نہ کہ لوگوں کی مدد سے جتھہ بنانے کا نام

نبوت و رسالت تو الگ رہی۔ قانون اسلامی کے ماتحت تو عورت خلیفہ بھی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ سورۂ نور میں

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ (النور: ۳۸)

ترجمہ: (یہ ذکر کرنے والے) کچھ مرد ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے اور نماز کے

قائم کرنے سے اور زکوٰۃ کے دینے سے نہ تجارت اور نہ سودا بیچنا غافل
کرتا ہے۔

کی آیت سے ظاہر ہے کہ یہ عہدہ بھی مردوں سے ہی مخصوص ہے۔

شاید کسی کو خیال پیدا ہو۔ کہ کیا کوئی عورت مصلح موعود کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ سو یہ امر بھی ممتنع ہے۔ کیونکہ مصلح موعود بھی بموجب پسر موعود۔ فرزند دلبند۔ وجیہہ اور پاک لڑکا زکی غلام وغیرہ الفاظ اور مذکر ضمیروں کے ایک مرد ہی ہو سکتا ہے نہ کہ عورت۔

شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ گذرے کہ حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو کو یا مریم کے خطاب سے الہام کیا گیا ہے۔ اس لئے شاید عورت بھی نبوت کی حقدار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استعارۃً ایسے الفاظ کا استعمال مضائقہ نہیں رکھتا۔ مریم کے لفظ میں تو ایک عورت سے ہی مشابہت ہے۔ مگر بعض الہامات میں ایک جانور یعنی شیر سے مشابہت موجود ہے اور خود حضور نے اپنے تئیں ایک درخت سے بھی مشابہت دی ہے جیسا کہ فرمایا ؎

اک شجر ہوں جس کو داؤدی صفت کے پھل لگے

پس یہ سب بلیغ و لطیف استعارات ہیں۔ حقیقت مراد نہیں ہے۔ ہمیشہ محکمات کی پیروی لازم ہے نہ کہ متشابہات کی۔ (روزنامہ الفضل ۷ جون ۱۹۴۴ء)

معجزات وکرامات کے پردہ میں ایک دھوکہ

بعض لوگ جب بعض قسم کے جنونوں کو پہچان نہیں سکتے۔ تو وہ حیران ہو کر دریافت کرنے لگتے ہیں۔ کہ ہم نے فلاں شخص سے یہ عجیب بات صادر ہوتے دیکھی ہے۔ اس کی کیا توجیہہ ہے؟ مثال کے طور پر ایک نوجوان کو جب ایک خاص قسم کا عصبی حملہ ہوتا ہے تو وہ بعض دفعہ مٹھی آگے کر کے کہہ دیتا تھا کہ خدا نے اس وقت میرے ہاتھ میں ایک مینڈک پیدا کیا ہے۔ یہ کہہ کر مٹھی کھولتا تو واقعی ایک مینڈک پھدک کر باہر نکل آتا۔ اور لوگ حیران رہ جاتے۔ ایک اور نوجوان مجھے گوجرانوالہ میں ملا۔ کہ میں گجرات میں ہوتا ہوں تو دھڑام کے ساتھ یہاں گوجرانوالہ میں پلک جھپکنے میں آپڑتا ہوں۔ اسی طرح گوجرانوالہ سے گجرات چلا جاتا ہوں۔ بعض ایسے آدمی ہیں جو کلمہ کا ٹھپہ یا بیج لئے پھرتے ہیں کہ یہ غیب سے ہم کو ملا ہے اور ہماری کرامت کا نشان ہے۔ مگر ان امور کے سوا جب ان لوگوں سے باتیں کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل دین کی اصلیت سے ناواقف۔ خدا کی صفات سے نابلد اور معجزہ کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں اور Mono Mania یعنی جنون کی ایک خاص قسم ان پر مسلط ہوتی ہے۔ چونکہ ان شعبدوں کی وجہ سے عوام الناس بعض اوقات ان کے دھوکہ میں آجاتے ہیں۔ اس لئے آج میں ایسے "معجزات" کی ایک اصلیت لکھتا ہوں۔ تاکہ حقیقت سے اطلاع پا کر ناواقف لوگ دھوکہ میں نہ پھنسیں۔

حقیقت ان "معجزات" کی یہ ہے کہ یہ خود ان کی بیماری کا ایک مظاہرہ ہوتے ہیں۔ اور عجیب قسم کا مظاہرہ ہیں۔ فریب اور افتراء نہیں ہیں۔ بلکہ مرض کا جزو ہیں۔ اور خود بیمار

بھی ان کو اپنی سچائی کا نشان سمجھتا ہے اور واقعی یقین کر لیتا ہے کہ میرے ہاتھ میں پہلے کچھ نہ تھا اور ابھی ابھی یہ مینڈک پیدا ہوا ہے۔ اور میں واقعی گجرات میں تھا کہ یکدم بغیر ریل کے گوجرانوالہ میں آگیا ہوں۔ اور یہ چھیے یکدم غیب سے میرے پر فلاں وقت نازل ہوئے۔ چونکہ یہ مانو مینیا Mono Mania اور سوم نیمبولزم Somnambulism کی شاخیں ہیں۔ اس لئے بعض سادہ اور ناواقف انسان چکر میں آجاتے ہیں۔

اصلیت اس شعبدہ کی یہ ہے کہ ایسا انسان بسبب اپنی عصبی اور دماغی بیماری کے بعض حصہ اپنے افعال کا بھول جاتا ہے۔ یا اُسے یاد ہی نہیں رہتا۔ کہ میں نے فلاں حصہ اس فعل کا خود کیا ہے۔ دماغ اس کے افعال کے ایک حصہ کو ایسا بھلا دیتا ہے۔ کہ واقعی وہ ایک کام کر کے پھر بھی یہی یقین رکھتا ہے۔ کہ میں نے یہ نہیں کیا۔ اس کا جنون اس کے افعال کے بعض حصوں پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ کئی لوگوں نے سوتے سے اُٹھ کر قتل اور خون کر دیئے ہیں۔ اور پھر گھر میں آکر لیٹ گئے اور دوسرے دن ان کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہ کام ہمارے ہاتھ سے ہی ہوا ہے۔ گویا وہ عصبی نیند تھی یا جنون کے جوش میں ایک وارفتگی تھی۔ جو ان کی قوتِ حافظہ کو دبا لیتی تھی۔ ایسا انسان اگر کوئی مینڈک پیدا کرتا ہے تو اسکی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک مینڈک پکڑتا ہے اسے اپنے ہاتھ میں لاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو ابھی خدا نے میرے ہاتھ پر یہ معجزہ جاری کیا ہے۔ یہ کہہ کر ہاتھ کھولتا ہے۔ اور لوگ اس میں سے ایک اصلی مینڈک پھدکتا دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایسے شخص نے جس وقت سے وہ مینڈک پکڑا تھا۔ اور جب اُسے لوگوں کو دکھایا تھا۔ درمیانی عرصہ کا سارا فعل بسبب شدت خواہشِ نفس اور شدت جنون اسے بالکل بھول جاتا ہے۔ اور دماغ کی سطح سے اس فعل کے تاثرات گُم ہو کر اندرونی طبقوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور ایک حصہ اپنے فعل کا اس کے مرض کی وجہ سے اس کے دماغ سے سراسر محو ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بعض اوقات ساری ساری رات پھرتے رہتے ہیں۔ اور پھر صبح کے قریب آکر اپنی چارپائی

پر سو جاتے ہیں۔ اور صبح ان کو ذرا بھی یاد نہیں ہوتا۔ کہ ہم گھنٹوں دیواروں اور سڑکوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے ہیں۔ پس اس بیماری میں مریض ایک حصہ اپنے فعل کا بھول جاتا ہے چنانچہ جو شخص گجرات سے گوجرانوالہ ایک منٹ میں آ جاتا تھا۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ کہ وہ گھر سے چلتا تو اس پر وہ کیفیت یقظہ نومی کی وارد ہو جاتی۔ وہ ریل میں سفر کرتا تھا اور گوجرانوالہ اتر کر اپنے مقام پر پہنچ کر کہا کرتا تھا۔ کہ دیکھو میں گجرات میں تھا یہاں کس طرح پہنچ گیا۔ گھر سے نکل کر گوجرانوالہ اپنے مقام پر پہنچنے تک کے فعل کا سارا حافظہ اس کے دماغ سے جاتا رہتا تھا۔ اسی طرح جو شخص کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے مصنوعی روپے جو دُنیا میں ہزاروں عدد بکتے ہیں اور رائج ہیں حاصل کر کے ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان ٹکڑوں کو حاصل کرنا اور چھپا کر رکھنا وغیرہ اس کا جنون بالکل دبا لے۔ اور دماغ سے اس حافظہ کو بالکل محو کر دے۔ اور پھر اس کا جنون اُسے یہی دھوکہ دے کر دیکھ یہ غیب سے تیرے پاس آئے ہیں اور چونکہ تو مقربان بارگاہِ الہٰی سے ہے۔ اس لئے تیرے لئے خدا نے یہ معجزہ قرار دیا ہے۔ پس یہ بیماری کی علامت یعنی حافظ کا خوابیدہ ہو جانا اس قسم کے جنون کی ایک عجیب علامت ہے۔ جس سے ناواقف آدمی دھوکہ کھا سکتا ہے۔ اسے پرانے لوگ اشراق کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ بلکہ ایسی حالت کو سلف مسمریزم کر کے خود اپنے پر طاری کیا کرتے تھے اور اسے علمِ اشراق کے نام سے موسوم بھی کیا کرتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں جو ایک علمی زمانہ ہے۔ ایسے معجزات کوئی معنے نہیں رکھتے۔ اور بھان متی کے تماشے سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اصل معجزہ مصفا علم غیب اور الہامی پیشگوئی کا معجزہ ہے جو شائع ہو کر اور پورا ہو کر خداوند عالم الغیب کے وجود پر گواہ ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر معجزہ تائید و نصرت الہٰی کا ہے۔ جو باوجود تمام دُنیا کی مخالفتوں کے ایک کمزور انسان کو ہر میدان میں فتح دیتی ہیں۔ نہ کہ مینڈک یا ٹھیکریاں جن میں ہزاروں دھوکوں کا احتمال ہے۔ اور جن کا پیش کرنا بھی جائے شرم ہے۔ جب ایسے یقظہ نومی والے

اپنی بیماری سے صحت پا جاتے ہیں۔ تو وہ تو ہاتھ مُنہ دھو کر دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم بیمار ہو گئے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اب خدا کے فضل سے صحت ہو گئی ہے۔ اور واقعی وہ قابل الزام نہیں ہیں۔ کیونکہ بیمار تھے۔ اگر کوئی سادہ مزاج بھلا مانس آدمی ایسے انسان کے پیچھے چل پڑے تو اس کے لئے مصیبت ہے۔ وہ اس وقت خدا جانے کیا عذر کر سکے گا۔ سوائے اس کے کہ اندر ہی اندر اس کا نفس اسے شرمندہ کرتا رہے۔ اور ہر مجلس میں لوگ اس پر مذاق کریں۔

بعض ناتجربہ کار لوگوں کا خیال ہے کہ جو مجنون ہوتا ہے۔ وہ ضرور لوگوں کو پتھر مارا کرتا ہے۔ اور کپڑے پھاڑ کر برہنہ پھرتا رہتا ہے اور اس کے ہوش وحواس مختل ہو جاتے ہیں۔ سو ایسے لوگوں پر واضح ہو کہ دللجنون فنون کا فقرہ بڑا ہی سچا فقرہ ہے اور اس مرض کے متعلق ایک صداقت یہ بھی ہے کہ دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ جنون کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور بعض مجنون سوائے ایک خاص وہم کے باقی ہر طرح اچھے بھلے نظر آتے ہیں۔ اور اپنی چالاکیوں سے سیدھے سادھے آدمیوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ مگر آخر چند دن میں ہی جنون ان کے اقوال وافعال سے جھلکنے لگتا ہے۔ (روزنامہ الفضل یکم جولائی ۱۹۴۴ء)

مغربیت کی بیماری اور اسکے عوارض وعلامات

میں نے بہت دفعہ دیکھا ہے کہ بعض جوشیلے نوجوان بڑے زور شور سے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور اُٹھتے ہی میز پر مکّا اور فرش پر بوٹ کی ایڑی مار کر یہ فقرہ زبان پر لاتے ہیں۔ کہ ہم مغربیت کو فنا کر کے رکھ دیں گے۔ یا مغربیت کی موت ہمارے ہاتھوں سے واقع ہونی مقدر ہو چکی ہے۔ یا یہ کہ ہم اسلام کو دوبارہ دنیا میں قائم کر کے رہیں گے اب مغربیت اپنا بوریا بستر باندھ لے۔ جب وہ ایسے ایسے فقرے چُست کر چکتے ہیں۔ تو اُن کی تقریر کے بعد اگر انہی سے مغربیت کے معنی یا مغربیت کے آثار و قرائن کے متعلق پوچھا جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ وہ اس لفظ کے مفہوم سے ہی ناواقف ہیں۔ ہاں ایک لفظ طوطے کی طرح رٹ رکھا ہے یا اگر مجمل معنی کسی کتاب میں سے پڑھ لئے ہوں گے تو تفاصیل کے متعلق کورے ہوں گے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ پچاس فیصد مغربیت خود ان کے اپنے گھروں یا سوسائٹی میں گھسی ہوئی نظر آئے گی بلکہ عملاً شائد وہ خود ہی مغربیت کا نمونہ ہوں گے۔ خواہ مجلسوں میں بطور رواج وہ اس مغربیت کو گالیاں ہی دیتے رہتے ہوں۔ ہر چیز اپنے آثار اور صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان والوں کے لئے اور خصوصاً ہندی مسلمانوں کے لئے اس مرض کے بعض مشہور علامات ہیں جنہیں دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ مغربیت کی بیماری میں مبتلا ہیں ورنہ صرف مختصر کتابی تعریف سُنا کر مریض کو اپنے مرض کا قائل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جب ذرا تفصیل سے اس بیماری کی علامات بتائی جائیں۔ تب اکثر لوگوں کو پتہ لگتا ہے۔ کہ ہم میں یہ مرض سرایت کر چکا ہے

میں نے دیکھا ہے کہ بعض احمدی نوجوان بھی ایسے دھوکوں میں مبتلا ہیں۔ اس لئے میں آج نہایت اختصار کے ساتھ کچھ علامات مغربیت کی بیان کروں گا۔ جن میں ہندوستان کے مسلمان گرفتار ہیں۔

مغربیت کیا ہے ؟

اصولاً تو جیسے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بھی اپنے لیکچروں میں بیان فرما چکے ہیں۔ مغربیت مادیت اور قومیت کا مجموعہ ہے یعنی مغربی اقوام کے نزدیک مادی ترقی ہی انسان کی اصل ترقی ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ اپنی قومیت کو بھی لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ یعنی نہ صرف اپنی قوم کو دیگر اقوام پر فضیلت دیتے ہیں۔ بلکہ مغربی قوموں کو دنیا کی دیگر تمام قوموں سے دماغ اور عقل میں بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہی ہوں بس ان کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ تمام ترقی مغربی اقوام کے دماغوں سے وابستہ ہے۔ اور وہ ترقی سائنس کے ذریعہ مادّی لائنوں پر ہی ہوئی اور ہوگی۔ مگر صرف اتنی سی بات سے ہم اس مرض کی تشخیص نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم بعض علامات کو دیکھ کر یہ تشخیص کریں گے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان یا فلاں قوم ہم میں سے مغربیت کی بیماری میں مبتلا ہے یا مبتلا ہوتی جا رہی ہے اور جب مغربیت کی بیماری کی انفیکشن کسی شخص یا قوم میں سرایت کر جاتی ہے۔ تو خواہ وہ خود کتنا ہی انکار کریں پہچاننے والا علامات کو دیکھ کر یہ فوراً کہہ دے گا کہ جب اس مرض کے آثار بیمار میں موجود ہیں تو پھر کس طرح اس کا انکار کیا جا سکتا ہے۔

اب میں مختصراً بعض عوارض آپ کو بتاتا ہوں۔ جو مغربیت کے ساتھ وابستہ ہیں عموماً ہندوستانی تہذیب کا اور خصوصاً اسلام کا ان عوارض سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر جب یہ عوارض بکثرت اور مستقل طور پر مریض کے اندر رچ جائیں۔ تو سمجھ لو۔ کہ اسلام اب رخصت ہو رہا ہے۔ یہ آثار مغربیت عموماً مذہب[۱]، اخلاق[۲]، سیاست[۳] اور معاشرت[۴] کے دائروں میں ایک

مخصوص تغیر پیدا کرتے ہیں۔ان کے علاوہ مغربیت کا ایک عجیب حربہ جس سے اس کی بےحد ترقی ہوئی ہے پروپیگنڈا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی اس کے مقابل پر اشاعت کا لفظ اختیار کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اشاعت تو صداقت کے پھیلانے کے لیئے کی جاتی ہے۔ اور پروپیگنڈہ جھوٹ اور دجل کے لئے بس اس حربہ کی بدولت اور حکومت و دولت کی وجہ سے مغربیت اکثر اقوام عالم پر چھا گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ۔کہ پاک مذہب اسلام اور سابقہ بہتر تہذیبیں اکثر لوگوں کی نظروں سے پست ہو گئیں۔ اور وہ ایک ایسی رَو میں بہہ گئے جو ان کی عاقبت کے لئے تو یقیناً مگر بہت حد تک ان کی دنیا کے لئے بھی تباہ کن ہے۔

اب میں ان فرضی پہلوانوں کے لئے جو روزانہ ایک لیکچر مغربیت کو توڑنے پر دیا کرتے ہیں حسب ذیل علامات پیش کرتا ہوں اور ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ عوارض خود ان میں تو نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو انہیں جھوٹی شیخیاں مارنے کی بجائے خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔

(۱)

(۱) میجاریٹی پر انحصار اور ووٹوں کا اقتدار (۲) ہر وقت اپنے حقوق اور مطالبات کا خیال اور مقدمہ بازیاں یا عرضی بازیاں (۳) ہنسیاریٹی پہ زور (۴) آپوزیشن (۵) سیاست اور معاہدات میں جھوٹ اور دجل۔ اور لفظی ہیر پھیر (۶) بعض مخصوص فقروں کا استعمال مثلاً جب کوئی معاملہ کسی نے پیش کیا تو کہنے لگے ۔

I.WILL DO (I will try to help you)
YOUR MATTER IS UNDER CONSIDERATION
MY BEST FOR YOU

وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ یہ سب فقرے رواجی فقرے ہوتے ہیں اور دھوکہ دہی اور جھوٹ کے طور پر استعمال کیئے جاتے ہیں ۔ (۷) دوسری اقوام یا غیر مغربی انسانوں کو ذلیل اور حقیر سمجھنا مگر مغربی اقوام کے لوگوں کی تعظیم کرنا (۸) قانون کے الفاظ کے تحت چالاکی سے سب کچھ کر لینا۔ (۹) DIVIDE AND RULE پر عمل (۱۰) جاسوسی پر سیاست کی بنیاد (۱۱) نسلی تفاخر اور تکبر (۱۲) EARTH HUNGER

(۲)

(۱) داڑھی مونڈھنا۔ یا اسے نہایت باریک کتر کے صرف دکھاوے کے لیے بہانہ کرنا۔
(۲) فیشن پرستی۔ تکلفات۔ تعیش کی زندگی۔ زرق برق اور دکھاوا ہمیشہ میز کرسی پر کھانا۔ مخصوص مغربی کھانوں کا استعمال۔ مخصوص مغربی لباسوں اور مخصوص مغربی معاشرت کی نقل۔ ناچ گانا۔ ریڈیو۔ گراموفون۔ سینما اور موٹر میں انہماک۔ شراب، سگرٹ، سگار، سر کے بالوں کے چھتے آگے کی طرف بطریق فیشن رکھنا۔ میز چھری کانٹا۔ کھانے کی گھنٹی۔ اور بلا ضرورت یورپین کھانے اور بینڈ ڈبوں کی غذائیں سوڈا لیمن۔ آئس کریم۔ پیسٹری چاکلیٹ، کیک۔ بسکٹ ڈبل روٹی کا عادتاً استعمال۔ کثرت فرنیچر کی۔ خصوصاً غیر ضروری پر تکلف فرنیچر۔ آرائش۔ تصاویر اور پردوں کی جن سے مکان آراستہ کیا جائے۔

(۳)

بڑی عمر میں شادی یا کنواری رہنا۔ عورتوں کی ملازمت کا فیشن۔ عورتوں کی ماڈرن تعلیم مردانہ لائن پر۔ سفیدی سرخی۔ لپ اسٹک پر زور۔ خاص قسم کی مغربی خوشبوئیں۔ ناخن پینیٹ کرنا۔ اور یہ سب زینت کا انہماک خاوند کے لئے نہیں بلکہ سوسائٹی کے لئے مجلسوں کے لیے یا غیر مردوں کے لئے ہوتا ہے۔ نکاح ثانی کو نفرت سے دیکھنا۔ زیورات میں کپڑوں میں مکان میں برتنوں میں۔ نوکروں میں۔ مغربی طرز زینت اور اسراف پر عمل علی الاعلان عورتوں، مردوں کی

چوما چاٹی اور لغبلگیر ہونا۔ خواہ وہ خاوند بیوی ہوں بہن بھائی ہوں یا باپ بیٹی۔ عورتوں کی نامحرموں سے بے تکلفی اور میل ملاپ۔ عورتوں کے فوٹو کھنچوانے اور یوں بھی فوٹوؤں کی کثرت۔ باریک کپڑے جس میں عورتیں ننگی نظر آئیں۔ اسی طرح عورتوں کا گلا کٹا ہوا قمیض جس میں جسم کا اوپر کا حصہ نظر آئے۔ عورتوں کا ننگے سر پھرنا۔ عورتوں یا لڑکیوں کا بلا وجہ بال کٹوانا۔ زنانہ کرتہ جس میں پوری آستین نہ ہو۔ گھگرا جس میں لاتیں یا رانیں برہنہ دکھائی دیں۔ ایسا کسا ہوا لباس جس میں عورتوں کے جسم کی بناوٹ اور محاسن معلوم ہوں۔ عورتوں کی شرعی بے پردگی کورٹ شپ۔ اپنے تئیں میم صاحب اور اپنے میاں کو صاحب اور بچہ کو بابا کہلوانا۔ بیوی یا بچوں پر یوروپین گورنس رکھنا۔

(۴)

مل کر ایک برتن میں کھانا نہ کھانا۔ حتیٰ کہ ایک برتن میں کھانے کے وقت بھائی کا بھائی سے اور بیٹے کا باپ سے اور دوست کا دوست سے نفرت محسوس کرنا۔ مردوں کو حسب ذیل مخصوص کپڑوں سے اُنس ہونا۔ ہیٹ۔ پتلون، کالر، ٹائی، پاک صاف انسان کا پس خوردہ نجس سمجھنا۔ راتوں کو بہت دیر تک جاگنا۔ اور صبح کو ۹ بجے اٹھنا۔ کموڈ کا دائمی اور مستقل استعمال بعد فراغت کاغذ سے طہارت کرنا۔ ہر وقت مغربی زبانوں کا استعمال۔ بلکہ رشتہ داروں تک کو بھی ماما۔ پاپا۔ ڈیڈ (DAD) بے بی ہنی بسیس وائف۔ آنٹی۔ ڈارلنگ وغیرہ کہنا تیز مسٹر مسز کا رواج۔ طرز گفتگو اور لب ولہجہ مغربی صاحب لوگوں کا سا رکھنا۔ لباس میں اسراف مثلاً کئی کئی قسم کے بوٹ ٹوپیاں۔ ہر جگہ اور ہر مقام و موقع کے لئے الگ الگ طرح کے لباس۔ کھانے پینے کے کئی کئی اوقات۔ بغلوں اور زیر ناف کی صفائی نہ رکھنی حُسن پرستی۔ اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ۔ فیشن ایبل بالوں کے ساتھ ہر وقت ننگے سر باہر پھرنا۔ لہو ولعب کی زندگی۔ سگریٹ، سگار۔ شراب۔

(۵)

محض اسباب پر ایمان رکھنا اور مسبب الاسباب کا خانہ بالکل خالی رکھنا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ بِسْمِ اللّٰہ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ۔ اِنْشَاءَاللّٰہ وغیرہ کے اسلامی اقوال کا ترک کرنا اور ان کی جگہ گڈ مارننگ۔ گڈ نائٹ۔ ٹاٹا۔ بائی بائی وغیرہ فقرات کا رواج۔ اتوار کو بطور رخصت کا دن سمجھنا۔ اسلامی رسوم کو لغو یا برا سمجھنا۔ اور فیشن کو دین اور ایمان سے بڑھ کر جاننا۔ دہریت کے عقائد۔ بزرگوں کا ادب نہ کرنا۔ کتوں سے شغف۔ مہذب جھوٹ کی کثرت۔ اسلامی مسائل کو مغرب کے مذاق پر ڈھالنا۔ خدا اور عاقبت کا خوف نہ ہونا۔ صرف جسمانی فوائد اور دنیاوی لذائذ میں منہمک رہنا۔ حلال و حرام کی تمیز کا احساس مٹ جانا۔ اسلامی معاشرتی مسائل پر مذاق اڑانا یا ان پر اعتراض کرتے رہنا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور اس کی چھینٹوں سے احتیاط نہ رکھنا۔ مغربی فلاسفروں اور مصنفوں کی عزت اپنی قوم و مذہب کے بزرگوں اور مصنفوں سے زیادہ کرنا۔ پیسہ کمانے کے خیال کو ہر دیگر خیال پر مقدم رکھنا دعاؤں کی قبولیت کو وہم اور خوابوں کی صداقت کو لغو یقین کرنا۔ اپنے ملک کی عمدہ سے عمدہ پیداوار کو بھی مغرب کی ادنیٰ پیداوار سے کم درجہ سمجھنا۔

غرض مغربیت میں اخلاق محض دکھاوا ہیں۔ اور اپنی قوم کے لئے مخصوص ہیں۔ سیاست محض دھوکا بازی ہے۔ معاشرت کے معنی عیاشی کے ہیں۔ اور مذہب سے مراد دہریت اور نفسانی آزادی ہے۔

اس مغربیت کا توڑ صرف وہ ایک مقدس کلمہ ہے جسے اس زمانہ کا نبی بطور علاج کے خدا کی طرف سے دنیا کے لئے لایا۔ اور جس کو اس نے ان الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ کہ:-

"میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔"

(روزنامہ الفضل ۲ اگست ۱۹۴۴ء)

کلمۂ طیبہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

نہیں کوئی محبوب تیرے سوا — نہیں کوئی مطلوب تیرے سوا

نہیں کوئی مقصود تیرے سوا — نہیں کوئی معبود تیرے سوا

پیارے ترا نام اللہ ہے — خلائق کا تو ہی شہنشاہ ہے

ہر اک عیب سے پاک ہے تیری ذات — ستائش کے قابل ہیں جملہ صفات

کریں تاکہ بندے سعادت حصول

محمدؐ کو بھیجا بنا کر رسول

(بخار دل ص ۱۲۲)

دُنیا میں تکالیف اور مصائب کیوں آتے ہیں

سوال : ایک دو سال کا ننھا سا بچہ بخار اور دردِ قولنج میں مبتلا تھا۔ اس کی تکلیف اور اضطراب کو سخت سے سخت دِل انسان بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رفع تکلیف کے لئے کبھی وہ اپنے ماں باپ کی طرف دیکھتا اور کبھی ڈاکٹر کے سامنے کڑوی کسیلی دوا کے لئے منہ کھولتا۔ اسی تکلیف میں ایک دن رات رہ کر وہ مرگیا۔ سوال یہ ہے کہ رب رحیم وکریم جو رافت اور شفقت کا منبع ہے۔ چھوٹے اور معصوم بچوں پر مصائب اور تکالیف کیوں وارد کرتا ہے؟ حالانکہ وہ ظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ نہیں ہے۔ اگر ماں باپ کا شافع بننا ہے تو معصوم بچہ کو یہ سزا کیوں ملی؟ اور وہ دوسروں کے فائدہ کے لئے خود کیوں زیر بار آئے؟

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (النجم: ۳۹)

ترجمہ :۔ (جو یہ ہے کہ) کوئی بوجھ اُٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی

جواب :۔ یہ سوال بچوں کی تکلیف کا بہت لمبا جواب چاہتا ہے اور خدا تعالےٰ کی عمیق در عمیق حکمتوں کا بیان اس میں کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے مختلف زمانوں کے لوگ بھی اگر برابر روشنی ڈالتے رہیں تو بھی پُورا حل نہیں ہوسکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال پر نظر کرکے اور اس کے کلام کو دیکھ کر ہم مجملاً بعض باتیں بتا سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ مفصل طور سے اس کے لئے زبانی گفتگو شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ پھر بھی بہت سی باتیں حجاب میں رہ جائیں گی۔ اور اگر واقعات کی تفصیل میں جانے لگیں تو شائد عمر نوحؑ بھی کافی نہ ہو۔ اور ہر بات کو دلائل سے مبرہن کرنے لگیں۔ تو کاغذ۔ دماغ اور اخبار کی گنجائش سب چکر میں آجائیں اس لئے نہایت مختصر طور پر اکثر دلائل کو چھوڑ کر ایک سرسری بیان لکھتا ہوں۔

چند مختصر باتیں

۱۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ ظالم نہیں بلکہ رحیم ہے۔

۲۔ دوسری یاد رکھنے والی بات یہ ہے جسے لوگ بھول گئے ہیں کہ تکالیف اور مصائب اور بیماریاں اور افلاس حتیٰ کہ سزائیں جہنم اور غضب الٰہی بھی خدا تعالےٰ کے رحم کے باب کی ایک فصل اور اس کے محکمہ کرم و شفقت کی ایک شاخ ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی حقیقت نہیں۔ تمام دکھ خدا تعالیٰ نے سکھ کی طرف جانے کا ایک ذریعہ بنائے ہیں۔ بغیر ان کے انسان خدا کی رحمت اور آرام کا پورا حصہ نہیں پا سکتا۔ اور یونہی بے مطلب و بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ کمال درجہ کی حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ چاہتا تو سکھ ہی سکھ ہوتا۔ مگر پھر یہ عالم اور یہ نظام نہ ہوتا

۳۔ طبعی اور جسمانی تکالیف سے اس دنیا میں کوئی بندہ خالی نہیں۔ نہ کافر نہ مسلمان نہ وحشی انسان نہ انبیاء۔ نہ بچے نہ بڑے۔ نہ جوان نہ بوڑھے نہ نیک نہ بد۔ ہاں اگلے جہاں میں جنت ابدی سکھ کے لئے بنائی گئی ہے اور دوزخ عارضی دکھ یا سزا کے لئے تاکہ بعض لوگ جو اپنی بیماریوں کی وجہ سے نعمائے جنت کی لذت حاصل نہ کر سکتے تھے۔ وہ وہاں اپنا علاج کرا کے نعمائے الٰہی کی لذت اور حلاوت پا سکیں۔

۴۔ خیال اور ذہنی دکھ یا قلبی اذیتیں اکثر انسان کی خود ساختہ ہیں۔ اس کی حرص و ہوا کا نتیجہ ہیں۔ دنیا طلبی اور لامذہبی ان کی جڑ ہے۔

۵۔ اگر ہم بعض دکھوں کی حکمت معلوم کر لیں۔ تو ہمارے لئے یہ کافی ہے۔ اور ہم اس نظریہ پر قائم ہو سکتے ہیں کہ سارے دکھ سکھ خدا کی حکمت کا ہی نتیجہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کہ ہر دکھ اور ہر سکھ کی وجہ ہم کو معلوم ہو جائے۔ صرف چند کی حکمت معلوم کر کے ہم سب کی حکمت کے قائل ہو سکتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران: ۱۹۲)

ترجمہ :۔ اے ہمارے رب تُو نے اس (عالم) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔

۶۔ ہر انسان شجرۂ انسانی کی ایک شاخ ہے اور ہر بچہ اپنی قوم یا خاندان کے درخت کی ایک شاخ ہے۔ بالکل علیحدہ چیز نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت سی باتوں میں اچھی یا بُری دُکھ کی یا سکھ کی وہ اپنے والدین خاندان یا قوم سے ورثہ بھی لیتا ہے۔ وہ دنیا میں اکیلا منقطع فرد نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان سلسلہ کی کڑی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ دُکھ سکھ کی ہے۔

۷۔ بچوں کو معصوم کہا جاتا ہے ہمارے نزدیک بچوں سے زیادہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ مگر دکھ اور بیماریوں سے وہ بھی بچے ہوئے نہیں ہوتے

۸۔ شرعی اور طبعی قانون دونوں الگ الگ ہیں۔ شرعی تو مکلف انسانوں کے لئے ہے مگر طبعی ہر انسان کے لئے یکساں ہے اِلّا مَاشَاءَاللّٰہ

۹۔ موت کے راستہ میں قدرت نے سخت دُکھ اور تکالیف رکھ دی ہیں تاکہ لوگ ہر قیمت اداکر کے موت سے بچیں۔ ورنہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر خودکُشیاں کر لیتے یا علاج میں لاپرواہی کرتے۔

۱۰۔ نظام عالم نہایت درجہ اختلاف چاہتا ہے۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے اس باغ و بہار کی ساری رونق ہے۔ اس اختلاف میں بدصورتی افلاس اور دُکھ درد دیکھ کر بعض آدمی حیران رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اختلاف کے لئے لازمی ہے کہ ہر قسم کا سکھ اور ہر قسم کا دکھ دُنیا میں موجود ہو۔

۱۱۔ یہ دُنیا انسان کا اصل گھر نہیں بلکہ صرف چند سالہ عارضی سرائے ہے۔ اصل گھر اس کا ایک ابدی جنّت ہے۔ جہاں کوئی تکلیف نہیں۔ جہاں اس کی ہر خواہش ہمیشہ پوری ہوتی رہے گی۔ دُنیا نہیں بلکہ عالم آخرت ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ اس اصل کے نہ سمجھنے اور صرف دنیا کی ساٹھ ستر سالہ زندگی کو ہی اصلی حیات انسانی اور اس جگہ کو دارالجزاء سمجھ لینے سے اکثر شکوک و شبہات اس قسم کے پیدا ہوتے ہیں۔ دُنیا تو دارالعمل اور دارالامتحان

ہے۔

۱۲۔ سارے دُکھ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے نہیں آتے۔ بلکہ ایک انسان دوسرے انسان کو دُکھ دیتا ہے۔ یا خود انسان اپنی غفلت ونسیان یا کم علمی یا کم عقلی کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی دُکھ میں ڈال لیتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو دُکھ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک حِصّہ تو ظاہراً کمال حکمت پر مبنی ہے۔ اور ایک حِصّہ ایسا ہے جو باریک بینی کا محتاج ہے اور ایک حِصّہ ایسا ہے۔ جو آئندہ زندگی کے لئے مفید ہے۔ خواہ بظاہر اس وقت اس کا حاضر فائدہ نہ ہو یا وہ دُکھ ہے جس کی جزا خدا کی طرف سے بہت بڑھ چڑھ کر آخرت میں ملے گی اور اس وقت انسان کہے گا کہ یہ تو بڑے نفع کا سودا تھا جسے میں نے خسارہ سمجھ رکھا تھا مجھے قربانی بنایا گیا۔ دوسروں کے فائدہ کے لئے اور اب مجھے اس قربانی کا فائدہ اور جزا اضعافاً مضاعفہ مل گئے۔

۱۳۔ دُکھ کا وجود سُکھ کے احساس کے لئے ضروری ہے ورنہ سکھ پھر کچھ بھی نہیں رہے گا نہ اس کی قدر ہوگی۔ نہ اس میں راحت محسوس ہوگی۔

۱۴۔ دنیا میں سُکھ بہت زیادہ ہے اور دُکھ بہر حال کم۔ قرآن نے

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ (الکوثر: ۲)

(اے نبی!) یقیناً ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔

میں کثرت نعماءِ الٰہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ناشکرے انسان کے پاس سے لاکھوں میں سے ایک نعمت چھن جائے۔ تو اس قدر غل مچاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ حالانکہ ابھی ننانوے ہزار نو سو ننانوے نعمتیں اس کے پاس موجود ہوتی ہیں

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ (النحل: ۱۹)

ترجمہ: اور اگر تم اللہ کے احسان شمار کرنے لگو تو (کبھی) تم ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۵)

ترجمہ:۔ انسان یقیناً بڑا ہی ظالم (اور) بڑا ہی ناشکر گذار ہے۔

۱۵۔ اس قسم کے سوال سے ظاہر ہے کہ لوگ ہر بیماری اور موت کی تکالیف کو گناہ کی سزا سمجھتے ہیں جبھی تو ایک معصوم بچے کے مرض کی تکلیف پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی تکلیف ایک نبی کو بھی ہوسکتی ہے۔ جو بچوں سے زیادہ معصوم ہے۔ یہاں تو معصومیت اور گناہ کا سوال ہی نہیں ہے۔ بلکہ صرف سوال یہ ہے کہ بیماری اور تکلیف دنیا میں کیوں ہے۔

۱۶۔ امن کے زمانہ میں نرم دل لوگ بعض غلط نظریئے قائم کر لیتے ہیں۔ اگر ان کو فوجی زمانوں کا حال معلوم ہوتا۔ اور قوموں کی کشمکش کی تاریخیں یاد ہوتیں۔ علمِ نباتات اور علمِ حیوانات سے واقف ہوتے۔ اور کروڑوں اربوں ادنیٰ مخلوقات کا پیدا ہو کر بظاہر بلا وجہ فنا ہوتے نظر آتا۔ اور مخلوقات کا ہر وقت ایک دوسرے کو کھائے جانے کا علم ہوتا۔ اور ان کے سفر زیادہ دراز اور تجربے زیادہ وسیع ہوتے۔ پھر تو شاید وہ خدا کو ظالم نہیں بلکہ اظلم قرار دیتے (نعوذ باللہ) حالانکہ یہ سب باتیں اس کی بے حد و بسیط قدرت۔ لا انتہا علم اور بے نہایت حکمت کی گواہ اور شاہد ہیں۔ کم علم اور کم عقل انسان خدا تعالیٰ کی چند مصلحتوں پر حاکم بننا چاہتا ہے۔ اور اس کو خدا کے زیادہ عظیم الشان کام اور پُر ہیبت مصالح نظر آ جائیں۔ تو شاید اس کا کلیجہ ہی پھٹ جائے۔

۱۷۔ ہمارا رب بے شک رحیم کریم ہے۔ بلکہ رحم و شفقت کا منبع ہے۔ لیکن سوائے رحم کے اس کی اور صفات بھی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتیں۔ تو یہ کارخانہ عالم بھی نہ چل سکتا۔ جہاں وہ رحیم کریم ہے۔ وہاں وہ مالک یوم الدین بھی ہے مُنْتَقِمُ بھی ہے۔ ضار مانع۔ مذل اور مُمِیْتُ بھی ہے۔ ورنہ وہ رَبُّ الْعَالَمِیْن اور کامل خدا نہ ہوتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس کی رحمت ہمیشہ اس کے غضب پر غالب ہے۔ اور اس کا غضب اس کی رحمت ہی

کی ایک شاخ ہے۔ کیونکہ وہ بندہ کے فائدہ کے لئے ہی ہے۔ نہ کہ اپنے کسی غصّہ کی تسکین کے لئے۔

۱۸۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (النجم: ۳۹)

ترجمہ:۔ (جو یہ ہے کہ) کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

کبھی کبھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بچہ کیوں والدین کے لئے قربان ہو۔ حالانکہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام دُنیا کے والدین اور عزیز ان کا مال اور محنت اور توجہ سب ان بچوں کے لئے قربان کئے جا رہے ہیں۔ اس صورت میں اگر کبھی کبھی بچہ بھی ان کے لئے قربان کر دیا جائے۔ تو کیا حرج ہے؟ بلکہ ضروری ہے۔

بچّوں کی تکالیف میں ان کو اور دوسروں کو کیا فائدے ہیں؟

اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ رحیم کریم خدا چھوٹے اور معصوم بچوں پر مصائب اور تکالیف کیوں وارد کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے تئیں

وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (ق: ۳۰) کہتا ہے۔

ترجمہ:۔ اور نہ میں اپنے بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی لڑکے کے ماں باپ یا استاد اس کی بہتری اور فائدہ کے لئے اسے ماریں یا تکلیف دیں۔ تو کیا لوگ ان کو ظالم کہیں گے یا خیر خواہ؟ یہی ہمارا جواب ہے۔ ہر تکلیف ظلم نہیں ہوتی۔ خدا کی طرف سے آئی ہوئی تو تمام تکالیف مصلحت حکمت اور فائدہ کے لئے ہوتی ہیں۔ اور مر جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ بلا استثناء ہر متنفس نے مرنا ہے۔ کوئی آگے جائے گا۔ کوئی پیچھے۔ یہ تو اس دُنیا کے لئے مقدر ہو چکا ہے اور مرنے کے بغیر انسان کے اعلیٰ جوہر نہیں کھلتے۔ جس طرح ماں باپ کے ہاں سے رخصت ہوئے بغیر لڑکی کے اصل جوہر نہیں کھلتے۔ کیونکہ اس عالم سے پرے ایک اصلی اور دائمی عالم ہے۔ جس کے

لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ پس یہ اعتراض مرنے کا بالکل باطل ہے۔ کیونکہ بڑا انسان طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر ستر سال میں مرتا ہے۔ اور اس کے انجام کی کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہوگا۔ لیکن دو برس کا بچہ جلدی مر کر فوراً ہی بسبب بے گناہ ہونے کے جنت کی طرف جاتا ہے۔ جہاں اس کے دیگر رشتہ دار بھی اُسے مل جائیں گے۔ بتائیے وہ نقصان میں ہے یا نفع میں ؟

رہا یہ امر کہ بچوں کو مرتے وقت تکالیف کیوں ہوتی ہیں۔ یہ بھی کوئی مخصوص امر نہیں۔ ہر جاندار کو موت کے دروازہ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور ہر موت کے ساتھ حکمت الٰہی نے تکالیف وابستہ کر دی ہیں۔ ورنہ یہ جہان اجڑ جاتا۔ لوگ اگلے جہان کے شوق میں ایک ایک دن میں فوج در فوج خودکشیاں کر لیتے۔ یا احتیاطیں پرہیز اور علاج نہ کیا کرتے۔ یہ بیماری کی تکلیفیں اور سکرات الموت ہی تو ہیں جن کے خوف سے انسان مرنے سے ڈرتا ہے ورنہ اگر مرنا بغیر دکھ کے ہوتا۔ تو انسان دنیا میں رہنا ہی پسند نہ کرتا۔ بیماری کے دُکھ ڈال کر اللہ تعالیٰ بندوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنا علاج کرو۔ بھوک اور افلاس کا دُکھ ڈال کر مجبور کرتا ہے کہ محنت کرو اور کما کر کھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر دکھ کسی سکھ کے حصول کے لئے ہے۔ اور یہ چیز اس دُنیا کے لئے جو دارالمحن۔ دارالعمل۔ دارالامتحان اور دارالابتلاء ہے ضروری ہے۔ ورنہ انسان کسی ابدی زندگی اور دائمی اجر کا مستحق نہ ہو سکتا۔ بلکہ حیوانوں کی طرح چر چگ کر مر کر مٹی ہو جاتا۔ اس کے لئے کوئی دارالجزاء نہ ہوتا۔ نہ ترقی کے سامان ہوتے۔ نہ ابدی نعمتیں۔ پس معصوم بچہ کا مرنا اس کے لئے آئندہ جہان میں مفید ہے۔ مرنا ہر جاندار کے لئے لازمی ہے۔ اور مرنے کو دکھوں سے وابستہ کرنا حکمت کے ماتحت ہے۔

ہاں بطور نمونہ ہمیں اتنا ثابت کرنا چاہیئے کہ بچوں کے یا انسانوں کے دکھوں میں کیا فائدے ہیں۔ بیماری کا دُکھ تو بچوں اور بڑوں سب پر حاوی ہے۔ اس لئے میں یہاں بچوں اور بڑوں دونوں کے متعلق کچھ فوائد بیان کروں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ صرف بیماری کے دُکھ کے فوائد ہی بیان کروں۔ بلکہ دوسرے مصائب مثلاً افلاس وغیرہ کا بھی ضمناً ذکر آجائے گا۔

بعض دکھ افراد یا قوموں پہ سزا کے طور پہ وارد ہوتے ہیں ۔ کیونکہ وہ خدائی اور عقلی قوانین پر عمل نہیں کرتے ۔ ایسے دکھوں میں بد پرہیزیاں بھی داخل ہیں ۔ ایک بچہ کو تولنج کا درد کیوں ہوا ۔ یا تو ماں باپ نے جہالت کی وجہ سے یا لاڈ پیار کے سبب سے اسے ثقیل غذا کھلادی یا بچہ نے آپ ہی کوئی ایسی چیز کھالی ۔ قانون طبعی سے چونکہ بچہ ۔ بڑا ۔ عقلمند ، بے عقل ارادتاً بد پرہیزی کرنے والا یا بھول کر اور غفلت سے کرنے والا سبھی سزا پاتے ہیں ۔ اس لئے اس دُکھ کا سمجھ لینا آسان ہے ۔

تکالیف کی حکمتیں

۱ ۔ سب سے بڑی حکمت تکالیف میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو پہچوانا چاہتا ہے ۔ بہت کم لوگ ہیں جو نعمتوں اور احسانوں کی معرفت خدا کو پہچانتے ہوں ۔ اکثر وہی گروہ ہے جو مصائب اور تکالیف بیماریوں اور شدائد کی وجہ سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے ۔ اور یہ ایک عظیم الشان فائدہ ہے کہ خداشناسی دکھ اور تکالیف کے راستہ سے حاصل ہوتی ہے ۔ انسان اپنی مصیبت درد اور لاچاری کو دیکھ کر خدا کی طرف توجہ کرتا ہے ۔ سُنا ہے کہ فرعون کو کبھی نزلہ اور دردِ سر کی تکلیف نہ ہوئی تھی نہ اُسے عمر بھر بخار چڑھا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا ۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا ۔ اگر کوئی شخص مصائب اٹھا کر خدا کی طرف رجوع کرے ۔ یا اس کا بچہ تکلیف میں ہو ۔ تو دُعا کرے ۔ اس کے مرنے پر صبر کرے ۔ اور خدا کی طرف اپنی توجہ پھیرے ۔ یعنی ایک بچہ قربانی دے کر ابدی جنت خرید لے تو میرے خیال میں ماں باپ اور بچہ دونوں کے لئے یہ بہت نفع مند سودا ہے ۔ بچہ تو اپنی معصومیت کی وجہ سے اور ماں باپ رجوع الی اللہ کی وجہ سے نجات پائیں گے ۔

۲ ۔ کسی بچہ کی بیماری اس کا قربانی کا بکرا بننے کے لئے بھی ہوتی ہے ۔ کئی بچوں پر تجربہ کر کے ڈاکٹر اس مرض کا علاج اور دقتیں وغیرہ معلوم کر لیتے ہیں ۔ اور چند بچے خواہ مر

بھی جائیں۔ مگر آئندہ بچوں کی نسل کے لئے اس بیماری کا علاج معلوم ہونے سے اور لاکھوں بچے بچ جاتے ہیں۔ امریکہ میں زرد بخار کا علاج اور ٹیکا معلوم کرنے کے لئے کئی ڈاکٹروں نے خود اپنے آپ کو وہ بیماری لگا کر ہلاک ہونے دیا مگر مقصد حاصل کر لیا۔ یوں علم میں بھی ترقی ہوئی اور خدا کی حکمتیں بھی ظاہر ہوئیں۔ اسی طرح بعض بچے بھی آئندہ ہونے والے بچوں اور نسلوں کے لئے قربان ہو کر یا ڈاکٹروں کے زیر تجربہ اور زیر مشق رہ کر مفید بن جاتے ہیں۔ بس یہ نسل انسانی کا فائدہ ہے جو مقدم ہے انفرادی فائدہ پر۔ اور اس میں علم و حکمت کی ترقی ہے اور خدا کا حکیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ موت کے علاوہ بعض بیماریاں خود رحمت ہوتی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے آئندہ زیادہ مہلک قسم کی بیماریاں اس بیمار کو نہیں ہوتیں۔ مثلاً اگست ۱۹۱۸ء میں جس جس کو انفلوئنزا ہوا۔ وہ سب بچ گئے۔ پھر انہیں اکتوبر ۱۹۱۸ء کا انفلوئنزا نہیں ہوا۔ جو نہایت درجہ مہلک تھا۔ پس پہلی بیماری رحمت تھی۔ اسی طرح ویکسی نیشن یعنی Coeur pox کی بیماری برداشت کر لینے کے بعد چیچک یعنی Small pox نہیں ہوتی جو سخت مہلک ہے۔

۴۔ بچے ہر بیماری میں بڑوں کی نسبت کم تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اعصاب اس وقت پختہ نہیں ہوتے۔

۵۔ بیماریاں اور تکالیف خدا تعالیٰ کی جلالی صفات کا مظہر ہیں۔ اگر صرف جمالی صفات والا ہی خدا ہوتا۔ تو وہ کامل خدا نہ ہوتا۔ اور خدا وہی ہے جس کے قبضہ میں آرام اور دکھ دونوں ہی ہوں تبھی تو قرآن میں آیا ہے کہ

مَا لَا یَنْفَعُھُمْ وَلَا یَضُرُّھُمْ۔ (الفرقان، ۵۶) یعنی مشرک ایسے معبودوں کو پوجتے ہیں جو نہ نفع دے سکتے ہیں نہ ضرر۔ کامل اختیارات والا خدا وہی ہے جو دونوں کا مالک ہو۔ انسان بھی انہی دو باتوں کی وجہ سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ورنہ اگر دنیا میں تکالیف نہ ہوں تو نہ انسان کے اخلاق ظاہر ہوں۔ نہ وہ خدا کی حکمتوں کا کھوج

لگا سکے۔ نہ خدا سے ڈرے۔ نہ کوئی اجر حاصل کر سکے۔ اور شاید سوائے خاص شکر گزار لوگوں کے کوئی نجات بھی نہ پا سکے۔

۶۔ بچپن کی بیماریاں اور تکالیف بھی قیامت کے دن حساب میں آئیں گی۔ اور ان کے بھی نمبر ملیں گے۔ جس طرح بڑے انسانوں کی بیماریوں کا اجر ملے گا۔ پھر کس بات پر اعتراض؟

۷۔ بیماریوں سے بعض بچے اندھے۔ لولے، لنگڑے یا معذور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بیماریاں اور ایسے مستقل نقائص آئندہ کے لئے ایسے بچوں کی زندگی کو سنوار دیتے ہیں۔ ورنہ بہت سے ان میں سے شیطان کو مات کر دیتے۔ لیکن یہ معذوریاں ان کی طبیعت کو ذہین صابر اور نیک بنا دیتی ہیں۔

۸۔ اگر بچہ بیمار نہ ہو۔ نہ اسے تکالیف پہنچتی رہیں۔ خواہ معذور نہ بھی ہو۔ تو بھی بڑے ہو کر ان مصائب کی وجہ سے تحمل جفاکشی تلخی کی برداشت اور نیک اخلاق اس میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

۹۔ ممکن ہے کہ ایک ماں باپ کے دو بچوں میں سے ایک مر جائے اور دوسرا بڑی عمر پائے۔ لیکن اگلے جہان میں پہلا جنتی ہو اور دوسرا دوزخی۔ پس کون فائدہ میں رہا؟ یہی تو وہ مخلوق ہے جس کی بابت روایتیں آئی ہیں کہ وہ جنت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

۱۰۔ انسان کے لئے تکلیف کا وجود اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے راحت کا مزا اس کی قدر اور شکر پیدا ہوتے ہی اس دُنیا میں جو شخص کبھی دکھی نہ ہو وہ یقیناً فرعون بن جاتا ہے جو کھاتا بھی ہے اور غراتا بھی ہے۔

۱۱۔ بچہ چونکہ سب سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ اس لئے اس پر بھی ضرور آفت آنی چاہیئے بموجب آیت وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ کے (محمد: ۳۲)

۱۲۔ کیا بچے ہمیشہ تندرست رہا کریں؟ پھر شاید یہ کہا جائے۔ کہ کسی جوان کی موت نہ ہو۔ اور آخر میں یہ کہ کوئی انسان بھی نہ مرے یہ سب لغویات ہیں۔ اور کسی اور عالم کا افسانہ

ہیں۔اس دُنیا کی بناوٹ کے ساتھ یہ تصور یہاں نہیں چل سکتیں ۔

۱۳۔ قدرتِ الٰہی ہر چیز کا بیج یا پنیری بہت کثرت سے پیدا کرتی ہے۔ پھر ناقص اور کمزور حصہ تلف ہو جاتا ہے۔ اور اچھا باقی رہتا ہے۔ جب ہر چیز کا بیج اور پنیری بکثرت تلف ہوتے رہتے ہیں۔ تو انسانی بچہ کے تلف ہونے پر کیا اعتراض ۔

۱۴۔ جب کسی قوم کی آئندہ نسلیں کمزور اور خراب ہونے لگتی ہیں۔ تو اُن کے بچے بہت مرنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح وہ قوم اپنی آنے والی تباہی سے واقف ہو جاتی ہے۔ اور بچاؤ کی تدبیروں میں لگ جاتی ہے۔ پس یہ وارننگ Warning بھی ایک حکمت ہے۔

۱۵۔ مرنا بغیر بیماری کی تکالیف کے نہیں ہوتا۔ اس لئے تکلیفیں ضروری ہیں۔ کیونکہ روح اور جسم کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ بغیر تکلیف کے علیحدگی ناممکن ہے۔ گویا ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہوتا ہے۔ اگر بغیر دکھ کے بچے یکدم مر جایا کرتے۔ تو نہ اُن کا علاج ہو سکتا۔ نہ علوم کھلتے۔ نہ لوگوں کو ہمدردی اور تیمار داری کا موقع ملتا۔

۱۶۔ بیمار بچوں اور دیگر مصیبت زدہ اشخاص میں دوسروں کے لئے خاص شفقت اور رحم پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے دکھوں کو دیکھتے ہیں۔

۱۷۔ تقویٰ کی جڑ بیماری کا پرہیز ہے۔ جب مریض بچہ بیماری کے لئے پرہیز کرتا ہے اور ضبط کی عادت ڈالتا ہے تو وہ بڑا ہو کر بھی تقویٰ اختیار کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک تو کوئی شخص متقی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ جسمانی پرہیزگار بھی نہ ہو۔ کیونکہ دونوں کی پشت پر ایک ہی طاقت کام کرتی ہے ۔

۱۸۔ بچہ اطاعت نہیں کرتا۔ جب تک اُسے لالچ یا ڈر نہ ہو۔ ڈر خواہ مار کا ہو خواہ بیماری کا۔ پس بیماری کے دکھ سے بھی بچوں میں اطاعت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ جو جڑ ہے عبودیت کی

۱۹۔ دُکھی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں میں خدا کے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ الحمدللہ ہم اس مصیبت سے محفوظ ہیں۔ اور خدا کے شکر کا جذبہ بھی انسان کے تعلقات کو خدا سے

مضبوط کرتا ہے ۔

۲۰۔ بچوں کی تکلیف کو دیکھ کر بڑوں میں شفقت اور رحم جوش مارتے ہیں اور نیک اخلاق کا جوش عظیم الشان تغیر اور نتائج پیدا کرتا ہے۔

۲۱۔ جو بچے اندھے ۔ کانے لنگڑے لُولے ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کے مخفی جوہر اور اپنی مخفی حکمتیں دکھانا چاہتا ہے۔ وہ طرح طرح کی خلافِ توقع لیاقتیں اور کام سیکھ جاتے ہیں جن سے انسانی کمالات کا اظہار ہوتا ہے ۔

۲۲۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس طرح میں انسان کی ربوبیت کرتا ہوں۔ اسی طرح والدین اور دیگر عزیز بھی بچہ کی تربیت پر ہمہ تن متوجہ رہیں ۔ ورنہ اس کی سزا بیماری اور موت ہے ۔ پس بعض موتیں اور بعض بیماریاں سزا ہیں والدین کے لئے کہ انہوں نے بچہ کی حفاظت کیوں نہ کی اور تاکہ وہ اور دیگر ناظرین آئندہ کے لئے محتاط رہیں ۔

۲۳۔ اگر بیماریوں میں سخت سخت دُکھ نہ ہوں تو لوگ مر جانے کو معمولی بات سمجھیں۔ علاج وغیرہ نہ کرائیں۔ نہ پرہیز و احتیاط کریں ۔ پس موت کو سخت دُکھ سے وابستہ کر کے خدا نے انسان کو علاج کی طرف مجبور کیا۔ تاکہ وہ خدا کی حکمتوں دوائیوں اور علوم کو باطل نہ کرنے پاوے۔

۲۴۔ جب بچہ بیمار ہوتا ہے ۔ تو اوپر والے دعائیں کرتے ہیں۔ ان کو خدا یاد آتا ہے۔ اور اگر مر جاتا ہے۔ تو اکثر دفعہ ان کے آئندہ ہونے والے بچوں کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ٹیکہ لگوانے میں سستی کی وجہ سے ایک بچہ چیچک سے ضائع ہو گیا۔ تو اس کے والدین آئندہ اپنے ہر بچہ کو بروقت ٹیکہ لگوایا کریں گے ۔

۲۵۔ بیماریاں اور دُکھ نہ ہوتے تو مخلوقات میں تعاون محبت علاج معالجہ کا سلسلہ نرسنگ Nursing یعنی تیمارداری ۔ مال، وقت اور محنت کی قربانی سب مفقود ہوتے۔ اسی طرح صبر استقلال شفقت اور رحم کے مظاہرے دُنیا میں نہ پائے جاتے جو بنی نوع انسان کے

لئے فخر ہیں ۔ رشتہ داروں کو اپنا نفس کچلنا پڑتا ہے ۔ رضا بقضا ہونا پڑتا ہے اور لَتُبۡلَوُنَّکُمۡ والے ابتلاؤں کو پاس کرنا پڑتا ہے ۔ نیک اور خدا رسیدہ ہونے کے سب دعوے پرکھے جاتے ہیں ۔

۲۶ ۔ ایک ٹھوکر کھا کر آئندہ ویسی بد پرہیزیوں سے بچوں کو بچانا آجاتا ہے ۔

۲۷ ۔ ڈاکٹروں حکیموں کی نئی نئی دواؤں کا تجربہ ہوتا ہے نیز بیماریوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے ۔

۲۸ ۔ انسان روئے زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا مظہر ہے ۔ پس بچوں کو بیماری اس لئے بھی بھیجی جاتی ہے کہ خدا کا خلیفہ اور نائب ایک فوج خدائی صفات یعنی رحم ۔ کرم شفقت ۔ شفا ۔ احیاء ربوبیت وغیرہ کی اپنی طرف سے اس دکھ کے مقابل پر لاکر کھڑی کر دے ۔ اگر بیماری موت اور شفا نہ ہوتے تو انسان بھی خدا کا ادھورا سا خلیفہ ہوتا ۔ نہ کہ کامل ۔

۲۹ ۔ بچوں کو بیماریوں میں صرف جسمانی تکلیف کا احساس ہوتا ہے ۔ اور وہ بھی بڑوں سے کم ۔ بڑوں کو تو اپنی بیماری میں اہل و عیال کے آئندہ گذارہ کا غم اور بیسیوں ضروری کاموں کا جو معلق رہ گئے ہوں ۔ فکر ہوتا ہے ۔ اور بیماری کے درد کے ساتھ ان کو سخت ذہنی فکر اور رنج و حزن بھی ہوتے ہیں ۔ جن سے بچہ بالکل آزاد ہوتا ہے ۔ نہ وہ موت کو جانتا ہے نہ ذمہ داری کو اس لئے سوائے جسمانی دکھ کے اُسے غم فکر رنج وغیرہ نہیں ہوتے ۔ علاوہ ازیں چونکہ اس کے احساسات بھی قوی نہیں ہوتے ۔ اس لئے جسمانی درد بھی اسے بڑے آدمی کی نسبت بہت کم ہوتا ہے ۔ پس یہ بھی خدا تعالیٰ کا فضل ہے ۔

خلاصہ

مضمون لمبا ہوگیا ہے ۔ اس لئے میں مختصراً اس کا خلاصہ حسب ذیل کر دیتا ہوں ۔

(اوّل) موجودہ عالم کا تمام نظام بدلنے کے سوا معترض خوش نہیں ہوسکتا اور تمام نظام

عالم کے بدل دینے سے یہ بہتر ہے کہ اعتراض ہی واپس لے لیا جاوے۔
(دوم) یہ دُنیا اصل مقام انسان کا نہیں ہے بلکہ اصل جگہ اس کے رہنے کی ایک اور عالم ہے۔
(سوم) اس دنیا میں بھی سُکھ کی مقدار دُکھ کی نسبت زیادہ ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہر شخص مرنے سے ڈرتا ہے۔ خواہ کیسی ہی تکالیف میں ہو۔
(چہارم) انسان کی پیدائش کی غرض خداشناسی ہے اور یہ غرض اس دُنیا میں دکھ اور سکھ کی موجودگی سے پوری ہوتی ہے۔
(پنجم) قیامت میں بچہ ہو یا بڑا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے دکھ کے نمبر ملیں گے۔
(ششم) مفلس اور غریب لوگ امراء کی نسبت پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے یہ ان کے افلاس کی جزا ہے۔
(ہفتم) کئی بیماریاں مومن کو شہید کے درجہ تک پہنچا دیتی ہیں۔ یہ ان تکالیف کا بدلہ ہے۔
(ہشتم) وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (الشوریٰ: ۲۸)
اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے رزق کے دروازے کھول دیتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ سرکش اور باغی ہو جاتے۔ پس دُنیا کے امن کی خاطر بھی مصائب ضروری ہیں۔
(نہم) یہ موجودہ نظام دُنیا کا بغیر اختلاف کے نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے کمال حکمت سے خدا تعالیٰ نے خوشی مال صحت آزادی، عزت۔ علم عقل اور بیماری، دُکھ موت، افلاس رنج غم فکر وغیرہ چیزیں لوگوں میں تقسیم کر دیں تاکہ وہ کارخانہ عالم کو ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ چلا سکیں۔ غریب امیر کا کام کرے۔ امیر غریب کی پرورش کرے۔ اہل علم طرح طرح کے علم کے نتائج سے اس باغ دُنیا کو آراستہ کریں۔ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہو۔ انسان اپنے رب کو پہچانے۔ اس کی اطاعت کرے اور دنیا کو اس سے روشناس کرائے اور بالآخر مرنے کے بعد ابدی جنت کا وارث ہو اور اس کی ساری تکالیف مٹ جائیں۔ بلکہ ان میں سے ہر

ایک کا بدلہ بڑھ چڑھ کر اسے ملے تاکہ پھر اُسے کسی قسم کی شکایت اپنے مالک کے متعلق نہ رہے

(دہم) اگر یہ سوال کہ بچہ کو باپ دادا کے افعال کی سزا کیوں ملتی ہے۔ اُس بچہ نے کیا گناہ کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بچہ کو سزا کے طور پر وہ بیماری نہیں ہوئی۔ اور اس وجہ سے وہ قابلِ ملامت نہیں ہے۔ وہ اپنی تکلیف کا اجر خدا کے ہاں سے پائے گا۔ ہر بچہ کو ہر شخص تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ اس کی ماں اسے زیادہ کھلا کر تکلیف دے سکتی ہے۔ اس کا باپ اُسے آتشک کا ورثہ دے کر اُسے بیمار کر سکتا ہے۔ اس کا بھائی اینٹ مار کر اس کا سر پھاڑ سکتا ہے۔ پس بچہ کی ہر ایسی تکلیف کے بدلے وہ موذی آخرت میں سزا پائے گا۔ جس نے اسے تکلیف دی اور خود بچہ آخرت میں جزا پائے گا۔ جس نے بے قصور دوسروں کا ظلم برداشت کیا۔ خدا کی طرف سے تو ہر طرح فضل ہی فضل ثابت ہے۔

(روزنامہ الفضل ۴ راکتوبر ۱۹۴۴ء)

عیدالاضحیٰ کی قربانیوں کے گوشت کا مصرف

ہمارے ملک کا رواج اب اس گوشت کے متعلق یہ ہوتا جاتا ہے۔ کہ کچھ آپ پکایا۔ اور اگر ہو سکا تو کچھ ایک دو دن کے لئے رکھ لیا۔ باقی میں سے عمدہ حصّہ دوستوں کے ہاں بھیج دیا اور دوست بھی وہ جن سے کام پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً کسی ڈاکٹر سے علاج کرایا تھا تو اُس کے ہاں ایک ران بھیج دی۔ کسی وکیل سے مشورہ لیا تھا تو کچھ اُس کے ہاں بھیج دیا۔ کسی کے ہاں سے اُن کے ہاں گوشت آیا تھا تو انہوں نے ان کے ہاں بھیج دیا۔ پھر کچھ تھوڑا سا اور ناقص حصّہ غرباء کو بھی دے دیا اور غربا بھی وہ جو اپنے کام آتے رہے ہوں اور ان لوگوں کے ہاں تو ضرور گوشت بھیجا جاتا ہے جن کے ہاں کئی کئی بکرے خود کٹ چکے ہوں اور انہیں گوشت کی ہرگز کوئی ضرورت نہ ہو۔ یعنی نیوتہ آیا۔ بھاجی کے طور پر وہ بھی عوض معاوضہ ہوتا ہے۔

میرے نزدیک شرع نے یہ سب صورتیں ناجائز رکھی ہیں حرام نہیں کیں۔ لیکن جو الفاظ قرآنِ مجید نے قربانیوں کے گوشت کے متعلق فرمائے ہیں۔ یہ باتیں ان کی روح اور مقصد سے دُور لے جاتی ہیں۔ اور ایک قسم کی رسم بن گئی ہیں یا بنتی جاتی ہیں۔ کلام الٰہی نے دو آیتوں میں اس گوشت کا مصرف یوں بتایا ہے۔

۱۔ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (الحج : ۲۹)

یعنی وہ گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو کھلاؤ۔

۲۔ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج : ۳۷)

یعنی اس میں سے خود کھاؤ اور نہ سوال کرنے والے اور سوالی فقیروں کو کھلاؤ۔
مگر ہوتا کیا ہے متمول یا متوسط درجہ کے لوگ جو روزانہ گوشت کھاتے ہیں۔ان کے ہاں بہت زیادہ گوشت پہنچتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ سوالی فقیروں یا خود دار مفلس کو ملے پھر آج کل تو ایک روپیہ یا سوا روپیہ سیر گوشت بازار میں بکتا ہے۔غریب بیچارے اسے کہاں کھا سکتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ دن میں دو دفعہ گوشت اڑاتے ہیں۔ان کے ہاں بقرعید کے دن بھی گوشت کی بھرمار ہو جاتی ہے۔اور سب پر طرہ یہ کہ قربانی کا گوشت متمول لوگوں کے ہاں بطور نیوتہ کی بھاجی اور غرباء میں بطور اجرت کے تقسیم ہوتا ہے۔قادیان میں ان رسوم کے توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ گھر گھر سے قربانی کا گوشت لے کر غرباء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یا لنگر خانہ اور دارالشیوخ میں بھیج دیا جاتا ہے مگر ابھی رسم کے بہت سے حصہ کو توڑنے کی اور اس تقسیم کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ قادیان سے باہر کے لوگوں کو بھی یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ خدا کا فضل ہے جو ہمیں خود بھی اس کے کھانے کی اجازت ہے۔ ورنہ اکثر حصہ تو اس کا غرباء کا حق ہی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید سے ظاہر ہے۔ یہ منع نہیں ہے کہ کوئی دوسرا نہ کھائے یا جنہوں نے خود قربانی کی ہو۔ وہ دوسروں کے ہاں کا حصہ واپس کر دیں لیکن جائز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود دار غرباء اور منگتے فقیروں کو تو اوجھڑی، پھیپھڑوں والا گوشت اور ہڈیاں وغیرہ سیر ڈیڑھ سیر مل جائیں اور ملاحظہ والوں متمولوں اور امیروں کے گھر بہترین حصہ چلا جائے یا ان لوگوں کو ہی ملے جو کمیتوں کی طرح ہمارے گھر کا کام کاج کرنے آیا کریں یا امیر ہمسایہ کے ہاں ایک ران بھیجی جائے۔ اور غریب ہمسایہ کے ہاں پاؤ بھر کی بوٹی۔ یا تمام بکرے میں سے
سری کلیجی گردے۔ عضلات اور عمدہ گوشت۔ قیمہ اور کباب بنانے کا چن چن کر خود رکھ لیا جائے اور باقی تلچھٹ غریبوں کا حصہ بنے۔ اسلامی اعمال کے سب امور نیتوں پر موقوف ہیں۔ مگر بعض اعمال ان نیتوں کا پردہ فاش کر دیتے ہیں جو ان اعمال کے پیچھے

ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کے حکم کے مقصد کو جو قربانی کے گوشت کے متعلق ہے پورا کرنے والے بنو۔ اس میں سے خود کھاؤ۔ تمہارے دوست بھی کھا سکتے ہیں۔ مگر جن کا حق صراحتاً مذکور ہے اور عقلاً بھی وہ اس کے زیادہ حصّہ کے مستحق ہیں۔ ان کو نہ بھولو۔ ان کا پورا حق ان کو پہنچاؤ۔

(الفضل یکم دسمبر ۱۹۴۴ء)

جہنم سزا ہے یا علاج ؟

سوال : سزا اس لئے ہوتی ہے کہ یا تو مجرم پھر وہ گناہ نہ کر سکے۔ مثلاً قتل کے بدلہ قتل یا اس لئے کہ دوسروں کو عبرت ہو - اگلا جہان نہ دارالعمل ہے۔ نہ وہاں عبرت کا سوال ہے۔ پھر جہنم کیوں بنایا گیا ؟

جواب : اول تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہنم شفاخانہ یا علاج گھر ہے۔ پس دوسروں کی عبرت کا سوال تو نہیں ہے۔ مگر آئندہ گناہ سے رُکنے کا ضرور سوال ہے۔ کیونکہ جو لوگ وہاں جائیں گے ان کی روحیں بیمار ہوں گی۔ اور اس قابل نہیں ہوں گی کہ وہ نعمائے جنت یا وصلِ الٰہی کی لذت اٹھا سکیں۔ جس طرح یہاں بیمار کو ٹھنڈا پانی بُرا لگتا ہے۔ مزیدار پھل ناموافق آتے ہیں۔ میٹھی چیز بوجہ مرض کے کڑوی لگتی ہے۔ جوان حسین تندرست بیوی بسبب نامردی کے بلائے جان اور خارِ پہلو ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پس ضروری تھا کہ انسان جو یہاں سے ایسی بہت سی روحانی اور اخلاقی بیماریاں لے کر اپنے ساتھ اگلے جہان میں گیا ہے۔ اسے بھی ایک شفاخانہ میں داخل کیا جائے۔ جہاں کے علاج سے اس کی بداخلاقیاں اور خدا ناشناسی کی بیماریاں دُور ہوں۔ پھر اس کے بعد شفا پا کر وہ جنت کا لطف اٹھا سکے۔ فرض کرو ایک عادی چور، خائن۔ تارک الصلوٰۃ آدمی فوراً بغیر ان امراض کا علاج کئے جنت میں بھیج دیا جائے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا ایسا غیر مغفرت یافتہ شخص وہاں لوگوں کی جو چیز پسند آئے گی چُرا لے گا۔ ان کی بیویوں پر نظرِ بد ڈالے گا یا ان کو چھیننے کی کوشش کرے گا۔ خدا سے دُعا نہ مانگے گا (کیونکہ نماز دُعا ہی ہے) پس وہ جنت والوں کے لئے سخت ایذا اور دُکھ کا موجب ہوگا۔ اس لئے اسے ایک عرصہ دوزخ میں رہنا ضروری ہے کہ وہ یہ سب بُرائیاں اور بداخلاقی جن کی اپنی روح کو عادت ڈال کر وہ

ساتھ لے گیا ہے۔ دوزخ میں علاج اور پرہیز کر کے چھوڑ دے۔ اور نیک اخلاق انسان بن کر گناہوں سے صاف ہو کر جنت میں جائے۔ تاکہ وہاں فساد نہ پھیلائے۔ نیز اس میں خدا تعالےٰ سے دُعا کرنے اور اس کی صفات کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو۔ تاکہ خداشناسی کی وجہ سے خدا کا کلام اور قبولیت دُعا کا درجہ اسے ملے۔ ورنہ جنت بے کار ہے۔ پس عبرت کا سوال نہیں۔ ہاں یہ سوال ہے کہ وہ جنت میں جا کر چونکہ پھر وہی بدیاں کرے گا اس لئے اس کی اصلاح کا ہونا اور بیماریوں سے اچھا ہونا ضروری ہے۔ رہی یہ بات کہ جب وہ حشر میں خدا کو دیکھ لے گا۔ تو پھر تو وہ ایماندار ہو ہی جائے گا۔ اور آئندہ خود ہی بُرے کام چھوڑ دے گا۔ اس لئے دوزخ کی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوزخی بھی تو خدا سے جہنم میں جانے سے پہلے ہی کہیں گے۔ کہ خداوند ہم نے تجھے اور تیری جزا سزا کی عدالت کو دیکھ لیا ہے۔ اب پھر ہمیں دُنیا میں واپس بھیج دے ہم وہاں خداشناس اور صالح بن کر تجھے دکھا دیں گے۔ تو ہم کو دوزخ میں نہ ڈال۔ مگر خدا تعالیٰ ان کی اس بات کا جواب پہلے ہی قرآن میں دے چکا ہے۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام: ۲۹)

یعنی تم جھوٹے ہو۔ اگر ہم تم کو واپس بھی کر دیں۔ تو تم ضرور پھر وہی شرارتیں اور بداخلاقیاں کرو گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ لوگ اگر جنت میں چلے بھی جائیں۔ تو وہ وہی کرتوتیں وہاں بھی کریں گے۔ پس شفاخانہ میں سے شفایاب ہو کر جانا پڑے گا۔ صرف حشر کی دہشت کافی نہیں۔ اور اسی شفاخانہ کا نام جہنم ہے۔

دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ دنیا کا تمام معاملہ خرید و فروخت بدلہ اور جزا سزا پر ہے۔ اب ایک آدمی نے ایک قتل کیا۔ اور دنیا میں ہی اس کی سزا پائی۔ یعنی پھانسی۔ اور ایک دوسرے آدمی نے سو قتل کئے۔ وہ بھی دنیا سے پھانسی پا کر رخصت ہوا۔ ان حالات میں اگر جہنم نہ ہو۔ تو پھر وہ ننانوے قتل کہاں گئے؟ ایک خون کرنے والا ایک پھانسی کی سزا پا کر جنت میں چلا گیا۔ اس طرح سو خون کرنے والا ایک پھانسی کی سزا پا کر اپنے سر پر ننانوے

خونوں کا بوجھ لے کر بھی جنت میں چلا گیا۔اب وہ اس بوجھ کو کہاں پھینکے ؟پس انسانی عقل اور خدا کا کلام دونوں ایسے شخص کے لئے جہنم کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔اور اس صورت میں خواہ عبرت یا آئندہ خون نہ کر سکنے کا سوال پیدا بھی نہ ہو۔مگر پچھلی سزا ضرور ملنی چاہیئے بعض اعمال ہی جہنم کا مطالبہ کرتے ہیں۔خواہ اس میں شفاخانہ والا حصّہ اُڑا بھی دیا جائے۔ایک شخص نے زنا کیا۔اور پہلی مرتبہ ہی اُسے آتشک اور سوزاک ہو گیا۔یہاں تک کہ وہ ساری عمر دکھوں اور زخموں میں مبتلا رہا۔اولاد سے بھی محروم رہا۔غرض اس کی زندگی ایک دوزخ میں کٹی۔ایک دوسرا شخص ساری عمر بدکاری کرتا رہا۔مگر بعض وجوہ سے اُسے کوئی بیماری نہ لگی۔اولاد بھی ہوئی صحت بھی اچھی رہی۔توبہ بھی نہ کی۔اب بتلائیے یہ ہزاروں دفعہ کا زانی کیا یونہی دندناتا جنت میں چلا جائے گا۔صرف اس بات پر کہ عبرت لینے والا کوئی نہیں ہے یا آئندہ یہ گناہ دوسرے جہان میں کر نہیں سکتا۔یقیناً عقل جواب دے گی۔کہ جیسا جہنم پہلے شخص کو ملا ہے۔اس سے ہزار گنا جہنم دوسرے کے لئے اگلے جہان میں ہونا چاہیئے۔

تیسرا جواب :یہ ہے کہ وہاں عبرت بھی موجود ہے۔دوزخ میں لوگ جائیں گے۔ان میں سے کوئی کسی گناہ کا مرتکب ہوگا۔کوئی کسی گناہ کا۔جب ایک چور اپنی چوری کے عوض جہنم میں تکلیف اُٹھا رہا ہوگا۔تو اُسکے دیگر ساتھی جو چور نہیں ہونگے۔بلکہ صرف جوئے کی وجہ سے وہاں ہونگے۔اُنکو چور کے حال سے عبرت ہوگی۔ان کو بے شک چوری کی سزا نہیں ملی۔کیونکہ انہوں نے عملاً کوئی چوری نہیں کی تھی۔لیکن ان میں بہت سی خیانتیں مخفی طور پر موجود تھیں۔اور موقع پا کر وہ چوری بھی کر سکتے تھے۔کیونکہ ان کا تزکیہ نفس نہیں ہوا تھا۔پس ایسا جوئے باز اس چور سے عبرت پکڑ کر اپنا تزکیہ نفس ان دیگر گناہوں سے بھی کرے گا۔جو اس کے اندر مخفی طور پر موجود تھے۔مگر ظاہر نہیں ہوئے تھے۔اس طرح سے جہنمی اپنی اپنی سزائیں بھی پائیں گے اور دوسروں سے عبرت بھی حاصل کریں گے۔اپنی سزا اور دوسروں سے عبرت ان کے کامل تزکیہ کا باعث ہوگی۔پھر وہ جنت میں چلے جائیں گے۔پس عبرت کا عنصر بھی دوزخ کی سزاؤں میں موجود ہے۔

چوتھے یہ کہ خواہ عبرت نہ ہو۔ اور خواہ آئندہ وہاں گناہ کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکے۔ تب بھی حقوق العباد میں جس قدر ایک مجرم نے دوسروں کو دُکھ دیا ہے اتنا دُکھ بطور بدلہ کے اس کے نفس کو بھی سہنا چاہیئے۔

پانچویں یہ کہ تکالیف غیر متزکی انسان کی تکمیلِ نفس کا موجب ہوتی ہیں۔ اسی طرح دوزخ بھی ان لوگوں کی رُوح کی تکمیل کی جگہ ہے جو دُنیا میں اپنے نفس کی تکمیل و ترقی کے مدارج طے نہ کر سکے تھے پس عبرت وغیرہ کا اعتراض قائم نہ بھی رہے تب بھی دیگر وجوہات سے ایک مجرم کا جہنم میں جانا ضروری ہے۔

پوچھا جاتا ہے کہ کیا جنتی اور دوزخی ایک ہی جگہ رہ سکتے ہیں؟ ہاں یہ ممکن تو ہے۔ کیونکہ جنت میں روحانی اور جسمانی انعامات ہیں۔ اور جہنم میں حسرت کی آگ دل کا غم اور جسمانی تکالیف ہیں۔ پس جس طرح اس دنیا میں دونوں قسم کے لوگ پہلو بہ پہلو رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات وہاں بھی ممکن ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ کہ جنت اور دوزخ بالکل الگ الگ مقام ہوں گے۔ کیونکہ ایک تو قرآن و حدیث میں دونوں مقامات کو بالکل الگ الگ اور ممتاز طور پر علیحدہ علیحدہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر ایک اور دلیل بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایک قلیل عرصہ کے لئے ایک خوش و خرم انسان ایک مغموم انسان کے پاس رہ سکتا ہے۔ یا ایک بیمار ایک تندرست کے ساتھ اکٹھے بسر کر سکتا ہے۔ لیکن نہایت لمبے عرصہ اور مدت دراز تک یہ صحبت ناممکن ہے۔ بیمار، غمگین، مغضوب اور مصیبت زدہ کا قُرب ایک جنتی کے عیش کو ہر حال مکدّر اور متغص کر دے گا۔ اور اس کی زندگی محض ایک دوزخی انسان کے قُرب کی وجہ سے تلخ ہونی شروع ہو جائے گی۔ پس عقلاً بھی جنتی اور دوزخی کا ایک دوسرے سے دُور دور الگ رہنا ضروری ہے اور نقلاً تو یہ ثابت ہے ہی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

اگر جنت اور دوزخ محض روحانی ہی ہوتے تو کسی قدر ان کے ساکنین کے اکٹھے رہنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر جبکہ وہ روحانی اور جسمانی دونوں ہیں۔ تو پھر مِل جُل کر ان کا رہنا نہایت

مشکل ہے۔ وہ مشترکہ مقام نہ رہے گا۔ بلکہ دوزخیوں کے ہر وقت سامنے رہنے کی وجہ سے جنتی بھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔

(الفضل ۱۴/ اپریل ۴۵ء)

کچھ اخلاق کے متعلق

اخلاق کے متعلق لوگ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ آج میں مختصر طور پر ایک ضروری اصول ان کے متعلق عرض کر دیتا ہوں۔ میرے خیال میں اچھے اخلاق کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

طبعی تقاضے جن پر اخلاق کا دھوکہ ہوتا ہے

بعض لوگوں میں بعض طبعی تقاضے جو ابھی اخلاق کا رنگ نہیں پکڑتے۔ یعنی عقل کے ماتحت نہیں ہوتے۔ اور موقع اور ضرورت کے مطابق صادر نہیں ہوتے۔ وہ بھی بہت پسندیدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان طبعی طور پر ہی نہایت حلیم اور بُرد بار ہوتا ہے۔ یہ اس کا طبعی تقاضا ہوتا ہے نہ کہ خُلق۔ بعض شخص پیدائشی اور طبعی طور پر ہی ہنس مکھ اور خوش رہنے والا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ طبعی طور پر ایثار کرنے والے یا سخی ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اگر اپنے طبعی تقاضوں پر فخر ہو۔ تو ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ ایک ہیجڑا یا نامرد کہے کہ دیکھو میں عفیف اور پاکباز ہوں۔ کہ مجھ سے بدکاری صادر نہیں ہوتی۔ ایسے اخلاق کا اجر خدا کے ہاں کچھ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ شخص بعض گناہوں یا تکالیف میں پڑنے سے بچ جاتا ہے۔ مثلاً جو طبعی طور پر نہایت درجہ حلیم ہے۔ چونکہ وہ کسی سے لڑے بھڑے گا نہیں۔ اس لئے لڑائی فساد کے نقصانات سے بچا رہے گا۔ یا اگر کوئی مخنث بدکاری نہ کرے گا۔ تو دُنیا میں زنا کے ارتکاب اور آخرت میں بدکاری کی سزا اُسے نہیں مل سکتی۔ ہاں ایک طرح سے یہ لوگ بھی بعض تکالیف اٹھا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایسا حلیم شخص دیّوثی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ یا ایسا طبعی صابر انسان

بے غیرتی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ عقل کے ماتحت اپنے طبعی تقاضوں کو لگام دے کر نہیں رکھتا
پس ایسے لوگوں کو صاحبِ اخلاقِ فاضلہ کہنا غلط ہے۔ گو یات بھی درست ہے کہ اچھے طبعی
تقاضے بُرے طبعی تقاضوں کی نسبت بہرحال پسندیدہ ہوتے ہیں۔

اخلاقِ فاضلہ یہ طبعی تقاضے نہیں ہوتے بلکہ واقعی اخلاق ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے طبعی
تقاضے جو عقل کے ماتحت چلائے جاتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں ۔

اخلاق قسم اوّل

یہ وہ اخلاقِ حسنہ ہیں جو انسان انسان کے لئے دکھاتا ہے۔ ان میں مذہب کا دخل
نہیں۔ ایک دہریہ بھی یہ اخلاق رکھ سکتا ہے اور انہی اخلاق پر ساری دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔
چونکہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس لئے اس کا گذارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ نیک اخلاق
پر عمل استعمال نہ کرے۔ وہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے ساتھ نیک سلوک کریں۔
وہ اپنے عہد پورے کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اس کے عہد پورے کریں۔ وہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرتا
ہے۔ تاکہ وقت پڑنے پر وہ اس کے ساتھ ہمدردی کریں۔ وہ دوسروں کی تیمارداری کرتا ہے تاکہ
بیماری کے وقت دوسرے اس کے کام آئیں۔ وہ اپنے ہمسایوں کے دفن کفن میں شریک ہوتا
ہے تاکہ ہمسائے اس کے دفن کفن میں شریک ہوں۔ یہ اخلاق مذہب نہیں ہیں۔ لیکن مذہب کی
بنیاد ہیں۔ اور اس بنیاد پر مذہب کی دیواریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ اور ان اخلاق کے سوا انسان
کو چارہ بھی نہیں۔ فرض کرو ایک شخص بیمار ہے لاچار ہے۔ اس کی خدمت دوسرے انسان ہی کر
سکتے ہیں۔ فرشتے عام طور پر اس کے لئے آسمان سے نازل نہیں ہوتے۔ یا کوئی مرگیا ہے۔ تو اس
کی قبر دوسرے انسان ہی کھودتے ہیں۔ جنات نہیں کھودیں گے۔ غرض اکثر حالات میں انسان ہی
انسان کے کام آتا ہے۔ خواہ وہ دوست ہوں بیوی بچے ہوں۔ رشتہ دار ہوں۔ ہمسائے ہوں یا
گورنمنٹ کے کارندے ہوں۔ اس وجہ سے دنیاوی زندگی اور امن کے لئے اخلاق کا یہ حصّہ بھی

لازمی اور ضروری ہے۔ مگر چونکہ یہ آپس کے لین دین کا حصّہ ہے۔ اس لئے اس حکمہ میں انسان انسان کو اجر دے دیتا ہے۔ خدا کے ہاں اس کا خاص اجر نہیں ملتا بہیں دُنیا میں آدمی کا اپنا بھائی ہی اس کا بدلہ اتار دیتا ہے ۔

اخلاق قسم ثانی

یہ اعلیٰ اخلاق ہوتے ہیں۔ ان میں طبعی تقاضے صرف عقل کے ماتحت ہی نہیں ہوتے ۔ بلکہ وہ عقل خود دین کے ماتحت بھی ہوتی ہے۔ ایسے اخلاق دین کی بنیاد نہیں۔ بلکہ خود دین ہی ہوتے ہیں۔ ان کے اظہار سے مومن کی یہ نیت ہرگز نہیں ہوتی۔ کہ بنی نوع انسان کے ساتھ میں اس لئے اخلاقِ فاضلہ برتوں کہ وہ لوگ وقت پر میرے کام آئیں ۔ بلکہ وہ اپنے ان اخلاق کو اس لئے استعمال کرتا ہے کہ اس کا خدا اس سے راضی ہو۔ وہ مخلوقات سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتا۔ اور یہی وہ اخلاق ہوتے ہیں جن کا اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے ۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (دہر: ۱۰)

یعنی اے ہمارے ہم جنس حاجت مندو ہم تم کو محض خدا کی رضا کے لئے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ۔ کہ تم ہم کو کسی قسم کا بدلہ دو۔ یا شکر کا ایک کلمہ تک زبان پر لاؤ ۔ ان اخلاق کا اجر خدا کی طرف سے انسان کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملتا ہے۔ انسان ان اخلاق کا اجر نہیں دے سکتا۔ یہ صرف خدا ہی کا کام ہے ۔ کہ ان کے عوض وہ بندے کو نیک اجر عطا فرمائے۔ پہلے دونوں قسم کے اخلاق کو اس قسم کے اخلاق سے کوئی مناسبت نہیں ۔

اخلاق کی تیسری قسم

یہاں تک ان اخلاق کا ذکر تھا۔ جو انسان انسان کے لئے ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ایک تیسری قسم بھی اخلاق کی ہے۔ جو انسان انسان کے لئے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی ذات کے لئے ظاہر کرتا ہے

قسم دوم کے اخلاق میں گو جزا و اجر مدنظر نہ ہو۔ مگر جن لوگوں سے حسنِ سلوک کیا جاتا ہے وہ پھر بھی محسن کے مشکور ہوتے ہیں اور اپنی طرف سے بدلہ یا دعا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس قسم سوم کے اخلاق دکھلانے والا مومن کسی دوسرے انسان پہ اپنا نیک خلق ظاہر نہیں کرتا۔ نہ کسی مخلوق کا اس کے اور خدا کے درمیان قدم آتا ہے بلکہ یہ اخلاق براہِ راست ذاتِ باری کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً خدائی ابتلاؤں اور آزمائشوں پہ صبر، الٰہی انعامات پر شکر اور عبادت، خُدا کے دین کے لئے استقامت اور استقلال، مالک کے عطا کردہ رزق پہ قناعت، خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق قربانیاں، الٰہی جلال کے اظہار کے لئے غیرت اور خود اللہ تعالیٰ سے محبت اور عشق کا تعلق وغیرہ۔ غرض یہ وہ اخلاق ہیں۔ جو مذہب کا مرکزی نقطہ ہیں۔ اور ان کا اجر خود اللہ تعالیٰ آپ ہے۔ اخلاق کی اس قسم میں طبعی تقاضے عقل کے ماتحت اور عقل دین کے ماتحت اور دین عشق و محبت کے جذبہ کے ماتحت کام کرتے ہیں۔

(روزنامہ الفضل ۲ رمئی ۱۹۴۵ء)

توبہ سے زیادہ سخت اور کونسی سزا ہے

عیسائی اور آریہ صاحبان یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے مطابق کوئی گناہ معاف نہیں ہوسکتا اور ضروری ہے کہ انسان کو اس کے ہر گناہ کی سزا ملے۔ اس لئے عیسائیوں کو کفارہ کی پناہ لینی پڑی۔ اور انہوں نے اپنے گناہ خدا کے فرزند پر لاد دیئے۔ اور پھر وہ جہنم میں چند روز کے لئے داخل ہوا تاکہ ان کے گناہوں کا کفارہ ٹھہرے۔ دوسری طرف آریہ صاحبان کو تناسخ ایجاد کرنا پڑا تاکہ لوگ اپنے گناہوں کی سزاؤں میں ہر قسم کی جونوں میں چکر کھاتے اور تکلیفیں اٹھاتے پھریں۔ برخلاف اس کے ایک مسلمان کہتا ہے کہ میرا خدا تعالیٰ میرے گناہ معاف کرتا ہے وہ سزا بھی دیتا ہے مگر اس میں عفو کی بھی طاقت ہے۔ اور ایک اعلیٰ طریقہ معافی کا اس نے یہ بھی مقرر کیا ہے کہ انسان اس گناہ سے سچی توبہ کرے لیکن اس توبہ کے لفظ کو دوسرے مذاہب والوں نے ایک تمسخر بنا رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ پہلے تو گناہ کر لیا۔ پھر منہ سے توبہ توبہ کہہ دیا۔ چلو گناہ معاف ہوگیا۔ گناہ تو تبھی معاف ہوسکتا ہے جب اس کی سزا انسان کو ملے۔ اور جو نافرمانی اس نے کی تھی اس کے تلخ معاوضہ کو خود چکھے ورنہ توبہ کا لفظ صرف ایک بہانہ ہے اور طفل تسلی ہے۔ اور ایک دھوکہ ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں پر اور دلیر ہوجاتا ہے۔ وہ مذہب سچا نہیں ہوسکتا جس میں گناہ کی سزا نہ ہو۔ بلکہ صرف توبہ توبہ کہہ دینے سے وہ گناہ معاف ہوجائے۔

دراصل یہ سزا اعتراض توبہ کے معنی نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے اور نیز اس خیال

سے پیدا ہوا ہے کہ اسلام گناہ کو بے سزا کے چھوڑ دیتا ہے۔ اگر توبہ کے حقیقی معنی اور گناہ کے سزا کی نوعیت معترض پر واضح ہو جائے تو امید ہے کہ پھر ایسے اعتراض کی گنجائش نہ رہے
میں اس مسئلہ کو دلائل سے نہیں بلکہ مثال سے واضح کرتا ہوں کیونکہ عمل کو انسان دلائل کی نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

مثال نمبر ۱

مسٹر متلاشی مسیح نے اپنے دفتر کی رقم میں سے کچھ رقم کا غبن کیا۔ کیونکہ پہلی بار ایسا کیا تھا۔ ان کے ضمیر نے ملامت کی اور وہ اپنے پادری صاحب کے پاس پہنچے اور کہا کہ مجھ سے ایک بڑا کام ہو گیا ہے آپ مجھے مشورہ دیں کہ کیا کروں۔ انہوں نے کہا کہ تم سچے دل سے خداوند مسیح پر ایمان رکھو وہ تمہارے سب بوجھ اٹھالے گا۔ اس پر متلاشی مسیح صاحب نے اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہا اور سارے گناہ کا بوجھ ان کے دل پر سے دور ہو گیا۔ اور ان کی تسلی ہو گئی کہ جب میرے گناہ کا اٹھانے والا موجود ہے پھر مجھے کیا فکر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے بداعمال میں اور دلیر ہو گئے اور دل کھول کر ہر ناجائز آمدنی پر ہاتھ مارنے لگے اور اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ ایک عیسائی کے لئے کوئی گناہ گناہ ہی نہیں۔ اور اس طرح کفارہ ان کی اصلاح کرنے میں فیل ہوا ؟

مثال نمبر ۲

ایک مہاشہ نے لعض بداطوار دوستوں کے اثر کی وجہ سے ایک نامناسب مجلس میں شمولیت اختیار کی اور حالات کا اثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہی وہ بھی بدکاری میں ملوث ہو گئے۔ مگر چونکہ ایک بڑا گناہ کیا تھا ان کو صبر نہ آیا اور سیدھے سوامی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ مجھ سے ایک بڑا پاپ سرزد ہو گیا ہے۔ مجھے کوئی صلاح دیں۔

سوامی جی نے تفاصیل سُن کر کہا کہ شاستروں میں لکھا ہے جو عورت ایسا پاپ کرے وہ دوسرے جنم میں گائے پیدا ہوگی۔ مرد کے بارے میں صراحت نہیں شاید وہ سانڈ پیدا ہو۔ یا ایسا ہی کوئی اور جنم لیتا ہو۔ مہاشہ جی نے کہا کہ آئندہ جنم کی بابت میں نہیں پوچھتا۔ اب کیا کروں اس پر سوامی صاحب سر ہلا کر بولے کہ اب تو جو کر چکے سو کر چکے وہ تو معاف ہوتا نہیں اور آئندہ جو جنم لو گے وہ رکتا نہیں۔ یہ سُن کر بیچارے واپس آگئے اور اپنے دوستوں کے سامنے یہ حال سُنایا تو وہ کہنے لگے کہ بھئی دہ جنم تو جب آئے گا سو آئے گا۔ تم اب کیوں ایسے پرہیز گار بنتے ہو۔ اب تو تم کو سانڈ بننا ہی ہے۔ وہ سزا تو ٹل نہیں سکتی۔ اس دُنیا کے مزے کیوں چھوڑتے ہو۔ ایک دفعہ بیل بنے یا سانڈ جنم لیا سب برابر ہے۔

چنانچہ مہاشہ جی نے سمجھ لیا کہ جو ہو گیا اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اور آئندہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر بیل یا سانڈ بھی بن گئے تو بھی کیا نقصان ہے۔ اس لئے وہ بھی بے پرواہ ہو کر دنیا کی بداعمالیوں میں غرق ہو گئے اور آریہ مت ان کو پاک نہ کر سکا۔ اور نہ آئندہ ان کی اصلاح ہوئی۔

مثال نمبر ۳

اب شیخ عبد التواب کا حال سُنیئے۔ یہ صاحب ایک متمول باپ کے وارث ہوئے۔ لیکن تعلیم دینی اچھی تھی اور بزرگوں کی صحبت کا فیض حاصل کر چکے تھے۔ باپ کی دولت ملتے ہی حسب معمول آوارہ گرد ان کے گرد بھی جمع ہونے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ بُری صحبت اور آزادی کی وجہ سے یہ بھی پھسل پڑے۔ چنانچہ ایک دن یہاں تک نوبت پہنچی کہ شراب نوشی تک کا ارتکاب کر لیا۔ فطرت نیک تھی اور دین کا علم دل میں محفوظ تھا۔ نشہ اترنے کے بعد تین دن سرگرداں رہے۔ اپنی حالت اور اپنے خاندان کی حالت اور اپنے گناہ اور اپنی تعلیم اور ان باتوں کے نتائج پر غور کیا تو نہایت پریشان ہوئے اور

سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ یہ راستہ تو ہلاکت کا ہے اور چند دن میں مال صحت، عزت اور خاندان سب کی تباہی ہے۔ اور اس سے زیادہ خدا کی ناراضی۔ اس وقت ان کے استاد صوفی حقیقت الدین کی تعلیم ان کے کام آئی اور انہوں نے اُٹھ کر پہلے غسل کیا۔ پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے نفل نماز میں کھڑے ہو گئے۔ اور نہایت گریہ وزاری اور عجز وانکسار سے اس نماز کے ہر رکن کو ادا کیا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے مسلسل اشک رواں تھے۔ قیام میں نہایت عاجزی سے یہ دعا کی کہ یا اللہ میں نے بڑا گناہ کیا ہے۔ تیرے حکم کی مخالفت کی اور اپنے نفس پر سخت ظلم کیا۔ میں اپنی نالائقی کا اقرار کرتا ہوں۔ میں سخت نادم اور شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف فرما اور درگزر فرما۔ میں نالائق کمزور اور بے سمجھ بندہ ہوں میری چشم پوشی اور پردہ پوشی فرما۔ اس در کے سوا اب کہاں معافی مانگنے جاؤں کہ تیرے سوا کوئی بخشنے والا نہیں۔ غرض بڑے سوز و گداز سے وہ اپنے گناہ کا اقرار کرتے اور اپنے خدا تعالےٰ سے معافی مانگتے رہے۔ رکوع میں گئے تو اس سے بھی زیادہ رقت تھی اور بار بار عاجزانہ کہتے تھے کہ اے میرے خداوند جہاں تک میری طاقت اور سمجھ ہے آئندہ ساری عمر کبھی ایسا فعل پھر نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں کروں گا اور پکا عہد کرتا ہوں کہ اگر انسان کی نسل اور مسلمان کا فرزند ہوں تو اب ہرگز ہرگز ایسی بات کے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔ اے میرے رب میں سچے دل سے تیری ہی قسم کھا کر اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے پھر ایسی غلطی سرزد نہ ہوگی۔ مجھے معاف کر کہ تو غفور رحیم ہے اور مجھے طاقت دے کہ میں اپنے توبہ کے عہد پر قائم رہوں کہ تیرے فضل اور رحم کے سوا میں کمزور ہوں۔ سجدہ میں گئے تو سوز و گداز اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور سر نیاز کو زمین پر رکھتے ہی عبدالتواب کی چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا کہ اے میرے اللہ جو کچھ سرزد ہو چکا اسے معاف فرما اور آئندہ کے لئے توفیق دے کہ پھر ایسی بات میں مبتلا نہ ہوں اور میرے عہد کو نبھانے میں میری مدد کر جو غلطی کر چکا ہوں وہ پھر نہ

کروں اور اس کی جو سزا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ۔ کیونکہ تو معاف کرنے پر بھی ویسا ہی قادر ہے۔ جیسا سزا دینے پر مجھے اپنے اعمال نامے سے اس بُرے عمل کے دھونے کے لئے توفیق دے۔ تا میں اس کے مقابل پر کثرت سے نیک عمل کروں اور تیری مخلوقات کو بھی جو اسی طرح کی گندگیوں میں پڑی ہے ایسے گناہوں سے نکالوں اور ان کی زندگی کو درست بناؤں۔ غرض شیخ عبدالتواب کی وہ نماز توبہ کیا تھی وہ ان تمام سزاؤں سے بہت سخت سزا تھی جو کوئی گورنمنٹ یا پولیس یا برادری یا حاکم کسی مجرم کو دے سکتے ہیں بلکہ ان سزاؤں سے تو ملزم بچنا چاہتا ہے اور اگر دی جائیں تو اس کے اندر سزا کے بعد ایک جذبہ کینہ اور غصہ کا اس کے برخلاف پیدا ہوتا ہے اور ہرگز آئندہ کی اصلاح نہیں ہوتی۔ ۳۰ سال کی قید با مشقت اور ہزار بید پشت پر وہ ندامت اور دل کی نرمی پیدا نہیں کر سکتے جتنا انسان کے اپنے نفس کی سچی توبہ۔ اور تمام خلائق کی لعنت و ملامت وہ اصلاح انسان کے اندرونہ کے نہیں کر سکتی جتنا تائب ضمیر کی روحانی گدازگی۔ اور ہزار آدمیوں کی ضمانتیں کسی انسان کو آئندہ کے لئے اس جرم سے نہیں روک سکتیں چنانچہ سچی توبہ کے وقت کا دلی اقرار۔ جو وہ اپنے خدا کے آگے سر جھکا کر کرتا ہے کہ اب آئندہ مجھ سے ایسا فعل سرزد نہیں ہوگا۔ اور کوئی بہت سے سخت سزا کسی گنہگار انسان کو آئندہ کے لئے نیکوکار نہیں بنا سکتی جتنا ایک سچے توبہ کرنے والے کا عہد کہ میں ہمیشہ اس گناہ کی تلافی کے لئے اس کے بالمقابل کی نیکیاں نہ صرف خود کروں گا بلکہ سوسائٹی میں سے اس بدی کی جڑ اکھیڑ کر نیکی کے پودوں کی نشوونما کروں گا۔

چنانچہ عبدالتواب نے ایسا ہی کیا اس کے تین دن جو توبہ استغفار میں گزرے وہ ایک جہنم کی سزا کے دن تھے ضمیر اس کو پھٹکار رہا تھا اس کی عقل اس کو شرمندہ کر رہی تھی اس کا ذہن اس کو ملامت کر رہا تھا حتیٰ کہ آخر اس نے سچی توبہ کا فیصلہ کر لیا وہ اس سے زیادہ رویا جتنا کسی عدالت سے سزا پانے پر روتا ہے۔ اس کا عہد ہزار رجسٹریوں سے

زیادہ پختہ عہد تھا اور اس کی آئندہ زندگی ایسی پاک ہوگئی جیسا بھٹی سے نکل کر سونا کندن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ نہ صرف اس نے اس گناہ سے بلکہ ہر گناہ سے توبہ کی اور آئندہ ہمیشہ وہ لوگوں کی اصلاح میں مصروف رہا۔ بیسیوں شرابیوں سے اس نے شراب چھڑائی اور سینکڑوں بداعمال اس کی صحبت میں بیٹھ کر نیک کردار بن گئے ۔

گناہوں کا حقیقی علاج توبہ ہی ہے

اب اے پادری اور مہاشہ صاحبان سچ بتائیے کہ گناہ کی سزا عبدالتواب کو ملی یا ان دوسرے دونوں صاحبوں کو جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے پھر یہ اعتراض کہ توبہ ایک بہانہ ہے اور بے سزا کے گناہ کا معاف ہونا ایک بیہودگی ہے کہاں تک درست ہے ؟ بات یہ ہے کہ آپ کو خود کبھی سچی توبہ کی چاشنی نصیب نہیں ہوتی۔ میرے دوستو فرق صرف یہ ہے کہ آپ کی تجویز کردہ سزا جسمانی اور ہلکی ہے اور توبہ کی سزا روحانی اور شدید ہے آپ کی سزا کے بعد۔ انسان پھر گناہ کرتا ہے بار بار کرتا ہے بلکہ دلیر اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے اور سچی توبہ کی سزا بھگتنے کے بعد نہ صرف وہ خاص گناہ نہیں کرتا بلکہ دوسرے گناہوں کو بھی ترک کر دیتا ہے اور نیکی میں ترقی کرتا ہے۔ خدا آپ کو بھی سچی توبہ نصیب کرے۔

اُف وہ ندامت! وہ ذلت کا احساس! وہ دل پگھل کر نکلنے والے آنسو! وہ سوزوگداز! وہ کلیجہ بھون کر باہر نکلنے والی افسوس کی آہیں! اے آریہ مت والو! تم نے یہ خوفناک سزائیں دیکھی ہی نہیں۔ وہ اپنے آقا کے سامنے ہاتھ جوڑنا وہ اس کے پیروں پر سر رکھ کر گڑگڑا کر معافیاں مانگنا۔ وہ قسمیں کھا کھا کر آئندہ اس کی نافرمانی سے بچنے کا عہد کرنا وہ ساری عمر تلافی مافات کے طور پر نیک اعمال کرنے کی کوشش میں لگے رہنا۔ اے پادری صاحبان آپ نے ان باتوں کی چاشنی چکھی ہی نہیں !!

پھر ایسی سچی توبہ کے بعد ضمیر پر سے بوجھ اُتر کر اس کا ہلکا ہو جانا اور اپنے خدا

میں اپنی پناہ اور ابدی راحت محسوس کرنا اور اُس رب العالمین توّاب الرحیم کا بھی توبہ کو قبول کرکے اُس عاجز بندے کو قبولیت کا نشان دینا اور رجوع برحمت کرکے اس کی زندگی کو نیکی اور فضل سے معمور کر دینا اور آئندہ گناہ سے بچنے کی طاقت بخشنا اور ایسے تائب بندے کے ساتھ پہلے سے زیادہ محبت اور کرم اور رحم سے پیش آنا اُس کی پردہ پوشی کرنا اور اُس کے گناہ کی سزا سے اُسے محفوظ رکھنا اور اسے روحانیت کے میدان میں بڑھنے کی قوت عطا فرمانا۔ اے تائب احمدی(   ) تمہارے سوا کوئی ان رازوں سے واقف ہی نہیں ۔

(روزنامہ الفضل ۲۰ر جولائی ۱۹۶۲ء

مرزا غالب اور ان کے طرفدار

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کے مجموعۂ کلام بخارِ دل میں ایک شگفتہ تحریر "مرزا غالب اور ان کے طرف دار کے عنوان سے شائع شدہ ہے۔ عنوان کے نیچے ایک غزل (غالب کے رنگ میں) لکھا ہے۔ مضمون کا متن یہ ہے

مرزا غالب مشکل گو شاعر بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ لیکن جب جام دو آتشہ کے نشہ میں شعر کہتے تھے تو کبھی کبھی کوئی لفظ یا فقرہ شعر میں محذوف بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اگرچہ کھینچ تان کر اس شعر کے معنے تو نکل سکتے تھے مگر اس کھینچا تانی کے لئے بھی ماڈرن دماغ ہی چاہیئے تھا۔ شاعر پرستی بھی ایک فیشن ہے۔ اس موجودہ زمانہ میں جب غالب بے حد ہردلعزیز ہو گئے ہیں تو ہر شخص خواہ لائق ہو یا نالائق ان کی تائید کرنے لگا ہے۔

بے معنی اشعار کے معنی نکلنے لگے ہیں۔ اور ٹٹ پونجیے بھی غالب دان بن گئے ہیں۔ جو باتیں مومن، ذوق اور دیگر آئمہ الشعراء کی سمجھ میں نہ آئی تھیں وہ آج کل کے سینما بین نوجوانوں کو نظر آنے لگی ہیں۔ اس زمانہ کے ایک مشاعرے میں ایک بڑے قادر الکلام شاعر نے خود مرزا غالب کو مجلس میں مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ

کلامِ میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور غالب آپ بھی اپنے اس نقص کے معترف تھے کہ میرے بعض اشعار بے معنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود ان کا ہی کلام ہے کہ ؎

نہ سہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی

میرا یہ مطلب نہیں کہ غالب معمولی شاعر تھے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو وہ نہایت اعلیٰ اور فلسفیانہ اشعار کہتے تھے مگر بعض اشعار ان کے مشکل اور دقیق اور بعض واقعی بے معنی ہوا کرتے تھے ۔ اور سب اہل الرائے ادیبوں اور شاعروں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ مگر آج کل ایک فرقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ان کو ناواجب طور پر آسمان پر چڑھا رہا ہے۔ انہی میں سے ہمارے ایک دوست محمد جی صاحب بھی تھے ۔ وہ کہا کرتے تھے ۔ واہ غالب ۔ غالب ۔ غالب ۔ تیرا کلام کیسا عجیب ہے۔ میرے نزدیک تیرا ایک شعر بھی بے معنی نہیں ہے۔ ایک بندش بھی بغیر خوبی کے نہیں ہے۔ وہ لوگ بدتمیز بے علم اور احمق ہیں جو تیرے اشعار کو مشکل یا بے معنی کہتے ہیں مجھ سے پوچھیں تو میں ان کو تیرے اشعار آب دار کی تفسیر کر کے بتاؤں ۔

جولائی ۱۹۰۶ء کا زمانہ تھا کہ ایک دن جب میں ایسے فقرے سنتے سنتے تھک گیا تو ان سے عرض کیا کہ بھائی محمد جی صاحب ہمارے پاس بھی آپ کے مکرم محترم غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہے ۔ جب جانیں تم اس کے صحیح معنے کر دو۔ ورنہ شیخی بگھارنا کوئی خوبی نہیں ۔ کہنے لگے ابھی لائیے ابھی ۔ میں نے عرض کیا کل پیش کروں گا ۔ چنانچہ رات کو ہماری پارٹی نے غالب بن کر ان کے طرز کی ایک غزل بنائی ۔ اس سازش میں تین چار آدمی شریک تھے ۔ دوسرے دن جب محمد جی صاحب تشریف لائے تو ہم نے وہ غزل پیش کی ۔ پہلے تو دیر تک اُسے پڑھتے رہے ۔ پھر فرمانے لگے ۔ بے شک ہے تو یہ غالب ہی کی پھر جھومنے لگے واہ کیا کلام ہے ۔ کیا باریک نکات ہیں ۔ کیا الفاظ کی بندش ہے ۔ کیا گہرائیاں ہیں ۔ کیا معانی ہیں ۔ بس قربان ہونے کو جی چاہتا ہے ۔

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ایک شعر کی باریکیاں اور معنے بیان کرنے شروع کئے جب آخری شعر کی تفسیر سے فارغ ہوئے تو حاضرین نے ایک قہقہہ لگایا ۔ پھر تالیاں پیٹیں ۔ اور

آخر میں تین دفعہ ہپ ہپ ہرے کا نعرہ بلند کیا۔ محمد جی صاحب بیچارے پریشان سے ہو گئے۔ کہنے لگے کیا بات ہے۔ آخر جب اصل بات معلوم ہوئی تو شرمندگی کے مارے ان کی یہ حالت ہوگئی کہ جیسے گھڑوں پانی سر پہ پڑ گیا ہو۔ بار بار پوچھتے تھے کہ سچ بتاؤ۔ واقعی یہ غزل غالب کی نہیں ہے۔ کہیں مجھے بنا تو نہیں رہے۔ مگر جب انہیں یقین آگیا تو پھر ایسے فغرد ہوئے کہ مدتوں تک ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب بھی ملے تو اکھڑے اکھڑے۔ اور اس واقعہ کے بعد تو انہوں نے غالب کا نام ہی لینے کی گویا قسم کھالی۔

ناظرین کے تفنن طبع کے لئے وہ غزل درج ذیل ہے۔

(واضح ہو کہ اس واقعہ سے غالب مرحوم کے کمال اور ان کی شاعری کی سبکی یا توہین ہرگز مقصود نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے بعض غالب شناسوں کی حالت کا دکھانا مقصود ہے)

غزل کے چند اشعار :-

سوزشِ دل تو کہاں اس حال میں

جان و تن ہیں سوزنِ جنجال میں

چشمِ بینا چشمۂ منقار ہے

دِقّتِ افعال ہے اقوال میں

نُور کا عالم پری ہو یا کہ حوُر

ہے صفائی سیم تن کی کھال میں

ہم نفس کہنا غلط ہے گاؤ میش

روغنِ گل بیضۂ گھڑیال میں

غالبؔ تیرہ دروں بیروں سیاہ

زلفِ مُشکیں پنجۂ خلخال میں

(ابتکارِ دل)

دُعا کی برکات ۔ ذاتی تجربات

اپنے فن یعنی شفائے امراض کی لائن میں تو مَیں نے اس قدر عجائبات خدا تعالیٰ کے فضلوں اور دُعا کی قبولیتوں کے دیکھے ہیں کہ کوئی شمار و حساب نہیں۔ مثلاً ڈاکٹروں کی دلچسپی کے لئے لکھتا ہوں کہ ایک دفعہ حضرت مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کی آنکھیں مَیں نے بنائیں اور دونوں ایک ہی دفعہ چوتھے دن پٹی کھولنے پر دیکھا تو دونوں آنکھوں میں سخت Plastic Iritis یعنی اندرونی پردوں میں سوزش اور ورم تھا بلکہ دونوں Ant Chambers اس طرح بھرے ہوئے تھے۔ جیسے پیپ سے بھرے ہوئے ہیں۔ مجھے مرحوم کے ساتھ بہت انس تھا اس لئے بہت بے قرار ہوا۔ حضرت صاحب کے گوش گزار کر کے دُعا کے لئے عرض کیا۔ اور حضرت اماں جان سے بھی۔ نیز خود بھی بہت دُعا کی۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے چند دنوں میں ہی بلکہ ایک ہفتہ کے اندر دونوں آنکھیں بالکل صاف ہوگئیں۔ اور جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے پیچھے بھی اس مرض کے کوئی نشان یا آثار باقی نہ رہے۔ اور وہ دونوں آنکھوں سے بالکل چنگے بھلے ہوگئے۔ ورنہ اس طرح سخت قسم کے Double Plastic Iritis کا جو اتنے جلدی آپریشن کے بعد پیدا ہوا ہو۔ اس طرح کامل طور پر صاف ہوجانا کہ گویا کہ کوئی بیماری ہی نہیں ہوئی۔ اور دونوں آنکھوں کا اس طرح بچ جانا میرے علم میں کبھی نہیں آیا۔ بلکہ لوگوں کو اندھا ہونے ہی دیکھا ہے۔ غرض ناامید بیماروں کی شفا کے نمونے بیان کرنے لگوں۔ تو یہ مضمون الف لیلہ ہی بن جائے۔

اور سنو ۱۹۰۵ء میں مَیں ملازم ہوا اور ملازم ہوتے ہی تین ماہ کے اندر اتنا مقروض

ہوگیا۔ کہ اس سے مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی اور اتنی پریشانی بڑھی کہ آخر میں نے دُعا کی کہ یا اللہ مجھے کبھی قرض کی بلا میں نہ پھنسا ئیو اور پھر اسی وقت یقین آگیا کہ اب یہ منظور ہوگئی۔

اب تیس سال کے بعد میں اس بات کے اظہار میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ میں یہ بیان کروں کہ پھر کبھی مجھ پر کسی قسم کا قرضہ نہیں چڑھا اور میں ان تیس سال کی ہر رات قرضے کی طرف سے اس آرام اور بے فکری کی نیند سویا ہوں کہ میرا دل ہی اس احسان الٰہی کی قدر کر سکتا ہے۔ جب میں لوگوں کو قرضہ کی تکالیف اور وعدوں پر ان کی ادائیگی کے لئے اضطراب کو دیکھتا ہوں تو ہزار نعمتوں کی ایک نعمت اسے پاتا ہوں۔ اور ہمیشہ دیکھتا ہوں کہ اگر میں کسی دن مر جاؤں تو انشاء اللہ کسی کا مقروض نہیں مروں گا اور اگر دست گرداں شائد کسی کا کچھ روپیہ دینا بھی ہو تو وہ اس کے فضل سے گھر میں موجود ہوگا۔ اور آئندہ کی بات معلوم نہیں۔ اور خدا کا علم سب علموں پر غالب ہے اور اس کا امر اس کے علم پر غالب ہے۔ اور وہ خود اپنے امر پر غالب ہے۔ بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ اس بے فکری کی نیند پر مجھے یاد آیا کہ ایک اور وجہ بھی بے فکری کی نیند کی ہے۔ جو حضرت خلیفۃ المسیح نے ایک دفعہ اپنے لیکچر میں بیان کی تھی۔ وہ یہ کہ جب انسان سونے کے لیے لیٹے تو اس وقت تمام لوگوں کے قصور معاف کر کے سوئے۔ میں اس وقت سے اس پر عامل ہوں اور دل ہی میں نہیں بلکہ زبان سے ایسے الفاظ ادا کر کے سوتا ہوں کہ میرے ذمہ کسی کا قصور نہیں۔ خداوند تو گواہ رہیو (میں نے جو قصور کسی کا میری ذات کے متعلق تھا وہ معاف کر دیا۔ سو اس دن سے عجیب راحت سوتے وقت اور عجیب معافیاں اپنے گناہوں اور غفلتوں کی اس رب العزت کی طرف سے پاتا ہوں۔

بعض چھوٹے چھوٹے واقعات قبولیتِ دُعا کے بڑے مزیدار ہیں۔ مثلاً ایک لمبا سفر رات کا پیش آگیا۔ میں دائم المریض، ساری رات کا سفر اور جاڑے کا موسم۔ برتھ ریزرو کرانے کا موقع نہیں ملا۔ دُعا کی ٹکٹ لیا۔ سوار ہوئے، تمام برتھ ریزروشدہ پائے۔ آدھ گھنٹہ پہلے

سب مسافر اوپر نیچے اپنے برتھوں پر دراز اور ہم ہیں کہ ڈبہ کے دروازے میں اس کے فضل کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص پانچ منٹ ٹرین کی روانگی سے پہلے آیا اور جبریہ ایک مسافر کو اوپر کے برتھ سے اُتار کر لے گیا کہ کل چلے جانا آج فلاں کام پڑا ضروری رہ گیا ہے۔ اب وہ برتھ اوپر کا تھا اور مجھے اوپر تکلیف ہوتی ہے اس لئے میں نیچے کا برتھ چاہتا تھا۔ اتنے میں ایک انگریز نیچے کے برتھ سے اٹھا اور مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگا مجھے امید ہے آپ کو اعتراض نہ ہوگا اگر میں اس اُوپر والے خالی برتھ پر سو جاؤں مجھے یہ نیچے کی جگہ پسند نہیں (شاید اس لئے کہ اسکے دونوں طرف "نیٹو" یعنی کالا لوگ سو رہا تھا) آپ میری جگہ اس درمیانی برتھ پر آرام کریں میں بہت مشکور ہوں گا۔ میں نے کہا اچھا اور میں اپنا بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں۔ اس ذرا سے واقعہ نے میرا دل اس میرے اپنے، میرے رفیق، میرے رحیم و کریم' اور میرے "پرسنل خدا" کے احسان کے شکر میں بالکل پگھلا دیا۔

ایک دفعہ میرا تبادلہ شملہ کا ہو گیا۔ وہاں ایک ایسے کرنل (کرنل جوڈوائن) سول سرجن تھے۔ جن کی سخت زبانی اور سخت گیری کی شہرت اس قدر تھی کہ میں نے روانہ ہوتے وقت بہت دُعا کی کہ خدایا تو مجھے ہر قسم کی سختی سے بچائیو۔ غرض میں شملہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ بیچارے کل سے بیمار ہیں اور واکر Walker ہاسپٹل میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان کو ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ "ہل ڈائریا" Hill Diarrhea کا دیا گیا ہے اور وہ لمبی چھٹی پر ولایت جا رہے ہیں۔ غرض دس روز بعد وہ واکر ہسپتال سے بالا بالا ہی ولایت ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ نہ پھر ہندوستان میں آئے نہ میں نے ان کی شکل کبھی دیکھی۔ اور خدا تعالیٰ نے ان کی جگہ ایک نیک نہاد افسر کرنل ہیلیلے کو جو اتفاقاً شملہ پر رخصت لے کر آئے ہوئے تھے وہیں لگوا دیا۔ اور وہ میرے بڑے محسن ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ جب میں تبدیل ہو کر لائلپور جانے لگا تو انہوں نے اپنی لائبریری میں سے مجھے کئی قیمتی کتابیں بطور تحفہ دیں۔

اب اس سے بڑھ کر لو! ایک سال اس جگہ جہاں میں متعین تھا ایک سخت عالمگیر قسم کی مصیبت آئی۔ اس میں خدا تعالیٰ کی حکمت سے ایسے اسباب امتحان کے پیدا ہو گئے کہ سب سے زیادہ میرا مالی نقصان ہوا اور صحت کو سخت دھکا لگا۔ اور کام نے مجھے توڑ دیا۔ لیکن بعض لوگوں نے میری باتوں کو بُرے رنگ میں مشہور کیا اور میری بعض باتوں کی رپورٹ ملاء القوم میں سے ایک بڑے آدمی کی معرفت نامناسب کرائی گئی وہ میرے مخالفین کی پشت پر تھا۔ اس نے بعض اختیارات میرے سلب کر لئے اور اپنے لوگوں کے سپرد کر دیئے جو ایک شریف آدمی کی توہین کے طریقے تھے۔ وہ سب اختیار کئے گئے۔ میں ڈر کے مارے دُعا بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ میں نے اس مصیبت میں امتحان کا رنگ محسوس کر لیا تھا۔ مگر بہر حال گو لفظی سوالی نہ تھا صورت سوالی ضرور تھا۔ آخر بڑے غوغا کے بعد یوں ہوا کہ ایک شخص کو خدا تعالیٰ نے میری طرف سے خود بخود میرا وکیل بنا کر کھڑا کر دیا اور اس نے بغیر میرے علم اور اطلاع کے ایک ایسا ایڈریس حاکم وقت کے سامنے پیش کیا کہ حاکم نے میرا نام لے کر میرے کام کی تعریف اس ایڈریس کے جواب میں کی پھر شام کو ایک دوسرے حاکم نے مجھے کہا کہ معاملہ ہم پر کھل گیا ہے۔ کہ یہ لوگ پشت کی طرف سے تم پر چھری چلا رہے تھے۔ سرکار نے مجھے نقصانات کا کچھ معاوضہ بھی دیا اور خطاب بھی اور میرے خدا نے بہت بہت، بہت زیادہ مجھ پر انعام فرمایا۔ اور ان لوگوں کی پارٹی ٹوٹ گئی اور وہ منتشر کر دیئے گئے۔ میں قادیان میں رخصت پر آیا پھر میں اپنی بیوی کی بیماری کے علاج کے لئے لاہور گیا۔ جس روز ہم نے قادیان واپس آنا تھا اس سے ایک دو روز پہلے سارا شہر بلکہ سارا صوبہ زلزلہ کی زد میں آگیا۔ وہ بڑا آدمی جو جوان اور ہٹا کٹا تندرست تھا اور جس کی طاقت پر ان لوگوں نے ریشہ دوانیاں کی تھیں اور میری ذلت کے درپے ہوئے تھے۔ عین اسی روز اس نے ایک بڑی بھاری دعوت کی اور جب وہ ختم ہوئی تو آدھ گھنٹہ بعد بے چارا دم کے دم میں رخصت ہوا۔ سو خدا مجھے قادیان لے گیا اور میرا سالانہ جلسہ جو میں نے تیس سال سے (الا ماشاء اللہ) کبھی ناغہ نہیں کیا تھا اس سے جبر یہ مجھے جدا کیا کہ چل موقعہ پر چل میں تجھے کیا بات دکھاتا ہوں۔

سو کیا عظمت اور شفقت ہے اس خدا کی جو اپنے ذلیل بندوں کا ایسا خیال رکھتا ہے جیسا ایک ماں بھی نہیں رکھتی۔ اور دکھاتا ہے میں یوں بھی کیا کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھے ایک نہایت عمدہ جگہ پر میری مرضی دریافت کر کے بھیج دیا اور وہاں میرے کاموں کے بوجھ ہلکے کر دیئے اور تنخواہ بہت بڑھا دی۔ اور کیا بیان کروں کیا کیا احسانات کئے جن میں سے بعض ناقابلِ بیان ہیں اور ایک یہ بھی کہ اس متوفی کی بیوہ اور بچوں کے علاج معالجہ کی مدت دراز تک مفت اور خاص توجہ اور شفقت کے ساتھ توفیق دی کہ خود مجھ پر یہ ثابت کر دے کہ میرے دل میں اس سے کسی قسم کی عداوت نہ تھی بلکہ وہ الٰہی تقدیر تھی جو براہِ راست نازل ہوئی تھی۔

غالباً ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ میرا تبادلہ گورداسپور سے گوجرہ کا ہو گیا۔ میں سیدھا اپنی موٹر سائیکل اور سائڈ کار بذریعہ نہر کی پٹڑی قادیان ہوتا ہوا آگے چلا۔ ایک کرایہ کا مستری موٹر سائیکل کو چلا رہا تھا اور میں سائڈ کار میں بیٹھا تھا۔ جب ہم دونوں قادیان سے اٹھارہ بیس میل نکل آئے تو وہ موٹر سائیکل ایک جگہ نہر کے کنارے یکدم ٹوٹ گیا۔ جنڈیالہ ریلوے اسٹیشن وہاں سے کئی میل تھا۔ میں نے مستری کو تو کہا کہ نزدیک کسی گاؤں میں جا کر کوئی گڈا کرایہ پر لے آئے اور خود نہر کے کنارے دُعا میں مصروف ہو گیا۔ خیر ایک دو گھنٹہ میں ایک ٹوٹا پھوٹا گڈا تو آ گیا اور موٹر سائیکل بھی اس پر لاد دی مگر مجھے یہ تشویش کہ اب غروبِ آفتاب کا وقت ہو گیا ہے اور جنڈیالہ پانچ سات میل ہے اور راستہ میں بالکل جنگل ہے۔ نہ مستری قابلِ اعتماد ہے اور نہ گڈے والے سکھ قابلِ اطمینان معلوم ہوتے ہیں۔ اور میری جیب میں کافی نقدی موجود ہے۔ میرے لئے رات کو اتنا چلنا بھی مشکل ہے۔ خدایا تو ہی کوئی انتظام کر۔ ابھی ہم روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ اتنے میں پیچھے سے موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے کہا کہ کوئی انگریز ہو گا جو دورہ یا سفر پر جا رہا ہو گا اتنے میں وہ کار یکدم میرے منہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ حیران رہ گیا جب اندر حضرت صاحب اور چوہدری

ظفراللہ خان صاحب کے چہرے نظر آئے پہلے دھوکہ ہوا کہ یہ یہاں کہاں ! شاید میرا خواب ہے یا وہم۔ مگر جب وہ ہنسے اور بولے تو مجھے یقین آیا کہ فرشتے نہیں بلکہ انسان ہیں۔ پس میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور سیدھا چوہدری صاحب کی اس کار میں لاہور تک آگیا ۔ یہ سب لوگ ہنسی خوشی کی باتیں کر رہے تھے ۔ مگر اس عجیب اور بر وقت آسمانی مدد سے میرا دل شکر کے جذبات سے اتنا لبریز ہوگیا تھا کہ سارے راستے میں بڑی مصیبت سے اپنے تئیں ضبط کرتا آیا۔ ورنہ روتے روتے شاید میری چیخیں نکل جاتیں ۔

لوگ ان باتوں کو اتفاقی سمجھیں مگر جس پر گزری ہوں اُس کے دل سے پوچھنا چاہیئے کہ آقا کے احسان غلاموں پر کس طرح ہوتے ہیں اور تکلیفوں سے وہ ان کو کس طرح نجات دیتا ہے اور کس کس رنگ میں اور یہ لطف ہمیشہ انہی کو آتا ہے جو کسی واقعہ یا حادثے کو دنیا میں اتفاقی نہیں سمجھتے بلکہ ان کا ایمان ہوتا ہے۔ کہ بلا مشیت اور ارادہ الٰہی کے کوئی بات بھی دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی ہے۔ واقعات کو اتفاقی کہہ دینا اور If happened by chance کا فقرہ منہ پر لانا صرف دہریوں کا کام ہے یا ان لوگوں کا جو بہت سی باتوں کو تصرف الٰہی سے باہر یقین کرتے ہیں۔ یہی " اتفاق " اور Chance کا خیال بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ پھر ان کا دل کہتا ہے کہ جب سو میں سے پچاس باتیں اتفاقی بغیر کسی ارادے اور مشیت کے خود بخود قانونِ قدرت میں واقعہ ہوتی رہتی ہیں تو باقی پچاس بھی ایسی ہی مان لو اور تمام انتظام کو اتفاقی سمجھ کر کسی مدبر بالارادہ، علیم، لطیف، خبیر ہستی کا انکار ہی کر دو اور اپنے سر سے ایک خواہ مخواہ کا بوجھ اتار پھینکو سو یہ بھی ہے ایک وجہ دہریہ ہونے کی اور علاج اس کا یہی ہے کہ تم کبھی یوں نہ کہو کہ فلاں بات اتفاقاً ہوگئی ہے یا فلاں حادثہ اتفاقاً پیش آگیا ہے بلکہ ہمیشہ یوں کہا کرو کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا یا اللہ تعالیٰ نے یوں چاہا۔ تب خدا کے فضل سے تم مخفی دہریت کی آگ سے محفوظ رہو گے جو آج کل دُنیا پر مسلط ہو رہی ہے۔

اگر اسی طرح قبولیتِ دُعا کے نمونے ہر احمدی اپنی ذات میں دیکھے تو حیران رہ جائے۔ مگر بات اتنی ہے کہ بعض لوگ دیکھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے اور ہر دُعا کے آئینہ میں اپنے رب کے چہرے پر نظر نہیں ڈالتے بلکہ صرف مطلب لے کر اور آئینہ اوندھا رکھ کر واپس چلے آتے ہیں۔ پس ڈھونڈو اپنے رب کو اپنی دعاؤں میں اور ان دعاؤں کی قبولیتوں میں اور تم پاؤ گے اس کو چھپا ہوا وہیں جہاں تمہاری دُعا ہے۔

چونکہ دُعا کا مسئلہ اس وقت درپیش ہے۔ اس لئے آخر میں مَیں بھی خلاف اپنی قدیم نامناسب عادت کے پڑھنے والے احباب کی خدمت میں یہ التماس کرتا ہوں کہ وہ میرے سلئے بھی فلاح دارین کی دُعا کریں اور یہ کہ مجھے اور میرے اہل وعیال کو خدا ہدایت نصیب کرے اور صراطِ مستقیم پر ہمیشہ قائم رکھے اور ہمیں اپنی قبروں کے لئے کچھ جگہ مقبرہ بہشتی میں مل جائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں جسمانی اور روحانی رزق دے کر اپنی معرفت، محبت عبدیت اور قرب کی چاشنی عطا فرمائے اور اپنی دائمی رضا سے سرفراز کرے، اپنے کلام یعنی قرآن مجید اور کتابِ حکیم سے مناسبت بخشے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہو۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے قدموں میں حشر ہو اور حضرت خلیفۃ المسیح میرا جنازہ پڑھائیں اور میت کو اپنا کندھا دیں۔ آمین۔

اور ساتھ یہ فضل ساری جماعت پر ہوں کیونکہ بغیر سب کی شمولیت کے کچھ لطف اور کچھ مزا نہیں اور ساری جماعت سے مراد نہ صرف موجودہ بلکہ گزشتہ اور آئندہ سب کی سب جماعت ہے۔ آمین۔

(الفضل ۱۷ار فروری ۱۹۶۱ء)

دعاؤں کی درخواستیں

حال ہی کا ذکر ہے کہ متفرق اوقات میں مجھے چند آدمی ملے۔ جن کا ذکر کرنا کچھ مناسب سمجھتا ہوں۔

پہلے صاحب فرمانے لگے (سلام و دعا) مزاج شریف۔ میرے لئے دُعا ضرور کیجئے۔ ضرور، ضرور، بالضرور۔ یاد رکھیں بھول نہ جائیں۔ آج کل کچھ تنگی ہے۔

دوسرے صاحب نے کہا (سلام و دعا) غریبوں کو آڑے وقت کی دعا میں ضرور یاد رکھیں۔ ہمارے گھر میں کچھ تکالیف ہیں۔

تیسرے صاحب نے فرمایا (سلام و دُعا) دردِ دل سے دُعا کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ ضرور ہماری درخواست کو قبولیت دیں گے۔ امسال میرے لڑکے نے امتحان دیا ہے مقابلہ کا۔

چوتھے صاحب بولے (سلام و دعا) بھائی جی مجھے آج کل بڑے ابتلا ہیں اور ہم دُعا کے محتاج ہیں۔ بڑے ہی محتاج ہیں۔ فجر سے پہلے کی عبادت کی دُعا کی ضرورت ہے۔ سہام اللیل چاہئیں۔ ایک مقدمے میں بے گناہ پھنس گیا ہوں۔

پانچویں صاحب یوں گویا ہوئے (سلام و دُعا) امید ہے دعاؤں میں آپ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو یاد کرتے ہوں گے۔ خاص دعا درکار ہے۔ آپ سے درخواست ہے ہمارا تو آپ لوگوں پر بھروسہ ہے۔ میں آپ کو بذریعہ خط یاد دہانی کرواتا رہوں گا۔ آج کل گھر کے سب لوگ بیمار ہیں۔

چھٹے صاحب نے کہا (سلام و دعا) ہمارے تو سارے کام دعاؤں سے ہی چلتے ہیں۔ بس آج کل ان کی بڑی خاص ضرورت درپیش ہے۔ خاص کر میرا تو سارا کام دعاؤں سے ہی ہوتا ہے۔ دعاؤں سے بیٹا نصیب ہوا۔ دعاؤں سے مقدمے سے خلاصی ہوئی۔ دعاؤں سے ملازمت ملی۔ ہمارا تو سارا انحصار ہی دعاؤں پہ ہے۔ اب فصلوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کے لئے دعا فرمایئے۔

ساتویں صاحب نے فرمایا (سلام و دعا) دُعا ضرور فرمانا۔ دُعا۔ دردِ دل کی دعا۔ یہ کہہ کر آگے چلے گئے۔ مگر پھر پلٹے۔ اور ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے کہ سخت حاجت ہے دُعا کی۔ اچھا وعدہ کریں کہ ضرور کریں گے۔ میں آپ کا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک آپ مجھ سے پکا وعدہ نہیں کر لیں گے۔ آپ کو معلوم ہے میرے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ اولادِ نرینہ کے لئے توجہ فرمائیں۔ ان ساتوں احباب کا جواب یہ ہے کہ ان کے اس مظاہرے پر اور ان کی وجہ سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان پر، ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں کہتے ہیں۔

دُعا کی حقیقت

مگر سب سے پہلے میں اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا ہوں تاکہ کسی شخص کو دھوکہ نہ لگے۔ دُعا ان عظیم الشان نعمتوں میں سے ہے جن سے فیج اعوج نے (۔) کو بالکل محروم کر دیا تھا۔ اور پھر حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اس نعمت سے ہم کو مالا مال کیا۔ دُعا ہمارے لئے اس سے زیادہ قوت اور سہارا ہے۔ جتنا ایک چھوٹے بچے کے لئے اس کا رونا اور چیخنا۔ اپنی ماں کو بلانے کے لئے۔ دعا خدا سے ملنے کا، اس پر ایمان لانے اور اس ایمان کو قائم رکھنے کا ایک یقینی وسیلہ ہے۔ دُعا اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کو جوش میں لانے کا ایک ذریعہ ہے۔ دُعا عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے۔ دُعا کے بغیر خدا اور بندے کا کوئی تعلق قائم ہو

ہی نہیں سکتا۔ دُعا ہر مصیبت کی سپر ہوتی ہے ۔ اور دُعا خدا تعالیٰ کی تمام تقدیروں کو جو خاص تقدیروں کو بھی تڑوا دیتی ہے ۔ اگر ہم دُعا نہ کریں تو بقول کشف حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ ہم گوں کھانے والی بھیڑوں سے بھی زیادہ خدا کی نظر سے ناپاک اور ذلیل ہوں گے ۔

یہ تو ہے دعا اور اس میں داخل ہے ہر قسم کی دُعا۔ فجر سے پہلے کی دُعا گریہ وزاری کی دعا۔ اضطراب اور تڑپ کی اور جوش کی اور اخلاص کی دعا۔ خاص موقعہ کی دعا۔ دکھے ہوئے دل کی ۔عام مجلسوں کی دعا۔ (عبادت) کی دُعا۔ خاص توجہ والی دُعا۔ اور بے خاص توجہ کی دُعا ۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا۔ اور صرف لبوں سے نکلی ہوئی دعا۔ بار بار کی دعا۔ دل میں صرف ایک سیکنڈ کے لئے کی ہوئی دُعا۔ کبھی بے سمجھی بوجھی دُعا جیسے کوئی ان پڑھ پنجابی شخص (عبادت) میں کوئی عربی دُعا مانگا کرے ۔ یا بے الفاظ کی دُعا جیسے کوئی خدا کے آگے ہاتھ جوڑ کر یا عاجزی کے ساتھ صرف سجدہ ہی میں پڑ جائے ۔ بغیر اس کے کہ کوئی لفظ بھی مُنہ سے نکالے۔ غرض دُعا ہر رنگ میں دُعا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ مضطر کی دُعا ہی دُعا ہے۔ بلکہ ہمارا تجربہ ہے کہ بعض اوقات منہ سے بات نکلی ادھر وہ بات قبول ۔ یہ نہیں کہ عاجزی ہو رہی ہو۔ بیت الدعا یا بیت الذکر میں داخل ہوں۔ اور رو رو کر سخت تضرع اور خشوع و خضوع سے دُعا مانگیں تو اسے دُعا سمجھیں بلکہ مثال کے طور پر حسب ذیل بھی دعائے مستجاب ہے جس کے پیچھے ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی ۔

چند سال کا ذکر ہے کہ ایک دن رات کو بعد مغرب کھانا کھا کر ہم سب اماں جان کے دستر خوان پر ہی بیٹھے تھے ۔ کہ کسی نے کہا اس وقت گنے کھانے کو جی چاہتا ہے ۔ ..... خدا کھلا دے (یعنی وہ گنا جسے پونڈا کہتے ہیں اور پنجابی میں پونا) حضرت اماں جان نے ایک آدمی بازار دوڑا دیا۔ وہ جواب لایا بازار میں کوئی پونڈا نہیں ملا۔ فارم کی طرف کوئی آدمی بھیجا گیا۔ اُدھر سے بھی جواب صاف آیا کہ گنے ہیں پونڈے نہیں ہیں ۔خیر جب دونوں تیر خالی گئے تو صبر سے بیٹھ گئے ۔ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے اور پانچ منٹ فارم والے پیغام بر کو آئے ہوئے نہیں

گذرے تھے کہ بیت مبارک کے دروازے سے مکرمی مفتی فضل الرحمان صاحب نے حضرت اماں جان کو یکدم آواز دی کہ اماں جان یہ گنے گورداسپور کے میں لایا ہوں۔ آج وہاں کسی مقدمے پر گیا تھا۔اور ابھی تانگے پر سیدھا آرہا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک پھاندی پونڈوں کی پردہ میں سے دھڑام کر کے اندر پھینک دی۔ یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے مگر ان پونڈوں کا عند الطلب غیب سے آجانے کا لطف ہماری ساری پارٹی کو خوب آیا۔ خصوصاً جبکہ وہ اسی خاص طرح آئے تھے۔اور ہر شخص بطور دعوتِ خداوندی ان کو نہایت شوق سے کھاتا تھا۔بعض لوگ غلطی سے یہ بھی کہتے تھے کہ کاش کچھ اور چیز اس وقت مانگی جاتی۔ حالانکہ خدا نے ہمیں گنے نہیں کھلائے تھے۔بلکہ اپنے اسماء سمیع، مجیب، کلیم اور معطی کا جلوہ دکھایا تھا۔گویا گنوں کے پردہ میں خود کو ظاہر کیا تھا۔ایسے موقعہ پر یہ کہنا کہ کاش کوئی زیادہ قیمتی چیز مانگتے تو مل جاتی ایک غلطی تھی۔ کیونکہ خود خدا سے بڑھ کر کون سی چیز قیمتی ہوسکتی ہے۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی پوزیشن ایسی واضح کر دی ہے کہ جو بات میں آگے بیان کرنے لگا ہوں۔ اس سے کسی صاحب کو نہ تو میرے عقیدہ دُعا کے متعلق دھوکا لگے گا نہ اُسے یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں (اللہ کی پناہ) خدا کی کسی قسم کی سبکی کرنی چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفسوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

اب آپ ان نقائص کو دیکھئے جو ایسی باتوں یا ان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ خدا کے فضل کا ذکر ضروری ہے۔آپ ان ساتوں صاحبان کی تقریر پھر پڑھیں۔اور دیکھیں کہیں انہوں نے خدا کے فضل کا بھی نام لیا ہے۔ دعا بہر حال بندے کی کوشش اور جدوجہد کا نام ہے۔اور اگر ہم لوگ رفتہ رفتہ ہر چیز کا انحصار دعاؤں پر ہی رکھ دیں گے۔ اور خدا کے فضل کا لفظی اقرار ہمارے مونہوں سے نکلنا بند ہو جائے گا۔ تو ہم رفتہ رفتہ ایک مشرکانہ رنگ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمارے لبوں سے سب سے زیادہ خدا کے فضل کا نام نکلنا چاہیئے نہ کہ بندے کی کوششوں کا۔ ہم کو خدا تعالیٰ کے براہ راست رحم پر اس

سے زیادہ ایمان اور اس سے زیادہ یقین رکھنا چاہیئے جتنا ہم انسان کی تدبیروں پر کرتے ہیں کیونکہ دعا گو وہ روحانی چیز ہو بہر حال ایک انسانی تدبیر ہے۔ پس ہرگز یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ میرے ہاں دعاؤں سے بیٹا ہوا۔ یا میں دعاؤں سے نوکر ہوا۔ یا میں دعاؤں سے صحت یاب ہوا۔ بلکہ پہلے یہ اقرار کرنا چاہیئے کہ خدا کے فضل سے اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی دُعا سے یہ بیٹا ہوا۔ اور خدا کے فضل سے اور حضرت امام جماعت کی دعاؤں سے مجھے صحت ہوئی۔ پس یاد رکھو کہ ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے اپنے فضل و کرم کو رفتہ رفتہ بھول جاؤ اور سارا انحصار انسانی کوششوں پر بیان کرنے لگو۔ اور آہستہ آہستہ خدا تعالیٰ کا نام اس کی نعمتوں سے الگ ہو جائے۔ بے شک دعاؤں کا بھی صاف نام لو اور بڑے زور سے لو۔ مگر فضل کرنے والی ذات کی طرف سے توجہ نہ پھرے۔ میں الفضل میں درخواستِ دُعا کے کالم کو التزاماً دیکھتا ہوں اور یہ بات خصوصاً دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اس بات کو کس رنگ میں لیتے ہیں۔ مگر سالہا سال میں شائد ایک دفعہ بھی یہ نہیں دیکھا کہ جہاں دعا سے اولاد ہونے کا ذکر ہو۔ وہاں اللہ میاں کا بھی کوئی حصہ نمایاں طور پر اس میں ظاہر کیا گیا ہو۔ پس احتیاط لازم ہے۔

۲۔ **درخواستِ دُعا** میں دُعا کے لئے اپنے بھائیوں سے درخواست کرنے کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ اس سے آپس میں تعلق بڑھتا ہے اور قربانی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دعا بعض اوقات قربانی کی کیفیت کو چاہتی ہے۔ اور جو لوگ سرسری اسی وقت جواب میں دُعا کر دیتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ اللہ فضل کرے۔ وہ بھی جائز ہے۔ اور ایسی دعائیں بھی منظور ہوتی رہتی ہیں۔ نیز بار بار ذکر دعا سے دعا کا خیال مردوں کو عورتوں کو اور بچوں کو اتنا ہو جاتا ہے کہ دُعا ایک قومی شعار بن جاتی ہے۔ مگر پھر بھی بعض لوگوں کا طرزِ ادا یا طرزِ درخواست ایسی ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہی کہ ہاتھ پکڑ کر وعدے لینے لگے۔ یا کوئی فجر سے پہلے کی عبادت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو اسے بار بار یہ کہنا

کہ بھائی صاحب ہمیں فجر سے پہلے کی عبادت کی دعائیں درکار ہیں۔ یا درد دِل کے مقدس لفظ کو اِس طرح گلیوں اور بازاروں میں پکار کر کہنا کم از کم میرے لئے تو ناقابلِ برداشت ہے۔پس اپنے الفاظ کو درست طور پر پیش کرو۔ نہ ایسے طور پر کہ حقارت اور بے ہودگی پیدا ہو اور پیچھے پڑنا تو خوامخواہ اگلے کو بھی شرمندہ کرنا ہے۔شائد کوئی قرض خواہ اپنے قرض داروں کو برسرِ بازار اتنا ذلیل نہیں کرتا ہوگا جتنا کسی حساس کا ایسے الفاظ دکانوں پر یا بازاروں میں سُننا۔اِس سے بہتر تھا کہ وہ صاحب زیادہ ثقاہت سے کام لیتے اور ایسی حرکتیں نہ کرتے۔

۳۔ اعلیٰ مقصد کے لئے دُعا۔ آپ پھر ان سات شخصوں کی دُعا کی درخواستوں کو پڑھیں۔آپ حیران ہوں گے۔کہ کسی ایک نے بھی نیکی، تقویٰ، آخرت، بہشتی مقبرہ کی نعمت، معرفت، علم کلام الٰہی، خدا تعالیٰ سے تعلق، اور محبت اور رضا کے لئے یا دُنیا کی ہدایت اور اشاعت احمدیت کی دُعا کے لئے کہا ہو۔ اگر زیادہ وضاحت چاہتے ہیں تو پھر الفضل کے دُعا کے کالموں کو دیکھ لیں۔اور اپنی حالت پر روئیں۔کہ سوا دنیا کے اور سخت ذلیل چیزوں کے عموماً لوگ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دُعا نہیں کراتے۔ نہ غالباً خود کرتے ہوں گے۔میں دنیاوی دُعا سے منع نہیں کرتا کراؤ اور ضرور کراؤ۔ مگر تمہارا خدا تو وہ ہے جس نے تمہیں یہ کہا ہے کہ جو صرف دُنیا کے فائدہ سے مانگتا ہے اُسے کہہ دو کہ ہمارے پاس دُنیا اور آخرت دونوں کے فائدے موجود ہیں۔ دونوں کیوں نہیں مانگتا۔پس میں خدا تعالیٰ کا یہ پیغام تمہیں سُنا دیتا ہوں کہ تمہارے خدا کے پاس دونوں نعمتیں ہیں اور دنیاوی چیزوں کی دُعا کے وقت آخرت کی کوئی چیز ضرور بالضرور شامل کر لیا کرو۔ اور پہلے اسی کا نام لیا کرو۔ ورنہ سخت دُنیا دار ٹھہرو گے۔پھر کس منہ سے دین کو دُنیا پر مقدم کرنے والے کہلا سکو گے۔

(اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ دعا کے سلسلے میں درخواست کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی شکایت کا انداز نہیں ہونا چاہیئے، اور امام جماعتِ وقت سے دُعا کی درخواست کرنی چاہیئے)

آپ فرماتے ہیں :۔

سب سے بڑا خطرہ جس کا احساس مجھے ہونے لگا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایسے دُعا کے طالبوں کو میں یہ کہتا ہوں کہ دیکھو حضرت امام جماعت جو ہمارے سردار ہیں۔ ان سے دُعا کراؤ۔ ان کا رُتبہ خدا نے اتنا بلند کیا ہے کہ بسبب حسن واحسان میں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا مظہر ہونے کے اور بسبب ان کی جانشین ہونے کے وہی حق رکھتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف بار بار اور ہر مصیبت اور تکلیف میں دُعا کی درخواست کریں ۔ کیونکہ دُعا دراصل ... کا امتیازی نشان یا معجزہ ہے۔ اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے ہمیشہ دُعا کے مقابلہ اور کثرت قبولیتِ دُعا کا چیلنج بار بار دیا ہے۔ پس اس نشان کی قدر کرو ہمیشہ حضرت صاحب سے دُعا کرایا کرو۔ اس پر جو جواب مجھے ملتے ہیں وہ چونکا دینے والے ہیں اور وہ عموماً ایسے رنگ کے ہوتے ہیں۔ کہ آپ نے واقعی یہ درست فرمایا مگر دیکھو کہ حضرت صاحب کو اتنے رقعے پڑھنے کی فرصت کہاں۔ اتنی بڑی جماعت ہو گئی ہے کہ حضرت صاحب کو کیا پتہ کہ ہم کون ہیں ۔ غریبوں کو بڑے آدمی پہچانتے بھی کہاں ہیں۔ اور پھر ان کو دن رات امامت کے کام ہوتے انہیں فرصت کہاں ملتی ہے۔ جو ہم جیسے حقیروں کی طرف توجہ کریں۔ میر صاحب فرماتے ہیں یہ جواب جھوٹ اور سفید جھوٹ اور خطرناک جھوٹ ہے ۔ حضرت امام جماعت ہر خط اور ہر رقعہ پڑھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ اس کا مضمون یاد رکھتے ہیں اور ہر شخص کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ جانتے اور پہچانتے ہیں اور باوجود دن رات کام میں مصروف ہونے کے حقیر سے حقیر شخص کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں۔ اور بارہا انہوں نے اس جھوٹ کی علی الاعلان مجلسوں کے موقعوں پر تردید فرمائی ہے کہ بعض لوگ ہیں پھر وہی بات رٹے چلے جاتے ہیں۔

(اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اپنے لئے آپ بھی دعا کرو۔ اور کہ قبولیتِ دُعا کو حضرت امام جماعت کی طرف منسوب کرو۔ اس مضمون کے آخیر پر آپ فرماتے ہیں۔

دُعا فروشوں سے خطاب

اب میرا روئے سخن بعض ان دوستوں کی طرف ہے جو گو نیک ہیں اور نیک نیت بھی ہیں۔ مگر کسی غلطی کی وجہ سے انہوں نے ایک گوناں دُعا فروشی کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دوں گا۔ صرف یہ عرض کر دوں گا کہ یہ کام مکروہ ہے۔ بے شک وہ دُعا کریں مگر اس کا معاوضہ کچھ کہہ کر طلب نہ کریں۔ کیونکہ اس سے دُعا کی برکت اور عظمت اور اصل قدر کم ہو جاتی ہے۔ اور دنیا کی دیگر ادنیٰ اشیاء کی طرح ایک معمولی حیثیت کی قابل خرید و فروخت چیز رہ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دُعا سے پہلے کسی نذرانے کا سوال قطعاً نہ آئے تو پھر بھی اتنا ہی یا اس سے بڑھ کر نذرانہ پہنچے گا اور توحید و توکل کا درجہ اور بلند ہو گا۔ اور لوگوں کی اعتقادی حالت اور زیادہ بہتر ہو جائے گی۔ اور روحانی فضا اور زیادہ صاف ہو جائے گی۔ اور عوام الناس دُعا کرانے والوں کی توجہ مرکز امامت کی طرف زیادہ رہے گی اور بس۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ جتنی بھی ہو سکتی ہے اور توفیق اللہ ہی دینے والا ہے۔

(الفضل ۷ نومبر ۱۹۳۶ء)

(منقول از الفضل ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

اظہارِ تشکّر

اس کتاب کی اشاعت میں حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کے اہل خاندان کا مالی تعاون حاصل ہوا۔ ہم اُن کے شکر گزار ہیں اور دُعا گو ہیں کہ قادر و قیوم خدا ان کے اخلاص، اموال اور نفوس میں برکت عطا فرماتا چلا جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ آمین

بغرضِ دُعا معاونین خواتین و حضرات کے اسمائے گرامی درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ مکرم سیّد محمد احمد صاحب و بیگم مکرمہ امۃ اللطیف صاحبہ
۲۔ مکرمہ بیگم سیّد سیّد احمد ناصر صاحب (مکرمہ ریحانہ باسمہ صاحبہ)
۳۔ مکرم سیّد امین احمد صاحب مع بیگم صاحبہ
۴۔ مکرمہ سیّدہ طیبہ صدیقہ صاحبہ بیگم نواب مسعود احمد خان صاحب
۵۔ مکرمہ سیّدہ امۃ اللہ بیگم صاحبہ بیگم پیر صلاح الدین صاحب
۶۔ مکرمہ سیّدہ امۃ الہادی بیگم صاحبہ بیگم پیر ضیاء الدین صاحب
۷۔ مکرمہ سیّدہ امۃ القدوس صاحبہ و مکرم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب
۸۔ مکرمہ سیّدہ امۃ السمیع صاحبہ و مکرم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب
۹۔ مکرمہ سیّدہ امۃ الرفیق پاشا صاحبہ بیگم حضرت اللہ پاشا صاحب
۱۰۔ مکرم سیّد ہارون مکرم احمد صاحب و بیگم سارہ نسیم احمد صاحب
۱۱۔ مکرمہ سیّدہ عائشہ صدیقہ شمع احمد و ڈاکٹر احمد حمید صاحب
۱۲۔ مکرم سیّد طاہر احمد صاحب
۱۳۔ مکرم سیّد مدثر احمد صاحب
۱۴۔ مکرم سیّد انیس احمد صاحب
۱۵۔ مکرمہ سیّدہ صبیحہ سلطانہ صاحبہ بیگم مرزا سلطان احمد صاحب
۱۶۔ مکرمہ فوزیہ فرحانہ صاحبہ بیگم مرزا کلیم احمد صاحب
۱۷۔ مکرم سیّد مجیب احمد صاحب
۱۸۔ مکرم سیّدہ ماہم امین صاحبہ

۱۹۔ مکرم نواب مودود احمد خان صاحب
۲۰۔ مکرمہ نصرت جہاں بیگم میر محمود احمد صاحب
۲۱۔ مکرمہ امۃ الناصر بیگم ظہیر احمد خان صاحب
۲۲۔ مکرمہ امۃ المومن خان صاحبہ بیگم نواب مودود احمد خان صاحب
۲۳۔ مکرم مامون احمد خان صاحب ابن نواب مودود احمد خان صاحب
۲۴۔ مکرمہ مدیحہ عنبر صاحبہ بنت نواب مودود احمد خان صاحب
۲۵۔ مکرمہ امۃ المالک فرخ صاحبہ بیگم پیر منیر احمد صاحب
۲۶۔ مکرمہ صاحبزادی امۃ العلیم عصمت صاحبہ بیگم نواب منصور احمد خان صاحب
۲۷۔ مکرم مرزا طیب احمد صاحب مع مکرمہ امۃ النور صاحبہ
۲۸۔ مکرم مرزا عبد الصمد صاحب مع مکرمہ صوفیہ احمد صاحبہ
۲۹۔ مکرمہ صاحبزادی امۃ الحفیظ صاحبہ
۳۰۔ مکرمہ صاحبزادی حمیرا امۃ الحمید صاحبہ
۳۱۔ مکرمہ صاحبزادی شبرہ امۃ اللطیف صاحبہ
۳۲۔ مکرم مرزا محمد احمد مصطفیٰ مع بیگم صاحبہ
۳۳۔ مکرم سید حسن زین العابدین صاحب ابن سید محمود احمد صاحب
۳۴۔ مکرمہ شمیم صادقہ بیگم نواب حامد احمد خان صاحب
۳۵۔ مکرم پیر فواد احمد خرم صاحب مع بیگم صاحبہ
۳۶۔ مکرم پیر جواد احمد صاحب مع بیگم صاحبہ
۳۷۔ مکرم پیر سعد احمد صاحب مع بیگم صاحبہ
۳۸۔ مکرم پیر محمد احمد صاحب
۳۹۔ مکرم پیر ذکی احمد صاحب مع بیگم صاحبہ
۴۰۔ مکرم پیر عمیر احمد صاحب
۴۱۔ مکرمہ قرۃ العین بشریٰ صاحبہ بیگم پیر محمد طاہر صاحب
۴۲۔ مکرم سید خضر پاشا صاحب